سیاست کے فرعون
PDFBOOKSFREE.PK
وکیل انجم
پنجاب کے جاگیرداروں کے عروج وزوال کی کہانی

بار اوّل ---------- ۱۹۹۲ء

مطبع --- فیروز سنز لاہور

مجلد --- 969 0 01126 X

انتساب

رب ذوالجلال کے نام

جس کی بادشاہی صدا قائم رہے گی

جس کے ہاتھ میں

زندگی اور موت کے فیصلے ہیں۔

سیاست کے فرعون

"سیاست کے فرعون" کا زیادہ تر حصہ سرکاری دستاویزات رپورٹوں اور کتابوں کے ترجمے اور حوالوں پر مشتمل ہے۔ کتابوں اور سرکاری دستاویزات کے حوالے یہ ہیں

- **Chief and Families of Note in the Punjab**
  Revised and Corrected up to July 1, 1939 under the orders of the Punjab Government
  Printed by the Superintendent, Government Printing, Punjab, 1940
- **Chief and Families of Note in the Punjab** by Griffin, K. C. S. I
  Revised & Corrected under the order of the Punjab Government by W. L. Conran, Major, Indian Army and H. D. Craik, Indian Civil Service
  Printed at the Civil and Military Gazette Press, 1909
- **Family Pension Funds**
  Published by the Manager of Publications, Delhi, Printed by the Manager, Government of India Press, New Delhi, 1937
- **Inam in the Rawalpindi District sanctioned upto 17th of January 1898**
  Published by Authority the Civil and Military Gazette Press Contractor to the Punjab Government, 1890
- **Indian Imperial Gazetteer**
  Published by Government of India
  Gazetteer, Compiled and Published by Authority of the Punjab Government, Lahore Civil and Military Gazette Press
  Gujrat 1883-1884, 1892, 1893, 1921, 1912, 1934
  Lahore 1883, 1884, 1894, 1895, 1920
  Lyallpure 1912, 1935, 1883, 1884, 1894, 1895, 1920
  Sialkot 1912, 1936, 1883, 1884, 1893, 1894, 1935, 1916
  Jhelum 1913, 1934, 1883, 1884, 1892, 1893, 1921
  Mianwali 1904, 1912
  Rawalpindi 1912, 1935, 1915, 1883, 1884, 1907
  Shahpure 1904, 1934, 1897, 1907
  Dera Ghazi Khan 1904, 1912, 1883, 1884, 1893, 1897
  Multan 1904, 1913, 1936, 1883, 1884, 1908, 1909
  Mozaffargarh 1913, 1914, 1936, 1916
  Montgomery 1913, 1935, 1883, 1884, 1898, 1899, 1933
  Gujranwala 1904, 1920, 1936, 1883, 1884, 1893, 1894, 1935
  Sheikhupura 1933
  Attock 1912, 1936, 1907, 1930
  Gujrat 1912, 1934, 1883, 1884, 1892, 1893, 1921
  Chenab Colony 1904
  Jhang 1883, 1884, 1908, 1909
- Indian Information. **For What Are Fighting?—Democracies, Debate War in World Order and Civilization, Future of India, Colonies and Minorities,** New Delhi, March 27, 1940, Editor Jossleyn Hennessy.
  Issued Fortnightly by the Bureau of Public Information of Government of India
- **Journals and Diaries of the Assistants to Resident at Lahore 1846–1849**
  Printed at the Pioneer Press, Allahabad, 1911

- **Martial Law Orders and Notices**
  Printed by the Superintendent, Government Printing, Punjab, 1919
- **Martial Races of India**
  by Lieut General Sir George Macmunn K-C, B, K-C. S-I D. S. O
  Gosha-e-Adab, Quetta, Pakistan
- **Mutiny Record**
  Printed by Lala Sita Ram, Superintendent, Punjab Government Press, Lahore, 1911
- **Mutiny Records Correspondence**
  Printed at the Punjab Government, 1911
- **Mutiny Report Part II**
  Printed at the Punjab Government Press, 1911
- **Mutiny Records Reports**
  Printed at Punjab Government Press, 1911
- **New Series No. 18**
  Selections from the Records of the Office of the Financial Commissioners, Punjab
  Published by Authority
- No. 44. Paper relating to the **ala-Lambardari Inam** in Six Districts of the Lahore and Rawalpindi. The Civil and Military Gazette Press Contractor to the Punjab Government 1896
- Pedigree Tables of the Families mentioned in the Revised Edition of **Chiefs and Families of Note in the Punjab**
  Printed at the Civil and Military Gazette Press, 1911
- **Political Diaries of Lieutenant Reynell G, Taylor Mr. P, Sandys Melvill Pandit Kunahya Lal, 1847, 1849**
  Printed by the Pioneer Press, Allahabad
- **Public Correspondence of the Punjab Government**
  Published by Authority Vol. IV, No. 4
  Memorandum of the Dera Ghazi Khan District
  Lahore, Printed at the Hope Press J. P. Williams, 1860
- **Punjab Chiefs**
  Printed by the Superintendent, Government Printing, Punjab, 1940
- **Punjab Government Record Lahore Political Diaries**
  1847, 1849, by Lieut, H, B Edwardes
  Allahabad. Printed at the Pioneer Press, 1911
- Revised Pedigree Tables of the Families mentioned in Revised Edition of **Chief and Families of Note in the Punjab**
  Printed by the Superintendent, Government Printing, Punjab, 1930
- Revised Pedigree Tables of the Families mentioned in Revised Edition of **Chief and Families of Note in the Punjab**
  Printed by the Superintendent, Government Printing Press, Punjab, 1940

پیش لفظ

پاکستان کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر، سیاسی کارکن اور باشعور شہری جمہوریت کا کلمہ پڑھتا ہے لیکن جمہوریت ہے کہ اس ملک میں جڑ ہی نہیں پکڑ چکتی۔ ستم ظریفی یہ کہ وہ ملک جو ایک جمہوری عمل کے نتیجے میں بنا وہاں عملاً کسی چیز کا فقدان ہے تو وہ جمہوریت ہے۔ یہاں تک کہ جب یہاں ایک جمہوری حکومت بر سراقتدار ہوتی ہے تو اس وقت بھی جمہوری رویئے نہیں اپنائے جاتے اور جمہوری قدروں اور اصولوں کی خوب خوب مٹی پلید کی جاتی ہے۔ اور پھر مارشل لاء لگ جاتا ہے۔ ہم جہاں سے چلتے ہیں، وہیں واپس آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمارا سارا سفر کھوٹا ہو جاتا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

کیا ہم ایک قوم کے طور پر جمہوریت کے اہل ہی نہیں؟

کیا سارا قصور فوج کا ہے جو ملک میں بار بار مارشل لاء لگا دیتی ہے؟

پاکستان کی سلامتی، یکجہتی اور ترقی کے لئے ان چبھتے ہوئے سوالوں کا صحیح صحیح جواب اس قدر ضروری ہے کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ اور پوری گہرائی میں اتر کر غور کرنا چاہیئے۔

ایک مدت کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب تک ہمارے ملک سے جاگیرداری اور ہماری سیاست سے جاگیرداروں کو نکال باہر نہیں کیا جاتا، پاکستان میں جمہوریت جڑ پکڑ ہی نہیں سکتی۔ یہ نتیجہ فکر اس اہم ترین اور انتہائی حقیقت پسندانہ نظریئے پر مبنی ہے کہ ہر معاشرتی اور معاشی (سوشو اکنامک) نظام اپنے لئے ایک مخصوص سیاسی نظام کو جنم دیتا ہے۔ اگر معاشرتی اور معاشی نظام کچھ اور ہو اور سیاسی نظام اس سے لگا نہ کھاتا ہو تو ان

میں سے ایک نظام دوسرے نظام کو کھا جائے گا۔ چنانچہ ہمارے یہاں جاگیرداری نظام جمہوری نظام کو بار بار کھاتا چلا جا رہا ہے۔ یہ دونوں نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر جمہوری نظام مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتا تو وہ جاگیرداری نظام کو کھا جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں جاگیرداری نظام اتنا مضبوط ہے کہ وہ جمہوری نظام کی جڑ لگنے ہی نہیں دیتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جاگیرداری نظام اس معدے کی طرح ہے جو جمہوریت کو ہضم کر ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ہم جب بھی اس پر اوپر سے جمہوریت ٹھونستے ہیں تو وہ اسے ہر بار اگل دیتا ہے۔

اس بظاہر سادہ سی حقیقت کے اندر معنی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ ہماری معاشرت اور معیشت پر صدیوں سے جاگیرداری نظام مسلط ہے۔ یہ نظام جہاں جہاں موجود ہوا، وہاں سیاسی سطح پر بادشاہت یا آمریت ہی قائم ہوئی۔ جمہوریت تو پیدا ہی اس وقت ہوئی جب جاگیرداری نظام ٹوٹا۔ یاد رہے کہ یونان کی قدیم "شہری جمہوریت" میں ہر شخص یا شہری کو ووٹ کا حق حاصل نہیں تھا کہنے کو تو قبائلی نظام میں بھی ایک طرح کی جمہوریت پائی جاتی ہے لیکن آج ہم جس نظام کو جمہوریت کا نام دیتے ہیں یا جس جمہوری نظام کے خواہش مند ہیں، وہ ہر بالغ شخص کو رائے دہی کا آزادانہ اور منصفانہ حق دے کر ہی قائم ہو سکتا ہے۔ ان معنوں میں جمہوریت اسی وقت آئی اور انہی ملکوں میں آئی جہاں صنعتوں نے فروغ پایا، زرعی معاشرہ صنعتی معاشرہ میں بدلا اور یوں جمہور کا زمین سے بندھا ہوا ووٹ آزاد ہو گیا۔ اس آزادی نے جاگیردارانہ معاشرت اور معیشت کا خاتمہ کر کے جمہوریت کو استحکام بخشا۔

بے شک آج پاکستان میں مارشل لاء نافذ نہیں اور جمہوریت کے عنوان سے یہاں سیاستدانوں کی حکومت قائم ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ پانچ فیصد جاگیردار اسمبلیوں کی پچانوے فیصد نشستوں پر قابض ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی نظام آج بھی جاگیرداری کے حوالے سے چل رہا ہے۔ ملک کا ہر قانون جمہور کے بجائے جاگیرداروں کے فائدے کے لئے بنتا ہے۔ مہنگائی، بے روزگاری اور بیماری کی مار جمہور کھاتے ہیں۔ ٹیکس دیتا ہے تو درمیانے طبقے کا نوکری پیشہ شخص یا دکاندار اور صنعتکار لیکن فائدے اٹھاتا ہے اور ہر طرح کے ٹیکس سے بری ہے تو بڑا زمیندار یا جاگیردار۔ یہی بڑے زمیندار اور جاگیردار فوج کے معاون رہے ہیں۔ انہی کے کندھوں پر سوار ہو کر فوج مارشل

لاء لگتی اور چلاتی رہی ہے۔ یہی لوگ فوج کی نگرانی میں بننے والی سیاسی جماعتوں اور
حکومتوں کے بڑے بڑے منصب سنبھالتے چلے آتے رہے ہیں۔

کہنے کو اب پاکستان میں جاگیرداری ختم ہو گئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وسطی
پنجاب کے کچھ اضلاع کو چھوڑ کر باقی سارے پاکستان میں اب بھی جاگیرداروں ہی کا
معاشرتی اور معاشی تسلط برقرار ہے۔ نتیجہ یہی ہے کہ جاگیردار ہی اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں اور
ظاہر ہے کہ وہ اپنے خلاف قانون سازی سے تو رہے۔ جاگیرداروں کی اس جمہوریت سے
جمہور کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اگر کسی کو فائدہ پہنچتا ہے تو صرف اور صرف جاگیرداروں
کو۔ یہ جمہور کی سادگی ہے کہ وہ جاگیردارانہ معاشرتی اور معاشی نظام کی تبدیلی کے بغیر
جمہوریت کے سیاسی نظام سے کوئی نیک توقع وابستہ کر بیٹھتے ہیں۔ گستاخی معاف، ہمارے وہ
محترم سیاسی لیڈر بھی سراسر منافقت سے کام لیتے ہیں جو جاگیردارانہ نظام کو بدلے بغیر
جمہوریت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس جمہوریت اور مارشل لاء میں صرف وردی کا فرق ہوتا
ہے، ورنہ یہ دونوں بادشاہت اور آمریت ہی کا ادل بدل ہیں۔

اگر ہمارے یہاں سچے معنوں میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے تو اسی صورت میں کہ ہم
سیاسی سطح پر جمہوریت کا مطالبہ کرنے سے بھی پہلے معاشرتی اور معاشی سطح پر جاگیرداری نظام
کے خاتمے کے لئے موثر آواز اٹھائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں جاگیرداری نظام
اور جاگیرداروں کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہوں تاکہ ہم اس نظام اور اس کے
پروردگان کی طاقت اور کمزوری کا درست ادراک کرتے ہوئے ان کے خلاف ٹھیک ٹھیک
نشانوں پر حملہ کر سکیں۔

جانے پہچانے صحافی وکیل انجم اس ملک کے تمام بہی خواہوں کے شکریے کے مستحق
ہیں کہ انہوں نے کمال محنت سے جاگیرداری نظام اور جاگیرداروں کے بارے میں قیمتی
معلومات کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ خاص مہربانی یہ کہ انہوں نے ایسے ایسے جاگیرداروں کی
شرافت اور نجابت کا پول کھول دیا ہے جو جمہور کے حقوق اور جمہوریت کے فروغ کے
علمبردار کہلاتے ہیں۔ انہوں نے واضح دلائل دیتے ہوئے نہایت تفصیل سے بتایا ہے کہ
ہماری سیاست کے یہ خدا کیسے وجود میں آئے اور انہیں وجود میں لاتے ہوئے کون کون سے
مذموم مقاصد ہمارے انگریز حکمرانوں کے پیش نظر تھے۔

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر پاکستان کی سیاست کو سمجھنے اور اسے اس ملک کی
سلامتی، یکجہتی اور ترقی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جاگیرداری نظام کا خاتمہ
ضروری ہے تو جاگیرداری نظام کی کمر توڑنے اور جاگیرداروں کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑنے
کے لئے وکیل انجم صاحب کی کتاب "سیاست کے فرعون" کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

محمد حنیف رامے

جاگیرداروں اور وڈیروں نے بہت سے مذہبی رہنماؤں کو بھی اپنا آلہ کار بنایا اور ان حضرات نے طرح طرح کے فتنے اور طرح طرح کے فرقے اٹھا کر لوگوں کو لڑایا، طرح طرح کے کلتوں اور شوشوں کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنایا، لیکن وسائل کی منصفانہ تقسیم پر زور دینے کی توفیق ان کو نہیں ہوتی۔ جہالت اور پس ماندگی کے خلاف جہاد کرنے کی فرصت ان کو نصیب نہیں ہوتی۔

اب کے وقت بہت ضائع ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کچھ کر گزرنا ہے اور اس مملکت خدا داد کو بچانا ہے تو اس کے اقتدار کو بے پیندے کے خداؤں سے محفوظ رکھنا ہو گا۔ سیاسی اور معاشی طاقت ان سے چھین لینا ہو گی۔ سیاست کو دولت مندوں کی داشتائی سے نجات دلانا ہو گی اس کے لئے معاشرے کے حساس اور باشعور عوام کو سر جوڑ کر بیٹھنا، اور قدم ملا کر چلنا ہو گا۔ مجھے امید ہے سیاست کے خدا پڑھ کر جعلی خداؤں کے خلاف جدوجہد کا جذبہ بیدار ہو گا۔ شعور عام کرنے میں مدد ملے گی کہ یہاں بندگی سے بھلا نہیں ہو گا، ان خداؤں کے لئے تو محمود غزنوی بننے کی ضرورت ہے بے مثال قربانیوں کے بعد حاصل کئے جانے والے پاکستان کو "سومنات" بنا کر رکھ دینے والے اپیلوں اور گذارشوں سے تو منہ کے بل گرتے رہے!!!

مجیب الرحمان شامی

نمرود کی خدائی

جناب وکیل انجم گے بندھے راستوں پر چلنے والے نہیں ہیں وہ اپنا راستہ آپ بنانے والوں، اور اپنا زمانہ بھی آپ بنانے والوں میں ہیں نوجوانوں کے اس کارواں سے تعلق رکھتے ہیں جو پاکستان کو پاکستان کے عوام کے لئے خاص کر دینا چاہتا، ظلم اور استحصال کا ہر نشان مٹا دینا چاہتا ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو نامناسب نہیں ہو گا کہ جناب وکیل پاکستان کے مظلوم عوام کے وکیل ہیں۔

ان کی تحریر میں اڑکاؤ اور الجھاؤ نہیں روانی اور بہاؤ ہے انہوں نے ایک ایسے موضوع کو چھیڑا ہے کہ جو آج بھی ہماری قومی زندگی کے لئے اہم ترین ہے پاکستان کا انتخابی اور سیاسی نظام، جاگیرداروں اور دولت مندوں کا یرغمال بنا ہوا ہے، جمہوریت کا نام لیا جا رہا ہو یا مارشل لاء اپنا ڈنکا بجا رہا ہو، سیاست کے خداؤں سے ان کی "خدائی" نہیں چھینی جا سکی، اسلام کے نام پر، کبھی عوام کے نام پر نمرودی خدائی سے ملتی جلتی یہ خدائی اہل پاکستان پر مسلط رہی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ سیاست کا اخلاق اور علم سے تعلق استوار نہیں ہو سکا۔ اور عوام کے لئے سوچنے اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ بھی نمایاں نہ ہو سکا۔ پاکستان میں نہ آج سڑکیں ہیں، نہ پبلک ٹرانسپورٹ کا انتظام، نہ سکول ہیں، نہ ہسپتال نہ سر چھپانے کی جگہ —— یہاں لمبی، چوڑی کاریں تو بہت در آمد کی گئیں امرا کے بچوں کے لئے سکول بھی بہت کھولے گئے بے شمار عظیم الشان کوٹھیاں بھی تعمیر کر ڈالی گئیں، لیکن یہ سب کچھ چند فی صد کے لئے تھا۔ کروڑوں عوام کے لئے سوچنے اور قدم بڑھانے کی کسی کو فرصت نہ تھی اور تو اور، یہاں انصاف بھی کسی کے دروازے پر نہیں پہنچا، بڑے بڑے دروازے انصاف کے پاس خود پہنچے اور اسے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔

عرض مصنف

جاگیرداروں اور ان کے عروج و زوال کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کے باوجود معاشرے پر جاگیردارانہ کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اب بھی اس پر لکھنے کی بہت زیادہ گنجائش موجود ہے۔ فیچر رائٹر کی حیثیت سے مجھے ملک کے پچانوے فیصد لوگوں کے کرب، دکھ اور المیوں کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ کوشش کے باوجود روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد نہیں ہو رہے جبکہ دوسری طرف اقتدار و اختیار کے تمام سوتے جاگیرداروں کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط سے ہی پھوٹتے ہیں۔ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان جاگیردار خاندانوں نے آپس میں ایکا کر رکھا ہے اور جب بھی ملک میں جمہوریت اور میرٹ کا راستہ کھلنے لگتا ہے تو ان کے بنائے ہوئے "سپیڈ بریکر" بار بار جمہوریت اور میرٹ کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیتے ہیں۔ ملک کی سیاست پر قابض یہ طبقہ کسی بھی سیاسی نظام کو چلنے نہیں دیتا۔ یہی مٹھی بھر لوگ غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے پرفریب نعروں سے سادہ لوح غریب عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔

اس کتاب کے ذریعے پاکستان کے کروڑوں باشندوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ سیاست پر قابض یہ دیہہ خدا کیسے وجود میں آئے؟ ان کی ابن الوقت سیاست نے ملک کو کتنا نقصان پہنچایا؟ ان کی غیر آئینی حرکتوں کے باعث جمہوریت کو کتنے صدموں سے دوچار ہونا پڑا؟ معیشت پر بھی انہی خاندانوں کی اجارہ داری رہی۔ انہی کے نام بینکوں سے کروڑوں روپے کے قرضے جاری ہوتے رہے ملک کے بدلتے ہوئے حالات پر گہری نظر رکھنے والے یہ خاندان ہر حکومت میں ایک آدھ وزارت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے رہے۔ اگر ان میں سے کوئی اقتدار کی غلام گردشوں تک نہ بھی پہنچ سکے تو بھی یہ ایک طرح سے

اقتدار میں ہی رہتے ہیں کیونکہ ان خاندانوں کی رشتہ داریاں ملک بھر میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ بالآخر ان کے ڈانڈے حزب اقتدار سے جا ملتے ہیں۔

١٨٥٧ء کی جنگ آزادی کے دوران اس طبقے کے گھناؤنے کردار نے جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ایک شرمناک باب کا اضافہ کیا۔ انہی جاگیرداروں کی جوڑ توڑ پر مبنی سیاست نے قیام پاکستان کے ثمرات عوام تک نہیں پہنچنے دیئے۔ صحت مند سیاست کے خاتمے کا آغاز اس دن سے ہوا جب ان جاگیردار سیاسی حکمرانوں نے سرکاری ملازموں کو بھی شریک اقتدار کیا۔ انہی کی بدولت سیاستدانوں کی گدیوں پر بیورو کریسی کو پاؤں پسارنے کے مواقعے ملے۔ اس طبقے نے اقتدار سے وابستہ رہنے کے لئے "عوامی مینڈیٹ" کا بھی احترام نہ کیا، جھرلو کی بنیاد رکھی اور عوام کی جائز خواہشات کو کچل کر مسند اقتدار تک پہنچنے میں ذرہ برابر شرم محسوس نہ کی۔ ابن الوقت جاگیرداروں کی یہی جنس راجہ رنجیت سنگھ سے لے کر میاں نواز شریف کی وزارت عظمیٰ تک ہر در اقتدار پر سجدہ ریز رہی ہے۔ خواہش کے باوجود عوام ان جاگیرداروں کے طلسم کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ان تمام قباحتوں اور بد اعمالیوں کے باوجود یہ طبقہ اپنے آپ کو "جمہوریت کا ستون" گرداننا ہے۔ "سیاست کے خدا" کا ماحصل یہی ہے کہ عوام الناس کے روبرو ان نام نہاد ستونوں کی بنیادیں کھود ڈالی جائیں تاکہ زر اور زمین کے طفیل ملک و قوم کے مقدر سے کھیلنے والے ان چہروں کو عوام اچھی طرح پہچان جائیں۔

اس کتاب کی تکمیل میں ذاتی مشاہدے نے میری رہنمائی کی خود جس کلاس سے تعلق رکھتا ہوں اس کے تجربات نے مجھے چونکا دیا کہ مجھ جیسے کتنے لوگ معاشرتی تفریق کی اس آگ میں جل رہے ہیں۔ دوران تعلیم یہ بھی تجربہ ہوا کہ ایک مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے طالب علم کو حصول علم کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کے لئے کیسے کیسے ناگوار مالی بحران سے گزرنا پڑتا ہے۔ تکمیل علم کے بعد اس کے پیچھے خواہشات کا ایک ہجوم لگ جاتا ہے میں نے بھی خود کو ان خواہشات کا اسیر نہیں بنایا۔ البتہ زندگی کو خوبصورت بنانے کا تصور جدوجہد کی صورت میں موجود رہا۔ خوبصورت زندگی سے میری مراد انسانی اقدار اور وہ ویلیوز ہیں جو انسان کو ہمیشہ عظمت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل تک کتنی مشکلات سے گزرنا پڑا،

کتاب کی تکمیل کے بعد سب کچھ بھول گیا۔ مجھے بیس بیس گھنٹے کام کرنا پڑا اور لکھتے لکھتے اکثر فجر کی اذان ہو جاتی۔ کئی مرتبہ اپنے دفتر میں ہی رات سے دن اور دن سے رات ہو جاتی۔ میں نے یہ کتاب لکھ کر اپنی نسل کے ان نوجوانوں کا قرض ادا کر دیا ہے جو معاشرے کے تضاد سے نفرت تو کرتے ہیں مگر اس کے لئے کر کچھ نہیں سکتے۔ اس کتاب کی تکمیل میں جس ہستی نے میرے ساتھ تعاون ہی نہیں بلکہ میری مکمل رہنمائی کی اس کا نام خالد یزدانی ہے اور اس موقع پر ضیا شاہد صاحب کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے انگلی پکڑ کر مجھے کوچہ صحافت میں دھکیل کر باقاعدہ صحافی بنا دیا اور خاص طور پر وہ موقع نہیں بھول سکتا جب انہوں نے میرے ایک فیچر کی پذیرائی کے اعتراف میں نہ صرف میرے اعزاز میں کھانا دیا بلکہ مجھے دو عدد خوبصورت قلم بھی تحفے میں دیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج میں نے ان کے دیئے ہوئے قلم کا حق ادا کر دیا۔ سلیم چوہدری صاحب جن سے میری رفاقت روزنامہ جنگ سے ہے جس میں فری لانس لکھا کرتا تھا پھر ایک عرصہ تک روزنامہ پاکستان میں کام کرتے رہے وہ میری تحریروں کو نہ صرف آڑے ہاتھ لیا کرتے تھے بلکہ مجھے ٹوکتے اور روکتے ان کے اسی انداز نے مجھے مختصر نویس بنا دیا۔ جب میں نے روزنامہ پاکستان سے استعفیٰ دیا تو سلیم چوہدری صاحب مجھے مس کرنے والوں میں نمایاں تھے۔ بہر حال وہ میرے بزرگ ہیں اور ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اپنے بھائی اور دوست قاسم منیر چوہدری کا ذکر بھی اس لئے ضروری ہے کہ وہ میری ذات اور تحریروں میں ایسی خوبیاں تلاش کرتے ہیں جو سرے سے مجھ میں موجود ہی نہیں۔ میری صحافتی زندگی میں طارق اسماعیل ساگر اور صہیب مرغوب صاحب بھی میرے رہنما اور راہبر رہے ہیں۔

میں نے انتہائی دیانت داری سے پنجاب کی سیاست کا خاکہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ تصویر بڑی دھندلی سی ہے پھر بھی حقیر سی کاوش کا مطالعہ ہر اس سیاسی کارکن اور اہل وطن کے لئے ضروری ہے جو سیاسی سسٹم کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں نو دولتیوں کے کرتوتوں کو بے نقاب کیا جائے گا جو ڈرگ مافیا کے ایجنٹ ہیں اور وہ غیر قانونی دولت کے مالک کیسے بنے جو سیاست پر کروڑوں خرچ کر کے حکمرانی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس معلوماتی کتاب کا مطالعہ سیاست کے علاوہ عمرانیات، معاشرت، صحافت، نفسیات اور مذہب کے طلبہ اور اساتذہ کے لئے بھی بے حد مفید اور دلچسپ ہو گا

وکیل انجم

راہنما

جی چاہتا ہے، پھر کوئی تصویر اٹھاؤں　　اس دل سے کوئی نالۂ شبگیر اٹھاؤں
مینا و سبو چھوڑ کے شمشیر اٹھاؤں　　بت خانہ میں ہنگامۂ تکبیر اٹھاؤں
آوازۂ اسلام خرابات سے نکلے
گلبانگ چمن صرصر حالات سے نکلے

جھولی گل و لالہ کی طراوت سے بھری ہو　　راضی رہے صیاد تو ہر شاخ ہری ہو
شہ یار کی شال ہو تو کھوٹی بھی کھری ہو　　قاتل کا تلطف ہو تو بزدل بھی جری ہو
خونِ رگِ شہباز ممولوں کو روا ہے
یا رب یہ عجب سلسلۂ صبح و مسا ہے

ہر راہنما کے لئے پرچم ہی کفن ہے　　مل جائے وزارت یہی موقف، یہی فن ہے
ہر دل میں سمائی ہوئی اپنی ہی لگن ہے　　کچھ قوم سے مطلب ہے نہ کچھ فکر وطن ہے
کس جرم میں مینا و سبو بیچ رہے ہیں
رہزن ہیں شہیدوں کا لہو بیچ رہے ہیں

تولہ کی طرح ہیں کبھی ماشے کی طرح ہیں　　ہر چند گنہگار کے لاشے کی طرح ہیں
پانی کے کٹورے میں بتاشے کی طرح ہیں　　جتنے بھی یہ لیڈر ہیں تماشے کی طرح ہیں
اب کیسے کہوں کس سے کہوں کون ہیں کیا ہیں؟
بازار میں بیٹھی ہوئی کسبی کی حیا ہیں!

شورش کاشمیری

انگریز کے وفادار

انیسویں صدی عیسوی نو آبادیاتی نظام کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے جس میں مغلیہ سلطنت کا زوال، ہندوستان کی علاقائی قوتوں کی باہمی چپقلش، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا برصغیر میں سیاسی و معاشی عروج، جیسے تاریخی واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ اس عروج میں مقامی باشندوں کا بڑا حصہ تھا جنہوں نے برطانوی راج کو بقائے دوام بخشنے کے لئے دن رات کوششیں اور کاوشیں کیں اور یہی طبقہ غیر ملکی تسلط کی اساس بن کر ان کے مفادات کو تادم آخر تحفظ دیتا رہا اور اس کے عوض جہاں منہ مانگی مراعات وصول کیں وہاں انگریزوں کے سیاسی تسلط میں بھی تھوڑا بہت حصہ وصول کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انگریزوں کے ان وفاداروں میں ان لوگوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا جو قیام پاکستان سے پہلے بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے انگریز نے "غدر" کا نام دیا تھا، دراصل ہندوستان کی پہلی آزادی کی تحریک تھی جو فرنگی جبر اور تسلط کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں اہل ہندوستان نے شکست کھائی اور لال قلعہ کے برجوں پر برطانوی پرچم لہرا دیا گیا۔

اس شکست پر اہل ہندوستان کو افسوس نہیں کرنا چاہیے تھا، اس لئے کہ طاقت ور ہمیشہ کمزور پر غالب آتا رہا ہے۔ مغلیہ شہنشاہیت کا آخری برج اتنا کمزور تھا کہ لال قلعہ کو قابو میں رکھنا اس کے بس کا روگ نہ رہا تھا۔ قدم قدم پر سازشیں اور رقابتیں تھیں۔ چاروں طرف نزاع کا عالم تھا۔ جب خود دہلی کی یہ حالت ہو تو ہندوستان کو کون سنبھالتا۔ انگریز آہستہ آہستہ بڑھتے آرہے تھے۔ وہ طاقت ور اور منظم تھے۔ آزادی کی تحریک چلی تو حریت پسندوں نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک

استعماری قوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ شکست غیر ملکی جارحیت پسندوں کی چوکھٹ پر پہنچ ہی گئی تھی کہ اپنوں نے غداری کی۔ اس طرح انہوں نے یونین جیک کو مضبوطی سے برصغیر پر گاڑ دیا۔ اگر بعض غداروں کی کوششیں انگریزوں کے شامل حال نہ ہوتیں تو شاید ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔

اس دعویٰ میں کلام نہیں کہ جن لوگوں کے پاس بڑی بڑی زمینداریاں ہیں وہ تمام زمینیں انہوں نے یا ملک و قوم سے غداری کے صلہ میں حاصل کی ہیں، یا ایسے روپے سے خریدی ہیں جو بہرحال شرعی حدود کے اندر کمایا ہوا نہیں تھا۔ پنجاب کی بڑی بڑی زمینداریوں کے مالک وہ ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی "وفاداری بشرط استواری" کے صلہ میں زمینیں حاصل کیں۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر انگریزی حکومت کے متزلزل ہونے تک سفید فام آقایان دہلی کی ہر لمحہ خدمت کی مثلاً انہیں مشکل وقت میں رنگروٹ دیئے، اسلامی ملکوں میں جاسوسی کی، قومی وقار کو پامال کیا، ملی تحریکوں میں مخبری کر کے انگریزوں کو مفید معلومات فراہم کیں اور انگریز بہادر کی خوشنودی کے لئے وہ تمام کام برضا و رغبت سرانجام دیئے جن کا ملک و ملت کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ ان خدمات کے صلہ میں سرکاری زمینوں کو اونے پونے خریدا۔ ۱۸۵۷ء کی بیشتر زمینداریاں مسلمان بادشاہت کے لہو سے حاصل کئے ہوئے وثیقوں پر پلی گئی ہیں۔ پنجاب کا ایک بہت بڑا خاندان اگرچہ بڑا زمیندار خاندان نہیں، لیکن اس کے اقتدار کی نیو لہو کے اس خط پر رکھی گئی جو جنرل نکلسن نے ان کے بزرگ کو وفاداری کے صلہ میں دیا تھا۔ جنرل نکلسن کلائیو کے ان ہم نشینوں میں سے تھا جس نے بہادر شاہ ظفر کے بچوں کا سر کاٹا اور تین دن کے بھوکے شہنشاہ کو ناشتہ کے طور پر پیش کیا۔ ایک اور بڑے نواب کی وسیع و عریض جاگیر سید احمد بریلوی علیہ الرحمۃ سے دغا کا صلہ ہے۔ اس طرح ایک اور نواب یا نواب زادہ کی ریاست رہزنی کی یادگار ہے۔ ان کے پردادا علاقہ کے نامور ڈاکو تھے۔ شروع شروع میں انگریز امن قائم رکھنے میں ناکام رہے تو ان سے کہا گیا جتنی جاگیر چاہو لے لو اور امن قائم کرنے میں مدد دو تو اس طرح یہ ریاست قائم ہوگئی۔ اس لحاظ سے ایوبی مارشل لاء سے قبل لاہور کے بہت بڑے جاگیر دار اور تحریک پاکستان کے مجاہد اور بائیں بازو نظریات کے رہنما میاں افتخار الدین کی جرأت قابل داد ہے جس نے پارلیمنٹ میں کشادہ پیشانی سے تسلیم کیا تھا کہ اس کی

زمینداریاں ان کے آباو اجداد کی غداری کا معاوضہ ہیں۔

علی ہذاالقیاس آپ کسی بھی بڑے سے بڑے زمیندار کا نامہ اعمال کھول لیجئے، اس کی زمینداری قوم اور ملک سے خوفناک بغاوت کا صلہ ہے۔

انگریزوں کے وفاداروں میں پنجاب کے جاگیرداروں کا بڑا حصہ ہے جنہوں نے موقعہ پرستی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ان میں شاہ پور کے ٹوانے، سرگودھا کے لون، بہاولپور کے نواب، لاہور کے ممدوٹ، ملتان کے قریشی، گیلانی، گردیزی، لاہور کے قزلباش، کالاباغ کے نواب، راولپنڈی کے گھکھڑ، جھنگ کے سیال، کمالیہ کے کھرل، مظفرگڑھ کے گورمانی، ڈیرہ غازی خان کے مزاری، لغاری، تونسوی، قیصرانی، دریشک، کھوسے، بزدار، لنڈبی، سدوزئی، گورچانی، اٹک کے خان، سیال، سید بلوچ، گھیبے، پنڈی کے راجے، مغل میرزادے، قادیان کے مرزائی شامل ہیں۔ انہوں نے راجہ رنجیت سنگھ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ جنگ آزادی میں حریت پسندوں کے خلاف پیش پیش رہے۔ عالمی جنگوں میں انگریزوں کو مالی امداد اور افرادی قوت فراہم کرتے رہے۔ ظلم کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کو دبانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاج برطانیہ ایڈورڈ ہفتم کے جشن تاج پوشی کے موقع پر ڈیرہ غازی خان کے رئیسوں اور سرداروں کی طرف سے ایک عرضداشت پیش کی گئی جس سے ان جاگیرداروں کی انگریزوں سے وفاداری کا ثبوت ملتا ہے جس میں انریبل نواب سر امام بخش مزاری، کے. سی. آئی. ای. (K.C.I.E) سردار بہرام خان مزاری، میاں لطف حسین خان سرائی، سردار دوست محمد خان مزاری، سردار اللہ یار خان کھوسہ، سردار ورہین خان دریشک، سردار جلب خان گورمانی، سردار محمد حسین خان بزدار، سردار نور کھنخان لنڈسوری، سردار فضل علی خان قیصرانی، سردار مسوخان لنڈبی، سید میر شاہ غیر سین، سردار تکیا خان لغاری، رئیسان میں سردار اللہ بخش خان سدوزئی، اللہ داد خان کھتران، ٹلو خان مزاری، محمد خان فتکانی، سائیں گنج لال، بھائی درباری لعل، لال کنیا لعل، حکیم بالارام، میوہ خان گورچانی، خواجہ بخش شاہ، میاں سلطان علی تنیا، امام بخش خان لشاقی، عزیز محمد خان تپانی، خان بہادر قادر بخش خان ابدالی، سید جاگن شاہ، رحیم خان کھوسہ شامل تھے۔

"عرضداشت گر قبول افتد زہے عزو شرف

بعد عرض فیض عرض بار یافتگان پایۂ سریر سلطانی، ظل یزدانی آیت دولت جاودانی، عدل و انصاف اور جہانبانی کے مصدر و منبع اعلیٰ حضرت شہنشاہ عالی جاہ، عالم پناہ والد بار گاہ، خدیو گیہان منصف دوران، سلیمان زمان، جمشید جہاں، جناب معلی القاب فیض مآب، معدلت انتساب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم، اللہ ان کے اقبال اور شان و شوکت کو تا ابد قائم و دائم رکھے۔

بے حد عجزو انکساری کے اظہار اور تسلیمات بے اندازہ و تعظیمات بے شمار کے بعد ہم ساکنان ضلع ڈیرہ غازی صوبہ پنجاب ملک ہندوستان یعنی بلوچی سرداران، ملازمان، رئیسان، میونسپل کمشنران اور دیگر رعایا بہ ادب و نیاز پایۂ تخت اعلیٰ حضرت شہنشاہ جہاں پناہ منبع فیوض و برکات کو بوسہ دیتے ہوئے بادشاہ سلامت کی تاج پوشی کے جشن پر پُر خلوص ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے لئے یہ جشن سعید ہے کہ شہنشاہ برطانیہ کلاں اور قیصر ہند کی تاج پوشی کے باعث ہم جانثار اور وفادار بندوں کو اس پُر مسرت موقع پر بے حد خوشی اور سرور حاصل ہوا۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ہم سلطنت عظمیٰ کے دوسرے ممالک میں بسنے والوں کا مقابلہ علوم و فنون کی تحصیل اور تجارت و زراعت کی ترقی میں کسی طور پر نہیں کرسکتے۔ مگر ہم اس بات پر بجا طور پر نازاں ہیں کہ ہم برطانیۂ عظمیٰ کے تخت کی تابعداری اور فرمانبرداری میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ ہم بصد عقیدت و احترام حضرت ملکہ معظم مغفور و مرحومہ قیصرۂ ہند کی ذات والا صفات کے مداح ہیں جو ہمارے لئے گنجینہ فیوض و برکات تھی۔ وہ بے شمار اوصاف حمیدہ کی حامل تھیں جنہیں حیطہ تحریر و تقریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ ممدوحہ مغفورہ نہ صرف عدل پرور اور کرم گستر ملکہ تھیں بلکہ ہندوستان کی رعایا کے لئے شفقت و مہربانی کے لحاظ سے مادر بھی تھیں۔ اس ملک میں ولی عہدی کے زمانہ میں حضور پرنور کی تشریف آوری اب تک ہمارے لئے انتہائی مسرت و طمانیت کا باعث ہے۔ ہماری عاجزانہ درخواست ہے کہ حضور انور شہنشاہ اکبر اپنے عہد حکومت میں انہی خیالات عالیہ کا اظہار فرماتے ہوئے اس دور افتادہ علاقہ کے باسیوں کو حسب معمول اپنے شاہانہ اور کریمانہ الطاف و عنایات سے نوازتے رہیں جن کے پیش نظر حضور نے اس سرزمین کو وقار بخشا تھا۔ آخر میں ہماری دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال شہنشاہ با استقلال اور عالم پناہ باکمال کے اقبال اور اجلال کو ہمیشہ عروج بخشے اور سایہ ہمایہ فیض گنجور

حضرت ملکہ معظمہ کے فیوضات کا ظہور اہل جہان کی پیشانی پر تا ابد قائم و دائم رہے۔ اقبال و اجلال شہنشاہ با استقلال و عالم پناہ باکمال راپیوستہ بہ عروج دار اود سایہ ہما پایۂ حضور فیض گنجور حضرت ملکہ معظمہ بمفالین ظہور بر مفارق عالمیان تابقائی جہاں دائم و قائم دار اود بحرمت النون والنضاد آمین یا الہ العالمین!

یہ تو حال تھا جاگیرداروں کا۔ اس سے آگے بڑھیے اور دیکھیں کہ پیروں اور پیرزادوں کی جاگیریں کس بات کا صلہ ہیں؟

ایک ہی جواب ہے کہ بڑے بڑے خانقاہ نشین جو کچھ سمیٹے بیٹھے ہیں، وہ تمام تر انگریز پرستی اور انگریز نوازی کی یادگار ہے۔ آخر ان پیرزادوں اور سجادہ نشینوں کی زمینداریوں کو کس اصل کی بنا پر جائز تسلیم کیا جاسکتا ہے جنہوں نے جنرل ڈائر کے قتل عام پر خاموشی اختیار کرلی۔ سر مائیکل اوڈوائیر کو سپاسنامہ پیش کیا۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی فتح کی دعائیں مانگی۔ شاہ جارج کو ظل اللہ کہا۔ مسلمان سپاہیوں کو ترکوں کے سامنے لڑائی کے لئے پیش کردیا۔ پنجاب کے مشائخ، علماء اور سجادہ نشینوں کی طرف سے پیش کردہ دعانامہ بطور ایڈریس پر ذرا غور کریں۔

"حضور والا!

ہم خادم الفقراء سجادہ نشینان و علماء مع متعلقین شرفائے حاضر الوقت مغربی حصہ پنجاب نہایت ادب اور عجز و انکسار سے یہ ایڈریس لے کر خدمتِ عالی میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقین کامل ہے کہ حضور انور جن کی ذات عالی صفات میں قدرت نے دلجوئی ذرہ نوازی اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، ہم خاکساران باوفا کے اظہار دل کو توجہ سے سماعت فرما کر ہمارے کلاہ فخر کو چار چاند لگا دیں گے۔

سب سے پہلے ہم ایک دفعہ پھر حضور والا کو مبارک باد کہتے ہیں جس عالمگیر اور خوفناک جنگ کا آغاز حضور کے عہد حکومت میں ہوا، اس نے حضور ہی کے زمانے میں بخیر خوبی انجام پایا اور یہ بابرکت و باحشمت سلطنت جس پر پہلے بھی سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا اب آگے سے زیادہ مستحکم اور آگے سے زیادہ روشن اور اعلیٰ عظمت کے ساتھ جنگ سے فارغ ہوئی جیسا کہ شہنشاہ معظم نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ہے۔ واقعی برطانوی

تلوار اس وقت نیام میں داخل ہوئی جب دنیا کی آزادی امن و امان اور چھوٹی چھوٹی قوموں کی بہبودی مکمل طور پر حاصل ہو کر بالآخر سچائی کا بول بالا ہوگیا۔ حضور کا زمانہ ایک نہایت نازک زمانہ تھا اور پنجاب کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی عنان حکومت اس زمانے میں حضور جیسے صاحب استقلال، بیدار مغز اور عالی دماغ حاکم کے مضبوط ہاتھوں میں رہی جس سے نہ صرف اندرونی امن ہی قائم رہا بلکہ حضور کی دانشمندانہ رہنمائی میں پنجاب نے اپنے ایثار و وفاداری اور جانثاری کا وہ ثبوت دیا جس سے "شمشیرِ سلطنت" کا قابل فخر و عزت لقب پایا۔ پھر ان کا معراج صلیب احمر کی اعجاز نما دستگیری، قیام امن کی تدبیر، تعلیم کی ترقی سب حضور ہی کی کاوشیں ہیں اور حضور ہی ہیں جنہوں نے ہر موقع و ہر وقت پنجاب کی خدمات و حقوق پر زور دیا۔ صرف جناب والا کو ہی ہماری بہبود و مطلوب نہ تھی بلکہ صلیب احمر Red Cross وتعلیم نسواں کے نیک کام میں حضور کی ہمدم و ہمراز جنابہ لیڈی اوڈوائر صاحبہ نے جن کو ہم مروت کی زندہ تصویر سمجھتے ہیں، ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہندوستانی مستورات پر احسان کر کے ثواب دارین حاصل کیا۔ ہماری ادب سے التجا ہے کہ وہ ہمارا دلی شکریہ قبول فرماویں۔

حضور انور! جس وقت ہم اپنی آزادیوں کی طرف خیال کرتے ہیں جو ہمیں سلطنت برطانیہ کے طفیل ہوئیں، جب ہم ان وفائی جہازوں کو سطح سمندر پر اٹکھیلیاں کرتے دیکھتے ہیں جن کے طفیل ہمیں اس مہیب جنگ میں امن و امان حاصل رہا ہے، جب ہم تار برقی کے کرشموں پر علی گڑھ و اسلامیہ کالج لاہور و پشاور جیسے اسلامی کالجوں اور دیگر قومی درسگاہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر جب ہم بے نظیر برطانوی انصاف کو دیکھتے ہیں جس کی حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں، تو ہمیں ہر طرف احسان ہی احسان دکھائی دیتے ہیں۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد — کسے را با کسے کارے نباشد

باوجود فوجی قانون کے خود فتنہ پردازوں کی شرارت کا نتیجہ تھا، مسلمانوں کے مذہبی احساس کا ہر طرح سے لحاظ رکھا گیا۔ شب برات کے موقع ان کو خاص رعایتیں دکھائیں۔ رمضان المبارک کے واسطے حالانکہ اہل اسلام کی درخواست یہ تھی کہ فوجی قانون ساڑھے گیارہ بجے شب سے دو بجے تک محدود کیا جاوے لیکن حکام سرکار نے یہ وقت بارہ بجے سے دو بجے کردیا۔ مسجد شاہی جو فی الاصل قلعہ کے متعلق تھی اور جو ابتدائی عملداری سرکار ہی میں

واگزار ہوئی تھی، اہالیان لاہور نے اس مقدس جگہ کو ناجائز سیاسی امور کے واسطے استعمال کیا جس پر متولیانِ مسجد نے جو خود مفسدہ پردازوں کو روک نہیں سکتے تھے، سرکار سے امداد چاہی۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار نے اس کا ایسا ناجائز استعمال بند کر دیا۔ ہم تہ دل سے مشکور ہیں کہ حضور والا نے پھر اس کو واگزار فرما دیا۔ سرکار نے حج کے متعلق جو مہربانی کی ہے ہم ان سے ناآشنا نہیں اور مشکور ہیں۔

ہم سچ عرض کرتے ہیں کہ جو برکات ہمیں اس سلطنت کی بدولت حاصل ہوئیں، اگر ہمیں عمر خضر بھی نصیب ہو تو بھی ہم ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے لئے سلطنت برطانیہ ابر رحمت کی طرح نازل ہوئی اور ہمارے ایک بزرگ نے جس نے پہلے زمانہ کی خانہ جنگیاں، خونریزیاں اور بدامنیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں، اس سلطنت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔

ہوئیں بد نظمیاں سب دور انگریزی عمل آیا
بجا آیا بہ استحقاق آیا بر محل آیا

ہم کو وہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا جب ترکوں نے ہمارے مشورہ کے خلاف کوتاہ اندیشی سے ہمارے دشمنوں کی رفاقت اختیار کی تو ہمارے شہنشاہ نے ازراہ کرم ہم کو یقین دلایا کہ ہمارے مقدس مقامات کی حرمت میں سرمو فرق نہیں آئے گا۔ اس الطاف خسروانہ نے ہماری وفا میں نئی روح پھونک دی۔ ھَلْ جَزٰٓءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الاحسان (احسان کو بدلہ احسان کے سوا نہیں) ہم ان احسانوں کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اب اس جنگ عظیم کے خاتمہ پر صلح کانفرنس میں سلطنت ترکی کی نسبت جلد فیصلہ ہو جانے والا ہے۔ ممکن ہے یہ فیصلہ مسلمانوں کی امیدوں کے برخلاف ہو۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس فیصلہ میں سرکارِ برطانیہ اکیلی مختار کار نہیں ہے بلکہ بہت سی دوسری طاقتوں کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ شہنشاہ معظم کے وزراء جو کوششیں ترکی کے حق میں کرتے رہے ہیں، ہم ان کے واسطے ان کے بہرحال مشکور ہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ یہ جنگ مذہبی اغراض پر مبنی نہ تھی اور اپنے اپنے عمل کا اور اس کے نتائج کا ہر ایک خود ذمہ دار ہے۔

زمور مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مگر ہمیں پوری توقع ہے کہ ہماری گورنمنٹ اس بات کا خیال رکھے گی کہ مقامات مقدسہ کا اندرونی نظم و نسق مسلمانوں کے ہی ہاتھ میں رہے اور ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن کو تشریف لے جاویں تو اس نامور تاجدار ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو، ہماری وفاداری میں سرمو فرق نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکار برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں، ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جانثار رہیں گے۔

ہمیں نہایت رنج افسوس ہے کہ ناتجربہ کار و نوجوان امیر امان اللہ خان والئی کابل نے کسی غلط مشورہ سے عہد ناموں کے اور اپنے باپ دادا کے طرز کی خلاف ورزی کر کے خداوند تعالیٰ کے صریح حکم: واوفوا بالعہد ــــ ان العہد کان مسئولہ (یعنی وعدے کا ایفا کرو ــــ ضرور وعدے کے متعلق پوچھا جائے گا) کی نافرمانی کی۔ ہم جناب والا کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم افغانستان کے اس طرز عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم اہالیان پنجاب احمد شاہ کے حملوں اور نادر شاہی قتل و غارت گری کو نہیں بھول سکتے۔ ہم اس غلط اعلان کی جس میں اس نے سراسر خلاف واقعہ لکھا ہے کہ اس سلطنت کی مذہبی آزادی میں خدانخواستہ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ واقع ہوئی، زور سے تردید کرتے ہیں۔ امیر امان اللہ خان کا خاندان سرکار انگلشیہ ہی کی بدولت بنا اور اس کی احسان فراموشی کفران نعمت سے کم نہیں۔

ہم کو ان کوتاہ اندیش دشمنانِ ملک پر بھی سخت افسوس ہے جن کی سازش سے تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی اور جنہوں نے اپنی حرکات ناشائستہ سے پنجاب کے نیک نام پر دھبہ لگایا۔ مقابلہ آخر مقابلہ ہی ہے۔ ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان گمراہ لوگوں کی مجنونانہ و جاہلانہ حرکات کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے قرآن کریم میں یہی تلقین کی گئی ہے۔ لایفسدوا فی الارض (یعنی دنیا میں فساد اور بدامنی مت پیدا کرو) اور ان اللہ لایحب المفسدین (یعنی بے شک خدا فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا)

حضور والا! اگرچہ آپ کی مفارقت کا ہمیں کمال رنج ہے۔

سر غم سے کھچے کیوں نہ سردار، ہمارا
لو ہم سے چھنا جاتا ہے سردار ہمارا

لیکن ساتھ ہی ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضور کے جانشین سر ایڈورڈ میکلیگن بالقاسم جن کے نام نامی پنجاب کا بچہ بچہ واقف ہے اور جن کا حسن اخلاق رعایا نوازی میں شہرۂ آفاق ہے اور جو ہمارے لئے حضور کے پورے نعم البدل ہیں، ان کا ہم دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی خدمتِ والا میں یقین دلاتے ہیں کہ ہم بشلِ سابق اپنی جوش عقیدت و وفاداری کا ثبوت دیتے رہیں گے۔

حضور اب وطن کو تشریف لے جانے والے ہیں۔ ہم دعا گویان جناب باری میں دعا کرتے ہیں کہ حضور بمعہ لیڈی صاحبہ و جمیع متعلقین مع الخیر اپنے پیارے وطن پہنچیں۔ تا دیر سلامت رہیں اور وہاں جا کر ہم کو دل سے نہ اتار دیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

المدعیان

یہ دعا نامہ بطور ایڈریس پنجاب کے علماء، مشائخین اور بڑے بڑے اولیا کرام کے سجادہ نشینوں نے ۱۹۱۹ء میں اپنے دستخطوں سے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ برطانوی سامراج کا نمائندہ یہ گورنر وہی ذات شریف ہیں جن کے حکم سے بیساکھی کے موقع پر جلیانوالہ باغ امرتسر میں جنرل ڈائر نے نہتے عوام کو بلا اشتعال گولیوں کا نشانہ بنایا اور جب پنجاب کے عوام نے اس ظلم و بربریت کے خلاف آواز بلند کی تو سر مائیکل اوڈوائر نے امرتسر، لاہور اور گوجرانوالہ وغیرہ میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور اس کی آڑ میں پنجاب کے عوام پر جو مظالم توڑے گئے، ان پر نہ صرف پورا برصغیر سراپا احتجاج بن گیا بلکہ اس ظلم و تعدی کی بازگشت برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ایوانوں تک سنی گئی۔

جس وقت ہمارے قابل احترام مشائخین، علمائے کرام اور سجادہ نشین صاحبان نہ صرف گورنر پنجاب بلکہ اس کی بیوی تک کی "خدماتِ جلیلہ" کی مدح میں رطب اللسان تھے اور قرآنی آیات کے حوالہ سے انگریز حکمرانوں کو اسلامیان ہند کے لئے باعث رحمت قرار دے رہے تھے، وہ دور برصغیر میں سیاست کے حوالہ سے نہایت طوفانی دور تھا۔ یہ وہی دور تھا جب اسلامیان ہند تحریک خلافت میں جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے تھے۔ اس دور میں بدنام زمانہ رولٹ ایکٹ پاس ہوا جسے برصغیر کی تمام سیاسی جماعتوں نے "کالا قانون"

قرار دیا اور قائداعظمؒ نے اس کالے قانون کے خلاف احتجاج کے طور پر مرکزی قانون ساز اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہی جاگیرداروں نے مسلم لیگ کے مقابلے میں یونی نسٹ پارٹی کی مکمل حمایت کی اور جب مسلم لیگ کو پنجاب میں پذیرائی حاصل ہوئی تو یہ مسلم لیگ کی اگلی صفوں میں نظر آئے۔ جو جنگ آزادی کے غدار تھے، انگریزوں کے وفادار تھے، وہ پاکستان کی سیاست میں نمایاں ہوتے رہے۔ قائداعظمؒ انہیں کھوٹے سکوں کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان موقع پرستوں، جاگیرداروں اور سیاستدانوں نے خود کو اقتدار کی کرسیوں سے کس کر باندھ رکھا تھا اور انہی کا پاکستان کی سیاست پر قبضہ رہا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ذاتی مفاد پر قوم کے مفاد کو قربان کیا ہے ان کی اسی روش کی وجہ سے ملک پر یکے بعد دیگرے مارشل لاء کے حملے ہوئے اور جمہوریت کی گاڑی بار بار پٹڑی سے اترتی رہی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک پنجاب کی سیاست پر انہی جاگیرداروں کا قبضہ رہا۔ راجہ رنجیت سنگھ سے لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تک ان کی جبینیں ہر در پر سجدہ ریز رہی ہیں اور پنجاب کے مجبور و محکوم عوام خواہش کے باوجود ان جاگیرداروں کے طلسم سامری کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انہی کی بدولت برصغیر کی تاریخ میں اس شرمناک باب کا اضافہ ہوا کہ یہاں پاکستان بننے سے پیشتر یونینسٹ کے مقابل مسلم لیگ کی حکومت قائم نہ ہو سکی۔ یہی جاگیردار مسلم لیگ کے خلاف معروف رہے۔ قیام پاکستان کی منزل قریب آ گئی تو انہی جاگیرداروں نے پنجاب کے عوام کو ایک بار پھر بے بس کر دیا۔ عوام نے عدیم النظیر تحریک چلا کر اپنی تمناؤں کا جو گلشن تعمیر کیا تھا، صیاد نے اس پر مالی کے روپ میں قبضہ کر لیا۔ جاگیرداروں کے ظلم و ستم کی داستان مختلف عنوانوں سے دہرائی جاتی رہی۔ انہی کی بدولت پنجاب پاکستان بننے کے بعد سیاسیات میں کوئی مثبت کردار ادا نہ کر سکا۔ جاگیردار خاندانوں میں جن کے ہاتھوں میں پاکستان کا سیاسی مستقبل تھا، خاص کر پنجاب کے حیات، نون، دولتانے، ممدوٹ، گردیزی، لغاری، سید، گیلانی، قریشی، پراچے اور قزلباش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض خاندانوں کی رشتہ داریاں سندھ کے بڑے بڑے جاگیرداروں کے ساتھ قائم ہیں اور یہی خاندان آئین ساز اسمبلیوں میں بھی غالب اکثریت رکھتے تھے لہٰذا پارلیمانی جمہوریت کو ناکام بنانے اور سیاسی اداروں کی نشو و نما میں رکاوٹیں ڈالنے والے بھی یہی بڑے جاگیردار خاندان تھے۔ ان جاگیرداروں نے ذاتی مفادات کی خاطر جس طرح

پارٹیاں تبدیل کی ہیں، اس دور کے ایک ہفت روزہ کا تبصرہ کچھ یوں تھا:

"غور فرمایئے یہ ہیں ہمارے نمائندے جن لوگوں کی انفرادی سیرت گراوٹ کے اس درجہ میں ہو ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ جمہور کی نمائندگی کے اہل ہیں یا ان کے کسی قول و فعل پر اعتبار کیا جاسکتا ہے یا وہ اعتبار کے قابل ہیں. ایک ایسی خود فریبی ہے جس کے لئے کوئی متعین الفاظ نہیں البتہ اسی بارے میں زیادہ سے زیادہ جو مغلظات کہی جاسکتی ہے. وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ کسی ملک کی آزادی اور کسی بھی قوم کی عزت کے لئے خطرے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ بحالات موجودہ ان لوگوں کے اس طرز عمل کا محاسبہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ڈرامے نے سمجھ دار لوگوں کے لئے لمحہ فکریہ ضرور مہیا کر دیا ہے۔ یہ بات بڑی شرمناک ہے کہ ارکان جماعت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مخنث جنس ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف کسی تادیبی یا احتسابی کارروائی کا نہ ہونا بڑا ہی افسوس ناک ہے۔ جو لوگ اس طرح عہد کر کے ایک دوسرے کو دھوکہ دیں اور زاویہ بدلتے وقت فرسودہ بہانے تراشیں، خود ایسے ایم ایلوں کو اپنی حیثیت اور اپنے مرتبے پر غور کرنا چاہیئے۔ وہ ایک صوبے کے نمائندے ہیں۔ ان کے سیاسی کردار سے ملک و قوم کے سیاسی مزاج کی تشکیل ہوتی ہے۔ اگر وہ سیماب صفت ادھر سے اُدھر لڑھکتے رہیں اور اپنی سودا بازی میں کسی اخلاق، کسی ضابطہ، کسی معاشرے اور کسی شرم، حجاب کو اہمیت نہ دیں تو اس سے بدتر ملک و قوم کے لئے خطرناک بات کون سی ہو سکتی ہے۔ آخر قومی کریکٹر بھی کوئی چیز ہے۔ ہمارے گرگٹ نما ایم ایل اے گریبانوں میں منہ ڈال کر جھانکیں اور پھر سوچیں کہ وہ کہاں تک اسی قومی کریکٹر سے عہدہ بر آہوئے ہیں۔ اگر جمہوریت کے ستون یہ لوگ ہیں جو صبح ایک جماعت سے منتخب ہوتے، شام کو دوسری جماعت میں چلے جاتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک کے ساتھ عہد باندھتے، دوسرے وقت میں دوسرے کا دامن تھام لیتے ہیں تو ان ستونوں کو گرا دینا ہی بہتر ہے۔ اس جمہوریت سے فسطائیت اچھی ہے۔ اگرچہ ہم فسطائیت کو ایک خطرناک لعنت سمجھتے ہیں، آخر ان جمہوری نمائندوں کی ضرورت ہی کیا ہے جنہوں نے اپنے ضمیر و ایمان کا گوشت اسمبلی کی محراب میں لٹکا رکھا ہے۔"

مسلم لیگ جب اقتدار سے آؤٹ ہوئی تو اس کی جگہ سازشوں کی کوکھ سے جنم لینے والی جماعت ری پبلکن کو ملک کی سب سے بڑی جماعت بنانے والے بھی جاگیردار تھے۔

مسلم لیگ میں شمولیت کو یہ لوگ بچپن کی نادانی کہنے لگے اور انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب جیسے کانگرسی کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا جس نے پرچم پاکستان کو سلامی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہی جاگیردار مسلم لیگ کے ذریعے اقتدار تک پہنچے اور مسلم لیگ کے نام پر حکومتوں کا لطف اٹھاتے رہے اور اپنے دور اقتدار کی خوبیوں کا سہرا تو اپنے سر باندھتے ہیں مگر اپنے دور کی دھاندلیوں اور بے قاعدگیوں کو مسلم لیگ کے سر تھوپتے رہے اور انہوں نے مسلم لیگ کو اس وجہ سے قصور وار ٹھہرایا کہ اس نے انہیں اقتدار کی گدیوں پر کیوں بٹھا دیا۔ پنجاب کے جاگیرداروں کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ اسمبلیوں کے انتخاب جیتنے کے لئے ہر پینترا بدلنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ انہیں کسی اصول یا نظریئے سے دلچسپی نہیں۔ انہیں کسی بھی جماعت کے برسر اقتدار آنے کا گمان گزرے تو یہ فوراً اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ آخر کار مفاد پرست سیاست دانوں کی وجہ ہی سے ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کو مارشل لاء نافذ کرنا پڑا اور ان جاگیرداروں کی سیاست پر کاری ضرب لگانے کے لئے ان کی زمینیں چھیننے کے لئے زرعی اصلاحات کا قانون جاری کیا۔ لیکن یہ اتنے طاقت ور تھے کہ انہوں نے زرعی اصلاحات اور ایبڈوز کے اثرات کو زائل کر دیا۔ انہوں نے سیاسی خانوادوں کے ذریعے ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرنے شروع کر دیئے جن میں پنجاب کے تقریباً تمام بڑے سیاسی گھرانے شامل تھے۔ ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو یہی جاگیردار ان کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے سب سے آگے بڑھے۔ جب مارشل لاء حکومت نے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا تو یہ کنونشن مسلم لیگ کی صفوں میں گھس گئے۔ جاگیرداروں کی بہت بڑی اکثریت ایبڈو ہو گئی تھی لیکن یہ در پردہ ایوب خان کے ساتھ چلتے رہے اور انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی انتخاب میں شکست دینے میں اہم کردار ادا کیا ایوب خان کا سنگھاسن ڈولا تو یہ ڈوبتی کشتی سے چھلانگیں لگا کر اتر گئے۔ جو لوگ ایوب خان کی گالیاں سن کر "ھل من مزید" کا نعرہ لگاتے تھے، جنہوں نے اقتدار کی چوکھٹ سے اپنا ناطہ جوڑنے کے لئے عوامی امنگوں اور خواہشوں کو بری طرح نظر انداز کر دیا تھا، ان لوگوں کے نزدیک ایوب خان کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ ان سے اقتدار چھن گیا تھا۔ اگر انہیں ذرہ بھر بھی امید ہوتی، کہ ایوب خان کبھی پھر برسر اقتدار آجائیں گے تو یہ لوگ ان کے در سے اٹھائے نہ اٹھتے۔ بھٹو صاحب تو یہاں تک کہا کرتے

تھے کہ صدر ایوب جیسا عظیم لیڈر اور بے مثال قائد شاید ہی عالم اسلام کو میسر آسکے اور اگر آج وہ امیرالمومنین ہونے کا اعلان کریں تو سب سے پہلے میں اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ ذوالفقار علی بھٹو صدر صاحب کو "ڈیڈی لارڈ" کہہ کر پکارتے تھے۔ جب محترمہ فاطمہ جناح سے صدارتی مقابلہ ہونے والا تھا تو ایوب خان نے اپنے سیاسی مشیروں کو اکٹھا کر کے کہا "یاد رکھیے! اگر فاطمہ جناح کامیاب ہو گئیں تو ہم سب کو سولی پر لٹکا دیں گی یا کولہو میں پلوا دیں گی۔ لہٰذا اگر آپ لوگوں کو اپنی، اپنے خاندان کی جان و مال عزیز ہے تو مس فاطمہ جناح کو ہرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیے" اور ان سب لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ آخر کار ۱۹۶۹ء میں ایوب خان کو اپنے خلاف عوامی رد عمل کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے ریڈیو پر یہ اعلان کرنا پڑا کہ "میرے لئے ناممکن ہے کہ میں ملک کی بربادی پر بیٹھا صدارت کرتا رہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میری زندگی کی ایک بڑی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ میری خواہش یہ روایت قائم کرنا تھی کہ سیاسی اقتدار آئینی طور پر منتقل ہوتا رہے۔ جاگیردار گھرانے یہ اعلان سنتے ہی ملک کی سب بڑی سیاسی جماعت کونشن مسلم لیگ کو چھوڑ کر مسلم لیگ قیوم گروپ اور پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں کونشن مسلم لیگ کو امیدوار نہ مل سکے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں موروثی خاندانوں کو پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے روٹی، کپڑے اور مکان کا انقلابی نعرہ لگایا تو ملک کے کروڑوں پسے ہوئے مجبور و محکوم عوام نے انہیں ملک کا وزیر اعظم بنا دیا۔ وہ بھی ان کے لئے کچھ نہ کر سکے اور ۱۹۷۷ء کے انتخاب میں جن لوگوں کو ٹکٹ ملے تھے. ان میں اکثریت ایک بار پھر انہیں جاگیردار سیاسی مسافروں کی تھی۔
۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کے الزامات کے باعث جب ملک میں مارشل لاء نافذ کیا گیا اور ملتوی شدہ الیکشن کا جب دوبارہ اعلان ہوا تو ان جاگیرداروں کو یہ انتخابات منعقد ہوتے نظر نہ آئے۔ لہٰذا ان کے تیور بدلنے لگے تو یہ لوگ ضیاالحق کی مجلس شوریٰ. کے رکن بنتے چلے گئے۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں انہیں ایک بار پھر اپنی دولت کے بل بوتے پر سر اٹھانے کے مواقع ملے۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کا عروج نظر آیا تو یہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو یہ کہہ کر دوبارہ اس میں شامل ہو گئے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہئے۔ جب بے نظیر کو وزارت عظمٰی سے رخصت کیا

گیا تو ان میں سے یہ جاگیردار پھر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس سے پہلے یہ لوگ محمد خان جونیجو کے ہاتھ بھی مضبوط کرتے رہے ہیں۔

جاگیردار ایوانوں میں کیسے پہنچے

گذشتہ نصف صدی کی پارلیمانی سیاست کی نقاب کشائی کی جائے تو سیاست پر جاگیرداروں کا ہی تسلط قائم نظر آتا ہے، جو اکثر اپنے مفادات کی خاطر پارٹیاں تبدیل کرتے رہے ہیں۔ پاکستان کے اعلیٰ ترین ایوان بھی ان کی خواہش کے مطابق چلتے رہے ہیں۔ ایسے واقعات کے جال ہمیں بساط سیاست پر قدم قدم پر بچھے نظر آتے ہیں۔ مفاد پرست اور جاگیردارانہ سیاسی ذہنیت ان تبدیلیوں کا ایک ذریعہ رہی ہے اور اب بھی یہی طبقہ سیاست اور معیشت پر آب و تاب سے چھایا ہوا ہے۔ ان بڑے بڑے خاندانوں میں جن کے ہاتھوں میں پاکستان کا مستقبل تھا اور اب بھی ہے، جن میں پنجاب کے حیات، نون، دولتانے، ٹوانے، ممدوٹ، قریشی، گورمانی، لغاری، مزاری، نواب صاحب، سیال، کھوسہ، ملک، پراچے، قزلباش اور گیلانی قابل ذکر ہیں، ان میں سے بعض خاندانوں کی رشتہ داریاں سندھ کے بڑے بڑے جاگیرداروں سے بھی قائم ہیں اور یہی خاندان آئین ساز اسمبلیوں میں غالب اکثریت رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ خاندان اب بھی رکھتے ہیں۔ پارلیمانی جمہوریت کو ناکام بنانے اور سیاسی اداروں کی نشو و نما میں رکاوٹیں ڈالنے والے بھی بڑے بڑے جاگیردار ہی تھے۔ لیاقت علی خان کے وزیر اعظم بننے پر بعض سیاست دان اور جاگیردار قطعاً خوش نہ تھے۔ سابق وزیر اعظم ملک فیروز خان نون نے تو یہاں تک کہا کہ پاکستان پر یوپی کا رہنے والا حکومت کر رہا ہے جس کا پاکستان میں کوئی حلقہ انتخاب ہی نہیں ہے۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو گورنر جنرل کے عہدے سے مستعفیٰ ہو کر وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا تو خواجہ ناظم الدین بھی ان جاگیرداروں کے سامنے بے بس ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء کو ان کی حکومت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ختم کر دی گئی حالانکہ

ایک ماہ قبل خواجہ ناظم الدین نے بجٹ کی منظوری کے موقع پر اسمبلی سے بھرپور اعتماد کا ووٹ لیا تھا اور یہی جاگیردار خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کو گورنر جنرل کی طرف سے کئے جانے والے اقدام کو ایک اعلیٰ حب الوطنی کا تقاضا قرار دینے لگے۔ پاکستان میں یہ بدترین جمہوری روایت کا آغاز تھا جس کی بنیاد بعض مفاد پرست سیاست دانوں نے رکھی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کی جگہ محمد علی بوگرہ جو اس وقت امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے، خصوصی طور پر جب وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے لئے تشریف لائے تو سابق کابینہ کے آٹھ ارکان ان کے استقبال کے لئے موجود تھے اور انہوں نے محمد علی بوگرہ کو اپنے لیڈر کی حیثیت سے اعتماد کا ووٹ دے دیا۔ اسمبلی کے وہ اراکین جو نہ تو جمہوری پارلیمانی روایات کا احترام کرتے تھے اور نہ ہی انہیں جمہوریت سے عقیدت تھی یہ سیاسی اداروں کی تباہی کا باعث بن رہے تھے۔ ان ارکان میں، بہت بڑی تعداد وڈیروں اور جاگیرداروں کی بھی شامل تھی۔ محمد علی بوگرہ کی حکومت بھی سیاستدانوں کی سیاسی چپقلش کی وجہ سے زیادہ دیر نہ چل سکی۔ اور یوں ستمبر ۱۹۵۴ء میں غلام محمد نے اسمبلی ہی توڑ دی۔ غلام محمد کو احساس تھا کہ ارکان اسمبلی نے جمہوری اداروں کو کس طرح تباہ کیا اور سابقہ وزارتیں توڑوانے کے لئے کس طرح محلاتی سازشیں کیں محمد علی بوگرہ کی برطرفی کے بعد غلام محمد نے ایک گورنر جنرل کی کونسل قائم کر لی جس نے آئندہ آئین سازی کی تشکیل تک ملک کی باگ دوڑ سنبھال لی۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۵۶ء کو حسین شہید سہروردی نے ری پبلکن پارٹی کے ساتھ مل کر نئی مخلوط حکومت تشکیل دی تو۔ ری پبلکن پارٹی میں وہی جاگیردار نمایاں تھے جو مسلم لیگی تھے۔ اب وہ مسلم لیگ میں شمولیت کو سیاسی غلطی کہہ رہے تھے۔ انہی کی وجہ سے سہروردی وزارت بھی محلاتی سازشوں کا شکار ہو گئی تو ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو آئی آئی چندریگر نے وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنی کابینہ تشکیل دی۔ اس سے قبل چندریگر آئین ساز اسمبلی میں قائد حزب اختلاف تھے۔ یہ وزارت بھی صرف دو ماہ چل سکی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ملک فیروز خان نون نے پاکستان کے ساتویں وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنی نئی کابینہ تشکیل دی۔ فیروز خان نون نے وزیر اعظم بننے کے بعد ان جاگیرداروں کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا اور زرعی اصلاحات کی تمام تجاویز کو رد کر دیا جس پر سابقہ حکومتیں کام کرتی رہی تھیں۔ پارلیمانی سیاست میں جاگیرداروں کی نمائندگی کتنی رہی؟ پہلی دستور ساز اسمبلی میں بڑے جاگیرداروں کی تعداد ۲۷ تھی اس کے

بعد یہ کہانی اس طرح دہرائی گئی کہ شہروں میں صنعت کاروں کا غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ جاگیردار محض اس لئے اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے رہے ہیں کہ ان کے پاس ہزاروں ایکڑ اراضی تھی۔

قیام پاکستان سے قبل پہلا مرکزی قانون ساز ادارہ ۱۹۴۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ اسے نہ صرف پاکستان کی پہلی اسمبلی ہونے کا اعزاز حاصل تھا بلکہ اس کے ذمہ قانون سازی کا مشکل کام بھی تھا۔ اسمبلی کے لئے ۶۹ اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں ہوا۔ دس افراد نامزدگی کے ذریعے اس میں شامل کر لئے گئے۔ اس میں ووٹ کا حق ان ہی کو حاصل تھا جو صاحب جائیداد یا بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے۔ پہلی اسمبلی نہ نمائندہ تھی اور نہ ہی اسے پاکستان کے عوام کی منظور کردہ آئینی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء سے ۲۴ اگست ۱۹۵۴ء تک کام کرتی رہی۔ سات سال کے اس عرصہ میں اس اسمبلی نے آئین سازی کے لئے "قرار داد مقاصد" منظور کرنے کے علاوہ کوئی کارنامہ سرانجام نہ دیا۔

پاکستان کی پہلی اور دوسری اسمبلی کسی کی نمائندہ تھی یا نہیں، یہ ان جاگیرداروں کی نمائندہ ضرور تھی جو برسوں سے اس معاشرے کے جسم سے جونک کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ پاکستان کی پہلی اسمبلی میں ۳۱ وکیل اور ۲۷ بڑے زمیندار شامل تھے۔ وکیلوں کی بڑی تعداد (سابقہ) مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتی تھی۔ دوسری اسمبلی کے تمام بڑے زمینداروں کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ ان کی تعداد ۲۸ تھی۔ اس اسمبلی میں مغربی پاکستان کے چالیس اراکین میں ۲۸ جاگیرداروں کے علاوہ تین وکیل، ۵ ریٹائرڈ افسر اور چار افراد تجارت و صنعت کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح مجموعی طور پر مغربی پاکستان کی نمائندگی کا حق ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا جو ملک کی زمین کے بڑے حصے پر قابض تھے۔ ان دو اسمبلیوں کے قیام کے دوران پاکستان کے دونوں حصوں میں صوبائی انتخاب ہو چکے تھے۔ ان انتخابات کو مغربی پاکستان میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہاں اسمبلیوں پر غلبہ مسلم لیگ کا ہی رہا لیکن مارچ ۱۹۵۴ء میں یہ انتخابات رائے دہندگان کی فہرست بالغ رائے دہی کے اصول پر ہوئے تھے۔ یونائیٹڈ فرنٹ جسے بنگالی میں جگتو فرنٹ کا نام دیا گیا تھا، ۲۱ نکات کی

بنیاد پر قائم ہوا تھا۔

اس فرنٹ کے رہنما نورالامین کو شکست دینے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ فرنٹ نے ۲۳۸ نشستوں میں سے ۲۲۳ پر قبضہ کر لیا۔ آزاد امیدواروں کو تین خلافت ربانی پارٹی کو ایک، مسلم لیگ کو دس، اقلیتی نشستوں پر بھی متحدہ محاذ کو دس، کانگرس کو ۲۴، کشتری دل کو تین، کیمونسٹ پارٹی کو ۴، شیڈول کاسٹ کو ۲۷، دیگر چار نشستیں عیسائی، بدھ مت اور ہندوؤں کے مختلف فرقوں کو حاصل ہوئیں۔ (سابقہ) مشرقی پاکستان کے انتخابی نتائج سے ظاہر ہوتا تھا کہ بنگالی مسلم لیگی رہنماؤں کی سیاست سے بے زار آ چکے ہیں۔

جون ۱۹۵۵ء میں قائم ہونے والی مرکزی اسمبلی میں سہروردی اور فضل الحق مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور وڈیروں کے زبردست حریف تھے۔ ۱۹۵۵ء کی مرکزی اسمبلی میں ۲۸ وڈیروں کا تعلق (سابقہ) مغربی پاکستان سے تھا۔ (سابقہ) مشرقی پاکستان سے آنے والے ۲۰ وکیل اور نو ریٹائرڈ افسر تھے۔ وہاں سے کوئی بڑا جاگیردار کامیاب نہ ہو سکا۔ دراصل اس حصے میں بڑی زمینداریاں زرعی اصلاحات کے ذریعے ۱۹۵۰ء میں ختم کر دی گئی تھیں۔ سابقہ مغربی پاکستان میں میاں ممتاز احمد دولتانہ، فیروز خان نون، افتخار حسین ممدوٹ، میاں عبدالباری، سکندر مرزا، عبدالحمید خان، کرنل عابد حسین، امیر اعظم خان، عزیز دین چوہدری، چوہدری محمد حسین چٹھہ، سردار عبدالحمید دستی، چوہدری عبدالغنی گھمن سی ای جین، سید عملدار حسین گیلانی، مشتاق حسین گورمانی، میاں افتخار الدین، مظفر علی قزلباش۔ میر بلخ شیر مزاری، سید محی الدین لال بادشاہ وغیرہ کے نام نمایاں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی پاکستان کی ۹۸ فی صد آبادی کا نمائندہ نہیں تھا۔

۱۹۵۵ء کے انتخابات میں یہ بات واضح تھی کہ اس اسمبلی میں پاکستان کے عوام کو قومی امور میں براہ راست حصہ لینے سے روکا گیا تھا۔ اس اسمبلی نے مارچ ۱۹۵۶ء میں پہلا آئین نافذ کیا۔ انتخابات کرانے کی بجائے جاگیردار ٹولے نے پہلی قومی اسمبلی کے اختیارات سنبھال لئے۔ اس اسمبلی کے ۷۲ اراکین مختلف انتخابی اداروں کے ذریعے منتخب کئے گئے تھے اور ان میں آٹھ نامزد تھے۔ اس آئین کا اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں جداگانہ یا مخلوط طریقہ کار کا واضح ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ نے ۱۹۰۶ء ہی سے جداگانہ طریقہ کار کا مطالبہ کیا

تھا اور اس کو اساس بنا کر تحریک پاکستان کو آگے بڑھایا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد جاگیرداروں کا یہ ٹولہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سوال کو اختلافی بنا کر جاگیردار انتخاب کو التوا میں ڈالتے رہے۔ اس طرح اسمبلی کا عوام سے رابطہ نہیں تھا۔ جنرل محمد ایوب خاں بھی اس سازشی ماحول کو بغور دیکھ رہے تھے۔ سات اکتوبر ۱۹۵۸ء کے پرامن انقلاب کے بعد پاکستان نے اپنی گیارہ سالہ سیاسی ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے نئے باب کا آغاز کیا۔ پاکستان گذشتہ گیارہ سالوں میں جمہوریت کے مقدس نام کے، تحت چند خاندانوں کی جاگیر بن کر رہ گیا تھا۔ جاگیردار سیاست دانوں نے جو بویا، وہ کاٹا اور سب سے پہلے ایوب خان نے ان کے گیارہ سالہ اعمال ناموں کو نکالا۔ ان کے سامنے ان جاگیردار سازشی سیاستدانوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے پروڈا جیسے قانون کی نظیر موجود تھی۔ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں اس قانون کو ناپسندیدہ سیاسی عناصر کے خلاف موثر انداز میں استعمال کیا گیا تھا۔ ایوب خان کا ہدف سیاستدانوں کو بے اثر کرنا تھا۔ "ایبڈو" کا قانون اس سلسلے میں خصوصی طور پر سیاستدانوں کے لئے بنایا گیا تھا، البتہ یہ رعایت اس قانون میں ضرور دی گئی تھی کہ اگر سیاستدان عدالت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش نہ کرنا چاہتے ہوں تو وہ رضاکارانہ طور پر اعلان کر دیں کہ وہ سیاست سے چھ سال کے لئے الگ ہو رہے ہیں۔ سیاستدانوں کی ایک بڑی تعداد نے جن میں میاں ممتاز احمد دولتانہ، نواب مظفر علی قزلباش فیروز خان نون، مخدوم زادہ حسن محمود اور نواب افتخار احمد ممدوٹ شامل تھے، کوئی فائر کئے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ فیروز خان نون کو تو نوٹس بھی نہ ملا تھا۔ کہ انہوں نے خود ہی ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک سیاست سے الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ بہر حال ایوب خان جو بھی اور جیسے بھی تھے، یہ درست ہے کہ سیاستدانوں کے دلوں میں بھی چور تھا۔ انہوں نے انجانے خوف کے باعث رضاکارانہ طور پر سیاست سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔

مغربی پاکستان میں پچاس میں سے ۳۸ سیاستدانوں نے رضاکارانہ طور پر سیاست سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان میں دس سابق وزرائے اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ، نواب افتخار حسین ممدوٹ، مخدوم زادہ حسن محمود، عبدالحمید دستی، محمد ایوب کھوڑو، یوسف ہارون، مظفر علی قزلباش، پیرزادہ عبدالستار، پیر الٰہی بخش اور قاضی فضل اللہ تھے ان جاگیردار سیاستدانوں میں سے ایم کے لغاری، سید عابد حسین، مشتاق گورمانی، فضل الٰہی

پراچہ، شمس الحق، غلام محمد لنڈ خور اور محمد حسین چٹھہ نے پوری تیاری سے مقدمہ لڑا اور جب ان بلند و بالا پہاڑوں کو کھودا گیا تو ان میں سے بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کی ایسی "چھوٹی چھوٹی چوہیاں" برآمد ہوئیں جن کی اس دور میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ پھر بھی انہیں نااہل قرار دے دیا گیا۔ ان کے علاوہ بیگم سلمٰی تصدق حسین، سی ای گبن، بیگم اصغری رحیم، میاں افتخار الدین، امیر عبداللہ خان روکڑی، ممتاز حسین قزلباش، سید علی گردیزی، سید علمدار حسین گیلانی، علی حسن منگی، محمد اشرف خان، چوہدری عبدالغنی گھمن، چوہدری نصیر احمد ملہی، قاضی محمد اکبر، میاں محمد سعید قریشی سرگودھا، ارباب نور محمد خان، سید محمد ولی علی شاہ، میاں عبدالعزیز اور صف اول کے دیگر لیڈر نااہل ہو گئے۔

ایوب خان کسی لحاظ سے بھی جمہوری شخصیت نہیں تھے۔ انہوں نے سازشی ماحول میں اقتدار حاصل کیا تھا اور جمہوریت کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ ایوب خان سیاستدانوں پر پابندی عائد کر کے اور زرعی اصلاحات کے ذریعے ان کی سیاسی قوت پر شدید ضرب لگانے کے باوجود ان کے اثر و رسوخ کو ختم نہ کر سکے۔ ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کے جس نظام کو عوام پر مسلط کیا تھا، اسے درباری دانشوروں اور جاگیرداروں نے بڑا سراہا اور ان کے ہاتھ مضبوط کرنے میں وہی جاگیردار پیش پیش تھے، جن پر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی تھی اور انہی جاگیرداروں کے خانوادے ۱۹۶۲ء کی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے یہ "انتخاب" ایسے تھے کہ جس گھوڑے پر ایوب خان ہاتھ رکھتے وہ جیت جاتا۔ انہوں نے ایوب خان کے اس نظام کو عوامی خواہشات کے عین مطابق قرار دیا۔ ان کے ہونٹ ایوب خان کے دربار میں ثنا خوانی کرتے ہوئے تھکتے نہیں تھے۔ سابق صدر ایوب خان کو بنیادی جمہوریتوں کے "تماشے" میں ۹۸ فی صد ووٹ ملے تھے۔ جن نمائندوں نے سابق صدر ایوب خان کے سر پر اعتماد کا تاج رکھا تھا، ان میں ریکارڈ کے مطابق ۵۰ء۷ فی صد انگوٹھا لگانے والے، ۳۶ء۷ فی صد پرائمری پاس، ۴ء۲۶ فی صد سیکنڈری پاس شامل تھے۔ جبکہ کالج تک تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد ۱۲ء۰۸ فی صد تھی اس طرح ایوب خان نے جن لوگوں سے آئین سازی کی توثیق کروائی تھی، ان میں صرف ۱۲ء۰۸ فی صد ایسے تھے جو آئین کے لغوی معنی جانتے تھے۔

یونین کونسلوں میں زرعی شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد ۳ء۷۷ فی صد، کاروباری اور ٹھیکیدار ۷ء۱۰ فی صد تھے۔ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں دولت مند اور انہی جاگیرداروں کے عزیز و اقارب کامیاب ہوئے تھے جن پر ایوب خان نے زرعی اصلاحات کے ذریعے کاری ضرب لگائی تھی۔ ایوب خان نے ان کے تعاون سے ۱۹۶۵ء میں محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح کی مخالفت کرنے والوں میں نواب امیر محمد آف کالا باغ، امیر عبداللہ خان روکڑی، شمس آباد خاندان، نون، ٹوانے، سیال، رجوعے، قریشی، ساہیوال کے راجپوت اور ارائیں، ملتان کے قریشی اور گیلانی، ڈیرہ غازی خان کے لغاری، مزاری، قیصرانی، خانیوال کے ڈاہے، راولپنڈی کے راجے، گجرات کے نوابزادے مظفر گڑھ کے دستی، اور دیگر خاندانوں کے بعض افراد پیش پیش تھے۔ اقتدار کے ایوانوں سے جنم لینے والی کونشن مسلم لیگ میں ان خاندانوں کی نمائندگی موجود تھی۔ صدارتی انتخاب میں ان کے دل تو محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ دھڑکتے تھے، لیکن ان کا تعاون حکومت کے ساتھ تھا۔ ایوب خان نے زرعی اصلاحات نافذ کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا تھا کہ جاگیرداری نظام دم توڑ دے گا۔ ۱۹۶۲ء میں بنیادی جمہوریتوں کے توسط سے بننے والی قومی اسمبلی میں (سابقہ) مغربی پاکستان کی ۷۵ نشستوں میں سے ۳۸ پر بھی جاگیردار اور وڈیرے منتخب ہو گئے تھے۔ ۱۹۶۵ کی اسمبلی میں ایوب خان نے صنعت کاروں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا تھا لیکن یہ سب کچھ ایسے نظام میں ہو رہا تھا جس کا عوام سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا اور اسی خامی نے جلد ہی ایوبی نظام کو عوامی خواہشات سے متصادم کر دیا۔ ایوب خان کی آمریت کے خلاف جب تحریک چلی تو مظاہرین نے ایک ایسے سیاسی نظام کا مطالبہ کرتے رہے جو عوام کی خواہشات کے تابع ہو۔ ایوب خان کے خلاف اٹھنے والی تحریک کو بڑے بڑے جاگیرداروں، وڈیروں اور صنعت کاروں نے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ایوب حکومت کے خاتمے کے بعد اقتدار چیف آف سٹاف یحییٰ خان کو مل گیا۔ جنرل یحییٰ خان کے لیگل فریم ورک کے تحت ہونے والے انتخاب میں پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی صورت میں دو بڑی سیاسی قوتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمان کو قومی اسمبلی کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۱۶۰ پر اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کو ۱۳۸

نشستوں سے ۸۱ نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔ یحییٰ خان نے (سابقہ) مشرقی پاکستان کے ۷۹ قومی اسمبلی کے اراکین پر مختلف الزامات عائد کر کے ان کی ۷۸ نشستوں کو خالی قرار دے کر ملک میں ایک ایسا سیاسی بحران پیدا کر دیا، جس سے پاکستان کی وحدت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سابقہ مغربی پاکستان میں یہ کامیابی اس لئے حاصل کی تھی کہ جبر کے نظام میں پسے ہوئے عوام نے انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھا تھا۔ جن جاگیرداروں کے خلاف انہوں نے جنگ لڑی تھی، ۱۹۷۷ء میں انہی کو پارٹی ٹکٹ ہی نہیں دیئے بلکہ ہر قدم پر پارٹی کا نظام ان کے مشورے سے چلتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے والوں میں تقریباً ۵۰ کا تعلق جاگیرداروں کے اسی ٹولے سے تھا جن کے خلاف بھٹو جنگ لڑ رہے تھے۔ ان میں دریا خان کھوسو، علی حسن منگی، سردار نور خان لنڈ، غلام مصطفیٰ خان جتوئی، پیر سید عبدالقادر شاہ، حاکم علی زرداری، ممتاز علی بھٹو، میر اعجاز علی تالپور، مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ، ملک انور علی نون، میاں عطاءاللہ، رائے شفقت خان، نواب صادق حسین قریشی، پیر غلام شاہ جیلانی، فضل الٰہی چوہدری، غلام مصطفیٰ کھر عبدالنبی کانجو، میر علی بخش خان، عبدالحمید جتوئی، ملک سکندر خان، عبدالستار گبول، عباس حسین شاہ، سید ناصر علی شاہ رضوی، سردار عبدالعلیم، حاجی محمد صادق، میاں محمد حسین خان، نور محمد میاں محمد رفیق، عبدالخالق خان وغیرہ شامل تھے۔

ایوب خان کا اقتدار ختم ہوا تو جو جاگیردار پیپلز پارٹی میں نہ سما سکے، وہ مسلم لیگ قیوم گروپ میں شامل ہو گئے تھے۔ پنجاب سے سید حسن محمود کی قیادت میں ملتان کے گیلانی، سرگودھا کے ملک نور حیات نون اور عبدالوحید خان شامل تھے جس کے بعد کئی تلواریں کونسل مسلم لیگ کی نیام میں چلی گئیں۔ ان میں چوہدری ظہور الٰہی میاں محمد اکبر، چوہدری اقبال چیلیانوالہ، کیمبل پور کے پیر صفی الدین ضلع سرگودھا کے ذاکر قریشی، مہر خداداد لک، ضلع فیصل آباد کا جاٹ گروپ جس کی قیادت سابق مرکزی پارلیمانی سیکرٹری سردار رشید احمد جڑانوالہ کے ہاتھ میں تھی، کونسل مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر جاگیرداروں اور بااثر دھڑے بند سیاسی گھرانوں کے جو افراد قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، ان میں کیمبل پور کے سردار شوکت حیات، پیر صفی الدین آف کمھٹہ، چوہدری ظہور الٰہی گجرات بابو کرم بخش سرگودھا، غلام حسین خان، میاں

ممتاز دولتانہ، میاں محمد ابراہیم، میاں نظام الدین سید رفیق محمد شاہ اور جمال محمد شامل تھے۔
اس طرح ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھی سیاست پر کسی حد تک ان کی گرفت مضبوط رہی۔
پاکستان کی سیاست پر جن جاگیرداروں کا قبضہ رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ان کو کسی حد تک پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ جاگیرداروں کو پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا سہرا ملک محمد حیات ٹمن اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ صادق حسین قریشی کے سر ہے۔ جو اپنے جاگیردارانہ پس منظر کے باعث ان خاندانوں کے ارکان کو اقتدار میں شامل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے رہے جن کے ارکان یونینسٹ حکومت سے لے کر ایوب خان کے دور تک قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے رکن رہے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں یہ پیپلز پارٹی میں اپنے لئے کوئی جگہ نہ بنا سکے تھے ۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل پیپلز پارٹی میں نووارد افراد کی قطاریں لگ گئیں اور انہوں نے بھٹو کو اسلام کا ایک عظیم سپاہی قرار دیا۔ اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کے دور کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ سیاسی شعور سے مالا مال قومی سیاست میں نمایاں افراد کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ بعض اہم قومی رہنماؤں کو خوفزدہ کیا گیا۔ میاں ممتاز دولتانہ جو پنجاب میں پیپلز پارٹی کی سب سے بڑی حریف سیاسی جماعت کونسل مسلم لیگ کے سربراہ تھے، انہوں نے بظاہر اپنی خرابی صحت کی بنا پر برطانیہ کی سفارت قبول کر لی۔ ان کے دست راست سردار شوکت حیات بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ کونسل مسلم لیگ کے اہم رہنما یحییٰ بختیار اٹارنی جنرل بنا دیئے گئے۔ پیر صفی الدین مکھنڈ، نوابزادہ میاں محمد ذاکر قریشی اور ملک کرم بخش اعوان جو کہ ۱۹۷۰ء میں کونسل مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے منتخب ہوئے تھے، بھی پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔

جبکہ میاں نظام الدین سیاست میں سرگرم نہ رہے۔ ان میں صرف چوہدری ظہور الٰہی ہی ایسے رہنما تھے، جنہوں نے پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں بے پناہ انتقامی کارروائیوں کے باوجود پیپلز پارٹی کی قیادت قبول کرنے سے انکار کیا۔ پیپلز پارٹی جس میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی تعداد دوسری جماعتوں سے کم تھی، ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں انہی روایتی جاگیردار گھرانوں نے پیپلز پارٹی کے پرچم تلے پناہ لی۔ راولپنڈی سے علی اصغر شاہ، جو ۱۹۶۲ء میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے، ایوب خان نے جب آئین میں چوتھی

ترمیم کی تو یہ حزب اختلاف کے ان چار افراد میں شامل تھے جنہوں نے سابق صدر ایوب کا ساتھ دیا تھا۔ پھر کنونشن لیگی ہو گئے۔ ۱۹۷۰ء میں یہ دو نشستوں سے امیدوار تھے۔ ایک سے انہیں خورشید حسن میر اور دوسری سے ملک محمد جعفر نے شکست دی۔ کیمبل پور سے سردار شوکت حیات ۱۹۷۷ء سے پہلے پیپلز پارٹی میں او ایس ڈی تھے۔ جب انہوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی تو بھٹو نے کہا تھا کہ انہیں اہم ذمہ داری سونپی جائے گی۔ پیر صفی الدین مکھنڈ بھی ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے امیدوار بنے۔ پیر صاحب ۱۹۷۰ء کونسل مسلم لیگ میں تھے، بعد میں پیپلز پارٹی میں آ گئے۔ وہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے مشیر ملک محمد حیات ٹمن کے مخالف گروپ کے سربراہ تھے۔ اگرچہ دونوں گروپ ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی میں تھے، مگر وہ ایک دوسرے سے شاکی اور اعلیٰ قیادت سے ایک دوسرے کے خلاف شکائتیں کرتے رہے۔ ملک محمد حیات ٹمن نے اپنے بیٹے عظمت حیات کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ بھی دلوایا تھا۔ جہلم سے پیپلز پارٹی نے سردار خضر حیات کو ٹکٹ دیا جو کہ کنونشن مسلم لیگ کے پارلیمانی سیکرٹری رہے۔ پیپلز پارٹی کے دور میں چار سال "بے قراری" سے گزار کر پیپلز پارٹی میں چلے جانے کے بعد انہیں جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کا رکن نامزد کیا گیا۔ سرگودھا سے شاہ پور ضلع کا دلچسپ ترین مقابلہ تھا۔ یہاں سے نواب زادہ ذاکر قریشی امیدوار تھے جو تحریک پاکستان کے کارکن تھے۔ کنونشن مسلم لیگ میں چلے گئے بعد ازاں کونسل مسلم لیگ میں رہے۔ پھر پیپلز پارٹی میں چلے گئے ۱۹۷۷ء تک پیپلز پارٹی میں رہے۔ سرگودھا کے بہت بڑے جاگیردار اور ملک فیروز خان کے بیٹے نور حیات نون امیدوار تھے۔ نور حیات نون ۱۹۷۰ء میں قیوم لیگ میں تھے۔ اپنے کزن انور علی نون سے شکست کھا گئے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کے کزن انور علی خان کو دوسرے حلقے سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ مل گیا۔

۱۹۷۷ء کے انتخاب میں میانوالی سے پیپلز پارٹی نے ملک مظفر علی آف کالاباغ کو ٹکٹ دیا۔ نواب آف کالاباغ کے مظالم میانوالی کے لوگوں کو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہ بھی ہمیشہ اہل اقتدار کے ساتھ رہے ہیں۔ میانوالی سے امیر عبداللہ روکڑی بھی پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے۔ وہ کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ۱۹۷۰ء کا انتخاب ہار گئے تھے۔ ان کا شمار اب آف کالاباغ کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ جھنگ کے سیال بھی اہل اقتدار کی بیساکھیوں

کے محتاج رہے ہیں۔ جھنگ سے غلام حیدر بھروانہ امیدوار تھے۔ غلام حیدر بھروانہ ۱۹۷۰ء میں جمعیت علمائے پاکستان میں شامل تھے اور یہاں سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جھنگ ۴ سے پیپلز پارٹی کے ذوالفقار علی بخاری امیدوار تھے۔ یہ علاقے کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ شاہ جیونہ گروپ کے سرگرم رہنما ہیں۔ صاحبزادہ نذیر سلطان ۱۹۷۰ء میں جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ حضرت سلطان باہو کی گدی کے متولی ہیں۔ انہوں نے فلور کراسنگ کر کے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے امیدوار بنے۔ وہ ۶۳۳۶۴ ووٹ لے کر کامیاب ہوئے۔ اس طرح فیصل صالح حیات، نثار اکبر فیصل آباد، سردار احمد علی، شمیم حیدر شیخوپورہ، رائے رشید احمد بھٹی، سیف اللہ، ملک مہدی حسن، میاں شہادت علی خان، سلطان احمد چیمہ، غلام سرور خاں، سجاد حسین قریشی، حامد رضا گیلانی، چوہدری عبدالرحمان والیہ، راجہ تاج الدین نون، ریاض احمد دولتانہ، سلیم خورشید، میر بلخ شیر مزاری، ابراہیم برق، امجد حمید دستی، ملک قادر بخش، پالین موتو، سعید الرشید عباسی، شجاع الدین شیخ، پرنس صلاح الدین، جمال کوریجہ، مخدوم حمید الدین، بلال خاں لغاری، کیمبل پور کے حیات، پیر آف کشمیر، ملتان، راولپنڈی کے راجے، جھنگ کے سیال، شاہ جیونہ فیملی، سرگودھا کے نون، قریشی اور لک وغیرہ ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی میں جاگیردار طبقے کی نمائندگی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب وفاقی کابینہ تشکیل دی تو رانا محمد حنیف خاں (تجارت اور لوکل گورنمنٹ) عبدالحفیظ پیرزادہ (خزانہ منصوبہ بندی صوبائی رابطہ) میر افضل خان (پانی و بجلی) مولانا کوثر نیازی (مذہبی و اقلیتی امور اور سمندر پار پاکستانیوں کے امور) عزیز احمد لاہور (خارجہ) یحییٰ بختیار (اٹارنی جنرل) سید حامد رضا گیلانی (صنعت) محمد حنیف خان (امور کشمیر قبائلی علاقہ و ریاستیں) تاج محمد خان جمالی (صحت پاپولیشن پلاننگ) یاسین وٹو (تعلیم) ایس ایم مسعود (قانونی و پارلیمانی امور) عبدالستار گبول (محنت و افرادی قوت) طاہر محمد خان (اطلاعات و نشریات) ارباب محمد جہانگیر خان (ہاؤسنگ و تعمیرات) نور حیات نون (ثقافت و آثار قدیمہ کھیل سیاحت) مخدوم حمید الدین (پٹرولیم و قدرتی وسائل) ڈاکٹر غلام حسین (ریلوے) انور عزیز (خوراک و زرعی نظم و نسق) فاروق احمد خان لغاری (پیداوار) نیاز محمد وسان (سائنس و ٹیکنالوجی) شیخ محمد رشید (زراعت اور باہمی زرعی

اصلاحات) اور ممتاز علی بھٹو (مواصلات) کے وزیر بن گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اس کابینہ میں روایتی جاگیرداروں کو پھر اہمیت دی تھی اور ان میں سے اکثریت ایسے سیاستدانوں کی تھی جو موجودہ حکومت میں بھی اہم عہدوں پر فائز ہیں یا ان کے حمایتی ہیں۔ جب بھٹو کی کابینہ میں یہ لوگ شامل تھے تو انہوں نے انہیں تیسری دنیا کا عظیم رہنما قرار دیا تھا۔ بعد ازاں انہی سیاستدانوں میں سے بعض نے صدر ضیاالحق کو امیر المومنین کہا اور جب تک مارشل لاء نافذ رہا یہ ضیاالحق کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ بعد ازاں انہوں نے وزیر اعظم کی حیثیت سے محمد خاں جونیجو کو "فاتح جمہوریت" کا نام دیا اور اب بھی ان میں سے کچھ وزیر اعظم میاں نواز شریف کے ساتھ اپنی وفاداریاں استوار رکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتائج کو قومی اتحاد نے تسلیم نہ کرتے ہوئے جب زوردار تحریک کا اعلان کیا تو ان جاگیرداروں میں سے سردار شوکت حیات، امیر عبداللہ روکڑی، نواب زادہ ذاکر قریشی، میاں صلاح الدین، میر بلخ شیر مزاری نے ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے بھٹو سے مطالبہ کیا کہ وہ انتخابات نئے سرے سے کرائیں اور انہوں نے ملک میں شرعی نظام کے نفاذ کا مطالبہ بھی کیا۔ سب سے پہلے قصور کے مرد قلندر اور پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے سردار احمد علی نے بھٹو مرحوم کی دھاندلیوں کے خلاف استعفیٰ پیش کیا حالات کا رخ جب مزید بدلا تو سردار نصراللہ دریشک سابق صوبائی وزیر آبپاشی چوہدری عید محمد، دیوان غلام عباس نجاری، ذوالفقار کھوسہ اور اسلم بھٹی نے بھی پیپلز پارٹی سے استعفے دے دیئے اس کے ساتھ ہی سردار شوکت حیات نے اسلام آباد میں پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا جس پر سابق وزیر اعظم بھٹو مرحوم کو وضاحت کرنا پڑی کہ سردار شوکت حیات کو اسمبلی کے اجلاس بلانے کا حق نہیں اور وہ خود پیپلز پارٹی میں نووارد ہیں۔

۱۹۸۵ء کے انتخابات غیر جماعتی ماحول میں منعقد ہوئے حکومت نے پیپلز پارٹی کے ان رہنماؤں کو بھی انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت دے دی جنہیں مختلف ٹربیونلوں نے نااہل قرار دے دیا تھا۔

۱۹۸۵ء کے انتخابات ہوئے تو متعدد سیاسی رہنماؤں نے پیپلز پارٹی سے علیحدگی

اختیار کر لی۔ جبکہ پیپلز پارٹی نے غیر جماعتی انتخاب کا بائیکاٹ بھی کر رکھا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کرنے والے بعض سابق ارکان اسمبلی نے پارٹی کے فیصلے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ ان میں ملک نسیم آہیر (خوشاب)، ملک نور حیات نون (سرگودھا)، سردار زادہ محمد علی شاہ (رجوعہ جھنگ)، چوہدری شمیم حیدر (شیخوپورہ) مخدوم حامد رضا گیلانی (ملتان)، میاں ریاض دولتانہ (وہاڑی) میر بلیغ شیر مزاری (راجن پور) میاں محمد یاسین وٹو (اوکاڑہ) چوہدری انور عزیز (سیالکوٹ) سعید الرشید عباسی (بہاولپور) نور حسن منگھیروی (بہاولپور)، شامل تھے۔ ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایم پی اے منتخب ہونے والے بھی ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں اٹک سے ملک محمد اسلم آف (شمس آباد) سردار سرفراز خان آف کھنڈا، میاں محمد افضل حیات (کوٹلیاں)، چوہدری محمد اقبال (آف چلیانوالہ)، چوہدری محمد نواز بوسال، مسٹر امان اللہ خان شاہانی، رائے عارف حسین کھرل، میاں ناصر علی بلوچ، مخدوم علی رضا شاہ، الحاج قمر الزمان کھگہ (ملتان)، سردار مقصود احمد لغاری (ڈیرہ غازی خان)، میاں غلام احمد مانیکا (ساہیوال)، میاں سیف اللہ اور رئیس شبیر احمد (رحیم یار خان) شامل تھے۔ ۱۹۷۷ء کے صوبائی انتخابات میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے اکثر ارکان اسمبلی نے ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں بھی پنجاب اسمبلی کی نشست کے لئے انتخاب لڑا اور کامیاب رہے۔ ان میں ملک سلیم اقبال (اٹک)، تاج محمد خان (بھکر)، ڈاکٹر سردار احمد (لاہور)، رانا پھول احمد خان (قصور)، نصر اللہ خان دریشک (ڈیرہ غازی خان)، سردار ذوالفقار علی کھوسہ (ڈیرہ غازی خان)، غلام فرید چشتی (ساہیوال)، نذیر سلطان (جھنگ)، چوہدری امتیاز اے گل، خان شہادت خان بلوچ چوہدری غلام نبی، مسٹر اسد مسعود (ٹوبہ ٹیک سنگھ)، میاں سیف اللہ تارڑ (گوجرانوالہ)، چوہدری سلطان احمد چیمہ (سیالکوٹ)، چوہدری عبدالرحمان، رانا تاج احمد نون (ملتان)، میاں محمد افضل وٹو (بہاولنگر)، خواجہ جمال محمد گوریجہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے چار ارکان اسمبلی سینٹ کے رکن بھی منتخب ہوئے ان میں جہلم سے سردار خضر حیات، سرگودھا سے میر خداداد خان لک۔ میانوالی سے امیر عبداللہ خان روکڑی اور ملتان سے مخدوم سجاد حسین قریشی شامل ہیں۔

۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے جو امیدوار ۱۹۸۵ء میں ہار گئے ان میں سردار محمد اشرف، ملک شہباز خان رائے احمد حیات خان کھرل خالد ملک، حاجی محمد حیات، سردار محمد عاشق ڈوگر، رانا افتخار حسین آف مانانوالہ، چوہدری توکل اللہ ورک، ملک فضل حسین اعوان، محمد انور بھنڈر، چوہدری انوار الحق، امیر عبداللہ خان آف خانیوال، پیر شجاعت حسنین قریشی، سید محمد رضی شاہ گردیزی، نواب صادق حسین قریشی، کنور محمد یاسین، میاں خورشید انور، مخدوم شمس الدین، میاں منظور احمد موہل، میاں عبدالروف، چوہدری محمد اسلم، محمد ارشد خان لودھی شامل ہیں۔

۱۹۸۵ء کے انتخابات میں ایسے امیدوار بھی شکست کھا گئے جو ۱۹۷۰ء میں پیپلز پارٹی کے انتخابی طوفان کی زد سے محفوظ رہے تھے۔ ان میں ایسے امیدوار بھی شامل تھے۔ جو ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کے مقابلے میں قومی اتحاد کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء میں کامیاب اور ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں ناکام ہونے والوں میں میاں خورشید انور (وہاڑی)۔ خانزادہ تاج محمد خان (اٹک) پیر محمد شاہ (مظفر گڑھ)، راؤ محمد افضل (اوکاڑہ) دلاور چوہدری (جھنگ)، شیخ محمد اقبال (جھنگ)، مسٹر نواز خان نون (ملتان)، سردار محمد عاشق ڈوگر (قصور)، امان اللہ لک (گجرات)، سید تابش الوری (بہاولپور)، ملک کرم بخش اعوان (خوشاب) نوابزادہ ذاکر قریشی (سرگودھا) خواجہ جمال محمد (گوریجہ) نواب ملک مظفر خان آف (کالاباغ)، صاحب زادہ نذیر سلطان (جھنگ) شامل ہیں۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن جیتنے والوں یا امیدوار بننے والوں کی اکثریت مسلم لیگ میں شامل ہو گئی تھی۔ بے نظیر کی سحر انگیز شخصیت نے پیپلز پارٹی کو ایک بار پھر پر کشش بنا دیا تھا کیونکہ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو محمد خان جونیجو اور ان کے ساتھیوں کو جن طریقے سے رخصت کیا گیا تھا۔ اس کا تمام تر سیاسی فائدہ پیپلز پارٹی کے حصہ میں ہی آیا ان سیاستدانوں نے محسوس کر لیا کہ پیپلز پارٹی کے علاوہ ان کے لئے کوئی اور موزوں پلیٹ فارم نہیں ہے۔ ان میں رکن سابق قومی اسمبلی راجہ شاہد ظفر (راولپنڈی)، کونسل مسلم لیگ کے ممتاز راہنما ریٹائرڈ ائیر مارشل نور خان (چکوال)، چوہدری ممتاز احمد تارڑ (گجرات)، حاجی محمد اصغر گھرکی (لاہور) سردار آصف احمد علی (قصور) اور صاحب

زادہ سعید الرشید عباسی آف (بہاولپور) نے پیپلز پارٹی کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا قومی اسمبلی کی دو سابق ارکان بیگم رافعہ طارق رحیم اور بیگم در شہوار مزاری بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئیں۔ پنجاب اسمبلی میں سابق ارکان حزب اختلاف کی اکثریت بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئی۔ ان میں گجرات سے افضل حیات (کوٹلیاں) راولپنڈی سے خان غلام سرور خان اور چوہدری محمد اسلم (جھنگ) ریاض حشمت جنجوعہ فیصل آباد سے فضل حسین راہی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے چوہدری محمد رفیق نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ پیپلز پارٹی کا جاہ و چشم نظر آیا تو جو ارکان پارلیمانی اداروں میں مسلم لیگ کے پارلیمانی گروپوں میں شامل تھے، دھڑا دھڑ پیپلز پارٹی میں شامل ہوتے چلے گئے۔ ان میں ملک محمد اسلم آف شمس آباد، راولپنڈی سے ایم پی اے چوہدری محمد خالد، ضلع گجرات سے نواب زادہ مظفر علی خان، سابق ایم پی اے حاجی محمد اصغر آف لالہ موسیٰ، میاں احسان الحق پراچہ چوہدری فرخ جاوید گھمن سمیت سابق ارکان پنجاب اسمبلی مہر غلام دستگیر خاں لک چوہدری محمد خان جسپال، میاں عبدالحق بھٹی اور سردار شجاع محمد خان بلوچ ضلع جھنگ کی تحصیل چنیوٹ سے ایک سابق ایم پی اے ملک محمد عباس نسوانہ بھی لک گروپ کے رکن کی حیثیت سے پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔
بھکر سے سابق ایم پی اے ملک نذیر احمد اترا، سردار شاہد اقبال فیصل آباد سے رائے جعفر خاں کھرل اپنے بھائی رائے اسلم خان کھرل کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے ہم نوا بن گئے سابق وفاقی پارلیمانی سیکرٹری مخدوم سید علی رضا شاہ، صاحب زادہ نذیر سلطان قصور سے چوہدری حاکم علی سابق ایم پی اے، شیخوپورہ سے سابق ایم این اے چوہدری شمیم حیدر، سیالکوٹ سے ایم این اے چوہدری شفاعت احمد خان، سابق ایم پی اے اعجاز احمد چیمہ۔ ضلع ملتان سے سید یوسف رضا گیلانی، پیر محمد اسلم بودلہ سابق ایم پی اے عبدالرزاق نیازی، میاں سکندر حیات بوسن۔ دیوان عاشق حسین بخاری سید فخرالدین شاہ سابق چیرمین ڈسٹرکٹ کونسل خانیوال، پیر عارف زمان شاہ قریشی، پیر شجاعت حسنین قریشی، میاں چنوں کے سابق چیئرمین چوہدری غلام حسین چیمہ راجن پور سے سردار جعفر خان لغاری، مظفر گڑھ سے سابق ایم پی اے سید محمد اقبال شاہ آف تجی شریف۔ ساہیوال سے رانا نعیم محمود، سابق وزیر خزانہ چوہدری ممتاز حسین اور سابق ایم پی اے میاں محمد امجد جوئیہ بہاولپور سے میاں نور حسن گھنگھیروی نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کیا ۸۵ میں الیکشن ہارنے والوں کو بھی پیپلز پارٹی نے ۱۹۸۸ء

میں ٹکٹ جاری کر دیئے ان میں جہلم سے چوہدری الطاف حسین ایڈوکیٹ، فیصل آباد سے شہادت علی بلوچ جھنگ سے صاحب زادہ نذیر سلطان، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے حاجی محمد اسحاق گوجرانوالہ سے ملک فضل حسین اعوان، اوکاڑہ سے راؤ محمد افضل، قصور سے سردار محمد عاشق ڈوگر، اوکاڑہ سے میاں عطا مانیکا خانیوال سے، مہر محمد اقبال ہراج، ساہیوال سے نوریز شکور ملک محمد اقبال لنگڑیال وہاڑی سے میاں ممتاز احمد بھابھہ، راجن پور سے سردار عاشق حسین مزاری مظفر گڑھ سے سید جمیل احمد بخاری اور لیہ سے نیاز احمد جکھڑ شامل تھے۔ اس طرح ایک بار پھر جاگیردار پیپلز پارٹی سے ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے
۱۹۸۸ء کے انتخابات میں میانوالی سے ملک مظفر آف کالا باغ دوسری بار شکست کھا گئے تھے۔ صوبائی حلقے سے گل حمید روکڑی، قومی اسمبلی مسٹر رشید اکبر نوانی، محمد اسلم خان کھرل، خان شہادت علی خان بلوچ فیصل آباد، جھنگ سے امیر حسین، بیگم سید عابدہ حسین، صاحب زادہ نذیر سلطان آف سلطان باہو، دوست محمد لالی جھنگ، سردار زادہ ظفر عباس، محمد نواز بھروانہ، سید غضنفر عباس آف رتہ، مہر اختر عباس بھروانہ، چوہدری تجمل حسین، چوہدری شجاعت حسین، سید یوسف رضا گیلانی، پیر ریاض حسین گیلانی، چوہدری عبدالرحمان والیہ رانا تاج احمد خان نون، شاہ محمود قریشی، دیوان عاشق حسین بخاری، میجر آفتاب خان وڑائچ سردار فاروق خان لغاری، سردار عاشق محمد مزاری، سردار نصراللہ خان دریشک، سردار امجد فاروق کھوسہ، سردار ذوالفقار خان کھوسہ، مقصود خان لغاری، جعفر خان لغاری، سردار شوکت حسین مزاری، ذوالفقار علی برق، مصطفیٰ کھر، سردار امجد حمید دستی، شہزادہ صلاح الدین عباسی، سید تسنیم نواز گردیزی، سلطان احمد گردیزی، مخدوم احمد محمود بھی ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں کامیاب ہو گئے۔
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد کے پلیٹ فارم سے دولتانے، قریشی، گیلانی، لغاری، مزاری، مخدوم، دستی، نواب، ٹوانے، کھوسے، اپنے خاندانوں کی روایات قائم رکھتے ہوئے کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح اب بھی انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کی موجودہ حکومت میں بھی انہیں سیاسی برتری حاصل ہے ان سیاسی گھرانوں نے کتنے ہی زوال دیکھے ہوں لیکن ہر بار یہ ابھر کر

سامنے آتے ہیں پنجاب کابینہ کے ارکان شاہ محمود قریشی، چوہدری پرویز الٰہی، مہر اختر عباس بھروانہ، چوہدری جعفر اقبال، سردار ذوالفقار کھوسہ، ملک خدا بخش ٹوانہ، سردار نصر اللہ خان دریشک، چوہدری محمد اقبال اور راجہ محمد خالد کا خاندان بھی پنجاب کی سیاست میں شروع سے ہی اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ پنجاب کی سیاست پر جاگیردارانہ چھاپ پاکستان میں سب سے زیادہ ہے۔ انگریزوں کے دور حکمرانی میں سر عمر حیات ٹوانہ کو "رائل ہیرالڈ آف دی کنگ" کا خطاب دیا گیا۔ اور وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ سر عمر حیات کے صاحب زادے اور ان کی جاگیر کے واحد وارث سر خضر حیات ٹوانہ نے قیام پاکستان سے قبل ہونے والے انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی۔ نواب افتخار حسین ممدوٹ قائداعظم کے ساتھی اور فیروز پور ریاست جلال آباد کے نواب سر شاہنواز کے فرزند تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ٹوانہ خاندان پس منظر میں چلا گیا۔ لیکن ٹوانہ خاندان کے قریبی رشتہ دار سر فیروز خان نون نے سیاست میں اس خلا کو پر کیا اور وہ بھی پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچے۔ ان گھرانوں کی رشتہ داریاں اس طرح قائم ہیں کہ ان کا اقتدار کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ میاں ممتاز دولتانہ کی کزن بیگم نادرہ خاکوانی پیپلز پارٹی کے دور میں ایم این اے اور وفاقی وزیر کے عہدوں پر متمکن رہیں۔ ممتاز دولتانہ کی بیٹی کی شادی سندھ کے کھوڑو خاندان میں ہوئی۔ سابق وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کے بیٹے محمود کھوڑو ممتاز دولتانہ کے داماد ہیں۔ محمود کھوڑو کے بھائی شاہ محمد پاشا کھوڑو جونیجو دور میں وفاقی وزیر رہے ہے جبکہ ان کی بہن حمیدہ کھوڑو جی ایم سید کی پیرو کار ہیں۔ پنجاب کے صوبائی وزیر صنعت اور جھنگ کے بھروانہ خاندان کے نمائندہ اختر عباس بھروانہ میاں ممتاز دولتانہ کے بھانجے ہیں۔ سرگودھا کے نواب زادہ ذاکر حسین قریشی سے ان کی رشتہ داری ہے۔ دولتانہ خاندان کا شمار پنجاب کے چند ایسے گھرانوں میں ہوتا ہے جن کی تقریباً ہر ذوریٹن کے جاگیر دار گھرانوں سے رشتہ داری ہے۔ مخدوم زادہ حسن محمود سندھ کے پیر صاحب آف پگاڑا شریف کے برادر نسبتی ہیں۔ پیپلز پارٹی اور جونیجو دور کے وفاقی وزیر اور موجودہ ایم این اے یوسف رضا گیلانی مخدوم زادہ حسن محمود کے بھانجے تھے۔ رکن صوبائی اسمبلی پیر قمر الزماں پیر صاحب پگارہ کے سمدھی اور سابق صوبائی وزیر ذاکر قریشی کے داماد ہیں۔ پیر صاحب پگاڑا کے بیٹے پیر علی گوہر شاہ کی شادی بھی مخدوم صاحب کے گھر ہوئی۔ پیر صاحب پگاڑا بہاولپور کے گردیزی،

کھگہ اور قریشی خاندان کے بھی عزیز ہیں ملتان کے قریشی خاندان کے سربراہ مخدوم سجاد حسین قریشی کا شمار ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ سابق وزیر اعلیٰ صادق حسین قریشی اور مخدوم سجاد حسین قریشی ہم زلف ہیں۔ مخدوم سجاد حسین قریشی کے ایک داماد خانیوال کے پیر شجاعت حسنین قریشی ہیں جو آئی جے آئی کے رکن قومی اسمبلی رہے ہیں۔ مخدوم سجاد حسین قریشی کے ایک داماد افتخار علی بخاری کا تعلق شاہ جیونہ خاندان سے ہے جبکہ ایک اور داماد مخدوم زادہ محمد احسن بھی رکن اسمبلی ہیں۔ افتخار علی بخاری کے بھائی ذوالفقار بخاری جونیجو دور میں مسلم لیگ کے سینیٹر منتخب ہوئے تھے۔ بائیں بازو کی نظریاتی سیاست کے اہم کردار قسور گردیزی بھی سابق گورنر پنجاب مخدوم سجاد قریشی کے برادر نسبتی ہیں۔

سید عابدہ حسین کی شادی خانیوال کے قتال پور کے سید گھرانے کے فرزند فخر امام سے ہوئی۔ سیدہ عابدہ حسین اور فخر امام کی شادی سے پہلے خالہ زاد تھے۔ سید عابد حسین جو سیدہ عابدہ حسین کے والد تھے، صدا بہار وزیر رہے ہیں۔ انہوں نے سیاست میں بہت کم وقت اپوزیشن میں گزارا تھا۔ انہیں ۱۹۷۰ء میں جامعہ محمدی شریف اور سیال شریف کے مرید خاص غلام حیدر بھروانہ نے شکست دی تھی۔ فخر امام کے ایک اور کزن ڈاکٹر خاور بھی ۱۹۸۵ء سے رکن اسمبلی منتخب ہوتے آ رہے ہیں۔ لغاری خاندان کی رشتہ داریاں بھی پنجاب بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سردار فاروق لغاری کی پھوپھی سابق وزیر اعلیٰ پنجاب نواب افتخار حسین ممدوٹ کی بھاوج ہیں اور تحریک تکمیل پاکستان کے صدر ذوالفقار حسین ممدوٹ ان کے پھوپھا ہیں۔ سردار جعفر خان لغاری، سردار عمر خان لغاری اور سردار مقصود خان لغاری تینوں ایم پی ایز فاروق لغاری کے کزن ہیں۔ سابق گورنر پنجاب نواب آف کالا باغ بھی لغاری خاندان کے رشتہ دار تھے۔ ان کے بیٹے سردار فاروق خان لغاری کے برادر نسبتی ہیں۔ نواب آف کالا باغ ایئر مارشل نور خان کے ماموں تھے۔ ضلع اٹک کا ایک اور خاندان شمس آباد صدیوں سے سیاست سے وابستہ ہے۔ اس وقت اس کے قائد محمد اسلم آف شمس آباد ہیں۔ ملک محمد اسلم کی ریاست بہاولپور کے سابق نواب پنجاب کے سابق گورنر ریٹائرڈ محمد عباس عباسی مرحوم سے بھی رشتہ داری ہے۔ نواب عباس عباسی کے فرزند نواب صلاح الدین عباسی کی شادی ملک محمد اسلم کی بیٹی سے ہو چکی ہے۔ ملک محمد اسلم آف شمس آباد کے

قریبی رشتہ دار ملک محمد قاسم بھی ہیں۔

چوہدری ظہور الٰہی کا خاندان رشتہ داریوں کے اعتبار سے پنجاب کا انتہائی اہم خاندان بن چکا ہے اور اس خاندان کی رشتہ داریاں پنجاب بھر کے سیاسی و غیر سیاسی گھرانوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی وزیر آباد کے چوہدری ریاست علی چٹھہ کے سمدھی بھی تھے۔ اس طرح پیپلز پارٹی کے سابق ایم این اے اور ضلع سیالکوٹ پیپلز پارٹی کے سابق صدر خورشید عالم چیمہ بھی ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔

گجرات پیپلز پارٹی کے رہنما سرور جوڑا چوہدری ظہور الٰہی کے بھتیجے چوہدری تجمل حسین کے بہنوئی ہیں۔ عامر سلطان چیمہ جو کہ موجودہ حکومت میں صوبائی وزیر ہیں، بھی ان کے رشتہ دار ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی کے گھرانے کی رشتہ داری میانوالی کے روکڑی خاندان سے بھی ہو چکی ہے۔ چوہدری شجاعت حسین کے بھائی سینیٹر امیر عبداللہ خان روکڑی کے بھانجے اور سابق وزیر گل حمید خان کے داماد بنے ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی خاندان کی ایک رشتہ داری اٹک کے کھٹڑ خاندان سے بھی ہے جن کے سردار محمد صادق نے میاں نواز شریف کے خلاف عدم اعتماد کے دوران چوہدری پرویز الٰہی کی حمایت کی تھی اور مشاورت سے استعفیٰ دیا تھا۔

جہاں تک سابق گورنر ملک غلام مصطفیٰ کھر کی رشتے داریوں کا تعلق ہے تو تونسہ شریف کے سجادہ نشین خاندان کے سلمان تونسوی مصطفیٰ کھر کے بھانجے ہیں۔ سلمان تونسوی بھی رکن اسمبلی رہے ہیں۔ کھر برادران بھی سیاست میں نمایاں رہے ہیں کھر کے چھوٹے بھائی نور ربانی کھر بھی وزیر رہے ہیں۔

ان سیاسی خاندانوں میں سابق وزیر اعلیٰ متحدہ پنجاب سردار سکندر حیات کے بھائی سردار برکت حیات خان بھی ۳۸ _ ۱۹۳۶ء میں آئین ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ سکندر حیات کی ایک صاحب زادی محمودہ سلیم خان ایوبی دور میں وزیر نامزد کی گئیں۔ میر مقبول محمد بھی حیات خاندان سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ وہ لیاقت حیات کی بیوی کے چچا تھے۔ مقبول محمد بھی ۳۰ _ ۱۹۲۳ء تک کونسل کے رکن رہے۔ پھر ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۶ء میں اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے۔ سکندر حیات کے آخری دور میں وہ چیف پارلیمانی سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے اور تقسیم کے وقت تک وہ شاہی چیمبر کے سیکرٹریٹ کے ڈائریکٹر تھے۔ یہ

خاندان آپس میں رشتہ داریوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے بہت نزدیک تھے۔ ان کی صاحب زادی شوکت حیات کی بیوی ہیں۔ مقبول محمد کی ایک صاحب زادی سندھ کے سابق رہنما اور معروف سیاسی خاندان عبداللہ ہارون سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس طرح اس خاندان کی رشتہ داریاں پنجاب کے مختلف خاندانوں کے علاوہ کراچی کے ہارون خاندان بہاولپور کے ایس عثمان علی سے ہے۔

سرگودھا کے نون اور ٹوانہ خاندانوں کو اگر فیملی گروپ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اس خاندان کا بھی سیاست میں اہم کردار رہا ہے۔ ٹوانہ خاندان کے بیشتر افراد لاہور، لندن کراچی اور اسلام آباد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ایوبی دور میں حق نواز ٹوانہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے بدنام سمگلر قاسم بھٹی نے عدالت کے روبرو بیان دیا تھا کہ انہیں نواز ٹوانہ کی سرپرستی حاصل رہی ہے جس کے عوض انہیں بھاری رقم دیا کرتا تھا میاں ممتاز دولتانہ کے انکل چوہدری شہاب الدین اور احمد یار دولتانہ نے سیالکوٹ کے ایک جٹ خاندان میں شادی کی تھی۔ شہاب الدین ۱۹۲۳ء تک کونسل کے ممبر رہے۔ یہ ۱۹۲۷ء میں کونسل کے صدر بھی رہے۔ انہیں ایک مختصر عرصے کے لئے وزارت بھی دی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں یہ دوبارہ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے اور ایک نئے آئینی ڈھانچے کے لئے ۱۹۳۷ء میں انہیں اسمبلی کا اسپیکر نامزد کیا گیا تھا۔

چوہدری شہاب الدین کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی، لہٰذا انہوں نے میاں ممتاز دولتانہ کو بیٹا بنا لیا تھا جو اب بھی چوہدری شہاب الدین کے گھر رہتے ہیں۔ اپنے ماموں کے رشتہ سے ممتاز دولتانہ کی کئی ممتاز شخصیتوں سے رشتہ داری ہے جن میں سرحد کے یوسف خٹک، گوجرانوالہ کے چوہدری صلاح الدین چٹھہ خاص کر نمایاں ہیں۔

اٹک کے کھٹڑوں کی رشتہ داریاں بھی پنجاب بھر میں پھیلی ہوئی ہیں سر محمد نواز جو ممدوٹ وزارت میں نائب وزیر رہے ہیں، نواب آف کالا باغ کے قریبی رشتہ دار تھے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل پاکستان پیپلز پارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں ایک انقلابی منشور کا اعلان کیا تھا جس میں پیپلز پارٹی نے جاگیرداری نظام کے خاتمے کا بھرپور عزم کیا لیکن۔ برسراقتدار آنے کے بعد پیپلز پارٹی نے جو زرعی اصلاحات نافذ کیں، وہ در حقیقت پارٹی منشور کے مطابق نہیں تھیں۔ ان اصلاحات کے تحت پیپلز پارٹی نے بڑے

جاگیرداروں کے مفادات کو ٹھیس پہنچائے بغیر عوامی اصلاحات کا سہرا اپنے سرباندھنے کی کوشش کی تھی۔ آج بھی قوم کوشش کے باوجود ان جاگیرداروں سے نجات حاصل نہیں کر سکی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ جاگیردارانہ کلچر کی بنیادیں اتنی مضبوط ہیں کہ انہیں ہلایا نہیں جا سکتا۔ اگر ہم انتخابی تناظر میں دیکھیں تو ۱۹۱۶ء میں پنجاب میں نئی انتخابی حلقہ بندی کے تحت کونسل کے لئے ۹۳ ممبر منتخب کئے گئے اور مزید سات کا انتخاب مخصوص نشستوں کے تحت عمل میں آیا۔ ان ۹۳ نشستوں میں سے بیس نشستیں غیر مسلموں کے لئے مخصوص تھیں۔ ہندوستان کے وہ مسلم علاقے جو اب پاکستان کے حصہ میں ہیں، ان علاقوں میں انیس نشستیں دریائے راوی اور ستلج کے مشرق میں چندرہ اضلاع میں واقع تھیں۔ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۶ء، اور ۱۹۳۰ء میں کونسل کے الیکشن ہوئے۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت کونسل میں ارکان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ انیس نشستیں مسلمان زمینداروں اور بلوچ سرداروں کے لئے تھیں۔

صرف اکیاون نشستیں دیگر مختلف لوگوں کے لئے مخصوص تھیں۔ لاہور کے جنوب اور گوجرانوالہ سے ہر انتخاب میں دو مختلف خاندانوں کے افراد جیت جاتے تھے لیکن بعد کے دو کامیاب ہونے والے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چوتھے الیکشن میں صرف چار ممبر گجرات کے چوہدری فضل الٰہی۔ شاہ پور کے ملک سر فیروز خان نون، ملتان کے مخدوم محمد سید رضا شاہ گیلانی اور بلوچ نشست پر سر محمد جمال لغاری منتخب ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مزید سات اراکین تین بار منتخب ہوئے۔ البتہ چار بار منتخب ہونے والوں کے لئے ضروری نہیں تھا کہ ہر مرتبہ اسی نشست پر منتخب ہوں۔ باقی تیرہ ارکان مزید دوبار ایک ہی نشست سے منتخب ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۵۸ء کی پارلیمانی حکومت کے اختتام تک پنجاب کے ان زمینداروں کی فہرست میں باغبانپورہ کے ارائیں میاں سر محمد شفیع، میاں محمد شاہنواز، بیگم شاہ نواز، میاں افتخار الدین، میاں بشیر احمد، موکل خاندان کے سردار حبیب اللہ، سردار رشید اور ضلع لاہور کے قزلباش، چشتیہ خاندان کے ریاست علی، صلاح الدین، نصیر الدین، دارا پور کے جنجوعہ طالب مہدی خان، خیر مہدی خان، پراچے، شاہ پور جہانیاں کے پیر سید غلام محمد، شاہ جیونہ کے سید مبارک اور سید عابد حسین، جلال پور پیر والا ضلع ملتان کے دیوان غلام

عباس، مظفر گڑھ کے سردار عبدالحمید دستی، میاں مشتاق گورمانی، میاں غلام جیلانی گورمانی۔ چیچہ وطنی کے رائے اقبال عارف والا کے رانا عبدالحمید۔ جھنگ کے سیال نوازش علی، ملتان کے دولتانہ اور گیلانی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۸ء تک اسمبلی کی آٹھ نشستوں پر قابض رہے ہیں۔

مندرجہ بالا خاندان کونسل کے انتخاب میں ۸۴ میں سے ۴۲ نشستوں پر قابض تھے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں بھی ۱۱۶ نشستوں میں سے ۵۳ نشستوں پر قابض تھے۔ یونسٹ پارٹی کے بانی اور اس تحریک کے رہنما میاں فضل حسین ان خاندانوں کے پس پردہ سرگرم عمل تھے۔ ۱۹۲۱ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے تحت فضل حسین مسلمان زمینداروں کی نشست پر آئین ساز کونسل کے رکن منتخب ہو گئے تھے DY ARCHY نظام کے تحت گورنر نے دو وزیروں کا انتخاب کیا جس میں ایک سر فضل حسین اور دوسرے دہی علاقہ کے ہندو لالہ ہرکشن لال تھے۔

سر فضل حسین کا خاندان اسمبلی کی سیاست میں زیادہ عرصے تک اپنی نشست پر قرار نہ رکھ سکا۔ ان کے ایک بیٹے عظیم ہندوستان کے محکمہ خارجہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور ان کے خاندان کے کئی افراد ایوب دور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ میاں ارشد حسین وزیر خارجہ بھی رہے ہیں۔ سر عبدالقادر کے صاحب زادے شیخ منظور قادر پاکستان کے وزیر قانون، چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے انتخابات کی ۵۸ نشستوں میں سے ۵۳ نشستوں پر انہی خاندانوں کے افراد منتخب ہوئے تھے۔ چوہدری سر محمد ظفر اللہ کے بھائی چوہدری اسد اللہ کو احمدی ہونے کی وجہ سے شکست ہو گئی تھی۔ موکل فیملی کے سردار حبیب اللہ کو میاں افتخار الدین کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی۔ راجہ غضنفر علی خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے لیکن فوراً پارٹی چھوڑ کر دوبارہ یونیسٹ پارٹی میں چلے گئے تھے اور انہیں پارلیمانی سیکرٹری بنا دیا گیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں جب سر فضل حسین دہلی سے واپس لاہور آئے تو انہوں نے سب سے پہلے یونیسٹ پارٹی کی تنظیم نو پر خصوصی توجہ دی۔ وہ پارٹی میں مختلف عناصر کی گروہ بندیوں سے باخبر تھے۔ لہٰذا انہوں نے اسے ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ سکندر حیات بمبئی ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے تھے لیکن ان کے معاون نواب مظفر

خان میر مقبول محمد اور احمد یار خان دولتانہ صرف انہی کی وجہ سے سیاست میں سرگرم تھے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں ۵۸ نشستوں میں سے ۷ نشستوں پر مسلم لیگ اور یونسٹ جماعت کے امیدوار کی حیثیت سے انہی جاگیرداروں نے کامیابی حاصل کی تھی۔ ان میں نو یونیسٹ اور سترہ مسلم لیگی اور ایک آزاد تھے۔ ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والوں میں ان خاندانوں اور ان کے ہم نواؤں کی اکثریت تھی۔ سات رکنی کابینہ میں جاگیر دار گھرانوں کی بھرپور نمائندگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواہ کتنے ہی سیاسی سسٹم تبدیل ہو جائیں، یہ جاگیردار پاکستان کی سیاست کے روشن ستارے ہیں۔

ایوبی دربار میں جاگیرداروں اور بیوروکریسی کی ادائیں

پنجاب جاگیردارانہ سیاست کا مرکز رہا ہے۔ اکثر جاگیرداروں کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ برسراقتدار طبقے کی آنکھوں کا تارہ بنے رہیں۔ ان کے نزدیک سیاست تاش کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اقتدار میں رہنے کے لئے یہ نت نئی چالیں چلتے رہے ہیں اور برسراقتدار طبقے کو بلیک میل کر کے ان کی حکومتوں کے عروج و زوال کا باعث بھی بنتے رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد جب میاں ممتاز دولتانہ اور وزیر اعلیٰ افتخار حسین ممدوٹ کے درمیان تخت نشینی کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی تو لیاقت علی خاں (جو اس وقت وزیر اعظم تھے) کو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس جنگ کے ہم نوا اکثر ایم۔ ایل۔ ایز نے دونوں کو اپنی تائید و حمایت کا یقین دلاتے ہوئے حلف ناموں پر دستخط کر رکھے تھے۔ ان میں سے اکثریت پاکستان کے انہی جاگیرداروں کی تھی جن کے خانوادے آج بھی کسی نہ کسی صورت میں اقتدار کی مسند سے منسلک ہیں۔ ان جاگیرداروں نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے بیوروکریسی سے بھی گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ لیاقت علی خان سے وزیر اعظم میاں نواز شریف تک سیاست کا کھیل اور اس میں حصہ لینے والے کھلاڑی وہی ہیں۔ احتساب تو حکمران ناپسندیدہ سیاسی عناصر کا اقتدار سے دور رکھنے کے لئے کرتے ہیں۔

یہی وہ جاگیردار سیاست دان ہیں جنہوں نے لیاقت علی خان کو قائد ملت، محترمہ فاطمہ جناح کو خاتون پاکستان، ایوب خان کو فخر ایشیا، بھٹو کو تیسری دنیا کا عظیم رہنما، ضیاالحق کو امیرالمومنین، محمد خان جونیجو کو جمہوریت کا چیمپئن، بے نظیر کو دختر مشرق اور میاں نواز شریف کو شیر پاکستان بنا دیا۔

خرابی کی بنیاد یہ ہے کہ ہم خود غلط لوگوں کے ہاتھ میں چلے گئے اور ایسے لوگوں کے

آلہ کار بن گئے جو اپنے موجودہ منصب کے اہل نہ تھے۔ جو سیاستدان مسلم لیگ کی پر شکن عوامی تحریک کے باعث قائداعظم" کے قریب گردش کر رہے تھے، ان کی اکثریت اس قیادت کی اہل نہ تھی اور حضرت قائداعظم" نے انہیں کھوٹے سکوں کے نام سے یاد کیا تھا۔ قائداعظم" کے وارث بننے والے جاگیردار اس عظیم انقلاب کو نہ سنبھال سکے۔ پہلے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی پھر باہم گیر تو تکار کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اپنی قبیلوی لڑائی یا غرضی فساد کے باعث بیورو کریسی کے لئے جگہ خالی کر گئے جن کی ذہانت اور سازش کے سامنے ان کا وجود حرف معطل تھا۔ ملکی سیاسیات کے تاریک ہونے کا دور اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب جاگیردارانہ قیادت نے سرکاری ملازموں کو اپنا شریک اقتدار کیا اور اسی بیورو کریسی نے سیاستدانوں کو ایسا رسوا کیا کہ ان کے سامنے ان کا وجود بھیگی بلی کی طرح ہو گیا اور اس نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے سیاستدانوں کو وزارتوں کی مسند پر لڑا دیا۔ وزارتی کشمکش کی بساط پر جو کچھ ہوتا رہا، وہ ہماری سیاست کا ایک افسوسناک باب بن گیا ہے۔

12 مارچ 1957ء کو خان افتخار خان ممدوٹ نے اسمبلی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے تسلیم کیا کہ صوبائی حکومت نے وزیر مواصلات سید عابد حسین اور ان کی اہلیہ محترمہ کی مملوکہ 49 مربعے 14 ایکڑ 5 کنال اور 7 مرلہ زمین کو گھوڑوں کا فارم قرار دے کر زرعی اصلاحات سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اس سے پہلے نواب افتخار ممدوٹ نے سات مارچ 1957ء کو بیگم طاہرہ آغا کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ ایک ہزار ساٹھ مربعے زمین 42 ایم ایلوں کو مختلف المعیا دپٹہ پر دی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر بڑے بڑے زمیندار ہیں اور بعض اپنی آمدنی کے دوسرے ذریعے بھی رکھتے ہیں مثلاً پیر آف کمشٹر کو 378 ایکڑ، شیخ ظفر حسین کو 302 ایکڑ چوہدری فیض احمد کو 200 ایکڑ خان محمد اشرف خان کو 185 ایکڑ ملک نور محمد کھوکھر کو 183 ایکڑ چوہدری عبدالحمید کو 172 ایکڑ میر عبداللہ خان کو 32 مربعے اور میر رسول بخش سیال کو 8 مربعے زمین دی گئی۔

سندھ کے علاقے میں سردار علی گوہر خان کے پاس 132 مربعے، سردار خان بزور کے پاس 21 مربعے، میر محمد یوسف کے پاس 145 مربعے، پیر عبدالستار کے پاس 80 مربعے، میر تیغ شیر حزاری کے پاس ہزاروں مربعے ہیں جو ان کے قبضہ میں 1901ء سے چلے

آئے ہیں۔ نواب قطب الدین صاحب کو 41 مربعے اور نواب زادہ نصراللہ خان کو 57 مربعے زمین 20 اور 30 سال کے پٹے پر دی گئی۔ نواب صاحب نے مزید فرمایا کہ ری پبلکن پارٹی نے یہ زمین نہیں دی بلکہ اس کی پیشرو مسلم لیگی وزارت نے حلوائی کی دکان سے نانی جی کی فاتحہ پر یہ لڈو تقسیم کئے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ لوٹ مار اور جائیدادوں پر قبضے مسلم لیگی جاگیرداروں اور مسلم لیگ سے باغی ہو کر ری پبلکن میں جانے والے جاگیرداروں نے کئے ہیں۔ جن لوگوں میں یہ زمینیں تقسیم کی گئی تھیں، ان کا ضمیر اس وقت گواہی ضرور دیتا تھا کہ انہیں یہ زمینیں استحقاق کی بنیاد پر نہیں بلکہ گروہی اختلافات میں وفاداریاں نبھانے کے صلے میں ملی ہیں

مارشل لا سے قبل جب نواب مظفر علی قزلباش وزیر اعلیٰ تھے تو ایک شرارتی اخبار نویس نے یہ خبر چلا دی کہ حکومت بدعنوان سیاست دانوں کا محاسبہ کرنے پر غور کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا "میں اس بات کو پسند کروں گا کہ قومی زندگی اور ملکی سیاست سے بد دیانتی کا قلع قمع کرنے کے لئے پارلیمینٹ ایسا قانون پیش کرے جس کی رو سے ایک کمیشن مقرر ہو جو اس بات کا پتہ لگائے کہ 1947ء کے بعد سیاسی راہنماؤں، آئے گئے وزیروں اور سرکاری افسروں نے کتنی دولت پیدا کی ہے؟ پہلے ان کا اثاثہ کیا تھا؟ اب وہ کتنی دولت کے مالک ہیں؟" مسٹر قزلباش نے کہا کہ اگر اس قسم کا کمیشن قائم کیا گیا تو وہ پہلے شخص ہونگے جو کمیشن کو اپنا حساب پیش کریں گے۔

20 اگست 1957ء کو مسلم لیگ کے صدر خان قیوم خان نے جو اس وقت صوبائی اسمبلی کے رکن بھی تھے، ایبٹ آباد کے ایک جلسہ عام میں اس تجویز پر اظہار خیال کرتے ہوئے نواب مظفر علی قزلباش کو چیلنج کیا کہ وہ اسمبلی کے اجلاس میں توسیع کر کے تقرر کا بل پیش کریں۔ یہ کمیشن موجودہ کابینہ، نائب وزراء، اسمبلی کے ارکان، اعلیٰ سرکاری افسران اور ری پبلکن کے حامیوں اور ان کے ___ اعزہ کی ___ ناجائز طور پر جمع کی ہوئی دولت کا جائزہ لے کیونکہ اس کی رائے میں ایسے داغدار افراد صرف ری پبلی کن پارٹی میں ہی شامل ہیں۔ کمیشن کی اس خبر کے ساتھ ہی حکمران جماعت میں شامل اور مسلم لیگی جاگیردار کچھ گھبرائے گھبرائے نظر آئے۔ اخباری بیانات تک تو یہ بحث چلتی رہی لیکن حکمران جماعت اور مسلم لیگ دونوں میں سے کسی کو بھی احتساب کا عمل شروع کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ یہ

حقیقت تھی کہ احتساب میں سب سے پہلے انھی بیان باز جاگیرداروں کا کس بل نکلا جن کی خبریں احتساب کی حمایت میں صفحہ اول پر شائع ہو رہی تھیں۔ بہر کیف جانبین کے انوار خطابت سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ملک میں سیاسی رہنماؤں، وزیروں اور سرکاری افسروں کی ایسی کھیپ موجود ہے جن کی دولت 1947ء کے بعد ناجائز وسائل اور اختیاری ہتھکنڈوں سے جمع ہوئی ہے۔ اعتراف دونوں سیاسی گروپوں کو تھا اور احتساب سے دونوں گریز کرتے تھے یعنی مسودۂ قانون پیش کرتے ہوئے دونوں ہچکچا رہے تھے۔ خان عبدالقیوم بھی جانتے تھے کہ لوٹ کب شروع ہوئی اور 1947ء کے بعد کتنے نو دولتیے پیدا ہوئے۔ قزلباش کو بھی چوروں کا حلیہ معلوم تھا۔ نوائے وقت نے لکھا تھا کہ "ری پبلکن پارٹی میں جو لوگ بے تحاشا آگھسے ہیں، وہ اسی شجر ممنوع کا پھل ہیں جس کی شاخوں سے ہر سیاسی عیب کی کونپلیں پھوٹی ہیں۔"

اس دور میں قومی پارلیمنٹ اور صوبائی مقننہ میں بہت کم ایسے لوگ تھے جو اپنے دامن کی پاکیزگی کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ عوام کو بھی ان کی دولت کے ایک ایک ذریعہ کا علم تھا۔ ان کی زبان پر وقت نے چپ کی مہریں لگا دی تھیں۔ عوام چوروں کو جانتے تھے اور وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ ان کو پکڑ نہیں سکتے تھے عوام جانتے تھے کہ سیاسی کشمکش کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جن محرکات کا اس ڈرامہ کی تشکیل میں حصہ ہے، وہ تمام تر حصول اقتدار کی لڑائی ہے۔ ان لوگوں نے سیاست کے نام پر ہر ناٹک رچایا۔ ایک ہی وقت میں وہ لوگ ہیروؤ اور ولن کا پارٹ ادا کرتے رہے اور یہ جاگیردار سیاست دان ملک و قوم کو ایک ایسے تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے جو محض فلمی دھنیں سننے کی خاطر فری پاس لے کر سینما ہال میں چلا جاتا ہے جس کا اپنا کوئی نقطہ نظر نہیں ہوتا اور وہ زندگی کو "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا خلاصہ سمجھتا ہے۔

انھی لوگوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا کہ انتخابات مجروح یا معلق ہوتے رہے اور خود انتخابات کی نت نئی راہیں تراش کر پھر حکومت سے چمٹ گئے۔ انہوں نے ملکی قانون کو جیبی گھڑی اور ملکی امن کو ہاتھ کی چھڑی سمجھ رکھا تھا۔ انہیں 1911ء کے جارج پنجم کی تخت نشینی کے موقعہ پر شاہی دربار میں کرسی حاصل کرنے کے لئے جس طرح کوششیں کرنا پڑی تھیں، اقتدار میں رہنے کے لئے وہ اس سے زیادہ کوششیں کرنے لگے تھے اور ملک کی

سیاست کو انہوں نے اپنے ڈرائنگ روموں میں بند کر دیا تھا۔

حصول اقتدار کا یہ دلچسپ ڈرامہ جس طرح سازشی ماحول میں ہو رہا تھا عوام سیاستدانوں سے کیا سیاست سے ہی نفرت کرنے لگے تھے۔ ایوب خان کو سیاستدانوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے سیاسی بالیوں کے کچھ قانون بھی بنانے پڑے۔ جاگیردار سیاستدانوں کے سیاسی اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے انہوں نے زرعی اصلاحات کے نام سے ان کی جاگیروں کو ہتھیانے کا منصوبہ بنایا جس میں مٹھی بھر لوگ پاکستان کی زمینوں پر قابض ہونے کی وجہ سے سیاست پر بھی اپنا حق سمجھ بیٹھے تھے، اور انہوں نے ملک کو جتنا نقصان پہنچایا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ انہیں سیاست سے کنارہ کش کر دیا جائے۔ یہ چوٹ زرعی اصلاحات کی صورت میں لگ سکتی تھی خضر حیات ٹوانہ کے پاس اس وقت 16 ہزار ایکڑ اراضی تھی۔ 1959ء میں ان کی آمدن تیس چالیس لاکھ سالانہ تھی۔ زرعی اصلاحات کے بعد بڑے بڑے جاگیرداروں کی کمر ٹوٹ گئی پنجاب کے چھ ہزار جاگیردار پانچ سو ایکڑ یا اس سے زائد زمین کے مالک تھے۔ جب زرعی اصلاحات کی زد ان پر پڑی تو ان میں سے 571 زیر کفالت خواتین کو چھ ہزار پیداواری یونٹ دینے پر تیار ہو گئے۔ 47 زمینداروں نے مویشی پالنے کے لئے زیر استعمال رقبے کو اپنے پاس بدستور رکھنے کی درخواست دی اور 27 زمینداروں نے گھوڑی پال اراضی کے استثنیٰ کی اجازت کے لئے درخواستیں دائر کیں۔ زرعی اصلاحات کے دوسرے مرحلے میں جب اراضی کمیشن نے ان زمینداروں کی درخواستوں کی جانچ پڑتال کی تو حکومت کو خطرہ ہوا کہ یہ جاگیردار دولت کے بل بوتے پر محکمہ مال سے انتقال اراضی کروالیں گے۔ حکومت نے صوبہ بھر میں انتقال اراضی پر پابندی عائد کر دی۔ اس پابندی کے باوجود صوبے بھر کے زمینداروں نے محکمہ مال کے کاغذات میں غلط اندراج کروالیا آخری مرحلے میں سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ خواتین کو ہبہ کرنے، مویشی پالنے کے لئے زیر استعمال رقبہ کو اپنے پاس رکھنے اور باغات کے لئے مقررہ حد تک مزید زمین رکھنے کی درخواستوں سے نپٹنا تھا۔ پہلے سال تک صرف چھ زمینداروں کو گھوڑے اور بھیڑیں پالنے اور بیس زمینداروں کو باغات لگانے کی اجازت دی۔ اس طرح مغربی پاکستان کے 35 اضلاع میں زرعی اصلاحات کے تحت 21 لاکھ 54 ہزار 537 ایکڑ

فاضل اراضی حاصل ہوئی حکومت کا دعویٰ تھا کہ اس سے 21,45,825 مزارعین مستفید ہونگے۔ اس اراضی میں زیر کفالت رقبہ 5,490، خود کاشت اراضی 46000 ایکڑ، قابل کاشت افتادہ اراضی 11,47,807 ایکڑ، دریا برد اراضی 84,654 ایکڑ پہاڑی رقبہ 59,337 ایکڑ اور متفرق رقبہ 1,93,131 ایکڑ تھا۔ کمیشن کا خیال تھا کہ زمین کی حد مقرر کرنے سے سیاسی اور اقتصادی استحصال ختم ہو جائے گا۔ کمیشن کے ایک رکن اور موجودہ صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان نے زرعی اصلاحات کو جس طریقے سے چلایا جا رہا تھا اختلاف کرتے ہوئے کہا "ہمارے ہاں زمین پر آبادی کا دباؤ زیادہ ہے۔ اس لئے زمین کو چند ہاتھوں میں محدود کرنے سے دو طبقے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے ہر فرد کو ترقی کے مواقع مہیا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زمین پر اجارہ داری ختم کر دی جائے اور زمین کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں دیا جائے۔" انہوں نے باغات کے لئے ڈیڑھ سو اور زیر کفالت خواتین کو چھ ہزار یونٹ تک اراضی ہبہ کرنے کی بھی مخالفت کی ان کے خیال میں بڑے بڑے زمینداروں کے طبقے بدستور قائم رہیں گے انہوں نے اپنے اختلافی نوٹ میں مثال دیتے ہوئے کہا کہ اگر ایک زمیندار کے پاس تین ہزار ایکڑ اراضی ہے اور اس نے ایک ہزار ایکڑ دو حصوں میں تقسیم کر دی اور ایک ہزار ایکڑ اپنے پاس رکھ لی تو اس ملکیت پر حد کے بعد نہ صرف وہ بلکہ اس کے بیٹے بھی آگے اپنی اراضی کو بطور تحفہ دے کر اصلاحات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

ملک میں 500 ایکڑ یا ایک ہزار ایکڑ اراضی کے مالکوں کی تعداد چھ ہزار تھی اور ان کے قبضے میں 74,90,933 ایکڑ رقبہ تھا۔ حکومت کے دعوے کے مطابق بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں سے حاصل شدہ اراضی 21,54,537 ہے۔ اس طرح یہ زمین بھی انہی کے قبضے میں بدستور رہے گی۔ بڑے بڑے زمینداروں میں فیروز خان نون کے پاس 1251 ایکڑ تھی جن کے 64250 پیداواری یونٹ تھے۔ اس میں سے 1129 ایکڑ اور 121 ایکڑ رقبے پر مشتمل ایک باغ رکھنے کی اجازت دے دی۔ ملک امیر محمد آف کالا باغ کے پاس 11975 ایکڑ تھی انہیں اپنے پاس 6191 اور 150 ایکڑ باغ کے لئے اجازت دے دی۔ اس طرح 7634 ایکڑ اراضی زرعی اصلاحات کی زد میں آئی۔ سب سے بڑی زد ڈیرہ غازی خاں کے تمن داروں پر پڑی۔ ان بڑے بڑے زمینداروں میں میر بلخ شیر

مزاری، بیگم خورشید بلخ مزاری، طارق محمود خان مزاری، زاہد محمود خان مزاری، ریاض محمود خان مزاری، سردار شیر باز مزاری، صفدر مرزا خان مزاری، سردار مجم خان، سردار جلال الدین خان، سردار غوث بخش خان، سردار ولی محمد خان، بیگم خورشید بلخ مزاری، طارق محمود خان مزاری، زاہد محمود خان مزاری، ریاض محمود خان، مزاری، بدر النسا مزاری، شرین مہر النسا مزاری، درشہوار مزاری، سردار انور رحمان مزاری، سردار رفیق الرحمان مزاری، شمین اعظم خان مزاری، امین خان مزاری، سردار بچہ دریشک، سردار بہادر خان دریشک، سردار محمد افضل خان دریشک، سردار محمد رمضان، سردار الٰہی بخش خان، سردار کرم الٰہی خان، سردار واحد بخش خان، سردار عطا محمد خان لغاری، سردار محمد علی خان لغاری، سردار احمد علی خان، سردار غلام علی خان، سردار تکیہ خان، سردار اعظم خان، نواب محمد جمال خان لغاری، سردار محمد خان لغاری، سردار محمود خان، شاہد بیگم، تاج محمد کھوسہ، ذوالفقار خان کھوسہ، سردار حیدر خان گورچانی، محترم عفیفہ بیگم، دختر سر نواب جمال خان لغاری جو ان اصلاحات کی زد میں آگئے ڈیرہ غازی خان کے تمن دار 1800 سے لے کر آج تک سیاست پر ہمیشہ نمایاں رہے ہیں۔ ان کی سیاسی قوت کو ایوب خان نے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں مکمل کامیاب نہ ہو سکے۔

کیمبل پور سے سردار محمد نواز خان زمیندار کوٹ فتح خان نے اصلاحات کی زد سے بچنے کے لئے اپنی والدہ، چار لڑکیوں اور ایک نواسے کو زمین تحفہ میں دینے کی درخواست کی جو منظور نہ ہوئی اس طرح انہیں اپنی ہزاروں یونٹ اراضی سے دستبردار ہونا پڑا۔ ملک محمد خاں کھنڈا نے بھی اپنی اہلیہ دو دختروں کو بھی زمین ہبہ کرنے کی درخواست دی جو مسترد کر دی گئی اور انہیں 9,356 ایکڑ زمین سے محروم ہونا پڑا۔ ملک خاکی جان آف کھنڈا کو چھ ہزار چوبیس ایکڑ تین کنال تین مرلہ اراضی سے محروم ہونا پڑا۔ ملک خاکی جان کا شمار بہت بڑے زمینداروں میں ہوتا رہا ہے۔ ضلع کی سیاست کا بھی مرکز و محور تھے۔ ملک اللہ یار خان ان کے فرزند ہیں ایوب، بھٹو اور ضیاء دور حکومت میں نہ صرف ایم پی اے منتخب ہوئے بلکہ وزیر بھی رہے۔

نوابزادہ سرفراز حسین آف پنڈی گھیب جو کہ سابق ایم پی اے رہے تھے، ان کے 61,655 یونٹ رقبہ زرعی اصلاحات کی زد میں آیا۔

ملک محمد حیات ٹمن جو ہر حکومت کا ہراول دستہ رہے ہیں، ان کا بھی 71356 یونٹ رقبہ اصلاحات سے نہ بچ سکا۔

خان آف مکھڈ شیر احمد خان، ان کے دو بھائیوں سردار سیف اللہ خان اور سردار امیر قمرالزمان خان 7759 ایکڑ زمین سے محروم ہو گئے۔ مسماۃ بھاگ بھری بیوہ نواب ملک عطا محمد خان آف کالاباغ کو 264 ایکڑ، سید فدا حسین شاہ آف کیمبل پور کو 157 ایکڑ اور ملک محمد اکبر خان آف شمس آباد کو 95 ایکڑ رقبہ سے مرحوم ہونا پڑا۔

سید عابد حسین آف جھنگ اور ضلع کے دوسرے تیرہ زمینداروں کی ان درخواستوں کو مسترد کر دیا تھا جس کے تحت سید عابد حسین اپنی والدہ کے نام چھ ہزار یونٹ منتقل کرنے کی اجازت چاہتے تھے کیونکہ سید عابد کی والدہ کے پاس پہلے ہی زمین تھی۔ اس سلسلے میں وہ ان کی محتاج نہیں تھی۔

لغاری خاندان کا یہ دعویٰ بھی گورنر اختر حسین نے مسترد کر دیا تھا کہ فورٹ منرو کا علاقہ ان کا ہے کیونکہ یہ علاقہ ضلع میں چھ ہزار تین سو فٹ بلند صحت افزا مقام ہے اور یہ ضلعی صدر مقام ہے۔ لغاری خاندان اس علاقے پر تقسیم پاکستان سے پہلے تک اپنے استحقاق کا دعویٰ کرتا آیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ماضی کی حکومتوں پر دباؤ بھی ڈالتے رہے ہیں کہ یہ علاقہ ان کو دیا جائے۔

ضلع لاہور سے نو بڑے زمیندار متاثر ہوئے تھے۔ ان میں نواب مظفر علی قزلباش کو چھ سو ایکڑ بشمول ڈیڑھ سو ایکڑ باغ اپنے پاس رکھنے کے بعد 4443 فاضل اراضی سے دستبردار ہونا پڑا۔

میاں افتخار الدین نے ضلع مظفر گڑھ اور رائے ونڈ میں اپنی 2160 اراضی ظاہر کی تھی انہوں نے 5 سو ایکڑ اور 150 ایکڑ باغ کے لئے اپنے پاس رکھنے کے بعد باقی حکومت کے حوالے کر دئے۔ اس طرح صرف ضلع لاہور میں 6369 ایکڑ اراضی زرعی اصلاحات کے ذریعے حکومت کو ملی تھی۔ ساہیوال سے 12640، ملتان سے 65595، فیصل آباد 2436، شیخوپورہ 4375، گوجرانوالہ 580، سیالکوٹ 185، مظفر گڑھ 14374، ڈیرہ غازی خان 204861، راولپنڈی صفر جہلم 67، گجرات 16562، سرگودھا 14575، کیمبل پور 71629، میاں والی 48480، ایکڑ اراضی حکومت کو حاصل ہوئی تھی۔

پنجاب میں دیگر زمینداروں سے جو اراضی حاصل ہوئی ان میں مشتاق گورمانی 4800 ایکڑ زمین کے مالک تھے اور صرف 180 ایکڑ حکومت کے حوالے کی۔

چوہدری محمد زبیر سندھیلہ کے پاس شیخوپورہ میں 893 ایکڑ تھے جن میں سے 369 ضبط کر لئے گئے۔

ملتان کے سید علمدار حسین شاہ گیلانی کے پاس 4833 ایکڑ تھے جن میں سے 4278 ایکڑ حکومت نے لے لئے۔ دیوان غلام عباس 3664 ایکڑ کے مالک تھے، پندرہ سو ایکڑ عطیہ کے طور پر دے دی۔ 1310 ایکڑ پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔

کرنل عابد حسین کے پاس 3050 ایکڑ اراضی تھی ان میں 447 ایکڑ عطیہ کے دے دیئے گئے۔ 2110 ایکڑ گھوڑی پال سکیم کے تحت مل گئے۔ 642 ایکڑ حکومت نے لے لی اور 749 ایکڑ ان کے پاس رہ گئے۔ حق نواز گنڈاپوری کے پاس کل رقبہ 3035 ایکڑ تھا۔ ان میں عطیہ کے طور پر 713 ایکڑ دیئے گئے صرف 91 ایکڑ رقبہ ضبط ہوا۔

سردار محمد خان لغاری کے پاس کل رقبہ 4113 ایکڑ تھا۔ 1278 ایکڑ ضبط ہوئے۔

سردار جمال خان لغاری کے پاس 26 ہزار ایکڑ اراضی تھی اور ان کے بیٹوں کے پاس 16,16 ہزار ایکڑ اراضی تھی۔

زرعی اصلاحات میں ایک زمیندار کی حد ملکیت زیادہ سے زیادہ پانچ سو ایکڑ نہری اور ایک ہزار ایکڑ بارانی رکھی گئی تھی جس کا مطلب بیس مربع زمین نہری اور چالیس مربع زمین بارانی تھی۔

زرعی اصلاحات کا اعلان ایک ایسا کارنامہ تھا جس پر پاکستان کے غریب عوام جو زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم اور سیاسی استحصال کا شکار چلے آ رہے تھے، محسوس کرنے لگے کہ وہ ان کے سیاسی تسلط سے ایک بار آزاد ہو جائیں گے زرعی اصلاحات کی چوٹ نے ان وڈیروں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور ان اصلاحات سے لغاری، مزاری، قیصرانی، مخدوم، گیلانی دولتانے گورمانی، کالاباغ کے نواب، کیمبل پور کے جاگیردار، ٹوانے، نون قزلباش، ممدوٹ، میاں رانے، جاٹ، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ایوب خان نے ان پر دوسری ضرب سیاسی نااہلیوں کی صورت میں لگائی انہوں نے

سیاستدانوں کو بے اثر کرنے کے لئے اور انہیں عوامی عہدوں سے باہر رکھنے کے لئے دو قوانین نافذ کئے۔ ایک پروڈا اور دوسرا ایبڈو۔ اس کے تحت سیاستدانوں پر چارج شیٹ لگائی جاتی اور اس کی بنیاد پر انہیں کہا جاتا کہ اگر وہ رضا کارانہ طور پر 31 دسمبر 1966ء تک سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو جائیں تو آپ کے خلاف اور آپکی بدعنوانیوں کی مزید تحقیق نہیں ہو گی اور نہ ان کی تشہیر ہو گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی صف اول کی قیادت جن کا تعلق جاگیردار گھرانوں سے تھا، بدنامی کے خوف سے سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو گئی۔

اس طرح ایوب خان کے سامنے ایک کھلا سیاسی محاذ تھا اس کا کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ کاروبار سیاست چلانے کے لئے کب تک بیورو کریسی کے سہارے چلتے۔ جن سیاستدانوں کو انہوں نے بدعنوان کہا تھا، ایوب خان کو انہیں کے سہارے کی ضرورت تھی۔ لیکن جاگیرداروں کے دلوں میں گرہ پڑ چکی تھی۔

اس طرح ایوب خان نے کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اپناتے ہوئے ان جاگیرداروں سے روابط بڑھا لئے۔ جب ایوب خان نے کنونشن لیگ کی بنیاد رکھی تو پنجاب کے جاگیردار ان کے ہاتھ مضبوط کرنے میں لگ گئے۔

پنجاب کا کوئی سرکردہ جاگیردار گھرانہ ایسا نہیں تھا جو ایوبی لیلیٰ اقتدار سے وابستہ نہ ہوا ہو۔ ایوب خان کی شہرت جب بام عروج تک پہنچی اور ہر سو ایوب خان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے تو یہ درباری گویوں کی طرح ایوب خان کی قصیدہ خوانی میں مصروف تھے اور مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دینے میں نمایاں تھے اور اس وقت اخباری بیانات کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ایوب خان جیسا عظیم لیڈر اس دنیا میں نہ آیا تھا اور نہ آئے گا۔ صدارتی انتخابات میں ایوب خان کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے والوں میں بہاولپور سے مخدوم حمید الدین، غلام میراں المعروف مخدوم الملک، ملتان سے سید رضی شاہ گردیزی، مخدوم سجاد حسین قریشی، اکرم بوسن، شیخ فیض المصطفےٰ گیلانی اقبال ہراج، میجر افضل ڈاہا، مخدوم سید رحمت شاہ، محمد امین کانجو، سردار منظور حسین گوپانگ، ابراہیم برق، اللہ یار لنگڑیال، حامد رضا گیلانی، علمدار حسین گیلانی، بابو فیروز الدین انصاری سرگودھا سے میاں خان کلیار، فتح خان ٹوانہ، میاں غلام محمد، مہر خدا داد لک، ملک نور حیات

نون، خان میاں خان۔ مظاہر حسین ایڈووکیٹ شامل تھے۔ میر بلخ شیر مزاری 1965ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے کیونکہ محمود خان لغاری نواب آف کالاباغ کے رشتہ دار تھے انہوں نے انہیں بلا مقابلہ منتخب کروالیا۔ میر بلخ شیر مزاری مسلم لیگ میں اس لئے شامل ہوئے تھے کہ ڈیرہ غازی خان کی بلدیاتی سیاست میں مزاریوں کو نمایاں نمائندگی دی جائے گی۔ اس کے علاوہ پیر آف دیول شریف تو ایوب خان کی حمایت میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ انہوں نے عوام کو خبردار کیا کہ صدارتی انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ نہ دیں۔ اگر عوام نے انہیں ووٹ دے بھی دیئے تو میرے لاکھوں مرید انہیں اقتدار سے الگ کر دیں گے۔ انہوں نے ایوب خان کی کامیابی کے لئے چلہ بھی کیا تھا۔ جھنگ سے سردار زادہ سید ظفر عباس ایڈووکیٹ رجوعہ، مخدوم محمد غوث سجادہ نشین شاہ جیونہ (جو فیصل صالح حیات کے والد تھے) مہر علی شاہ کوٹ عیسیٰ، سید غضنفر عباس رتہ، مہر ظفر اللہ خان بھروانہ، بھاولپور سے سید احمد نواز گردیزی، گوجرانوالہ سے ارشاد اللہ خان تارڑ، ساہیوال سے غلام محمد مانیکا، چوہدری عبدالحق، رائے محمد اقبال شیخوپورہ سے چوہدری محمد اقبال، قربان علی چوہدری محمد رفیع، ملک غلام علی واگہ، چوہدری غلام مرتضیٰ، رائے منصب علی، رانا پھول خان قصور، سردار رشید احمد قصور، انور بھنڈر سیف اللہ تارڑ، گوجرانوالہ، میاں عبدالعزیز اور سردار اشرف خان جہلم انور علی بلوچ، چوہدری امتیاز احمد گل، عارف حسین، اصغر علی رندھاوا فیصل آباد نوابزادہ اصغر علی گوجرانوالہ، امان اللہ خان شاہانی خوشاب گل حمید روکڑی میانوالی محمد اکرم شمس آباد، اٹک افضل مہدی جہلم لاہور سے چوہدری عید محمد، ذوالفقار قزلباش، احمد سعید کرمانی، معراج خالد، ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے ان کی دن رات کی کوششوں سے صدارتی انتخاب میں ایوب خان نے واضح کامیابی حاصل کی تھی۔

پنجاب کا کوئی جاگیردار گھرانہ ایسا نہیں تھا جس نے اپنے ضلع میں ایوب خان کو کامیابی سے ہم کنار کرانے کے لئے جتن نہ کئے ہوں۔ اس حمایت سے جہاں یہ لوگ اقتدار میں شامل ہو گئے، وہاں زرعی اصلاحات کی زد میں آئی ہوئی زمینیں بھی انہیں مل گئیں۔ اب بیورو کریسی بھی ان زمینوں کا بہت بڑا حصہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی زرعی اصلاحات کے تحت جو رقبہ زمینداروں سے قیمتاً خریدا گیا اور پھر بڑے بڑے زمینداروں اور سرکاری افسروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کم از کم دو لاکھ ایکڑ رقبہ جن افراد کو بلا

کرایہ پٹہ پر دیا گیا ان کے نام یہ ہیں:۔

سلطان احمد چانڈیو	1,23,381	ایکڑ
امیر بہاولپور	20,000	ایکڑ
ملک امیر محمد خان آف کالاباغ اور ان کے چار صاحبزادے	18,619	ایکڑ
ملک خضر حیات خان ٹوانہ	5,700	ایکڑ
میر صاحب خیرپور	5,239	ایکڑ
حاجی غلام رسول جتوئی مرحوم	3,787	ایکڑ
ایس غلام محمد خان مہار اور ایس علی گوہر خان	4,061	ایکڑ
نواب سر محمد فرید	1,818	ایکڑ
ایس گل حسن شاہ لواری شریف	3,124	ایکڑ
کرنل سید عابد حسین	1,075	ایکڑ
ایس غلام محمد شاہ اور ایس طاہر علی شاہ	1,075	ایکڑ
پیر صاحب رانی شریف	364	ایکڑ
ذوالفقار علی بھٹو	178	ایکڑ
میاں جمال شاہ	500	ایکڑ
میاں غلام محمد نگیانہ	74	ایکڑ
نواب محمد مہر شاہ	936	ایکڑ
کرنل محمد علی نون	1,482	ایکڑ
میاں محمد سعید قریشی	1500	ایکڑ
کرنل جے وی سی کنگھم	2,948	ایکڑ
منیجر آرمی سٹڈ فارم	12,519	ایکڑ
جے وائی ایل ٹیلر	7,723	ایکڑ
محمد امین خان	500	ایکڑ

غلام جیلانی خان	500	ایکڑ
سید محی الدین لال شاہ	100	ایکڑ
بریگیڈیئر ملک گل شیر خان نون	3,171	ایکڑ
غلام محی الدین	500	ایکڑ
میجر جنرل جمعدار	527	ایکڑ
ملک فضل الٰہی ٹوانہ	429	ایکڑ
لیفٹیننٹ کرنل محمد عطاء اللہ سنبل	550	ایکڑ
خان بہادر سردار دوست محمد خان	4,190	ایکڑ
چوہدری ظفر اللہ خان	4,056	ایکڑ
سید محمد عباس شیر کھڑی	224	ایکڑ
نواب میجر سر محمد فرید خان	121	ایکڑ
سردار محمد نواز خان	14	ایکڑ
چوہدری اصغر علی خان	29	ایکڑ
نواب سجاد علی خان	23	ایکڑ
ملک خضر حیات خان ٹوانہ	24	ایکڑ
ملک شیر احمد خان	69	ایکڑ
چوہدری خدا بخش	33	ایکڑ
ملک فیروز خان نون	121	ایکڑ
ملک خضر حیات خان ٹوانہ	135	ایکڑ
ملک حبیب اللہ خان	12	ایکڑ
مسٹر وزیر آغا	88	ایکڑ
میر غلام دستگیر	13	ایکڑ
میاں خان محمد	54	ایکڑ
سعید محمد شاہ	11	ایکڑ
محمد حیات خان	27	ایکڑ

نوازش علی خان	25	ایکڑ
مسمات خورشید بیگم عرف نسیم بی بی	19	ایکڑ
سردار غلام محمد	12	ایکڑ
سید محمد وارث	11	ایکڑ
سید مبارک علی شاہ	82	ایکڑ
ملک محمد نواز خان	10	ایکڑ
نوابزادہ ملک امیر محمد خان آف کالا باغ	120	ایکڑ
میاں خدا یار خان	76	ایکڑ
میر بخش شیر خان	36	ایکڑ
سردار شیر جان خان	36	ایکڑ
صوفی عطا محمد	28	ایکڑ
ایس محمد نواز شاہ	23	ایکڑ
پیر معراج الدین	47	ایکڑ
ایس محمد نصیر الدین	27	ایکڑ
ایس محمد نذر حسین شاہ	84	ایکڑ
خواجہ محمود خان	137	ایکڑ
دیوان ایس غلام عباس شاہ	40	ایکڑ
ایم ممتاز محمد خان دولتانہ	28	ایکڑ
ایم مشتاق محمد خان	61	ایکڑ
میجر شمس الدین	30	ایکڑ
میاں غیاث الدین	66	ایکڑ
ہز ہائی نس میر علی مراد خان تالپور	46	ایکڑ
نثار احمد	22	ایکڑ
میر اللہ بخش بجائیو	35	ایکڑ
شریمتی بھگواں	62	ایکڑ

سر راجپر ٹومو	37	ایکڑ
حاجی علی حسن ہاڑی	54	ایکڑ
اخوند حاجی عبداللطیف	13	ایکڑ
آر ایس روپ چند سیوول	15	ایکڑ
حاجی محمد صالح ناھیون	19	ایکڑ
میر غلام	12	ایکڑ
سید محمد حسن	110	ایکڑ
حاجی قلندر بخش	14	ایکڑ
مسماۃ بادشاہ زادی	65	ایکڑ

ملک خدا بخش بچہ کے بقول یہ زمین ان حضرات کو زرعی اصلاحات کے قانون 9 (ڈی) کے تحت بھیڑ بکریاں پالنے، گھوڑے رکھنے، باغات لگانے اور شکار گاہوں کے لئے عطا کی گئی۔ جب رکن اسمبلی ایم حمزہ نے سوال کیا کہ کیا ان سے پٹہ کی رقم وصول کی جائے گی تو وزیر موصوف نے نفی میں جواب دیا۔

ایوب خان نے بارسوخ افراد کو استعمال کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ اور انہیں در آمدی اور بر آمدی لائسنسوں کی مد دی انہوں نے مخصوص مفادات کے حامل افراد کو بعض صنعتوں کے قیام کے اجازت نامے دے کر اقتدار کو ہموار کرنے کی کوشش کی ایک دور ایسا بھی آیا جب سیاستدانوں، سیاسی کارکنوں اور دیگر عناصر کے علاوہ سرکاری ملازمین اور عدلیہ کے ارکان کو بھی مخصوص مفادات کے تحت نوازا گیا۔ پرانی اور نئی کالونیوں کی آباد کاری کے نام پر بہترین زرعی اراضی کی بندر بانٹ کی گئی۔ ملک کے ایسے پر آشوب دور میں بھی مفلوک الحال عوام کی ہڈیوں پر عشرت کدے تعمیر کرنے والوں نے احتساب اور محاسبہ کی دہائی سنی گمراں کی پکار سنی ان سنی کر دی گئی۔ 1957 ء سے لے کر 1969 ء تک ملکی دولت ایسے لوگوں میں تقسیم کی گئی جو اس کے کسی صورت میں بھی حقدار نہ تھے۔ اس کے برعکس مستحق افراد روتے اور بلکتے رہے۔ اس دور میں موروثی جاگیردار سیاستدانوں اور وزراء کے علاوہ افسر شاہی کے کل پرزوں کی بھی چاندی ہو گئی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار ایکڑ سے زائد اراضی انھیں الاٹ کی گئی۔ جس نئی اور پرانی کالونیوں میں زرعی اراضی الاٹ کی گئی، ان میں پنجاب کے وسطی علاقے میں دس ہزار نو سو ایکڑ ڈیرہ اسماعیل خان میں دو ہزار دو سو پینتالیس ایکڑ، غلام محمد بیراج میں سوا چھ ہزار ایکڑ، کدو بیراج میں 28000 ایکڑ سے زائد، پنجاب کے مختلف مقامات پر ایک سو پچاس ایکڑ اراضی گورنروں، وزرا اور عدلیہ کے ارکان کو الاٹ کی گئی ان کے نام کے ساتھ اس وقت کے عہدے بھی دیئے جا رہے ہیں:۔

سابق جج سپریم کورٹ مسٹر جسٹس ایس اے رحمان، سابق گورنر مغربی پاکستان اختر حسین، سابق گورنر مغربی پاکستان میاں امین الدین، سابق جسٹس محمد منیر، سابق جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ مسٹر جسٹس عبدالعزیز، سابق جج سپریم کورٹ مسٹر جسٹس بی زیڈ کیکاوس، سابق مرکزی وزیر داخلہ چوہدری علی اکبر، سابق وزیر مغربی پاکستان خدا بخش بچہ، خان بہادر شیر زمان خان ایڈیشنل کمشنر ڈیرہ اسماعیل خان، عبدالرشید خان ایڈیشنل کمشنر ریونیو، کرنل اے ایس بی شاہ چیرمین پبلک سروس کمیشن کراچی، ایس ایم سید ڈپٹی چیف انجینئر اری گیشن، میاں ناصر احمد سی ایس پی ممبر آف بورڈ آف ریونیو، مغربی پاکستان، غلام صادق خان چیف انجینئر بجلی، ایس اے رحیم پی سی ایس چیرمین امپروومنٹ ٹرسٹ ایس اعجاز حسین شاہ سی ایس پی آفیسران سپیشل ڈیوٹی انٹی کرپشن، اے کے ملک سی ایس پی، اے ایچ قریشی سی ایس پی چیف سیکرٹری، سابق مغربی پاکستان سید حسن ڈپٹی چیرمین پلاننگ کمیشن، ایس غیاث الدین احمد ایڈیشنل چیف سیکرٹری سابق مغربی پاکستان، آغا محمد علی ڈی آئی جی پولیس، ملک عطا محمد نون ڈی آئی جی پولیس

جنرل (ریٹائر) کے ایم شیخ۔ ایس ایف حسن سی ایس پی چیف سیکرٹری سابق مغربی پاکستان، ایم ایم احمد سی ایس پی سیکرٹری وزارت خزانہ، ایم ایوب سی ایس پی، این اے قریشی چیرمین ریلوے بورڈ، آئی عبدالحمید سی ایس پی ڈائریکٹر پبلک سروس اکیڈمی، ایم اے مجید سی ایس پی ممبر بورڈ آف ریونیو، این اے فاروقی سی ایس پی پرسنل سیکرٹری صدر پاکستان ڈاکٹر ایچ ایم طوسی، غلام فرید ایس پی ساہیوال ایک سو ایکڑ اور ۷۵ ایکڑ اراضی حاصل کرنے والے خوش نصیبوں میں شیخ عبدالحمید پی سی ایس ایڈیشنل سیکرٹری محکمہ خوراک۔ میاں غلام صابری سی ایس پی، خان بہادر رشید احمد پی سی ایس سابق سیکرٹری گورنر مغربی پاکستان، عبدالمجید

خان سی ایس پی سابق سیکرٹری خوراک فرزند علی خان پی سی ایس سابق ایڈیشنل کلیم کمشنر، ظہور الحسن سابق ایڈیشنل سٹلمنٹ قاضی غضنفر حسین ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لاہور، شیخ عبدالکریم ایگزیکٹو انجینئر اری گیشن (ریٹائر) اے وحید ڈپٹی سیکرٹری صدر پاکستان (ایوب خان) خان عبداللہ خان ایس پی سیالکوٹ، ایس ایس کرمانی چیف انجینئر واپڈا، چوہدری محمد حسین ڈائریکٹر انٹی کرپشن، میاں محمد سعد اللہ ڈپٹی سیکرٹری (سابق) مغربی پاکستان گدو بیراج کے علاقہ میں چالیس ایکڑ کے لگ بھگ زمین حاصل کرنے والے خوش نصیب یہ ہیں پیر محمد ابراہیم چیف انجینئر سال ڈیریز راولپنڈی آغا ہلالی سی ایس پی ہائی کمشنر برائے پاکستان متعینہ لندن، آغا شاہی سی ایس پی وزارت خارجہ، مسٹر جسٹس انعام اللہ خان جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ، مسٹر ایم ڈبلیو عباس چیف سیکرٹری سابق مغربی پاکستان مسٹر آئی چوہان سی ایس پی ممبر بورڈ آف ریونیو، میاں مشتاق احمد کنٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل حکومت پاکستان معز الدین احمد سی ایس پی ممبر بورڈ آف ریونیو، مسٹر ایس آئی حق چیف سیکرٹری، مسٹر ایس ایم شریف صوبائی سیکرٹری تعلیم، مسٹر امیر محمد خان سیکرٹری، میر احسن الدین شاہ سی ایس پی، مسٹر ایم سیال ممبر واپڈا، مسٹر مشتاق احمد سی ایس پی جائنٹ سیکرٹری محکمہ خوراک، چوہدری محمد افضل صوبائی سیکرٹری مواصلات، میاں انور علی سی ایس پی، مسٹر ایم اے رشید ڈپٹی سیکرٹری پلاننگ، میاں عبدالعزیز سیکرٹری مواصلات، مسٹر محمد اسلم خان سفیر پاکستان متعینہ افغانستان۔ ایچ ولی خان، اے رحمان خان سفیر متعینہ بلجیم، میر بشیر خان چیف انجینئر محکمہ آبپاشی، مسٹر محمد یعقوب آغا، ممبر پبلک سروس کمیشن، خان نجف خان ڈائریکٹر انفور سمنٹ میاں ضیاالدین سفیر پاکستان۔ مسٹر ایچ جے اصغر چیف سیکرٹری ری ہاؤسنگ، مسٹر محمد افضل کمشنر ترقی زراعت، مسٹر عبدالحمید جنرل منیجر محکمہ بجلی، جسٹس مسعود احمد، ایس عالمگیر سی ایس پی سیکرٹری سید نذیر عالم انسپکٹر جنرل پولیس، مسٹر شریف خان چیرمین مغربی پاکستان روڈ ٹرانسپورٹ، میاں مظفر احمد چیف انجینئر آبپاشی میجر جنرل (سابق) اکبر خان ممبر روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن جن افسروں کو ایک سو ساٹھ ایکڑ زرعی اراضی الاٹ ہوئی رانا میاں داد خان جائنٹ سیکرٹری ہوم مغربی پاکستان ڈاکٹر عبدالستار ڈپٹی ڈائریکٹر ایگریکلچر، سردار غلام فرید خان ڈپٹی کمشنر رحیم یار خان فی کس ایک سو تیس ایکڑ اراضی جن افسروں کو الاٹ ہوئی:۔

خان انور خان ڈپٹی سیکرٹری ایڈمنسٹریشن لینڈ کمیشن، شیخ عنایت اللہ سیکشن آفیسر

ہیلتھ، مسٹر عنایت اللہ خان ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر شیخوپورہ سید امیر علی شاہ سیکرٹری صوبائی اسمبلی، سید عباس علی شاہ سپرنٹنڈنٹ پولیس، مسٹر فضل کریم ایگزیکٹو انجینئر آبپاشی مسٹر ایم ایم اقبال اسسٹنٹ سیکرٹری صوبائی وزارت قانون، مسٹر ممتاز احمد خان اے آئی جی پولیس، چوہدری نیاز علی آفسران اسپیشل ڈیوٹی ریونیو بورڈ غلام محبوب سجانی ٹیکنیکل آفیر گورنر انسپکشن ٹیم، مسٹر الطاف حسین ترمذی سابق ڈپٹی کمشنر سکھر، چوہدری نصیر احمد ورک ڈپٹی سیکرٹری ریونیو، رانا مقبول احمد ڈپٹی سیکرٹری ریونیو بورڈ، ڈاکٹر جی ایم شیخ سیکرٹری پبلک ورکس 100 ایکڑ اور چھیانوے چھیانوے ایکڑ اراضی حاصل کرنے والے سرکاری افسروں کے نام یہ ہیں

مسٹر بشیر احمد اسسٹنٹ سیکرٹری ریونیو بورڈ، چوہدری محمد اقبال ڈپٹی سیکرٹری مالیات ایس اکبر احمد کنٹرولر امتحانات تعلیمی بورڈ لاہور ایس فتح علی خان سیکشن آفیسر سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن، ایس ایم شریف بجٹ آفیر، ملک حاکم خان اے ڈی سی گوجرانوالہ سید بشیر علی سیکشن آفیر ایگریکلچر ڈویلپمنٹ کارپوریشن، چوہدری غلام رسول سینئر سپرنٹنڈنٹ کوئٹہ، مسٹر مولا بخش رجسٹرار آئی جی پولیس آفس، مسٹر شیر علی پی ڈی ایس پی، مسٹر بشارت حسین شاہ ڈپٹی کلکٹر محکمہ آبپاشی، مسٹر دوری حسین شاہ ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ مسٹر محمد یعقوب پلاننگ آفیر، چوہدری محمد حسین ڈپٹی سٹلمنٹ کمشنر، مسٹر شفیق احمد ڈی ایس پی مسٹر رحمت علی ایڈمنسٹریٹو آفیر الیکٹرسٹی لاہور، مسٹر سلطان احمد ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ،

غلام محمد بیراج میں بڑے بڑے افسروں کو اونے پونے نرخوں پر اراضی الاٹ کی گئی ان میں دو سو چالیس ایکڑ اراضی حاصل کرنے والے خوش نصیبوں میں ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ محکمہ صحت بریگیڈیئر ایف آر کلو ڈپٹی ڈائریکٹر خوراک ڈاکٹر محمد سعید سپرنٹنڈنگ انجینئر بہاولپور، ڈاکٹر ریاض قدیر ایڈمنسٹریٹر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، مسٹر احمد حسن چیف انجینئر مشیر اے ڈی سی شیخ مظہر الحق ریجنل منیجر بجلی (واپڈا) میاں اصغر علی ڈپٹی سیکرٹری تعلیم، مسٹر سعید حمید چیف انجینئر، مسٹر یونس ای حسین چیف انجینئر آبپاشی، مسٹر اے آر قریشی چیف انجینئر پی اینڈ آر، مسٹر ایم مسعود احمد چیف انجینئر واٹر ونگ، مسٹر ایس ایم سعید چیف انجینئر واٹر اینڈ سوشل اکنومکس ڈویژن، غلام محمد بیراج ہی میں ایک سو ساٹھ ایکڑ فی کس اراضی حاصل کرنے والوں میں یہ افسر شامل ہیں

شیخ نور محمد ایڈیشنل کمشنر سرگودھا۔ مسٹر الماس علی بیگ جائنٹ ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر۔

ان خوش نصیبوں کے حصہ میں ایک سو چالیس ایکڑ آئی

مسٹر اے آر پیرزادہ ڈائریکٹر زراعت، مسٹر اعجاز احمد قریشی ڈائریکٹر لینڈ اینڈ ریکلیمیشن لاہور، ڈاکٹر مظہر حسین اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیلتھ سروسز لاہور چوہدری محمد شفیع ظفر ڈائریکٹر بنیادی جمہوریت ملتان، چوہدری عبدالحق سیکشن آفیسر محکمہ تعلیم، مسٹر سرفراز خان پولیٹیکل ایجنٹ خیبر، مسٹر آئی آئی ایچ صدیقی کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری مغربی پاکستان، مسٹر افضل خان ڈپٹی سیکرٹری محکمہ قانون، ڈاکٹر مشتاق احمد ڈائریکٹر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آبپاشی، خان بشیر احمد ڈپٹی سیکرٹری سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن، ڈیرہ اسماعیل خان میں دو سو چالیس ایکڑ اونے پونے حاصل کرنے والے افسروں کے نام یہ ہیں

مسٹر عبدالرشید خان سابق کمشنر ڈی آئی جی ڈویژن، حبیب اللہ خان سابق وزیر قانون، خان شیر افضل خان سی ایس پی جائنٹ سیکرٹری حکومت پاکستان، مسٹر جسٹس محمد داود خان جج ہائی کورٹ مسٹر جسٹس فیض اللہ خان جج ہائی کورٹ، سابق وزیر خان غلام سرور خان، مسٹر ہدایت اللہ خان سی ایس پی جائنٹ سیکرٹری مغربی پاکستان علاوہ ازیں ڈیرہ اسماعیل خان ہی میں سابق ایس پی پولیس خان فیض اللہ خان کو 75 ایکڑ اراضی دی گئی جبکہ اس وقت کے مرکزی سیکرٹری بحالیات کو بلاقیمت ایک سو پچاس ایکڑ اراضی دینے کی منظوری دی گئی۔

اس کے علاوہ لاہور کے سرحدی علاقوں میں دس سے ساٹھ مربعے تک ایوب خان نے اپنے خوشامدیوں اور قصیدہ گو بیوروکریٹ اور سیاستدانوں کو الاٹ کئے اور اس زمین کی اصلاح کے لئے کروڑوں روپے سرکاری خزانے سے خرچ کئے گئے۔

ان نوازشات کے صلہ میں بیوروکریسی اور جاگیرداروں نے ایوب خان کے اقتدار کو مضبوط کرنے میں دن رات ایک کر دیئے۔

ایوب خان اقتدار کے نشہ میں اتنے اندھے ہوگئے تو ان کی ذات بھی ان الزمات کی زد سے نہ بچ سکی جس میں ان کے وزراء اور بیوروکریسی ملوث ہوگئی تھی۔ ۵ مئی ۱۹۶۰ء کو ایک ہنگامہ خیز واقعہ پیش آیا جس نے بین الاقوامی سیاست کو زیر وزبر کر کے رکھ دیا۔ یہ امریکہ کے فضائی جاسوسی کرنے والے طیارہ یو۔ ٹو۔ کا تاریخی واقعہ تھا جسے روس میں گرالیا

گیا تھا۔ جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں نیو یارک ٹائمز نے یہ سنسنی خیز خبر شائع کی کہ غیر ملکی جاسوسی کا ادارہ سی آئی اے اپنے خفیہ فنڈز سے تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے بعض اخبارات، مذہبی و سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کو ہر سال کروڑوں ڈالر کی بھاری رقم فراہم کرتا ہے۔ اس خبر کی بنیاد دراصل امریکی کانگرس کے اس کمیشن کی رپورٹ ہے جو سی آئی اے اور دوسرے امریکی اداروں کی خفیہ سرگرمیوں کی چھان بین کے لئے قائم کیا گیا ہے کہ سی آئی اے کی جانب سے اس مد میں ہر سال دس ارب ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں۔ جس میں غیر ملکی رہنماؤں کو دی جانے والی رقم بھی شامل ہے۔ ان رہنماؤں میں سے ایک غیر ملکی سربراہ مملکت کو ۱۴ سال کے دوران ۹ لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر دیئے گئے۔ نیو یارک ٹائمز کے کمیشن کی اس خفیہ رپورٹ کو انتہائی راز داری کے باوجود کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیا مگر اس نے رپورٹ کی جو تفصیلات شائع کی تھیں، ان میں بعض سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ان غیر ملکی مذہبی و سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے نام افشا کرنے سے گریز کیا جنہوں نے سیاسی رشوت کے طور پر کروڑوں ڈالر کی رقم حاصل کی۔ بعض اخباری اطلاعات کے مطابق جن مذہبی و سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے نام نیو یارک ٹائمز نے ظاہر نہیں کئے اور جو کمیشن کی رپورٹ میں ہیں، پاکستان کی دو نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں اور جس سربراہ مملکت کو ۱۴ سال کے دوران ۹ لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر کی رقم سیاسی رشوت کے طور پر دی گئی، وہ صدر ایوب تھے۔ جو حقائق باوثوق غیر ملکی ذرائع سے سامنے آئے تھے، وہ بتاتے ہیں کہ صدر ایوب اور سی آئی اے کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ تھا جس کے تحت یہ طے پایا تھا کہ صدر ایوب سی آئی اے کو اس کی بین الاقوامی سرگرمیوں کے سلسلے میں پاکستان کی حدود میں بعض خصوصی مراعات اور سہولتیں فراہم کریں گے اور اس کے صلے میں انہیں ستر ہزار ڈالر سالانہ تاحیات ملتے رہیں گے جو ان کے غیر ملکی بنکوں کے اکاؤنٹ میں ہر سال پابندی سے جمع ہوتے رہیں گے۔ اس خفیہ معاہدے پر ۱۹۶۰ء سے عمل درآمد شروع ہو گیا تھا اور ۱۹۷۴ء میں ایوب خان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہ رقم اس قدر راز داری کے ساتھ ادا کی جاتی تھی کہ اس کا علم صرف دو افراد کو تھا۔ ان میں سے ایک صدر ایوب تھے اور دوسرے سی آئی اے کا ڈائریکٹر تھا۔ سی آئی اے اور ایوب خان کے درمیان ایسا خفیہ معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت وہ ستر ہزار ڈالر سالانہ تاحیات وصول

کرتے رہے؟ دراصل معاہدہ کا تعلق براہ راست یو۔ ٹو کی خفیہ پروازوں سے تھا۔ اس سلسلہ میں اس سمجھوتہ کا ذکر بھی ضروری ہے جو فروری ۱۹۵۵ء کو معاہدہ بغداد کے تحت پاکستان اور امریکہ کے درمیان ہوا جس میں یہ طے پایا تھا کہ حکومت پاکستان گلگت اور صوبہ سرحد میں امریکہ کو اپنے فوجی اڈے قائم کرنے کے لئے ضروری مراعات اور سہولتیں فراہم کرے گی۔ اس معاہدہ پر محمد علی بوگرا نے بحیثیت صدر اور ایوب خان نے فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ اپنے سیاسی چیلوں چانٹوں کو نوازنا پاکستان کے اس پہلے فوجی حکمران کی مجبوری تھی ورنہ دوسری صورت میں اس کے سیاسی حواری مخالفین کی صفوں میں جا بیٹھتے۔ سیاسی مفادات کے حصول کے لئے جائز و ناجائز ذرائع کی کوئی تمیز نہیں تھی۔ ایوبی دور میں کاروباری خرد برد اور بدعنوانیوں کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی تاکہ اپنے سیاسی حامیوں کی حمایت کو خریدا جا سکے۔

ایوب خان جو سیاستدانوں پر نااہلیت، بدعنوانیوں اور کرپشن کے الزامات عائد کرتے ہوئے اقتدار پر قابض ہوئے تھے، جلد ہی خود ان سرگرمیوں میں ملوث ہو گئے۔ جب ایوب خان اقتدار سے الگ ہوئے تو ڈاکٹر فرانزیک کے تخمینے کے مطابق وہ دس سے بیس ملین ڈالر تک دولت کے مالک تھے۔ گوہر ایوب نے اس سلسلے میں جو تگ و دو کی، اس کے نتیجہ میں وہ جولائی ۱۹۶۸ء کے اختتام پر کئی اداروں کے چیئرمین، ایم ڈی اور ڈائریکٹر تھے۔ ایوب خان نے جب کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو صنعت کار طبقے کو پارٹی کے لئے فنڈز کی اپیل کی۔ ایوب خان کے ایک ہی اشارے پر ملک بھر سے کروڑوں روپے ایک ایسی مسلم لیگ کے لئے اکٹھے ہو گئے جس کی عوام میں جڑیں نہیں تھی۔ اس دور میں کارخانے اور ملیں لگانے کے لئے پرمٹوں کی ضرورت تھی جس کی اجازت صرف وفاقی حکومت ہی دیتی تھی۔ کنونشن مسلم لیگ پر پیسہ انویسٹ کرنا اس دور کا منافع بخش کاروبار بن گیا تھا اسی دور میں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا جو فرضی ناموں سے لائسنس حاصل کرتا اور بھاری قیمت وصول کر کے ضرورت مندوں کو فروخت کر دیتا۔ اس سارے غیر قانونی کام کی پشت پناہی پر وزراء اور کنونشن مسلم لیگ پر قابض جاگیرداروں کا ہاتھ تھا۔ ایوب خان کے امراء اور وزراء نے تو بدعنوانیوں کے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ افسر شاہی سے تعلق رکھنے والے جو لوگ ایوب خان کے اچھے اور برے کاموں میں شریک تھے، انہوں نے ایوب خان

کے اقتدار کے سنگھاسن کو ڈولتے دیکھا تو کہنے لگے کہ ایوب خان تو اچھے آدمی ہیں، وہ عوام کو سیاستدانوں کی زیادتیوں سے بچانے آئے تھے اور ان کے کوئی سیاسی عزائم نہیں تھے۔ لیکن ہوا کا رخ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نیک نیتی کا سارا بھرم کھل گیا۔ جب ملک سیاسی زوال کے دہانے پر پہنچ گیا تو موقع پرست بیور کریسی اور جاگیردار سیاست دان جو ایوب خان کو خلیفۃ المسلمین بنانے والے تھے، اچانک سیاسی بحران کے دوراہے پر چھوڑ گئے اور انہوں نے ایوب خان کو آمر وقت کا لقب دیا اور اس کے عہد کو سازشوں اور لوٹ مار کا دور قرار دیا۔

اپریل ۱۹۶۹ء کی تیسری صبح تھی۔ ہال میں اعلیٰ فوجی اور سول حکام کا اجتماع تھا۔ یہ میٹنگ یحییٰ خان نے ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بلائی تھی ان کے دور حکومت کی یہ پہلی میٹنگ تھی اس کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ آگے کی نشستوں پر فوجی جنرل، بریگیڈیئر کرنل اور لیفٹننٹ کرنل بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے سول حکام قطار اندر قطار بیٹھے تھے۔ فوجی افسروں کے چہروں پر شگفتگی اور شادابی تھی۔ وہ مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ سول حکام کا یہ عالم تھا کہ ان کے چہرے خاموش، ہونٹ خشک اور دلوں میں وسوسے اور اندیشے تھے اور سب سے آگے ایک پر تکلف کرسی رکھی ہوئی تھی۔ یہ اکلوتی کرسی یحییٰ خان کے لئے تھی جو ابھی پہنچے نہیں تھے اور ہر آنکھ ان کی منتظر تھی۔ ان دنوں اسلام آباد کے سرکاری دفتروں میں وقت کی پابندی کا سختی سے خیال رکھا جاتا تھا۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے دفتروں کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ دیر سے پہنچنے والوں کی باز پرس ہوتی تھی۔ یحییٰ خان وقت مقررہ سے ٹھیک ۳۷ منٹ بعد میٹنگ میں پہنچے۔ ان کی آمد پر سب احتراماً کھڑے ہوگئے۔ یحییٰ خان اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحے خاموش رہے پھر مسکرا کر جنرل حمید نے کچھ کہا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے، جنرل پیرزادہ بولنے کے لئے اپنی نشست سے اٹھے، یحییٰ خان نے انہیں اشارے سے بٹھا دیا۔ پھر حاضرین سے یوں مخاطب ہوئے: "جیسا کہ آپ سب کو علم ہے ملک پر ایک بار پھر مارشل لاء لگ چکا ہے لیکن یہ مارشل لاء پہلے مارشل لاء سے قطعی مختلف ہوگا۔ اس مرتبہ کسی رعایت سے کام نہیں لیا جائے گا۔ کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔ یہ مارشل لاء صحیح معنوں میں مارشل لاء ہوگا۔" یحییٰ خان لمحہ بھر خاموش رہے پھر کہنے لگے " آپ کو یہ بھی علم ہے کہ میں نے تمام اختیارات

سنبھال لئے ہیں۔ میرے سر پر اس وقت چار ٹوپیاں ہیں، پہلی ٹوپی صدر مملکت کی، دوسری مسلح افواج کے سپریم کمانڈر انچیف کی، تیسری چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی اور چوتھی بری فوج کے کمانڈر انچیف کی، یہ ذمہ داریاں میں نے خوشی سے قبول نہیں کیں، حالات کا یہی تقاضا تھا۔ ملک کو بچانے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ نظم ونسق درہم برہم ہو چکا تھا۔ قانون کا احترام اٹھ چکا تھا۔ جس کا جو جی چاہتا تھا کرتا تھا۔ لوگ سڑکوں پر آ گئے تھے، توڑ پھوڑ کرتے تھے، آگ لگاتے تھے، جلسے جلوس تھے، مظاہرے تھے، گھیراؤ تھا، جلاؤ تھا، ہر طرف لاقانونیت اور افراتفری تھی، حکومت کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ ملک تباہ ہو رہا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رکے پھر چیخ کر بولے "اس تباہی کی ذمہ داری بڑی حد تک آپ پر عائد ہوتی ہے۔" یحییٰ خان نے سول افسروں کی طرف اشارہ کیا " آپ لوگوں پر۔ آپ نے اس بڈھے (ایوب خان) کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا، یہ خوشامدیوں، چاپلوسوں اور نکموں کا ایسا گروہ تھا جس نے اس شخص سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لی تھیں، اسے باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر کر دیا تھا۔ ناکارہ اور مجہول بنا دیا تھا۔ اسے اندھا کر دیا تھا۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی بھی حالت میں ان بے غیرتوں کو چاپلوسی اور خوشامد کی اجازت نہیں دوں گا۔ کسی نے ایسی جرات کی تو اس کا انجام برا ہوگا۔ میں اس کے ساتھ بدترین رویہ اختیار کروں گا۔ سخت ترین سزا دوں گا۔ اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

یہ کہتے کہتے یحییٰ خان کی آواز اونچی، اور اونچی ہوتی گئی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں جلال اتر آیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ جب انہوں نے اپنی بات ختم کی تو ہال پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سول افسروں کے دل دھڑکتے تھے، چہروں پر ہوائیاں اڑی تھیں۔ کئی لمحے اسی خاموشی سے گزر گئے۔ پھر ایک سینئر سی ایس پی اپنی نشست سے اٹھے (یہ غالباً ایم ایم احمد تھے) وہ دونوں ہاتھ باندھے سر جھکائے کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر انہوں نے کہنا شروع کر دیا

"صدر محترم! اس میں کوئی شک نہیں کہ سول انتظامیہ جس کا بدقسمتی سے میں بھی ایک رکن ہوں، سخت کرپٹ اور نااہل ثابت ہوئی ہے۔ ہم لوگ اپنے سسٹم کے خود شکار

سنبھال لئے ہیں۔ میرے سر پر اس وقت چار ٹوپیاں ہیں، پہلی ٹوپی صدر مملکت کی، دوسری مسلح افواج کے سپریم کمانڈر انچیف کی، تیسری چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کی اور چوتھی بری فوج کے کمانڈر انچیف کی، یہ ذمہ داریاں میں نے خوشی سے قبول نہیں کیں، حالات کا یہی تقاضا تھا۔ ملک کو بچانے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ نظم و نسق درہم برہم ہو چکا تھا۔ قانون کا احترام اٹھ چکا تھا۔ جس کا جو جی چاہتا تھا کرتا تھا۔ لوگ سڑکوں پر آگئے تھے، توڑ پھوڑ کرتے تھے، آگ لگاتے تھے، جلسے جلوس تھے، مظاہرے تھے، گھیراؤ تھا، جلاؤ تھا، ہر طرف لاقانونیت اور افراتفری تھی، حکومت کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ ملک تباہ ہو رہا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رکے پھر چیخ کر بولے "اس تباہی کی ذمہ داری بڑی حد تک آپ پر عائد ہوتی ہے۔" یحییٰ خان نے سول افسروں کی طرف اشارہ کیا "آپ لوگوں پر۔ آپ نے اس بڈھے (ایوب خان) کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا، یہ خوشامدیوں، چاپلوسوں اور نکموں کا ایسا گروہ تھا جس نے اس شخص سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لی تھیں، اسے باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر کر دیا تھا۔ ناکارہ اور مجہول بنا دیا تھا۔ اسے اندھا کر دیا تھا۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی بھی حالت میں ان بے غیرتوں کو چاپلوسی اور خوشامد کی اجازت نہیں دوں گا۔ کسی نے ایسی جرات کی تو اس کا انجام برا ہو گا۔ میں اس کے ساتھ بدترین رویہ اختیار کروں گا۔ سخت ترین سزا دوں گا۔ اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

یہ کہتے کہتے یحییٰ خان کی آواز اونچی، اور اونچی ہوتی گئی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں جلال اتر آیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ جب انہوں نے اپنی بات ختم کی تو ہال پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سول افسروں کے دل دھڑکتے تھے، چہروں پر ہوائیاں اڑی تھیں۔ کئی لمحے اسی خاموشی سے گزر گئے۔ پھر ایک سینئر سی ایس پی اپنی نشست سے اٹھے (یہ غالباً ایم ایم احمد تھے) وہ دونوں ہاتھ باندھے سر جھکائے کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہے۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر انہوں نے کہنا شروع کر دیا

"صدر محترم! اس میں کوئی شک نہیں کہ سول انتظامیہ جس کا بدقسمتی سے میں بھی ایک رکن ہوں، سخت کرپٹ اور نااہل ثابت ہوئی ہے۔ ہم لوگ اپنے سسٹم کے خود شکار

ہوئے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے بے ایمان ہیں، بہت سے نااہل اور نکمے ہیں، سابق صدر نے واقعی ہم کو خراب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہم نہ صرف اپنی لغزشوں کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اس پر سخت شرمندہ بھی ہیں۔" سینئر افسر لمحہ بھر خاموش کھڑے رہے۔ پھر یوں گویا ہوئے "سر آپ نے جو ذمہ داریاں سنبھالی ہیں، وہ اہم ہیں۔ اگر آپ ذمہ داریاں نہ سنبھالتے تو ملک تباہ ہو جاتا۔ آپ نجات دہندہ بن کر آئے ہیں۔ صرف آپ ہی اس ملک کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ اس مقدس فرض میں، اور میرے تمام ساتھی، تمام سول افسران آپ کے ساتھ ہیں۔ ہر خدمت کے لئے آمادہ ہیں ہم خلوص دل اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ ہم نہایت وفاداری اور تابع داری سے آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری کمزوریوں اور غلطیوں کو نظر انداز کر کے ہمیں خدمت کرنے کا موقع دیں گے۔" اس سینئر افسر کی تقریر کے ساتھ ساتھ یحییٰ خان کے چہرے کی خشونت اور کرختگی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور جب انہوں نے یحییٰ خان کے صدر مملکت بننے اور مستقبل میں عظیم قومی کارنامہ انجام دینے کے بارے میں ایک روحانی پیشوا کی بشارت کا بطور خاص ذکر کیا تو یحییٰ خان کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ گردن ہلا ہلا کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے ہر انداز کے ساتھ میٹنگ کا رنگ بدلتا گیا۔ فضا کا بوجھل پن کم ہو گیا، اس بدلتے ماحول میں قصیدہ خوانی کرنے والوں اور پیمان وفا باندھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ سب اعلیٰ سول افسر تھے۔ ایک اٹھا، دوسرا اٹھا، تیسرا اٹھا، پھر یکے بعد دیگرے کئی اٹھے، پھر غالباً الطاف گوہر اٹھے۔ انہوں نے مودب ہو کر نظریں جھکا کر لہجے میں رقت طاری کر کے فرمایا "صدر محترم! مجھ سے پہلے میرے سینئر اور قابل احترام ساتھی جو کچھ فرما چکے ہیں، اس کے بعد میرے لئے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی، میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا نہ صرف احساس ہے بلکہ شدت کے ساتھ احساس ہے۔ ہماری تاریخ کے اس سنگین مرحلے پر آپ نے جو مقدس فریضہ سنبھالا ہے، اس میں ہر محب وطن کی تائید اور حمایت آپ کے ساتھ ہے۔ میں ایک محب وطن کی حیثیت سے اپنی پوری وفاداری اور مکمل تعاون کا آپ کو یقین دلاتا ہوں۔"

الطاف گوہر کے بعد کچھ اور سول افسران کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بھی یحییٰ خان

ہوئے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے بے ایمان ہیں، بہت سے نااہل اور نکمے ہیں، سابق صدر نے واقعی ہم کو خراب کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ ہم نہ صرف اپنی لغزشوں کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اس پر سخت شرمندہ بھی ہیں۔" سینئر افسر لمحہ بھر خاموش کھڑے رہے۔ پھر یوں گویا ہوئے " سر آپ نے جو ذمہ داریاں سنبھالی ہیں، وہ اہم ہیں۔ اگر آپ ذمہ داریاں نہ سنبھالتے تو ملک تباہ ہو جاتا۔ آپ نجات دہندہ بن کر آئے ہیں۔ صرف آپ ہی اس ملک کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ اس مقدس فرض میں، اور میرے تمام ساتھی، تمام سول افسران آپ کے ساتھ ہیں۔ ہر خدمت کے لئے آمادہ ہیں ہم خلوص دل اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ ہم نہایت وفاداری اور تابع داری سے آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری کمزوریوں اور غلطیوں کو نظر انداز کر کے ہمیں خدمت کرنے کا موقع دیں گے۔" اس سینئر افسر کی تقریر کے ساتھ ساتھ یحییٰ خان کے چہرے کی خشونت اور کرختگی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور جب انہوں نے یحییٰ خان کے صدر مملکت بننے اور مستقبل میں عظیم قومی کارنامہ انجام دینے کے بارے میں ایک روحانی پیشوا کی بشارت کا بطور خاص ذکر کیا تو یحییٰ خان کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ گردن ہلا ہلا کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے ہر انداز کے ساتھ میٹنگ کا رنگ بدلتا گیا۔ فضا کا بوجھل پن کم ہو گیا، اس بدلتے ماحول میں قصیدہ خوانی کرنے والوں اور پیمان وفا باندھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ سب اعلیٰ سول افسر تھے۔ ایک اٹھا، دوسرا اٹھا، تیسرا اٹھا، پھر یکے بعد دیگرے کئی اٹھے، پھر غائبًا الطاف گوہر اٹھے۔ انہوں نے مودب ہو کر نظریں جھکا کر لہجے میں رقت طاری کر کے فرمایا " صدر محترم! مجھ سے پہلے میرے سینئر اور قابل احترام ساتھی جو کچھ فرما چکے ہیں، اس کے بعد میرے لئے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی، میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا نہ صرف احساس ہے بلکہ شدت کے ساتھ احساس ہے۔ ہماری تاریخ کے اس سنگین مرحلے پر آپ نے جو مقدس فریضہ سنبھالا ہے، اس میں ہر محب وطن کی تائید اور حمایت آپ کے ساتھ ہے۔ میں ایک محب وطن کی حیثیت سے اپنی پوری وفاداری اور مکمل تعاون کا آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ "

الطاف گوہر کے بعد کچھ اور سول افسران کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بھی یحییٰ خان

کی مدح سرائی کی۔ وفاداری کا عہد کیا اور پچھلی آوازوں میں اپنی آواز ملا کر بیٹھ گئے۔ خاصی دیر بعد قدرت اللہ شہاب کی باری آئی لیکن ان کے بولتے ہی ہال میں گویا ایک دھماکہ ہوا۔ انہوں نے یحییٰ خان کو صدر محترم کی بجائے "مسٹر چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر" کہہ کر مخاطب کیا۔ یحییٰ خان کے چہرے کی شگفتگی اچانک اڑ گئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے مگر وہ خاموش رہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی بات کا آغاز اس سوال سے کیا مسٹر چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر اگر آپ اجازت دیں تو یہ بات دوستانہ ماحول میں کی جائے یحییٰ خان نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا ضرور ضرور ہم چینی یا روسی نہیں ہیں ہم دوست ہیں ہم پاکستانی ہیں بات یقیناً دوستانہ فضا میں ہونی چاہئے۔ قدرت اللہ شہاب نے کہنا شروع کیا " میں نہایت ادب سے پہلی بات یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے محترم دوستوں نے یہاں جو کچھ کہا ہے مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں مجھے افسوس ہے کہ جو کچھ آپ نے کہا ہے اس سے بھی مجھے اتفاق نہیں میٹنگ پر سناٹا چھا گیا قدرت اللہ شہاب کی آواز گونجتی رہی۔ سر آپ نے جس خوشامد اور چاپلوسی پر اظہار نفرت کیا تھا سابق صدر کی جس کمزوری کی نشاندہی کی تھی کیا ابھی اور اسی وقت روپ اور بہروپ کا وہ ناٹک ایک بار پھر اسٹیج نہیں کیا گیا معاف کیجئے میں اس پیمان وفا اور اعتراف گناہ کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

قدرت اللہ شہاب اپنی بات پوری نہ کر پائے تھے کہ کئی آوازیں غصے سے بھرائی ہوئی ابھریں۔ " خاموش ہو جاؤ " بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، ان میں فوجی افسران کے ساتھ سول افسران کی بھی آوازیں تھیں فوجی افسروں کی آواز میں غصہ اور نفرت تھی سول افسران کی آواز میں عجز اور التجا تھی لیکن اس چیخ و پکار کے باوجود قدرت اللہ شہاب نہ بیٹھے اور انہوں نے بیورو کریسی کے مجرمانہ کردار اور ماضی کو بے نقاب کر کے چھوڑا یحییٰ خان کردار کے حوالے سے ایوب خان سے ذرہ مختلف تھے ان کی حکومت کا سارا نظام بیورو کریسی کے سہارے چلتا تھا یہی بیورو کریسی جس کی چمڑی ادھیڑنے کی باتیں ہوتی تھیں یحییٰ خان ان کے سامنے کٹھ پتلی بن گئے تھے۔

سیاسی نوازشات کا یہ نظام کب تک چلے گا؟

جب بھی کوئی حکومت اقتدار سے الگ ہوتی ہے یا کی جاتی ہے، اس کے بعد آنے والے سابقہ دور کو بدعنوانیوں اور کرپشن کا دور قرار دیتے ہیں۔ ان کے مشیروں اور وزیروں کی جائیدادوں اور لوٹ مار کی تحقیقات شروع ہو جاتی ہیں۔ پھر سابقہ حکومت کا وائٹ پیپر چھپتا ہے۔ عدالتوں میں ریفرنس بھیجنے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ایک نئے جوڑ توڑ کی بنیاد پڑتی ہے۔ جو لوگ سابقہ حکومت کے وفادار رہتے ہیں، وہ آنے والوں کی نظروں میں کرپٹ یا بعض صورتوں میں پاکستان دشمن تک قرار دے دیئے جاتے ہیں اور جو حالات سے سمجھوتہ کر کے اندرون خانہ نئے حکمرانوں سے مل جاتے ہیں، وہ جمہوریت کے چیمپئن، وطن دوست اور صالح بن جاتے ہیں۔ جو ان کے ساتھ نہ چلیں تو انہیں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے کیونکہ فائلوں کا ریکارڈ انہیں خاموش کرانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ کسی ایک حکمران کا طرز عمل نہیں ماضی، حال اور مستقبل کی ایک ہی کہانی ہے اور رہے گی۔ سیاسی سٹیج کے اداکار وہی ہیں البتہ وقفے وقفے سے ان کا گٹ اپ تبدیل کرنے کے لئے تھوڑا سا میک اپ بدلنا پڑتا ہے۔ اس سارے کھیل میں احتساب تو صرف انہی لوگوں کا ہوتا ہے جو حکمرانوں کی آنکھوں کا کانٹا بن کر کھٹکتے رہتے ہیں۔

ایوب خان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے قوم نے یحیٰی خان کے مارشل لاء کو برضا و رغبت قبول کیا تھا حالانکہ کسی آزاد ملک کے شہری کی طرف سے ایسی صورت حال پر افسوس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہوتی کہ ان کے بنیادی حقوق چھین لئے جائیں۔ ۱۹۵۸ء میں جب ملک میں جمہوریت کو ختم کر کے مارشل لاء نافذ کیا گیا تھا تو عوام نے اپنا یہ

چھین جانے پر افسوس کا اظہار کرنے کی بجائے اطمینان کا اظہار کیا تھا، صرف اس لئے کہ وہ پرانے سیاستدانوں کی محلاتی سازشوں سے تنگ آ چکے تھے۔ یہ رہنما جنہوں نے پاکستان کی جدوجہد میں قائداعظم کے ہاتھ مضبوط کئے تھے۔ ایبڈو کی زنجیروں میں جکڑے گئے تو کسی کی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا تھا صرف اس لئے کہ ان رہنماؤں نے لیلائے اقتدار کے عشق میں اپنی ان تمام خدمات کی نفی کر دی تھی جو انہوں نے حصول آزادی کی جنگ لڑ کر سرانجام دی تھیں۔ قوم انہیں ان خدمات کا یہ صلہ دینے کے لئے تیار نہ تھی کہ وہ پاکستان اور اس کے عوام کے مفادات کو اپنے ذاتی، گروہی یا جماعتی مفادات پر قربان کرتے رہیں۔ قوم نے ایوب خان پر اعتماد کیا تھا۔ اپنے مستقبل کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھما دی تھی لیکن جب فیلڈ مارشل ایوب خان نے بھی ان خوابوں اور توقعات کو چکنا چور کر دیا جو انہوں نے مارشل لاء کے غلاف پر دیکھے تھے تو انہیں اس کا شدید رنج ہوا اور ان کی خدمات ان کی غلطیوں، کوتاہیوں اور کرپشن کے زنگ سے آلودہ ہو گئیں اور انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت درباری سیاستدانوں کے منہ سے جھوٹی تعریفیں سن سن کر گزار دیا اور یہی لوگ ایوب خان کو فخر ایشیا بنانے والے تھے۔ انہوں نے عوام کے مسائل کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی غلطی کی اس لئے ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں (سابقہ) مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی عوام کی اکثریتی پارٹی بن کر ابھری۔ عوام نے اپنی معاشرتی اور معاشی محرومیوں جن کا وہ سالہا سال سے شکار تھے، کے چنگل سے آزادی کے حق میں یہ فیصلہ دیا تھا۔ عوام نے ۱۹۷۰ء میں استحصالی طبقوں پر فیصلہ کن وار کیا۔ ایسا وار کہ جس کی پاکستان میں نظیر نہیں ملتی۔ اس عوامی ریلے میں جو لوگ بہہ گئے ان میں ایسے بزعم خود بڑے بڑے نام اور مقتدر رہنما بھی تھے، مثلاً جی ایم سید، ائرمارشل اصغر خان، میاں طفیل محمد، نوابزادہ نصراللہ خان، سید حسن محمود، ملک غلام جیلانی، محمد حسین چٹھہ، اے کے بروہی، زیڈ ایچ لاری، قاضی فضل اللہ، محمود الحسن عثمانی، مولانا جان محمد عباسی، کنیز فاطمہ، حبیب جالب، میاں یاسین وٹو، ملک قاسم، میجر جنرل ریٹائرڈ سرفراز خان، ڈاکٹر جاوید اقبال، مولانا حامد علی، سید علمدار حسین گیلانی اور بڑے بڑے قد آور نام تھے۔ اس کے باوجود جاگیرداروں اور زمینداروں میں ظفراللہ خان چودھری، میاں ممتاز دولتانہ، سردار شیرباز خان مزاری، میاں نظام الدین بہاولپور، صاحبزادہ سعید الرشید عباسی، سید رفیق، محمد شاہ، جمال محمد، نور محمد، سردار شوکت حیات، سید صفی الدین پیر

آف گمٹھ، بابو کرم بخش، میاں محمد ذاکر قریشی، نواب زادہ ملک مظفر خان آف کالاباغ، مہر غلام حیدر بھروانہ، صاحب زادہ نذیر سلطان جیسے جاگیردار بھی اسمبلیوں میں پہنچ گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جاگیرداروں کے خلاف عوام میں جس جوش کو اجاگر کیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ عوام کے مسائل بہرحال ہر صورت میں حل ہونے چاہئیں اور یہ وعدے بھٹو کی تقریروں اور ان کے منشور میں شامل تھے۔ بھٹو صاحب بڑے جہاں دیدہ سیاستدان تھے۔ انہیں اقتدار میں رہنے اور اس سے محروم رہنے میں جو فرق ہوتا ہے، اچھی طرح معلوم تھا۔ انہوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب قوم نے مادر ملت کی عظیم قیادت میں ایوب خان کے خلاف تحریک چلائی تھی۔ وہ وزیر تھے اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ مخالف عوامی تحریک کا سامنا کرنے میں کتنی مشکلات ہوتی ہیں اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ عوامی تحریک کی قیادت کرنے میں کتنا لطف ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں ذائقے ان کے سیاسی کام و دہن میں تازہ تھے۔

بھٹو کو عوام نے اتنے ووٹ دیئے کہ وہ بوکھلا اٹھے کیونکہ کسی سیاسی تجزیہ نگار کو اتنے بڑے اپ سیٹ کی امید نہ تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو حکمرانوں کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ تھے۔ پھر بھی وہ ان غلطیوں سے نہ بچ سکے جو ماضی قریب میں دو فوجی حکمران کر چکے تھے۔ جس استحصالی اور جاگیردار طبقہ کے خلاف انہوں نے زوردار مہم چلائی تھی، وہی پیپلز پارٹی کی صف اول کی قیادت بن گئی تھی۔ وہی غریبوں کی حامی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بھٹو (مرحوم) کا وہ انقلاب فیل ہو گیا جس کا خواب انہوں نے غریب عوام کو دکھایا تھا۔ اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے انہوں نے سیاستدانوں اور جاگیرداروں پر نوازشات کے منہ کھول دیئے۔ ارکان پارلیمنٹ کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے اسلام آباد کے انتہائی قیمتی علاقے میں پلاٹ اونے پونے داموں تقسیم کئے۔ ہم اس لسٹ کی تفصیل پر نگاہ ڈال کر اپنی یادداشت تازہ کر لیں کہ ان میں سے کتنے غریب اور بے گھر ہیں اور انہیں کتنے مربع گز کے پلاٹ الاٹ ہوئے:

سردار شوکت حیات کا پلاٹ ان میں سب سے بڑا 3744 مربع گز تھا۔ سردار شوکت حیات اور مولانا عبدالحق کو دو پلاٹ الاٹ ہوئے۔ مولانا کوثر نیازی کے پلاٹ کا سائز

۳۱۵۷ مربع گز تھا۔ باقی سب چھوٹے سائز میں تھے۔ ان میں مولانا مفتی محمود مرحوم ۱۰۶۷، ملک محمد صادق ایم این اے ۸۰۰، ملک محمد اختر ایم این اے ۸۰۰ فاروق لغاری سینیٹر ۱۱۳۳، محمد سردار خان ایم این اے ۸۰۰، چوہدری غلام حیدر چیمہ ایم این اے ۸۰۰، غلام نبی چوہدری ایم این اے ۸۰۰، نیامت اللہ خان شنواری ایم این اے ۸۰۰، چوہدری نثار احمد بٹول ایم این اے ۸۰۰، چوہدری ممتاز احمد ایم این اے ۸۰۰ سردار شوکت حیات ایم این اے ۱۲۰۰، مہر غلام حیدر بھروانہ ایم این اے ۹۳۳ صاحب زادہ نذیر سلطان آف سلطان باہو ایم این اے ۱۰۶۶، خان کمال محمد گوریجہ ایم این اے ۱۰۶۶، مولوی نعمت اللہ ایم این اے ۱۰۶۶، مولوی صدر الشہید ایم این اے ۱۰۶۶، محمد خان چوہدری ایم این اے، ۹۷۸، چوہدری محمد اسلم سینیٹر ۱۰۶۶، محمد ہاشم غلزئی ۱۰۶۶، مس عذرا مسعود دختر میاں مسعود احمد ایم این اے ۱۰۶۶، مولانا عبدالباقی ایم این اے ۱۰۶۶، مہر مہران خان بجارانی سینیٹر ۹۷۷، فضل الٰہی پراچہ سینیٹر ۱۰۶۶، عبدالنبی کانجو ایم این اے، اکبر خان ایم این اے ۹۳۳، احمد خان معرفت شہادت خان بھٹی ایم این اے ۹۳۳، تاج محمد جمالی سینیٹر (اب وزیر اعلیٰ بلوچستان ہیں) ۱۰۶۶، حاجی صالح خان ایم این اے ۱۰۱۱، شہادت علی خان ایم این اے ۱۰۱۱، حاجی سید حسین شاہ سینیٹر ۹۳۳ غلام رسول تارڑ ایم این اے ۸۰۰، اتالیق جعفر علی شاہ ایم این اے ۸۰۰، مولانا عبدالحق ایم این اے ۸۰۰، خواجہ سلیمان ایم این اے ۸۰۰، محمد حنیف خان ایم این اے ۹۳۳، مس طلعت احسان دختر احسان الحق پراچہ سینیٹر ۱۲۴۴، سید قمر الزماں شاہ سینیٹر ۱۳۲۲، صاحب زادہ فاروق علی خان سپیکر ۸۰۰، ملک محمد سلیمان ایم این اے ۸۰۰، محمد زمان اچکزئی سینیٹر ۹۳۳، منظور حسین سومرو ایم این اے ۱۰۶۶، ابراہیم برق ایم این اے ۹۳۳، شیرباز خان مزاری ایم این اے ۱۰۶۶، شفقت خان ایم این اے ۱۰۶۶، پیر عبدالقادر شاہ جیلانی ایم این اے ۱۰۶۶ عبدالعزیز بھٹی ایم این اے ۹۳۳، مولانا عبدالحق ایم این اے ۸۰۰، مہر مسیح عثمان فاتح سینیٹر ۱۰۰۰، احمد وحید اختر سینیٹر ۸۰۰، چوہدری جہانگیر علی ایم این اے ۱۱۶۶، خان حبیب اللہ خان چیئرمین سینٹ ۸۰۰، محمد داؤد خان ایم این اے ۲۰۰۰، مسز نونیہ خانم دختر زاہدہ سلطان ایم این اے، ۲۵۰۰، مولانا کوثر نیازی ایم این اے ۳۱۵۷، نصر اللہ خان خٹک ایم این اے ۲۵۰۰، مولانا غلام غوث ہزاروی ایم این اے ۵۵۵ قمر الزماں سینیٹر ۵۰۰، ظہور الحق سینیٹر، ڈاکٹر غلام حسین ایم این اے ۱۷۷۷ مخدوم محمد

ایمن ایم این اے ۸۰۰ احمد رضا قصوری ایم این اے ۸۰۰، مولانا عبدالحکیم ایم این اے ۸۰۰، سید خیال شاہ سینیٹر، چوہدری بشیر احمد ایم این اے، حفیظ اللہ چیمہ ایم این اے ۱۲۴۴، منظور حسین دوہرا ایم این اے ۱۲۴۴، میاں حامد یاسین ایم این اے ۱۲۴۴، سید صرارعی گردیزی ولد عباس حسین گردیزی ایم این اے ۸۰۰، پاشان میر ولد خورشید حسن میر ایم این اے ۹۳۳، میر دریا خان کھوسو ایم این اے ۱۲۴۴ ملک نصر اللہ خان آفریدی سینیٹر ۸۰۰، ممتاز فاروق خٹک ایم این اے ۱۳۲۲، غلام مصطفیٰ جتوئی ایم این اے ۱۴۰۶، ملک جہانگیر خان ایم این اے ۱۲۴۴ راؤ عبدالستار ایم این اے 1244 ، نوابزادہ محمد ذاکر قریشی ایم این اے ۱۱۷۵، کرم بخش اعوان ایم این اے ۱۳۱۱، محمد یوسف خٹک ایم این اے ۱۴۷۲، عبدالحفیظ پیرزادہ ایم این اے ۱۲۴۴، راجہ تری دیورائے ایم این اے ۱۰۶۶ بیگم شیریں وہاب ایم این اے ۱۲۰۰، سکندر یوسف عبدالرحمان ولد جے اے رحیم ایم این اے ۱۰۶۶، اسعد علی نون ایم این اے ۱۲۴۴، میاں احسان الحق ایم این اے ۱۰۶۶، میاں غلام عباس خان ایم این اے ۱۰۴۰، عبدالسبحان ایم این اے ۱۰۴۰، سردار عبدالعلیم ایم این اے ۱۰۰۰، مربع گز کے پلاٹ لینے والوں میں شامل تھے۔

نوازشات کا یہ سلسلہ اسلام آباد تک ہی نہیں بلکہ لاہور میں لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے پلاٹ الاٹ کئے گئے ان میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے اس سے حکومت پر بیورو کریسی کی مضبوط گرفت کے اشارے ملتے ہیں سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے کے دور میں شادمان کالونی میں ۶۸ افراد کو دس مرلے سے لے کر دو کنال تک کے پلاٹ الاٹ کئے گئے ان ناموں کو دیکھ کر اندازہ ہو گا کہ بعض خاندانوں نے مختلف ناموں سے لاہور کی انتہائی ماڈرن کالونیوں، گارڈن ٹاؤن گلبرگ، شادمان اور مسلم ٹاؤن میں دو کنال سے آٹھ کنال تک اراضی الاٹ کرا لی۔ ان ناموں میں ارکان قومی و صوبائی اسمبلی بھی شامل ہیں سینیٹر احسان الحق دو کنال، سینیٹر عبداللہ خان دو کنال، رکن قومی اسمبلی محمد افضل رندھاوا ایک کنال، محمد خان دو کنال، میاں شاہدت علی خان دس مرلے رکن پنجاب اسمبلی رائے عمر حیات ایک کنال، چوہدری محمد علی دو کنال، سابق صوبائی وزیر محمد صادق میں (دو کنال)، چوہدری غلام قادر (دو کنال)، سابق وزیر اعلیٰ کے سابق مشیر راجہ منور احمد (دو کنال)، چوہدری مشتاق احمد (دس مرلے) صوفی نذیر محمد (دس مرلے)، مہر علی مہر (دس

مرلے) سابق صوبائی وزیر محمد افضل وٹو (دو کنال) رائے احمد حیات کھرل (دو کنال) مرزا طاہر بیگ (ایک کنال) سابق صوبائی وزیر اوقاف وجیل خانہ جات ملک حاکمین خان (دو کنال) ملک خالق داد خان (دو کنال) چوہدری بشیر احمد (دو کنال) حاجی محمد بخش مخدوم (دس مرلے) چوہدری حمید اللہ (دس مرلے)۔ شامل ہیں۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے لیڈر اور اراضی حاصل کرنے والوں کے نام اس طرح ہیں۔ عارف اقبال بھٹی نائب صدر پی پی پی لاہور (ایک کنال) مولوی ہدایت اللہ (ایک کنال) شہزادہ جہانگیر بار ایٹ لا (ایک کنال) قیوم نظامی سیکرٹری اطلاعات پی پی پی پنجاب (دس مرلے) راجہ محفوظ علی حیدر پی پی پی رحیم یار خان (دس مرلے) بہادر حسین ڈار (دس مرلے) ایس اے رؤف (دس مرلے) حکیم عمر دین صدر پی پی پی داتا نگر لاہور (دس مرلے) ذکیہ بیگم نے دس مرلے کا پلاٹ لیا۔

اعلیٰ حکام میں ہندوستان میں پاکستان کے سفیر سید فدا حسین دس مرلے سابق اسسٹنٹ ایڈووکیٹ عبدالستار نجم (ایک کنال) مقبول حسین قریشی صاحب زادہ صادق حسین قریشی وزیر اعلیٰ پنجاب (دو کنال) عاشق حسین قریشی معرفت صادق حسین قریشی وزیر اعلیٰ پنجاب (دو کنال) جسٹس محمد افضل چیمہ سیکرٹری وفاقی وزارت قانون (دو کنال) آصف ہاشمی افسر کے از بکار خاص وزیر اعلیٰ پنجاب (سوا کنال) شیخ محمد اسد اللہ سیکرٹری پنجاب اسمبلی (ایک کنال) ایک ریٹائر چیف جسٹس ہائی کورٹ کے ایک ریٹائر جج اور جج صاحبان کو (دو، دو کنال) شوکت علی رانا اسسٹنٹ کمشنر فیروز والا (ایک کنال) سید عابد علی سابق ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنز پنجاب اور مال ڈائریکٹر پی آر او واپڈا (دو کنال) میجر جنرل سعد طارق سابق چیئرمین واپڈا (دو کنال) میاں وحید الدین ڈپٹی سیکرٹری بورڈ آف ریونیو (دو کنال) فاروق ایوب ایڈیشنل سیکرٹری سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن (دو کنال) نبی بخش بھٹی پرائیوٹ سیکرٹری وزیر اعلیٰ (ڈیڑھ کنال) شیخ صلاح الدین ڈپٹی ڈائریکٹر ایل ڈی اے (ایک کنال) سلمان خالق سابق آئی جی پنجاب پولیس (دو کنال) انور آفریدی سابق آئی جی پنجاب (چھ کنال) اشفاق احمد خان ٹاؤن پلانر (ڈیڑھ کنال) ثناء اللہ ڈپٹی ٹاؤن پلانر (ایک کنال) ڈاکٹر عبدالرحیم ڈائریکٹر پلاننگ ایل ڈی اے (ایک کنال) کے محمود وفاقی ایڈیشنل سیکرٹری (ایک کنال) اے اے تسیم کمشنر بہی (دو کنال) مبارز خان اے آئی

آف کمٹھ، بابو کرم بخش، میاں محمد ذاکر قریشی، نواب زادہ ملک مظفر خان آف کالاباغ، مہر غلام حیدر بھروانہ، صاحب زادہ نذیر سلطان جیسے جاگیردار بھی اسمبلیوں میں پہنچ گئے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جاگیرداروں کے خلاف عوام میں جس جوش کو اجاگر کیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ عوام کے مسائل بہرحال ہر صورت میں حل ہونے چاہئیں اور یہ وعدے بھٹو کی تقریروں اور ان کے منشور میں شامل تھے۔ بھٹو صاحب بڑے جہاں دیدہ سیاستدان تھے۔ انہیں اقتدار میں رہنے اور اس سے محروم رہنے میں جو فرق ہوتا ہے، اچھی طرح معلوم تھا۔ انہوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب قوم نے مادر ملت کی عظیم قیادت میں ایوب خان کے خلاف تحریک چلائی تھی۔ وہ وزیر تھے اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ مخالف عوامی تحریک کا سامنا کرنے میں کتنی مشکلات ہوتی ہیں اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ عوامی تحریک کی قیادت کرنے میں کتنا لطف ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں ذائقے ان کے سیاسی کام و دہن میں تازہ تھے۔

بھٹو کو عوام نے اتنے ووٹ دیئے کہ وہ بوکھلا اٹھے کیونکہ کسی سیاسی تجزیہ نگار کو اتنے بڑے اپ سیٹ کی امید نہ تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو حکمرانوں کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ تھے۔ پھر بھی وہ ان غلطیوں سے نہ بچ سکے جو ماضی قریب میں دو فوجی حکمران کر چکے تھے۔ جس استحصالی اور جاگیردار طبقہ کے خلاف انہوں نے زوردار مہم چلائی تھی، وہی پیپلز پارٹی کی صف اول کی قیادت بن گئی تھی۔ وہی غریبوں کی حامی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بھٹو (مرحوم) کا وہ انقلاب فیل ہو گیا جس کا خواب انہوں نے غریب عوام کو دکھایا تھا۔ اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے انہوں نے سیاستدانوں اور جاگیرداروں پر نوازشات کے منہ کھول دیئے۔ ارکان پارلیمینٹ کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے اسلام آباد کے انتہائی قیمتی علاقے میں پلاٹ اونے پونے داموں تقسیم کئے۔ ہم اس لسٹ کی تفصیل پر نگاہ ڈال کر اپنی یادداشت تازہ کر لیں کہ ان میں سے کتنے غریب اور بے گھر ہیں اور انہیں کتنے مربع گز کے پلاٹ الاٹ ہوئے:

سردار شوکت حیات کا پلاٹ ان میں سب سے بڑا 3744 مربع گز تھا۔ سردار شوکت حیات اور مولانا عبدالحق کو دو پلاٹ الاٹ ہوئے۔ مولانا کوثر نیازی کے پلاٹ کا سائز

۳۱۵۷ مربع گز تھا۔ باقی سب چھوٹے سائز میں تھے۔ ان میں مولانا مفتی محمود مرحوم ۱۰۶۷، ملک محمد صادق ایم این اے ۸۰۰، ملک محمد اختر ایم این اے ۸۰۰ فاروق لغاری سینیٹر ۱۱۳۳، محمد سردار خان ایم این اے ۸۰۰، چوہدری غلام حیدر چیمہ ایم این اے ۸۰۰، غلام نبی چوہدری ایم این اے ۸۰۰، نیامت اللہ خان شنواری ایم این اے ۸۰۰، چوہدری نثار احمد بٹول ایم این اے ۸۰۰، چوہدری ممتاز احمد ایم این اے ۸۰۰ سردار شوکت حیات ایم این اے ۱۳۰۰، مہر غلام حیدر بھروانہ ایم این اے ۹۳۳ صاحب زادہ نذیر سلطان آف سلطان باہو ایم این اے ۱۰۶۶، خان کمال محمد گوریجہ ایم این اے ۱۰۶۶، مولوی نعمت اللہ ایم این اے ۱۰۶۶، مولوی صدر الشہید ایم این اے ۱۰۶۶، محمد خان چوہدری ایم این اے، ۹۷۸، چوہدری محمد اسلم سینیٹر۱۰۶۶، محمد ہاشم غلزئی ۱۰۶۶، مس عذرا مسعود دختر میاں مسعود احمد ایم این اے ۱۰۶۶، مولانا عبدالباقی ایم این اے ۱۰۶۶، مہر مہران خان بجارانی سینیٹر ۹۷۷، فضل الٰہی پراچہ سینیٹر۱۰۶۶، عبدالنبی کانجو ایم این اے، اکبر خان ایم این اے ۹۳۳، احمد خان معرفت شہادت خان بھٹی ایم این اے ۹۳۳، تاج محمد جمالی سینیٹر (اب وزیر اعلیٰ بلوچستان ہیں) ۱۰۶۶، حاجی صالح خان ایم این اے ۱۰۱۱، شہادت علی خان ایم این اے ۱۰۱۱، حاجی سید حسین شاہ سینیٹر ۹۳۳ غلام رسول تارڑ ایم این اے ۸۰۰، اتالیق جعفر علی شاہ ایم این اے ۸۰۰، مولانا عبدالحق ایم این اے ۸۰۰، خواجہ سلیمان ایم این اے ۸۰۰، محمد حنیف خان ایم این اے ۹۳۳، مس طلعت احسان دختر احسان الحق پراچہ سینیٹر ۱۲۴۴، سید قمر الزماں شاہ سینیٹر ۱۳۲۲، صاحب زادہ فاروق علی خان سپیکر ۸۰۰، ملک محمد سلیمان ایم این اے ۸۰۰، محمد زمان اچکزئی سینیٹر ۹۳۳، منظور حسین سومرو ایم این اے ۱۰۶۶، ابراہیم برق ایم این اے ۹۳۳، شیرباز خان مزاری ایم این اے ۱۰۶۶، شفقت خان ایم این اے ۱۰۶۶، پیر عبدالقادر شاہ جیلانی ایم این اے ۱۰۶۶ عبدالعزیز بھٹی ایم این اے ۹۳۳، مولانا عبدالحق ایم این اے ۸۰۰، مہر سیع عثمان فاتح سینیٹر ۱۰۰۰، احمد وحید اختر سینیٹر ۸۰۰، چوہدری جہانگیر علی ایم این اے ۱۱۶۶، خان حبیب اللہ خان چیئرمین سینٹ ۸۰۰، محمد داؤد خان ایم این اے ۲۰۰۰، مسز نوشیہ خانم دختر زاہدہ سلطان ایم این اے، ۲۵۰۰، مولانا کوثر نیازی ایم این اے ۳۱۵۷، نصر اللہ خان خٹک ایم این اے ۲۵۰۰، مولانا غلام غوث ہزاروی ایم این اے ۵۵۵ قمر الزماں سینیٹر ۵۰۰، ظہور الحق سینیٹر، ڈاکٹر غلام حسین ایم این اے ۱۷۷۷ مخدوم محمد

امین ایم این اے ۸۰۰ احمد رضا قصوری ایم این اے ۸۰۰، مولانا عبدالحکیم ایم این اے ۸۰۰، سید خیال شاہ سینیٹر، چوہدری بشیر احمد ایم این اے، حفیظ اللہ چیمہ ایم این اے ۱۲۴۴، منظور حسین دوہرا ایم این اے ۱۲۴۴، میاں حامد یاسین ایم این اے ۱۲۴۴، سید صرار علی گردیزی ولد عباس حسین گردیزی ایم این اے ۸۰۰، پاشان میر ولد خورشید حسن میر ایم این اے ۹۳۳، میر دریا خان کھوسو ایم این اے ۱۲۴۴ ملک نصر اللہ خان آفریدی سینیٹر ۸۰۰، ممتاز فاروق خٹک ایم این اے ۱۳۲۲، غلام مصطفیٰ جتوئی ایم این اے ۱۳۰۶، ملک جہانگیر خان ایم این اے ۱۲۴۴ راؤ عبدالستار ایم این اے 1244 ، نوابزادہ محمد ذاکر قریشی ایم این اے ۱۱۷۵، کرم بخش اعوان ایم این اے ۱۳۱۱، محمد یوسف خٹک ایم این اے ۱۴۷۴، عبدالحفیظ پیرزادہ ایم این اے ۱۳۴۴، راجہ تری دیورائے ایم این اے ۱۰۶۶ بیگم شریں وہاب ایم این اے ۱۲۰۰، سکندر یوسف عبدالرحمان ولد جے اے رحیم ایم این اے ۱۰۶۶، اسعد علی نون ایم این اے ۱۲۴۴، میاں احسان الحق ایم این اے ۱۰۶۶، میاں غلام عباس خان ایم این اے ۱۰۴۰، عبدالسبحان ایم این اے ۱۰۴۰، سردار عبدالعلیم ایم این اے ۱۰۰۰، مربع گز کے پلاٹ لینے والوں میں شامل تھے۔

نوازشات کا یہ سلسلہ اسلام آباد تک ہی نہیں بلکہ لاہور میں لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے پلاٹ الاٹ کئے گئے ان میں زیادہ تر سرکاری ملازم تھے اس سے حکومت پر بیورو کریسی کی مضبوط گرفت کے اشارے ملتے ہیں سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے کے دور میں شادمان کالونی میں ۶۸ افراد کو دس مرلے سے لے کر دو کنال تک کے پلاٹ الاٹ کئے گئے ان ناموں کو دیکھ کر اندازہ ہو گا کہ بعض خاندانوں نے مختلف ناموں سے لاہور کی انتہائی ماڈرن کالونیوں، گارڈن ٹاؤن گلبرگ، شادمان اور مسلم ٹاؤن میں دو کنال سے آٹھ کنال تک اراضی الاٹ کرا لی۔ ان ناموں میں ارکان قومی و صوبائی اسمبلی بھی شامل ہیں سینیٹر احسان الحق دو کنال، سینیٹر عبداللہ خان دو کنال، رکن قومی اسمبلی محمد افضل رندھاوا ایک کنال، محمد خان دو کنال، میاں شہادت علی خان دس مرلے رکن پنجاب اسمبلی رائے عمر حیات ایک کنال، چوہدری محمد علی دو کنال، سابق صوبائی وزیر محمد صادق میں (دو کنال)، چوہدری غلام قادر (دو کنال)۔ سابق وزیر اعلیٰ کے سابق مشیر راجہ منور احمد (دو کنال)، چوہدری مشتاق احمد (دس مرلے) صوفی نذیر محمد (دس مرلے)، مہر ز علی مہر (دس

مرلے) سابق صوبائی وزیر محمد افضل وٹو (دو کنال) رائے احمد حیات کھرل (دو کنال) مرزا طاہر بیگ (ایک کنال) سابق صوبائی وزیر اوقاف وجیل خانہ جات ملک حاکمین خان (دو کنال) ملک خالق داد خان (دو کنال) چوہدری بشیر احمد (دو کنال) حاجی محمد بخش مخدوم (دس مرلے) چوہدری حمید اللہ (دس مرلے)۔ شامل ہیں۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے لیڈر اور اراضی حاصل کرنے والوں کے نام اس طرح ہیں۔ عارف اقبال بھٹی نائب صدر پی پی پی لاہور (ایک کنال) مولوی ہدایت اللہ (ایک کنال) شہزادہ جہانگیر بار ایٹ لا (ایک کنال) قیوم نظامی سیکرٹری اطلاعات پی پی پی پنجاب (دس مرلے) راجہ محفوظ علی حیدر پی پی پی رحیم یار خان (دس مرلے) بہادر حسین ڈار (دس مرلے) ایس اے رؤف (دس مرلے) حکیم عمردین صدر پی پی پی داتا نگر لاہور (دس مرلے) ذکیہ بیگم نے دس مرلے کا پلاٹ لیا۔

اعلیٰ حکام میں ہندوستان میں پاکستان کے سفیر سید فدا حسین دس مرلے سابق اسسٹنٹ ایڈووکیٹ عبدالستار نجم (ایک کنال) مقبول حسین قریشی صاحب زادہ صادق حسین قریشی وزیر اعلیٰ پنجاب (دو کنال) عاشق حسین قریشی معرفت صادق حسین قریشی وزیر اعلیٰ پنجاب (دو کنال) جسٹس محمد افضل چیمہ سیکرٹری وفاقی وزارت قانون (دو کنال) آصف ہاشمی افسر کیے از بکار خاص وزیر اعلیٰ پنجاب (سوا کنال) شیخ محمد اسد اللہ سیکرٹری پنجاب اسمبلی (ایک کنال) ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج اور جج صاحبان کو (دو، دو کنال) شوکت علی رانا اسسٹنٹ کمشنر فیروز والا (ایک کنال) سید عابد علی سابق ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنز پنجاب اور مال ڈائریکٹر پی آر او واپڈا (دو کنال) میجر جنرل سعد طارق سابق چیئرمین واپڈا (دو کنال) میاں وحید الدین ڈپٹی سیکرٹری بورڈ آف ریونیو (دو کنال) فاروق ایوب ایڈیشنل سیکرٹری سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن (دو کنال) نبی بخش بھٹی پرائیوٹ سیکرٹری وزیر اعلیٰ (ڈیڑھ کنال) شیخ صلاح الدین ڈپٹی ڈائریکٹر ایل ڈی اے (ایک کنال) سلمان خالق سابق آئی جی پنجاب پولیس (دو کنال) انور آفریدی سابق آئی جی پنجاب (چھ کنال) اشفاق احمد خان ٹاؤن پلانر (ڈیڑھ کنال) ثناءاللہ ڈپٹی ٹاؤن پلانر (ایک کنال) ڈاکٹر عبدالرحیم ڈائریکٹر پلاننگ ایل ڈی اے (ایک کنال) کے محمود وفاقی ایڈیشنل سیکرٹری (ایک کنال) اے اے تسیم کمشنر بی (دو کنال) مبارز خان اے آئی

جی ویلفیئر پنجاب پولیس (ایک کنال) ایس ایم اشرف جائنٹ ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر (ایک کنال) محمد اسلم بٹ پی اے ٹو آئی جی پنجاب پولیس (دس مرلے) حاجی محمد اکرم صوبائی سیکرٹری (ڈیڑھ کنال) نذیر احمد سپرنٹنڈنٹ گورنر ہاؤس (دس مرلے) شوکت علی کمپٹرولر گورنر ہاؤس (دس مرلے) ایم اے مفتی پی اے ٹو سیکرٹری ٹو گورنر پنجاب (دس مرلے) یوسف سپروائزر فشریز گورنر ہاؤس (دس مرلے) ایم محمود چیئرمین پنجاب پبلک سروس کمیشن (دو کنال) کے زیڈ درانی کمشنر سوشل سیکورٹی (ایک کنال) اے یو سلیم ایڈمنسٹریٹر لاہور میونسپل کارپوریشن (ایک کنال) ریٹائرڈ بریگیڈیئر مظفر خان ملک چیف سیکرٹری پنجاب (دس مرلے) چوہدری محمد اکرم سابق سیکرٹری خوراک (دس مرلے) جاوید احمد قریشی چیئرمین سیڈ کارپوریشن (ایک کنال) خالد جاوید کمشنر لاہور ڈویژن (ایک کنال) اقبال مسعود صوبائی سیکرٹری (ایک کنال) اسد علی شاہ ہوم سیکرٹری پنجاب (ایک کنال) نسیم احمد سابق وفاقی سیکرٹری اطلاعات (ایک کنال) صاحب زادہ رؤف علی سابق انسپکٹر جنرل پولیس دو کنال اور دو کنال کا دوسرا پلاٹ اہلیہ کے نام ڈاکٹر اسد ملک سیکرٹری ہاؤسنگ (دو کنال) علی حسن انڈونیشیا میں پاکستانی سفیر دو کنال اور دو کنال کا دوسرا پلاٹ اہلیہ کے نام، اے جی رضا وفاقی لینڈ کمشنر (دو کنال) اے کے چوہدری صوبائی سیکرٹری (دو کنال) آئی اے امتیازی سابق ایڈیشنل سیکرٹری (دو کنال) خالد احمد کھرل ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ (دو کنال) ہمایوں فیض رسول (دو کنال) شوکت حسین پرسنل اسسٹنٹ وزیر اعلیٰ (دس مرلے) ملک منظور علی کمپٹرولر چیف منسٹر ہاؤس (دس مرلے) مراتب علی شیخ پی آر او وزیر اعلیٰ (دس مرلے) حفیظ اللہ اسحاق ڈپٹی کمشنر لاہور (دو کنال) کشور ناہید پاکستان نیشنل سنٹر (ایک کنال) ایل ڈی اے کے سید امتیاز، عبدالحمید ڈار عبدالقدیر کوثر اور عباس علی شاہ (ایک ایک کنال) مسماۃ نور جہاں دو کنال اور چھ ارکان اسمبلی سید مہتاب احمد شاہ مظفر گڑھ، چوہدری منظور احمد گوندل گجرات منیر علی ہرل فیصل آباد صوفی نذر محمد نارووال، چوہدری مشتاق احمد لاہور اور سید نذر حسین حافظ آباد کو ایک ایک کنال کے پلاٹ دیئے گئے۔ اس کے علاوہ شیخ رشید وفاقی وزیر، اور ڈپٹی سپیکر مسٹر شمیم احمد بھی پلاٹ حاصل کرنے والے خوش نصیبوں میں شامل تھے۔

جب ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار کا سورج گہنا گیا تو نصرت بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو کی گرفتاری کے خلاف سپریم کورٹ میں درخواست دی۔ اس درخواست پر آئینی بحثیں چھڑ گئیں۔ وفاق پاکستان کی طرف سے مسٹر اے کے بروہی پیش ہوئے جنہوں نے مسٹر بھٹو کی حکومت کو غیر قانونی، بیسویں صدی کی بدترین لاقانونیت قرار دیتے ہوئے غریب عوام کی کمائی پر شاہانہ عیش و عشرت کے خلاف "تاریخ کی شہادت" کے نام سے طویل الزامات کی تفصیل عدالت کے سامنے پیش کی۔ انہوں نے عدالت کو بتایا کہ راؤ رشید نے ہر حال میں اپوزیشن کو تیس نشستوں پر ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں شکست دینے کے احکامات دیئے تھے۔ ان میں قومی اسمبلی حلقہ نمبر ا پشاور ائیر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان، این اے ۳ پشاور ۳ سردار شیر باز مزاری، این اے ۸ مردان ۳ بیگم نسیم ولی خان، این اے ۱۲ ایبٹ آباد ائیر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان، این اے ۱۳ ایبٹ آباد ۳ گوہر ایوب، این اے ۳۵ فیڈرل کیپٹل پروفیسر عبدالغفور، این اے ۴۷ گجرات ۱ اور این اے ۴۸ گجرات ۲ سے چوہدری ظہور الٰہی این اے ۶۰ میانوالی این اے ۶۱ میانوالی ۲ سے مولانا عبدالستار خان نیازی این اے ۸۲ لاہور ۲ حنیف رامے، این اے ۱۵۰ رحیم یار خان ۳ حسن محمود مخدوم زادہ این اے ۱۸۳ کراچی ۱ شیرباز مزاری، این اے ۱۹۰ کراچی ۸ ائیر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لئے حزب اختلاف کے امیدواروں میں پی پی ۲۳ راجہ منور احمد، پی پی ۵۱ میانوالی ۲ مولانا عبدالستار نیازی۔ پی پی ۹۹ لاہور ۱۶ مسعود احمد کھوکھر پی پی ۱۶۱ ملتان نمبر ۵ ایم کے خاکوانی، پی پی ۲۳۸ رحیم یار خان ۵ مخدوم زادہ حسن محمود، پی پی ۲۳۹ رحیم یار خان ۸ حسن محمود مخدوم زادہ اس طرح سندھ اور بلوچستان کی صوبائی قیادت کے لئے جو کل کو خطرہ بن سکتے تھے، ہر صورت میں شکست دینے کا حکم جاری کیا۔ ۷۲-۱۹۷۱ء سے ۷۷- 1976 تک کے برسوں میں مجموعی طور پر ایک کروڑ ۹۵ لاکھ ۶۷ ہزار ۵۶۳ روپے ۳۷ پیسے بھٹو نے سیکرٹ فنڈ سے استعمال کئے۔ بھٹو نے ان فنڈز کے بیشتر حصے کو پارٹی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ان میں مسٹر خورشید حسن میر ۱,۹۴,۶۳۲ روپے ڈاکٹر مبشر حسن ۲,۳۰,۰۰۰، ڈاکٹر غلام حسین ۱,۰۰,۰۰۰، مسٹر ناصر رضوی ۲,۱۰,۰۰۰ پی پی پی کے صوبائی صدر مسٹر حیات شیرپاؤ ۳۰,۰۰۰، پی پی پی پنجاب کے صدر اور جنرل سیکرٹریز میں میاں محمد افضل وٹو ۴۰,۰۰۰ مسٹر محمد خالد ملک ۱۰,۰۰۰، پی پی کوئٹہ کے صدر غوث بخش رئیسانی ۱,۹۰,۰۰۰ صوبہ سرحد کے وزیر

اعلیٰ مسٹر نصر اللہ خاں خٹک 1,50,000 روپے دیئے انٹیلی جنس بیورو کے فنڈز سے پرائم منسٹر سیکریٹ سے دی جانے والی رقم کچھ اس طرح ہے مسٹر خورشید حسن میر ۱۵,۳۶۷ ڈاکٹر مبشر حسن ۳۰,۰۰۰, ڈاکٹر غلام حسین ۴۰,۰۰۰ مسٹر ناصر علی رضوی ۱۰,۰۰۰ مسٹر حیات محمد شیر پاؤ ۵۰,۰۰۰، مسٹر آفتاب احمد شیر پاؤ ۲۰,۰۰۰، میاں محمد افضل وٹو ۲۰,۰۰۰، مسٹر محمد خالد ملک ۵۰,۰۰۰، سردار غوث بخش رئیسانی ۳۵,۰۰۰، مسٹر نصر اللہ خان خٹک ۳۰,۰۰۰، مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی کو ۸۰,۰۰۰، روپے دیئے گئے۔ دیگر الزامات میں "پیپلز فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ ۱۴ر اگست ۱۹۷۴ء کو قائم کیا گیا تھا۔ یہ ٹرسٹ خالص خیراتی وقف ادارے کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا اور سنٹرل بورڈ آف ریونیو سے اس کی اسی حیثیت میں رجسٹریشن حاصل کی گئی تھی۔ اس کو بھٹو خاندان کے لئے استعمال کیا گیا۔ تمام ٹرسٹی بھٹو خاندان سے تھے اور نصرت بھٹو اس کی چیئرمین تھی۔ (ب) ۲۲ کنال کا ایک پلاٹ جو لارنس روڈ اور ریس کورس کے سنگم پر واقع ہے، ۵ لاکھ ۶۴ ہزار کی معمولی قیمت پر لیا گیا جبکہ اس کی بازار میں مجوزہ قیمت ۲ لاکھ سے تین لاکھ روپے فی کنال تھی۔

(ج) صنعتی ترقیاتی بنک نے پرنٹنگ پریس کی مشینری کی خریداری کے لئے قرض دیا اور ایسا کرتے ہوئے ضوابط کو نظر انداز کیا گیا۔ یہ پریس پیپلز پارٹی کے اخبار کی طباعت کے لئے استعمال کیا گیا اور پیپلز پبلی کیشنز لمیٹڈ نے ۱۹ لاکھ ۴۶ ہزار روپے میں ٹرسٹ کو منتقل کر دیا (یہ بھٹو خاندان کی ملکیت ہے) (د) ٹرسٹ نے کراچی میں ۳۵۴۹ مربع گز کا ایک پلاٹ ۲۳۵ روپے فی مربع گز کے حساب سے حاصل کیا جبکہ اس وقت مارکیٹ کی قیمت ۱۵۰۰ روپے فی مربع گز تھی۔ اس پلاٹ پر دو کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک دس منزلہ عمارت تعمیر کی گئی یہ تعمیر کراچی میونسپل کارپوریشن کے ضوابط کی خلاف ورزی ہے اس عمارت کا نقشہ بھی منظور نہیں کروایا گیا۔

(د) اس عمارت کے حصے کرائے پر دینے کے لئے سرکاری کارپوریشنوں سے پیشگی کرایہ کی رقم حاصل کی گئی اور اس سے سالانہ ۴۸ لاکھ روپے کرایہ وصول ہوتا ہے۔

۲۳ر اگست ۱۹۷۴ء سے ۱۰ مئی ۱۹۷۷ء تک ابو ظہبی کے حکمران سے مختلف قسطوں میں دو کروڑ ۴۸ لاکھ ۷۵ ہزار ۲۹۷ روپے ۳۰ پیسے وصول کئے۔ یہ عطیے ابو ظہبی

کے حکمران نے پاکستان کے عوام سے اپنی محبت کے اظہار کی وجہ سے دیئے لیکن ٹرسٹ نے اسے بھٹو اور پیپلز پارٹی کا پروپیگنڈا کرنے اور ان کی تشہیر کے لئے غلط طور پر استعمال کیا۔ یہ رقم پارٹی کے اخبارات اور رسائل کے ذریعے خرچ کی گئی۔ جسے ہلال پاکستان اور نصرت وغیرہ جو ٹرسٹ شائع کرتا ہے۔

پیپلز فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے علاوہ ایک اور ٹرسٹ جو زیڈ اے بھٹو ٹرسٹ کہلاتا تھا، قائم کیا گیا۔ یہ ٹرسٹ ۶ر نومبر ۱۹۷۳ء کو قائم کیا گیا اور اس کے لئے ابو ظہبی حکومت سے فنڈ لئے گئے۔ انہوں نے ۲۷ لاکھ ابتدائی طور پر اور ایک لاکھ امریکی ڈالر کا عطیہ دیا۔ ابو ظہبی کے حکمران نے تقریباً تین کروڑ روپے زر مبادلہ میں عطیہ دیا۔ اس ٹرسٹ کا مقصد پاکستان کے عوام کے لئے طبی، تعلیمی اور مذہبی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا تھا۔ تاہم قانون کی خلاف ورزی کر کے اسے ذاتی تشہیر کا ایک ادارہ بنا دیا۔ نصرت بھٹو اس ٹرسٹ کی بھی چیئرپرسن تھیں۔ ۱۹۷۷ء کے الیکشن کے کاموں کے لئے اور کارکنوں کو پارٹی خدمات کے صلہ میں نوازنے کے لئے موٹر سائیکل اور سائیکل تقسیم کئے گئے۔

ضلع	طلبہ میں	مزدوروں میں	کارکنوں میں
	سائیکل۔ موٹر سائیکل	سائیکل۔ موٹر سائیکل	سائیکل۔ موٹر سائیکل
قصور ڈویژن	ـــــــ	ـــــــ	۳_۱۲
لاہور ڈویژن	۳_۳	۶_۲	۳_۳
گوجرانوالہ ڈویژن	x_۳	۳_x	۱۸_۲
شیخوپورہ ڈویژن	x_۲	۴_x	۱۸_۲
سیالکوٹ	۳_x	۴_۱	۳۰_۳
راولپنڈی	۳_۱	۶_۱	x_۳
جہلم	۲_۱	۳_x	۱۸_۳
گجرات	x_۲	۲_۱	۱۸_۳
ملتان	۳_۱	۴_۲	۳۰_۳
وہاڑی	۳_۱	ـــــــ	۱۸_۳
ساہیوال	۲_۱	۲_x	۲۴_۳

مظفر گڑھ	x _ ۱	x _ ۲	۳ _ ۲۴
ڈیرہ غازی خان	x _ ۲	x _ ۲	۳ _ ۱۸
سرگودھا	۱ _ ۲	۱ _ ۳	۳ _ ۲۴
فیصل آباد	x _ ۳	۱ _ ۵	۳ _ ۲۴
جھنگ	x _ ۱	x _ ۲	۳ _ ۱۸
میانوالی	x _ ۱	x _ ۳	۳ _ ۱۸

بہاولپور میں مجموعی طور پر گیارہ موٹر سائیکل اور ۷۶ سائیکل کارکنوں میں تقسیم کیے گئے۔

اس کے علاوہ بھٹو نے چھ کروڑ کی تشہیر سرکاری فنڈز سے کی۔ بنکوں سے قرضوں کی تفصیل الگ ہے علاوہ ازیں سیاسی نوازشات کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ یہاں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

1977 ء میں ضیاالحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا تو عام انتخابات سے پہلے احتساب کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس سلسلے میں ۳ر ستمبر ۱۹۷۷ء کو مارشل لاء کا ضابطہ نمبر ۲۱ جاری کیا گیا جس کی رو سے ایسے تمام افراد جو دسمبر ۱۹۷۰ء سے جولائی ۱۹۷۷ء تک کسی صوبائی یا مرکزی اسمبلی کے ممبر یا سینیٹر رہے ہوں، انھیں اس ریگولیشن کی تاریخ سے پندرہ یوم کے اندر اپنے اثاثوں اور منقولہ اور غیر منقولہ املاک کے گوشوارے داخل کرانے کا پابند کیا گیا۔ ۳ر فروری ۱۹۷۸ء کو اعلان کیا گیا کہ ۸۹ سیاستدانوں کے مقدمات نااہل قرار دینے والی خصوصی عدالتوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں پیپلز پارٹی کی مرکزی اور صوبائی قیادت شامل تھی۔ ۱۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو حکومت نے مارچ ۱۹۷۷ء کی انتخابی دھاندلیوں کے بارے میں پہلا وائٹ پیپر شائع کیا۔ دوسری جلد میں یہ بتایا گیا کہ مسٹر بھٹو نے سٹیٹ کے بااختیار اداروں، پارلیمنٹ، عدلیہ، سرکاری و نیم سرکاری اداروں کو کس طرح اپنے مخالفین اور حکمران جماعت پر نکتہ چینی کرنے والوں کے خلاف استعمال کیا۔

تیسری جلد میں ریاستی اقتدار کے غلط استعمال کا ذکر کیا گیا تھا۔ غیر جماعتی اسمبلی کے ذریعے ۱۹۸۵ء میں جب محمد خان جونیجو نے وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے کے بعد سب

سے پہلا کام یہ کیا کہ اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے (سی ڈی اے) کو ایک خصوصی حکم نامہ ارسال کیا جس کی رو سے تمام رہائشی پلاٹوں کی الاٹمنٹ پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ پابندی محمد خاں جونیجو نے بعض ارکان اسمبلی کی شکایت پر لگائی تھی۔ اس وقت سی ڈی اے کے چیئرمین جان نادر خان تھے جن پر قومی اسمبلی اور سینٹ کے ارکان نے دباؤ ڈالا تھا کہ انھیں انکی پسند کے پلاٹ الاٹ کئے جائیں۔ جب چیئرمین سی ڈی اے نے ان کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ان ارکان اسمبلی نے چیئرمین کے خلاف شکایات کا دفتر کھول دیا۔ مئی ۱۹۸۵ء میں چیئرمین نادر خان کو ان منصب سے سبکدوش کر کے ان کی جگہ مظفر رفیع کو سی ڈی اے کی نئی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ جن درخواستوں پر سی ڈی اے نے اپنے مجوزہ قواعد و ضوابط کے مطابق پلاٹ الاٹ کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی، ایسے تمام معاملات کیبنٹ ڈویژن کو ریفر کیے گئے تاکہ وزیر اعظم ان پر اپنا فیصلہ صادر کر دیں اور معاملات محمد خان جونیجو کے پاس دو ڈھائی سال تک التوا میں پڑے رہے۔ ایک وفاقی وزیر کے بقول کہ وزیر اعظم چاہتے تھے کہ سب سے پہلے قومی اسمبلی اور سینٹ کے اراکین کو اچھے اور خوبصورت سیکٹروں میں پلاٹ الاٹ کئے جائیں۔ ۲۲ ستمبر کے اجلاس میں سید عابدہ حسین کے ایک سوال کے جواب میں ایوان کو بتایا گیا کہ وزیر اعظم کی طرف سے حال ہی میں ۷۵ ارکان اسمبلی کو اسلام آباد میں پلاٹ الاٹ کئے گئے ہیں۔ ان میں ۶۳ پلاٹ سیکٹر ایف اور گیارہ پلاٹ جی گیارہ میں الاٹ ہوئے۔ اس فہرست میں محمد خان جونیجو کے روحانی مرشد پیر آف پگاڑا کا نام شامل نہیں تھا۔ جنھیں اسلام آباد کے سب سے خوبصورت سیکٹر ای ۷/۲ میں ۴ کنال کا پلاٹ دیا گیا جن ممبران کو سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے اپنے ہی ڈائریکٹو کو بائی پاس کرتے ہوئے رہائشی قطعات عنایت کئے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء تک یعنی محمد خان جونیجو کے دور حکومت کے خاتمے تک ایک آدھ کے سوا کسی نے مکان تعمیر نہیں کیا تھا۔ صرف ایک سو چالیس سے زائد مسلم لیگی ارکان کو پلاٹ ملے تھے۔ ان میں صرف کنور قطب الدین اور نواز بوسال نے مکان تعمیر کئے۔ ان میں سندھ کی ایک روحانی شخصیت کو سیکٹر ایف ۶ میں پلاٹ الاٹ ہوا تھا۔ انھوں نے اسے ۲۵ لاکھ میں فروخت کر دیا۔ ان پلاٹ حاصل کرنے والے مسلم لیگی ارکان نے سیکٹر ایف ۸، ایف ۱۰، جی ۱۱ میں آٹھ آٹھ سو مربع گز کے پلاٹ پندرہ سے بیس لاکھ میں فروخت کر دیئے جبکہ انھیں ایک پلاٹ کی قیمت ڈیڑھ لاکھ سے بھی کم ادا کرنا پڑی تھی۔

پاٹ حاصل کرنے والوں میں سردار غلام احمد، سردار مقصود احمد لغاری، سید شاہد نسیم سدی، احمد میمن، مسز فرخ مختار، راجہ افسر، میاں شمیم حیدر، ملک محمد اسلم، سید احمد عالم انور، صاحب زادہ نور حسن، سالم خان، امان الظفر، انور علی چیمہ، صاحب زادی محمودہ بیگم، نواب زادہ مظہر علی، مولانا محمد رحمت اللہ، غلام محمد چشتی، ایم پی بھنڈرا، بیگم سلمیٰ احمد، میاں محمد آصف، بیگم نسیم ماجد، محمد اسلم بھیلد، پرنس جام محمد یوسف، رانا شوکت حیات نون بیگم بلقیس شہباز، بریگیڈیئر افتخار بشیر محمد اکرم خان، چوہدری محمد اقبال، نواب یامین خان، حاجی خیر محمد ہنور، محمد قاسم خان، محمد عارف جان محمد حسنی، بیگم سروری صادق، قمر الزماں شاہ کھگہ، پادول کو بلی، خواجہ صفدر محمود، اسلام الدین شیخ، رانا تنویر احمد خان، غلام محمد مانیکا، سینیٹر ملک عبدالواحد، پیر محمد صابر شاہ، فضل داد خان، مقبول احمد خان، چوہدری ممتاز احمد تارڑ، چوہدری امیر حسین، راجہ شاہد سعید، رائے منصف علی، عارف حسین ملک محبوب حسین، عطا محمد مری، ملک عبدالرؤف، صاحب زادہ محمد احمد علامہ مصطفیٰ الازہری، غلام الدین مروت، چوہدری محمد سرور، بیگم بلقیس نصر من اللہ، گوہر ایوب، ڈاکٹر مس نور جہاں پانیزئی، بریگیڈیئر محمد اصغر، پیر محمد ثناءاللہ بودلہ، بیگم عشرت اشرف، میر نواز علی مروت، کنور قطب الدین، یعقوب خان، کیپٹن ریٹائرڈ ثناءاللہ، لیفٹننٹ کرنل (ریٹائرڈ) ہربرٹ بلوچ، مسز ریحانہ مشہدی، راجہ محمد افضل، سردار محمد جہانگیر، پیر علی گوہر شاہ، چوہدری ممتاز احمد، آغا عطا محمد خان، میر مہران خان بجرانی، دل مراد نادر شاہ، حاجی جاوید اقبال، شہزادہ محی الدین، سردار محمد سرفراز، چوہدری نواز بوسال، ملک عمرالدین بخش، سید احمد عالم انور، راجہ محمد بھدرانہ، امان اللہ خان شاہانی، نواب امان اللہ خان سیال، سید منظور حسین، ریاض دولتانہ، ملک غلام مجتبیٰ غازی کھر، حمید خان، میر خدا داد خان، محمد ایوب خان، ملک نادر خان، نواز عبدالسبحان، بھگوان داس چاولہ، محمد اسلم، میاں گل اورنگزیب، گل جی، سینیٹر عبدالرحمان جمالی، سینیٹر شاد کرم علی، سینیٹر ملک سعد اللہ خان، سینیٹر بریگیڈیئر عبدالقیوم خان، سینیٹر گلاب خان، سینیٹر محمد ہاشم، سینیٹر مولانا سمیع الحق، سینیٹر ملک محمد علی، سینیٹر اصغر علی شاہ، سینیٹر نواب زادہ، شیخ محمد خان، سینیٹر احمد میاں سومرو، سینیٹر سید شجاعت حسین قریشی، سینیٹر اسحاق بلوچ، سینیٹر امان ارم، سینیٹر محمد فضل آغا، سینیٹر رسول بخش لہری۔

سابق صدر ضیاالحق نے محمد خان جونیجو کی وزارت کو ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جب

برخاست کیا تو ان کے وزراء اور ارکان اسمبلی کے خلاف بدعنوانیوں اور ملکی خزانے کی لوٹ کھسوٹ کے الزامات عائد کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ملک کو معاشی اعتبار سے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

جونیجو دور کی غیر جماعتی اسمبلی میں پہلے ہی سال بدعنوانیوں اور رشوت کی گرم بازاری کی گونج سنائی دینے لگی۔ جاوید ہاشمی جو محمد خان جونیجو کے خلاف حزب اختلاف کے بینچوں پر بیٹھ کر پارلیمانی جوہر دکھاتے رہے، انہوں نے محمد خان جونیجو کی حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس دور میں سیکرٹری سطح پر اور سیاست کے اندر اربوں روپے میں ملک کو بیچا جا رہا ہے۔ اسمبلی کے ایوانوں میں ارکان اس طرح کے خیالات کا کھلم کھلا اظہار کرنے لگے جس سے جونیجو حکومت کی بدعنوانیاں فاش ہوتی تھیں۔ رکن قومی اسمبلی جناب عبدالحمید جتوئی نے اس دور میں ملازمتوں کے ریٹ بتاتے ہوئے کہا پرائمری ٹیچر ۲ ہزار، اسسٹنٹ انجینئر کے بھرتی ہونے کا ریٹ ۵۰ ہزار اور اس سے بڑی نوکری کا ایک لاکھ ہے مئی ۸۷ء میں وفاقی وزراء اور وزرائے مملکت کے اہل خانہ کے گوشواروں کے حصول کے لئے سابق صدر ضیاالحق نے کوڈ آف کنڈکٹ جاری کیا اس کے تحت اگر وزراء بد عنوان ثابت ہوں تو ان کے خلاف مقدمات درج کئے جائیں۔ سابق وزیر اعظم جونیجو نے امریکہ کو در آمد کرنے کے لئے تولیہ سیکنڈل کے سلسلہ میں سخت اقدامات کئے۔ ۳۰ ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو وفاقی وزیر پرنس محی الدین اس سیکنڈل کے سبب مستعفی ہوئے۔ محمد خان جونیجو کے ایک وزیر انور عزیز کو کواپریٹو سوسائٹی فنڈ کے سیکنڈل میں مستعفی ہونا پڑا تھا۔

ارکان اسمبلی کو ترقیاتی فنڈز کے نام پر کروڑوں روپے دیئے گئے۔ انتخابات تک ایسی رقوم صرف پنجاب میں ایک کروڑ سے کہیں زیادہ تھیں۔ کچھ اہم شخصیات بدعنوانیوں میں ملوث تھیں جونیجو حکومت کی قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین صاحب زادہ محمد علی شاہ نے کہا کہ "نوکر شاہی عوام سے کھلے عام رشوت لے رہی ہے۔ ہر کام پر پیسے طلب کئے جاتے ہیں۔ سرکاری محکموں میں یہ کھلے عام ڈکیتی ہے جیسا کہ گن پوائنٹ پر راہزن لوٹتے ہیں۔"

پنجاب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے ۵۰ ارب کے خرد برد کا انکشاف بھی کیا۔

○ ــــ ۸۳ ارب روپے کے قرضوں کی مختلف قسم کے دباؤ کی وجہ سے عدم ادائگی

- ری بیٹ کی مد اور بنکوں میں کروڑوں روپے کا فراڈ
- افراد زر کی وجہ سے زیر گردش نوٹوں کی تعداد میں ایک ارب ۱۷ کروڑ روپے کا اضافہ
- ٹیکس چوروں اور ہیروئن کے سمگلروں کے پاس ایک کھرب ۲۲ ارب روپے کا انکشاف بھی رپورٹ میں شامل تھے۔

سابق صدر ضیا الحق نے بد عنوانی اور کرپشن کو روکنے کے لئے جتنی بھی کوششیں کیں، وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ انہوں نے بھی فوجی افسروں اور سیاستدانوں کو جس قدر پلاٹ الاٹ کئے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ نئے سیکٹروں، کمرشل اور صنعتی علاقوں میں الاٹمنٹ تو اپنی جگہ، پرانے سیکٹروں میں کسی اور کام کے لئے مخصوص جگہوں یا گرین ایریا میں نئے پلاٹس بنا کر انہیں فروخت کرنے سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک بے شمار لوگوں نے ضیاء الحق کی خوشامد کر کے یا ضیا الحق نے سیاسی حواریوں کو پلاٹ بطور رشوت دی ان میں ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک سیکٹر ۶ جی، ۷ جی، ۶ ایف اور ۸ ایف میں جو نئے پلاٹس بنا کر الاٹ کئے گئے، ان کی تعداد ۷۶ تھی۔ الاٹمنٹ کی اس فہرست میں دار الحکومت کے سب سے مہنگے علاقے ۷۔ ای اور دوسرے سیکٹروں ۹۔ جی، ۸۔ جی، ۱۰ جی، ۸۔ ای اور ۱۰۔ ایف کے علاقوں میں کی گئی الاٹمنٹس شامل نہیں۔ اس فہرست میں دس پلاٹس ایسی خواتین کو دیئے گئے جن کی ولدیت یا زوجیت ظاہر نہیں کی گئی۔ ان میں مسز ثریا فرمان علی ۵۰۰، مسز شوکت آرا ۲۲۳، مسز تسیم اختر کیانی ۲۳۳، مسز مسرت حسین قاضی ۲۳۳، مسز رفعت مسعود ۲۳۳ مسز تسنیم کوثر ۲۳۳، مسز نوشابہ خاتون، ۲۳۳، مسز سعدیہ انور کے نام شامل ہیں۔ ایک پلاٹ حاصل کرنے والے دیگر خوش نصیبوں کے نام کچھ یوں ہیں۔ کیپٹن وحید ارشد ولد ارشد چوہدری (پی ڈی پی کے لیڈر کے بیٹے ہیں) کو ۱۳۷۸ مربع گز ڈاکٹر محمد افضل سابق وزیر تعلیم ۸۵۵، مسز انجم نسرین ۸۵۵، ڈاکٹر آفتاب احمد خان ۸۰۰، مسز روبینہ سلیم ۱۰۶۶، ڈاکٹر بشارت جذبی ۱۲۶۶، مسز نسرین اختر ۵۰۰، مسٹر اعجاز الحق ۱۰۶۶، الہی بخش سومرو ۱۰۲۲ لیفٹننٹ جنرل محمد اکرم ۸۸۸، اے کے بروہی، مسز آر محمد علی خان ۹۳۳، گل جی ۹۳۸، مسز ثریا صفدر ۱۲۳۳، مسز سعید زمان نقوی ۸۰۰، مسٹر ریاض خان ۸۰۰، انور حسین ۹۳۳، ائیر

مارشل وقار عظیم ۱۳۲۳، شوکت جاوید ۵۵۵ صفیر اسد حسین ۱۲۰۰، محمد افضل کھوٹ ۱۱۶۶، محمد انظار الحق ۱۴۰۰، (ضیا الحق کے بھائی) لیفٹننٹ جنرل جہاں داد خان ۱۸۰۰، عبد القیوم ۵۵۶، راجہ محمد اکرم خان ۵۵۶، سیٹھ اللہ دتہ ۱۰۶۶، سید حسن رضا ۷۰۰، بریگیڈئر محمد انور ۷۰۰، ڈاکٹر ساجد شاہ ۳۶۶، مسز سرور سلطانہ ۳۶۶، مسز نیئر محفوظ ۳۶۶، مسز شاہد عشی ۳۶۶، لیفٹننٹ کرنل محمد ظہیر ملک، لیفٹننٹ عبد الجلیل ۸۰۰، شفیع اے سوانی ۸۰۰، ایڈمرل (ریٹائر) کے آر نیازی ۱۵۱۲، بریگیڈئر ذوالفقار احمد خان ۸۰۰، مسز سلیمہ آر خان ۸۰۰ ائیر مارشل جمال اے خان ۸۰۰، مسز عزت بانو بلگرامی ۸۰۰ مسز زبیدہ فیاض ۲۶۷، کرنل ریٹائر ایم اے حسن ۲۶۷، محمد اسلم باجوہ ۸۰۰، ایم زیڈ اے تیموری ۷۰۰، وائس ایڈمرل احمد ضمیر ۸۵۵، بیگم بشریٰ ملک زوجہ میجر جنرل عبد الوحید ملک ۶۰۰، یوڈی خان ۵۰۰، میجر جنرل شاہ رفیع عالم ۶۰۰، افتخار احمد خان ۶۰۰، اے آر صدیقی ۸۰۰، ایڈمرل طارق کمال خان ۱۵۵۶، مسز شمیم اعجاز ۴۶۶، پروفیسر شیخ امتیاز علی ۶۰۰، سید احمد شہود الحق ایڈووکیٹ ۶۰۰، چوہدری فضل داد ۱۱۵۵، نوابزادہ جہانگیر شاہ جوگیزئی ۹۳۳، رفیق احمد ۹۵۵، شیخ حفیظ الرحمان ۸۶۱، الطاف یاور اور ۳۸۷، طارق حمید ۶۰۲، سردار خضر حیات ۴۴۹ مربع گز کے پلاٹ حاصل کرنے والوں میں شامل تھے۔

ضیاء الحق جن کے بارے میں عوامی رائے عامہ یہی تھی کہ وہ حکومت کی ان خرابیوں سے دور رہتے ہیں جو اقتدار ختم ہونے کے بعد بد عنوانی کی صورت میں منظر عام پر آتی ہیں، اپنے گیارہ سالہ دور حکومت میں جنرل ضیا۔ الحق اور ان کے قریبی ساتھیوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کیا۔ محمد خان جونیجو کے جن ساتھیوں کو بد عنوان اور کرپٹ کہہ کر حکومت سے فارغ کیا تھا، ان میں سے نصف درجن سے زائد یہی وزراء ضیاالحق کی نئی کابینہ میں شامل تھے ان کے بعض ساتھیوں نے اربوں روپے کی جائیدادیں بنائیں۔ ۱۹۸۰ء کے وسط میں امریکی جریدے ٹائم کے اس شمارہ پر پابندی لگا دی گئی تھی جس میں انہیں ساتھیوں کو دنیا کے امیر ترین جرنیلوں کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ ضیاء الحق کے دور میں ان کے برادر نسبتی بشارت الٰہی کے بارے میں بھی مختلف افواہیں گردش کرتی رہیں۔ ان دوران ڈاکٹر بشارت الٰہی نے ۱۷۰ کروڑ روپے کے قرضے حاصل کئے تھے۔ ان کی "کاروباری سلطنت" کا حجم اور طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں بھی ان سے یہ

دریافت نہ کیا جاسکا کہ انہوں نے قرضوں کے عوض کیا ضمانتیں دی تھیں۔

جب محترمہ بے نظیر بھٹو برسراقتدار آئیں تو امید کی جارہی تھی کہ ملک میں اعلیٰ جمہوری روایات قائم ہوں گی لیکن بے نظیر کے جیالوں نے جنہیں بارہ سال بعد اقتدار میں آنے کا موقع ملا تھا، دل کی حسرتیں نکالنا شروع کیں۔ یہاں تک کہ ان بدعنوانیوں کے الزامات میں ان کے شوہر آصف زرداری کے نام کئی مالیاتی سکینڈلز منظر عام پر آئے اور بین الاقوامی لین دین میں ان کے کمیشن مقرر ہونے پر اخبارات نے انہیں مسٹر ٹن پرسنٹ کا نام دیا۔ انہوں نے اسلام آباد کے قیمتی پلاٹ اپنے پسندیدہ لوگوں اور وفاداروں میں تقسیم کئے۔ اس دوران ہارس ٹریڈنگ کی اصطلاح بھی منظر عام پر آئی جس میں اسلامی جمہوری اتحاد نے الزام عائد کیا کہ رئیس شبیر احمد میاں غلام محمد مانیکا، انور عزیز، امان اللہ شاہانی اور سرحد میں اسلامی جمہوری اتحاد کے اراکین کی بہت بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملالیا اور اپنی کمزور حکومت کو مستحکم کرتی رہیں۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خلاف متحدہ اپوزیشن کی تحریک عدم اعتماد کو ایک سو سات ووٹ ملے تھے اور بے نظیر کی حکومت بارہ ووٹوں کے فرق سے بچ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے جو کچھ کیا وہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔

جب ارکان اسمبلی کو خریدنے کے الزمات عائد ہوئے تو اس کے جواب میں وفاقی حکومت کی طرف سے حزب اختلاف پر بھی خریدنے اور قیمت چکانے کے الزمات لگائے۔

۲۵ مئی ۱۹۹۰ء کو متحدہ اپوزیشن کا پارلیمانی اجلاس اسلام آباد میں منعقد ہوا جس میں بے نظیر حکومت کے مختلف محکموں، ان کے وزیروں، ان کے خسر اور ان کے شوہر کی بدعنوانیوں اور بے ضابطگیوں کا اظہار کیا گیا ۔ اس موقع پر اسلامی جمہوری اتحاد کے قائدین نے دستاویزی ثبوت بھی پیش کئے۔ انہوں نے اس موقع پر ملکی اور غیر ملکی میڈیا کے سامنے یہ کہتے ہوئے عار محسوس نہ کی کہ حکومت کی بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں کی وجہ سے ملکی معیشت اور جمہوری عمل کو لاحق خطرات کے پیش نظر اقتدار سے الگ ہو جانا چاہئے۔ اس کونشن میں قراردادوں کی صورت میں مطالبہ کیا گیا کہ سپریم کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک

جوڈیشل ٹریبونل فوری طور پر قائم کیا جائے جو اس سارے معاملے کی چھان بین کرے۔ ان الزامات میں:۔

— پیپلز پارٹی کے جیالوں کو اسلام آباد میں پلاٹوں کی تقسیم سی ڈی اے کے ماسٹر پلان کے تحت راول جھیل کی زمین اور ایوان صدر اور قومی اسمبلی کی ناک کے نیچے واقعہ ۸۷ ایکڑ زمین، نیشنل پارک ۲۰۰ ایکڑ کے علاوہ گارنٹی ٹرسٹ کو دی گئی ہے جس سے قوم کو ۴۶۴ کروڑ کا نقصان ہوا ہے۔

— پیپلز پارٹی کی حکومت نے قومی مالیاتی اداروں اور تجارتی بنکوں کا نظم وضبط تباہ کر کے قوم کی جڑیں کاٹ دی ہیں اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے سٹیٹ بنک آف پاکستان اور دیگر اداروں پر ناموزوں افراد مسلط کر کے اس سیاسی رشوت کا ذریعہ بنا دیا گیا ۔

— نجی سرمایہ کاری کے نام پر ۵۰ ارب روپے کے قرضے ان لوگوں کو جاری کئے گئے جن کی بینک گارنٹی اور اثاثے مشکوک تھے۔ گدون امازئی پروجیکٹ کے سلسلہ میں وزیر اعظم نے وفاقی وزیر قاسم شاہ کے بھائی کو وہاں گھی مل کے قیام کی اجازت دی اور انہیں پی ٹن ۶۲۰۰۰ ٹن ریگولیٹری ڈیوٹی کی چھوٹ بھی دے دی گئی۔

— بھٹو کی برسی کے موقع پر پی آئی اے کے ہوٹل کی آرائش پر ایک کروڑ ۵۸ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔

— پیپلز ورکس پروگرام کی ۵ ارب روپے کی رقم پارٹی کارکنوں اور جیالوں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے۔ جھنگ میں فیصل صالح حیات کی گدی اور ذاتی سڑکوں کی تعمیر کے لئے ۷۶ لاکھ پیپلز پروگرام کے عوامی فنڈ سے خرچ کئے گئے۔

ایک سال میں بیرون ملک غریب ضرورت مند ۶۰ مریضوں کو بھیجا گیا۔ ان غریبوں میں مختار اعوان۔ فیصل صالح حیات اور یحییٰ بختیار بھی شامل تھے۔

صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان نے جب ۶ر اگست ۱۹۹۰ء کو اسمبلیاں برخاست کر دی تو اس اعلان کے موقعہ پر انہوں نے کہا "وزیر اعظم کے خلاف تحریک عدم اعتماد کے وقت تحریک کے خلاف حمایت حاصل کرنے کی مہم میں ایسے غیر اخلاقی اور غیر قانونی حربے استعمال کئے گئے کہ ہماری قومی اسمبلی دنیا بھر میں مذاق کا نشانہ بن کر رہ

گئی۔ ''

عین ممکن ہے کہ وہ الزامات غلط ثابت ہوتے مگر ان کے درست ہونے کا امکان بھی تھا۔ قول و فعل کے کئی انداز ایسے تھے جن کے ذریعے پارلیمنٹ کے وقار کو بری طرح مجروح کیا گیا۔ ۶ر اگست کو صدر نے بے نظیر حکومت پر سیاسی وفاداریوں کی کھلے بندوں لگاتار خرید و فروخت کے ذریعے انتخابی مینڈیٹ میں خرد برد، قومی وسائل کی لوٹ مار اور بد عنوانی کی شرمناک وارداتیں سامنے لائیں۔

ہارس ٹریڈنگ کے بارے میں ایسی قیاس آرائیاں بھی سامنے آئیں کہ ڈیڑھ ارب میں ارکان اسمبلی کی رائے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کے موقع پر بعض سیاستدانوں نے جس کردار کا مظاہرہ کیا، وہ ہماری پارلیمانی سیاست میں شرمناک باب بن کر رہ گیا ہے۔ ممبران اسمبلی ایک طرح سے یرغمال بن کر جس بے جا میں رہے۔ لالچ اور دھمکیوں کے زور پر انہیں اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنے سے روکا گیا۔ کوئی وزارت کے ترازو میں تلا اور کسی نے پلاٹ کا سودا کیا۔ کوئی اس جنگ تخت نشین میں قرضے منظور کروا گیا اور کسی نے وعدہ فردا کے لالچ میں سیاسی استواری برقرار رکھی۔

جس طرح مرکز میں بے نظیر نے نوازشات کا سلسلہ جاری رکھا تھا، پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ بھی ایسی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ حکومت پنجاب کی جانب سے علاج کی غرض سے بیرون ممالک بھیجے جانے والے مریضوں کے لئے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حکومت کو کروڑوں کے زر مبادلہ کا نقصان پہنچایا گیا علاج کے لئے جو مریض بھیجے گئے، ان میں سے تقریباً اسی فی صد کا علاج پاکستان میں ممکن تھا جن کے لئے وسائل کا ناجائز استعمال کیا گیا۔ علاج کے لئے بھیجے جانے والوں میں بعض وزراء، ممبران قومی صوبائی اسمبلی، اعلیٰ افسران اور ان کے رشتہ دار شامل ہیں۔ ان میں سے ۹۰ فی صد اپنے خرچ پر بھی بیرون ممالک جا سکتے تھے۔ جو بیرون ممالک بھیجے گئے، ان میں ۱۹۸۸ء میں ایم پی اے غلام فرید چشتی کو دل کے امراض میں ۸۵۰۰ پاؤنڈ، ایم پی اے سید حسنات احمد ۸۸۰۰ پاؤنڈ، خالد جاوید ورک ایم پی اے ۳۰۰۰ پاؤنڈ، سر کی چوٹ ایم پی اے ارشاد حسین ۵۰۰۰ پاؤنڈ، کان کے پردے میں پیپ پڑ جانا ایم پی اے ڈاکٹر شیلانی چارلس ۳۰۰۰ پاؤنڈ، شوگر اور آنکھوں کی تکلیف ایم پی اے مقصود احمد لغاری دل کی مرض ۱۳۰۰۰ پاؤنڈ، ۱۹۸۹ء میں

ایم پی اے غلام فرید چشتی دوسری بار امریکہ گئے ۲۳۰۰۰ ہزار امریکی ڈالر، ایم پی اے حاجی سردار خان ۸۵۰۰ پاؤنڈ دل کا مرض، ایم این اے عبدالخالق کی بیٹی رخسانہ ۵۰۰۰ پاؤنڈ آنکھوں کا ورم، ایم این اے راو خضر حیات خان ۸۵۰۰ پاؤنڈ دل کا مرض، وزیر صحت ملک سلیم اقبال کی اہلیہ ۵۰۰۰ پاؤنڈ ملک سلیم اقبال کا بیٹا طارق اقبال گردے فیل ہونے کی شکایت ۳۰۰۰ پاؤنڈ اور فروری ۱۹۹۱ء میں دوبارہ ۳۰۰۰ پاؤنڈ، ایم پی اے شمون قیصر ۸۵۰۰ پاؤنڈ دل کا مرض، ایم این اے چوہدری عبدالغفور کی اہلیہ ۱۰۰۰۰ ہزار پاؤنڈ، وزیر تعلیم ذوالفقار علی کھوسہ کی اہلیہ ۸۵۰۰ پاؤنڈ دمہ کا مرض، ایم پی اے شاہد فاروق کے والد کرنل محمد حسین ۸۵۰۰ پاؤنڈ دل کا مرض، ۱۹۹۰ء میں صوبائی وزیر صنعت سردار محمد عارف نکئی ۸۵۰۰ پاؤنڈ دل کا مرض ڈپٹی سپیکر سردار حسن اختر موکل ۸۵۰۰ پاؤنڈ کمر یا گردن میں درد، اپریل ۱۹۹۱ء میں دوبارہ ۸۵۰۰ پاؤنڈ ماہر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا یہاں مکمل علاج ہے ایم پی اے مخدوم علی رضا ۸۵۰۰ پاؤنڈ گردے میں پتھری، ایم پی اے سردار ایم صادق ۳۰,۰۰۰ پاؤنڈ سانس کا مرض، ۱۹۹۱ء میں چوہدری محمد فاروق کی والدہ ۸۵۰۰ پاؤنڈ دل اور جگر کی بیماری۔ صوبائی وزیر کوآپریٹو رانا پھول خان ایم پی اے سید طاہر احمد شاہ ۷۵۰۰ پاؤنڈ ریڑھ کی ہڈی کا اپریشن ایم پی اے منظر قریشی کا بیٹا حسن قریشی ۸۵۰۰ پاؤنڈ ایم پی اے رانا شمیم احمد خان ۸۵۰۰ پاؤنڈ سر کا درد یا چکر آنا، ایم پی اے میاں محمود کی والدہ رشیدہ بیگم ۸۵۰۰ پاؤنڈ گردن کا درد، ایم پی اے سعید احمد ہنس ۱۰,۰۰۰ پاؤنڈ، دوبارہ پھر دس ہزار پاؤنڈ گردن کا درد میاں منظور احمد وٹو کی اہلیہ ۸۵۰۰ السر کی تکلیف کے لئے دیئے گئے۔

سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں میں خان بابو سعید مسلم لیگ یونٹ حلقہ ۸۵ دس ہزار عمر الدین معرفت محمد رشید ایم این اے ملتان ۵۰,۰۰۰، صوفی عبدالکریم معرفت محمد رشید ایم این اے ملتان ۴۰,۰۰۰، ملک احمد یار ایم پی اے ۳۰,۰۰۰، محمد یامین چیئرمین ڈسٹرکٹ کونسل راولپنڈی اور اب وزیر ہیں ۲۵,۵۰۰، چوہدری عبدالغفور ایم این اے ۲۰,۹۵۰، بلقیس اہلیہ عبدالغفور ایم این اے ۲۱۱,۷۶۳، شاہد مرزا ایم پی اے ۶۲,۸۶۰ ہزار، شاہد مرزا ایم پی اے ۲۸۵,۱۸۶، ملک حنیف کونسلر ملتان ۲۰,۰۰۰، سید حمید علی شاہ جو کہ

سید افضل شاہ وزیر صحت کے بھتیجے ہیں، ۲۹,۵۰۰ سید حمید علی شاہ کو دوسری بار ۲۵۲,۵۸۵، چوہدری محمد ارشاد سابق ہیلتھ منسٹر ۹۸۰,۱۵۴ مسٹر الطاف ایم پی اے تلہ گنگ چکوال ۳۸۲,۹۳، مسٹر الطاف ایم پی اے تلہ گنگ چکوال ۱۵,۰۰۰ ایم این اے رحیم یار خان اپنی بیٹی کے علاج کے لئے ۱۷,۶۷۲ اور دوسری بار ۳۰,۰۰۰ راؤ خضر حیات ایم این اے قصور ۳۰,۰۰۰ اور دوسری بار ۲۸۹,۴۴۳ صاحب زادہ غلام فرید چشتی چیف منسٹر ایڈوائزر ۳۸۴,۰۸۹ دوسری بار ۳۵,۰۰۰ روپے ملے۔

سرکاری ملازمین میں انڈر سیکرٹری چیف منسٹر سیکرٹریٹ لاہور ۲۰,۰۰۰ اسسٹنٹ کمشنر مری ۲۵,۰۰۰ ڈپٹی کمشنر شیخوپورہ ۱,۳۳۹,۱۷۰ ڈائریکٹر جنرل ایل ڈی اے لاہور ۱۷,۵۰۰ امجد اعوان معرفت پرسنل سٹاف آفیسر آف چیف منسٹر ۲۰,۰۰۰ احتشام الدین ریسرچ آفیسر پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ گورنمنٹ آف پنجاب ۲۵,۰۰۰ مقبول احمد معرفت ڈائریکٹر جنرل پبلک ریلیشنگ ۲۰,۰۰۰ کرنل جاوید حسین بہاولپور ۱۰,۰۰۰ اسرار احمد پاکستان ریلوے ۲۵۶,۸۰۰ سیکرٹری انفارمیشن اینڈ کلچر پنجاب ۱۵,۰۰۰ کمشنر ملتان ڈویژن ۷۳۲,۰۰۰ محمد الیاس چیف منسٹر کے سیکورٹی گارڈ تھے ۱۰,۰۰۰ حمیدہ بی بی معرفت اختر علی خصوصی معاون وزیر اعلیٰ ۱۵,۰۰۰ کمانڈنٹ آفیسر ٹریننگ سکول منگلا کینٹ ۱۰۰,۰۰۰ سید محمد اکرام شاہ پرنسپل اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۶۹۲,۴۳۴ سرفراز احمد معرفت ڈی سی فیصل آباد ۱۰۰,۰۰۰ جعفر علی معرفت ڈی سی فیصل آباد ۱۰۰,۰۰۰ مختار احمد (معرفت ڈی سی فیصل آباد) کو ملے۔

آئی جے آئی کے معروف سیاستدان جنہوں نے بھاری قرضے حاصل کئے، ان میں میاں نواز شریف بارہ سو کروڑ، گجرات کا چوہدری خاندان تین ارب اور پچاس کروڑ، ڈاکٹر بشارت الٰہی ایک سو ستر کروڑ، سیف اللہ خاندان ۲ ارب، چوہدری نذیر فیصل آباد سے رکن اسمبلی ایک ارب، غلام فاروق سینیٹر ایک سو بیس کروڑ غلام مصطفیٰ جتوئی پچاس کروڑ، میر نبی بخش زہری سینیٹر دس کروڑ، نصراللہ دریشک ۴۵ کروڑ، مخدوم احمد محمود رکن قومی اسمبلی (جمال دین شوگر مل) پچاس کروڑ، پیر پگاڑا (سنگری کاٹن اور راجہ شوگر ملز) ساٹھ کروڑ، سید عباس شاہ سینیٹر (بنوں شوگر ملز اور ایک آئس فیکٹری کے لئے چالیس کروڑ) اسلام الدین شیخ سینیٹر (کرن شوگر ملز) ستر کروڑ، اشرف تابانی سابق گورنر سندھ ستر کروڑ، مرحوم محسن صدیقی

سینیٹر پاک لینڈ سیمنٹ ساٹھ کروڑ، سلطان لاکھانی سینیٹر (سینچری پیپر بورڈ، میرٹ پیکجنگ، نیشنل ڈیٹرجنٹ، لیکسن تمباکو، سبز لینڈ) نوے کروڑ، ذوالفقار جاموٹ (سید آئس فیکٹری، غیاری شوگر ملز، نجیب اینڈ کمپنی) تین کروڑ، ہمایوں اختر عبدالرحمان ایم این اے (تاندلیانوالہ شوگر ملز، گریس ٹیکسٹائل، پیپسی کولا) اسی کروڑ، میر افضل خان وزیر اعلیٰ سرحد (چشمہ شوگر ملز) پچاس کروڑ، جام معشوق علی وفاقی وزیر جام صادق کے صاحب زادے (تھر شوگر ملز) پچاس کروڑ، منظور احمد وٹو سپیکر پنجاب اسمبلی (ستلج شوگر ملز) پینسٹھ کروڑ، محمد خان جونیجو ایم این اے سابق وزیر اعظم (سانگھڑ شوگر ملز) اسی طرح اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت سے وابستہ یا حلیفوں نے مجموعی طور پر ۲۹ ارب روپے کے قرضے لئے۔

پیپلز پارٹی نے حال ہی میں نواز شریف کی مالی بدعنوانیوں کے بارے میں سنگین الزامات (The Plunder of Pakistan) میں عائد کئے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں میاں نواز شریف خاندان پر سرکاری مالیاتی اداروں اور قومی بینکوں سے لئے گئے قرضوں کی مالیت چار کروڑ روپے تھی لیکن بعد کے دس سالوں میں انہوں نے انتہائی تیزی سے اس رقم کو بارہ سو کروڑ یعنی بارہ ارب تک بڑھا لیا اور یہ رقم پنجاب کے سالانہ بجٹ سے ڈیڑھ گنا ہے۔

اگست ۱۹۹۱ء میں سروسز کریڈٹ کارپوریشن نے اپنے برانچ آفس بند کر دیئے اور کھاتہ داروں کو کسی بھی قسم کی ادائیگی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کارپوریشن کے سربراہ اسلامی جمہوری اتحاد کے ایک ایم پی اے ذوالفقار اعوان تھے۔ اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ بغیر سیاسی ریکارڈ کے انہیں اس لئے ملا کہ انہوں نے ڈھائی کروڑ دیئے تھے یہ کہانی اس وقت منظر عام پر آئی جب کواپریٹو اداروں کی سابق رجسٹرار سروش سلطان (آئی جے آئی کے ایک وزیر کی اہلیہ) نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کو ایک رپورٹ پیش کی۔

بحران کے چند ہفتوں کے اندر پنجاب کے سب سے بڑے کواپریٹو بنک "دی نیشنل انڈسٹریل کواپریٹو فنانس کارپوریشن" (این آئی سی ایف سی) جس کے منتظم بھی اسلامی جمہوری اتحاد کے ایک اور ایم پی اے چوہدری عبدالمجید نے بھی اچانک ممبروں کو اچانک ادائیگیاں بند کر دیں۔ این آئی سی ایف سی گجرات کے چودھریوں کا ایک نجی بنک ہے۔

صوبائی وزیر پرویز الٰہی کے والد منظور الٰہی اس کے سرپرست ہیں۔ چوہدری خاندان اور نواز شریف خاندان اس کارپوریشن سے بھاری رقمیں لیتے رہے ہیں۔ نواز شریف خاندان نے ۲۲ اگست ۱۹۹۱ء کو اس ادارہ سے قرض کے طور پر حاصل کردہ ۳۵ کروڑ کی رقم ایک ترقیاتی بنک بنکرز ایکویٹی لیمیٹڈ سے لے کر ادا کر دی۔ یہ کام صرف ۵ دن میں مکمل ہو گیا۔

"پاکستان کے خزانے پر ڈاکہ" میں مزید لکھا ہے "دوسری طرف چودھریوں نے چونکہ بھاری رقوم لے رکھی تھی، اس لئے وہ رنگے ہاتھوں پکڑ لئے گئے۔" اس طرح ایک اندازے کے مطابق اسلامی جمہوری اتحاد کے ان سیاست دانوں نے بنکنگ کے نظام سے ۲۵۰۰ کروڑ حاصل کئے ہیں۔ یہ پاکستان کی سب سے بڑی بنک ڈکیتی ہے۔

وزیر اعلیٰ پنجاب کی حیثیت سے نواز شریف کے صوابدیدی اختیارات کی جھلک (اپوزیشن کی طرف سے عائد کردہ الزامات کے مطابق)

۸۵_۱۹۸۶	۱۲ لاکھ
۸۶_۱۹۸۷	ایک کروڑ ۸۹ لاکھ ۵۰ ہزار
۸۷_۱۹۸۸	ایک کروڑ ۸۹ لاکھ ۹۰ ہزار
۸۸_۱۹۸۹	۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ۳ ہزار

مزید ایک کروڑ ۸۸ لاکھ ۸۰ ہزار روپے

یہ رقم غریب مگر باصلاحیت طالب علموں، معذوروں، بیوگان، دانشوروں، غریب ضرورت مندوں کے بیرون ملک علاج، مذہبی اداروں پر خرچ کی جاتی ہے۔ اگر ہم اوپر ایک نظر ڈالیں تو ان میں سے کتنے لوگوں کا استحقاق تھا۔ یقیناً اس جھلک سے ہمیں مایوسی ہوگی۔ میاں نواز شریف کو کوآپریٹو سکنڈل کی تحقیقات کرنے والے کمیشن نے الزامات سے بری کر دیا تھا۔

جاگیردار

وہ جو سامنے ایک زمیں ہے　　وہ گوبر کے ڈھیر جہاں ہیں
مزدوروں کی، دہقانوں کی　　جس میں بہت سی جھونپڑیاں ہیں

——☆——

اک مقروض سے سستے داموں　　میں نے اس کو خرید لیا ہے
واہ رے میری چابک دستی　　میں نے بھی کیا کام کیا ہے

——(ایک ملازم)——

آپ کو اے سرکار مبارک　　اتنی لمبی چوڑی دھرتی
اب دیتی ہے مجھ کو دکھائی　　قسمت ان لوگوں کی سنورتی

——(دوسرا ملازم)——

اب ان مفلس بے چاروں کو　　راحت کا انعام ملے گا
جھونپڑیاں آباد رہیں گی　　لوگوں کو آرام ملے گا

——(جاگیردار)——

مردودو! یہ کیا بک بک ہے؟　　شاید تم کچھ دیوانے ہو
اتنے پرانے نوکر ہو کر　　مجھ کو اتنا ہی جانے ہو؟

——☆——

یہ دھرتی جنت تو بنے گی　　چھپر بھی مٹی میں ملیں گے!
پہلے اس میں خاک اڑے گی　　پھر اس میں گلزار کھلیں گے

——☆——

اس میں میرا قصر بنے گا	باغ بنیں گے، راغ بنیں گے
مٹی اس کی نور بنے گی	ذرے اس کے چراغ بنیں گے
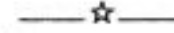
☆

مخمل جیسا سبزہ ہوگا	ریشم جیسی سنبل ہوگی
عارض جیسا پھول کھلے گا	زلفوں جیسی بلبل ہوگی

☆

کلیاں ہوں گی غنچے ہوں گے	پھولوں کی مہکار بھی ہوگی
موج ہوا کا رقص بھی ہوگا	نغموں کی جھنکار بھی ہوگی

☆

پھولوں کے ساغر کھنکیں گے	برکھا رت مے برسائے گی
کوئی گرائے کی دوشیزہ	میرا پہلو گرمائے گی!

☆

اس دھرتی کے اک گوشے میں	ایک کلب گھر بنواؤں گا
اس میں کیا کیا شغل رہیں گے؟	یہ تم کو پھر سمجھاؤں گا

☆
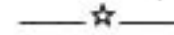
خدمت گارو! سوچتے کیا ہو؟	جاؤ جھونپڑیوں کو گرا دو
بنیادیں کھدوا دو ان کی	ان کا نام، نشان مٹا دو!

☆
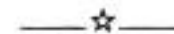
آہوں کے شعلے اٹھنے دو	اشکوں کے دریا بہنے دو
اس دھرتی، میری دھرتی پر	کوئی غلاظت مت رہنے دو

☆

اس میں میرا قصر بنے گا	باغ بنیں گے، راغ بنیں گے
مٹی اس کی نور بنے گی	ذرے اس کے چراغ بنیں گے

عاصی کرنالی

ڈیرہ غازی خان کے مزاری

ڈیرہ غازی خان پنجاب کا پس ماندہ اور توجہ سے محروم علاقہ ہے۔ جس میں تقریباً ۴۰ فی صد قبائلی بلوچ ہیں اور اندازاً نصف سرائیکی بولنے والے ہیں، صرف دس فی صد مہاجر اور مرکزی پنجاب کے باشندے ہیں۔ ضلع ڈیرہ غازی خان کے شمال میں صوبہ سرحد کا ڈیرہ اسماعیل خان، جنوب میں صوبہ سندھ، مغرب میں بلوچستان کا کوہ سلیمان اور اس کے مشرق میں دریائے سندھ بہتا ہے۔ انگریز نے اپنا سامراجی تسلط قائم رکھنے کے لئے اس علاقے میں اپنے نمک خوار پیدا کئے اور بلوچ قبائل کو نوتمن داریوں میں بانٹ دیا جن میں تمن مزاری، تمن لغاری، تمن دریشک، تمن گورچانی، تمن لنڈ، تمن کھوسہ، تمن بزدار، تمن قیصرانی، تمن کھتران نمایاں ہیں۔ ان تمن داروں کے ذریعے انگریزوں نے اس علاقہ کے لوگوں کے جذبہ حریت کو کچل کر رکھ دیا اور عوام پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ انگریز نے اپنی مطلب بر آوری یعنی سامراجی تسلط کے لئے عوام کو ظلم و استبداد کے جس آہنی شکنجے میں جکڑا، اس کے چلے جانے کے بعد بھی عوام بدستور ظلم کی چکی میں اسی شدت اور بے رحمی سے پسے جا رہے ہیں۔ انگریز نے اپنے وفاداروں کو "مال مفت دل بے رحم" کے مصداق تمنداروں کو بے حد و حساب جاگیریں بخش کر نہ صرف دولت کا مالک بنا دیا تھا بلکہ انہیں نیم سیاسی اختیارات بھی عطا کر دیئے تھے اور اس طرح انگریز کے یہ وفادار مکمل طور پر عوام کی قسمت کے مالک بن گئے۔ انگریز نے ان سرداروں کو افسر مال کے اختیارات اور محدود فوج رکھنے کی بھی اجازت دے دی۔ انہوں نے یہ حکمت عملی ایک قبائلی نظام کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لئے اختیار کی تھی۔ ان سرداروں نے عوام کا خون پوری سنگدلی سے چوس کر سامراجی رگوں میں بھرا اور انگریز کی بخشی ہوئی حیثیت کو ڈھٹائی کے ساتھ استعمال

کیا۔ سرکاری زمینیں چپکے چپکے ان کے نام منتقل ہونے لگیں۔ جب ان کو انتخابات کی ضرورت محسوس ہوتی تو سردار محلات میں بیٹھ کر انتخاب لڑتے تھے۔ ان کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ سرداری نظام پر پہلی چوٹ ایوب خان نے لگائی تھی جب زرعی اصلاحات کے ذریعے لاکھوں ایکڑ زمین حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لی تھی۔ ان کے ظلم کے ایوان آہستہ آہستہ ہلنے لگے اور عوام میں بے داری کی لہر پیدا ہوئی۔ ڈیرہ غازی خان کی قیادت انہی نو بڑے خاندانوں کے گرد گھومتی رہی ہے۔ ان تمن داریوں کے سرکردہ سرداروں میں کھتران کے رب نواز، قیصرانی کے سردار منظور احمد خان، بزدار کے دوست محمد، لغاری کے سردار جمال محمد خان، گورچانی کے سردار غلام حیدر اور مزاری کے سردار بلخ شیر مزاری نے سیاست و قیادت میں خوب نام کمایا ہے۔ اس ضلع میں زمین بھی تقریباً انہی نو خاندانوں میں تقسیم ہے۔ آٹھ لاکھ، چار لاکھ، تین لاکھ اور دو لاکھ ایکڑ اراضی کی ذاتی ملکیت ایک جانب اور سات لاکھ افراد میں سے کم و بیش پونے سات لاکھ باشندوں کی غیر متوازن اقتصادی زندگی دوسری طرف تھی۔ اس نوع کے معاشی نظام میں اگر ضلع کے بیشتر دیہاتوں میں دو وقت کی روٹی مل جاتی تو اسے غنیمت سمجھا جاتا لیکن اس ضلع میں اب بھی غربت اپنے آخری نشیب پر اور امارت اپنے انتہائی عروج پر ہے۔ اس ضلع میں بسنے والے قبائل میں سب سے بڑا قبیلہ مزاریوں کا ہے۔ کسی زمانہ میں انہیں "شورش پسند" کہا جاتا تھا۔ لیکن جونہی یہ انگریز کا دم بھرنے لگا، اسے معزز اور قابل فخر کہتے انگریز کی زبان خشک نہ ہوتی۔ مزاری قبیلہ کسی زمانہ میں ڈیرہ غازی خان کے پورے جنوبی علاقہ پر عمر کوٹ تک قابض تھا اور ان کی ریاست کی سرحدیں سندھ اور بہاولپور کو چھوتی تھیں۔ اس قبیلہ کے سربراہ کو تمن دار کہا جاتا ہے۔ تمنداروں کے مورث اعلیٰ نواب بہرام خان سی آئی ای تھے۔ شروع شروع میں مزاری اپنے آپ کو بلوچوں سے الگ سمجھتے تھے۔ وہ اپنا مورث اعلیٰ "ہوت" کو بتاتے ہیں جو بلوچ نسل کی پانچ بڑی شاخوں میں سے ایک کا سربراہ تھا۔ ہوت کے ایک بیٹے علی کے دو لڑکے تھے۔ سمحاک اور پنوں جب بلوچی پنجاب کے میدانوں میں اترے تو سمحاک سندھ کے ایک شہر کشمور میں آباد ہو گیا۔ اس زمانہ میں مزاری بھمبور کی پہاڑیوں کے قریب رہتے تھے۔ سمحاک نے یہاں کاروبار شروع کر دیا اور بڑا فائدہ اٹھایا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ مزاریوں نے اس کا ذکر

اپنے سردار بزن سے کیا۔ ایک مرتبہ جب مزاریوں کو کشمور کے لوگوں نے قید کر لیا تو بزن نے چار عورتیں صحاک کے پاس بھیجیں تاکہ ان کو چھڑا سکیں۔ صحاک نے حاکم سے سفارش کی جس پر چار آدمیوں کو رہا کر دیا گیا۔ اس سے خوش ہو کر بزن نے صحاک کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ جب صحاک پہنچا تو مزاریوں نے اسے اپنا سردار منتخب کر لیا۔ بزن نے خود اپنی پگڑی صحاک کے سر پر باندھی اور اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دی۔

صحاک کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام بلوچ تھا جس سے بلوچانی نکلا اور دوسرے کا نام شادین۔ صحاک کے بعد بلوچ اس کا وارث بنا لیکن اہل قبیلہ انتخاب کے قائل تھے۔ انہوں نے بلوچ کے لڑکے رادھو کو اپنا سردار منتخب کر لیا۔ تاہم انتخاب کے چند دنوں بعد زور کا جھکڑ چلا جس سے رادھو کی جھونپڑی اڑ گئی۔ اسے بدشگونی سے محمول کیا گیا۔ اس طرح انتخاب دوبارہ ہوئے۔ اب کے شادین کے بڑے لڑکے بدھیل کو سربراہ منتخب کر لیا گیا لیکن بدھیل نے کہا کہ میں اپنی ماں سے مشورہ کر لوں۔ ماں نے تین شرطیں پیش کیں۔
۱۔ اگر کوئی مزاری دوسرے کو قتل کر دے یا بے عزت کرے (یعنی کسی لڑکی کو اغوا کرے) تو اسے قبیلہ چھوڑ کر کم سے کم ایک سال تک جنگلوں میں رہنا ہو گا۔ وہ اس وقت واپس آ سکتا ہے جب زخم خوردہ خاندان اسے معاف کر دے۔ ۲۔ اگر کوئی مہمان یا اجنبی آئے اور سردار کسی مزاری سے بھیڑ بکری لے کر اس کی تواضع کرے تو اس کی قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔ ۳۔ سردار کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ تمام اہل قبیلہ سے ٹیکس وصول کرے۔ مزاریوں نے یہ شرائط قبول کر لیں اور بدھیل اس قبیلہ کا سربراہ بن گیا۔

دریائے سندھ کی زرخیز زمینوں پر قابض ہونے کے لئے مزاری اپنے تمام ہمسایہ قبیلوں سے لڑتے جھگڑتے رہے اور کبھی جیتے، کبھی ہارے۔ آخر جمال دوم کے زمانے میں سندھ کے کنارے اتر کر آباد ہونے لگے۔

بگٹی قبیلہ سے مزاریوں نے بے شمار لڑائیاں لڑیں۔ ایک موقع پر مزاری مویشی چرا کر لے جا رہے تھے کہ ان کے پانچ ساتھی ایک پہاڑی پر بیٹھ کر جوا کھیلنے لگے۔ وہ اس کھیل میں اتنے مشغول اور محو ہو گئے کہ بگٹیوں نے ان کو اچانک آ لیا اور قتل کر دیا۔ جب اس کی اطلاع میر جمال خان کو پہنچی تو اس نے قسم کھائی کہ اگر آئندہ ایک بھی مزاری جوا کھیلتا دیکھا گیا تو اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے اپنے بیٹے مٹھا خان کو

جوا کھیلتے دیکھا۔ مٹھا خان نے باپ کو دیکھتے ہی دیوار پھلانگ کر بھاگنا چاہا لیکن جمال خان نے ایسا تاک کر تیر چلایا کہ اس کے بیٹے کی ران کو چھیدتا چلا گیا۔ جب مزاریوں نے دیکھا کہ ان کا سردار جوئے کے بارے میں اتنا سخت ہے تو انہوں نے جوا کھیلنا بند کر دیا۔

مزاریوں اور دریشکوں کی لڑائیاں بھی قابل ذکر ہیں۔ دونوں کی دشمنی چند سال پہلے ہی ختم ہوئی تھی۔ وہ پیپلز پارٹی میں اکٹھے گئے اور یہیں سے وہ صدیوں پرانی دشمنی چھوڑ کر حلیف بن گئے۔ دشمنی کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ مزاری اپنی بھیڑ بکریاں گنڈاری کی پہاڑیوں پر چرایا کرتے تھے۔ دریشک آتے اور ان کے جانور اٹھا کر لے جاتے۔ جمال خان نے ان پر ایک مرتبہ چڑھائی کی جس میں کم از کم چندرہ دریشک مارے گئے۔ اس کے بعد دونوں قبائل ایک دوسرے پر حملے کرتے رہے جن میں جمال خان کی بیوی ماری گئی اور ماں بھی زخمی ہو گئی۔ مزاری آج تک کہتے ہیں کہ دریشکوں نے ان کی بے عزتی کی۔ دریشکوں کا بیان ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ عورتوں پر حملہ اتفاقیہ تھا۔

میر جمال خان کے بعد اس کا بیٹا میر مٹھا خان قبیلہ کا سردار منتخب ہوا۔ اس وقت بھی ہمسایہ قبیلوں کے ساتھ مزاریوں کی جنگ جاری تھی۔ آخر کار گورچانیوں نے اپنی ایک لڑکی جمال خان کے پوتے مصطفیٰ خان سے بیاہ دی جس کے بعد قدرے امن ہوا۔ اب تک مزاری آزاد قبیلہ کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب احمد شاہ درانی نے حملہ کیا تو اس نے ہڑند داجل کا علاقہ بروہی قبیلہ کے سردار ناصر خان کو دے دیا۔ ناصر خان نے مزاریوں کو مار بھگایا اور کشمور میں قلعہ بنا کر پورے میدانی علاقہ پر قابض ہو گئے۔ لیکن بروہیوں نے اس کا پیچھا کیا اور ان کے سردار میر گل شیر خان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد مزاریوں کی طاقت کمزور ہو گئی تاہم میر شاہ علی نے سب کو اکٹھا کر کے کشمور پر حملہ کیا۔

ادھر چانڈیو ابھی تک دریائے سندھ کے دامن میں دندنا رہے تھے۔ مزاریوں نے ان سے صلح کر لی اور دونوں بروہیوں کے مشترکہ دشمن بن گئے۔ لیکن سندھ کے کنارے کی زمین ایسی تھی کہ قبائلی جنگیں ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ میر شاہ علی نے فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے راتوں رات کشتیوں کے ذریعے دریا کے پار اپنے سینکڑوں آدمی اتارے اور چانڈیوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملہ میں بے شمار چانڈیو مارے

گئے۔ حزاریوں نے ایک ایک گھر کو لوٹا اور پورے علاقے پر قبضہ جمالیا۔ ادھر قلات کا ناصر خان حزاری علاقوں پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنانے لگا۔ اس کے ساتھ بگٹی قبیلہ کے لوگ بھی حزاریوں کے خلاف ناصر خان کے اتحادی بن گئے۔ انھوں نے روجھان پر حملہ کر دیا اور ۴۲ حزاری قتل کرنے کے بعد ان کے مال مویشی اٹھا کر لے گئے۔ بروہیوں نے عمر کوٹ میں ایک قلعہ بنا رکھا تھا۔ حزاریوں نے ۵۰۰ آدمیوں کا ایک لشکر تیار کر کے اس پر حملہ کر دیا اور بروہیوں کے سردار کو مار ڈالا۔ اس کے بعد خان آف قلات کو حزاریوں کی آزادی میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوئی تاہم میر جمال خان نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہ کسی طاقت ور سردار سے راہ و رسم رکھے۔ چنانچہ اس نے سندھ کے تالپوری امیر سے سمجھوتہ کر لیا اور بنفس نفیس خیرپور کے دربار میں حاضر ہوا اور حزاریوں کی تمام مملوکہ اراضی کی مالگذاری پیش کر دی۔ میر تالپور نے رسمی طور پر تمام اراضی کی ملکیت کے حقوق حزاریوں کو عطا کر دیئے۔ یہ واقعہ ۱۷۹۱ء کا ہے۔ اس سمجھوتہ کے تحت حزاریوں کی عملداری اب بھی تسلیم کی جاتی ہے۔

بروہی بھاگ گئے تو حزاریوں نے بگٹیوں کے علاقہ پر حملہ کر دیا اور ایک ندی کے کنارے فتح پانے کے بعد بے شمار مال غنیمت لوٹا لیکن ابھی وہ مال لے کر واپس جا رہے تھے کہ بگٹیوں نے عقب سے ان پر حملہ کر دیا اور رات کی تاریکی میں بے شمار حزاری موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازی خان کا علاقہ انتظامی لحاظ سے ریاست بہاولپور میں شامل کر دیا۔ دیوان ساون مل اس علاقے کا گورنر تھا۔ اس کے نزدیک حزاری کیونکہ ابھی تک مار دھاڑ میں مصروف تھے. وہ سات ہزار کی فوج لے کر ان پر چڑھ دوڑا اور ان کے تمام مال مویشی چھین کر ان کو پہاڑوں پر مار بھگایا، تاہم وہ پھر اکٹھے ہو کر کوٹ مٹھن پر حملہ آور ہوئے۔ یہاں سے بھی حزاریوں کو جلد بھاگنا پڑا۔ آخر کار حزاریوں نے پے در پے حملے کئے اور سکھ فوج کو شکست دے کر انھیں مٹھن کوٹ میں قلعہ بند ہونے پر مجبور کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے اطالوی جنرل ونچورا کو بھاری توپ خانے اور جدید اسلحہ سے لیس چھ ہزار کی کمک کے ساتھ حزاریوں سے لڑنے کے لئے بھیجا۔ مٹھن کوٹ سے چندرہ میل جنوب مغرب میں عمر کوٹ کے مقام پر شدید جنگ کے بعد حزاری روجھان کی طرف پسپا ہو گئے۔ جہاں خوفناک جنگ کے بعد حزاریوں کو روجھان چھوڑنا

پڑا۔ سکھوں نے انتقام میں سارے شہر کو آگ لگا دی اور قتل عام کیا۔ حزاری ایک بار پھر صف آرا ہوئے اور روجھان سے دس میل دور کن میں جم کر لڑے لیکن توپ خانے کے آگے ان کی پیش نہ چلی اور انھیں پہاڑوں کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ یہاں سے انھوں نے چھاپہ مار جنگ جاری رکھی۔ اس جنگ کی قیادت امیر دوست علی اور میر بہرام خان کر رہے تھے۔
اس دوران تحریک مجاہدین کے ایک رہنما نصیرالدین شاہ جو سید احمد شہید" اور شاہ اسماعیل" شہید کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، حزاری قبیلے میں آئے اور اس طرح حزاریوں کی سکھا شاہی کے خلاف جدوجہد تحریک مجاہدین سے منسلک ہو گئی۔ بہر حال حزاری بڑے پیمانے پر متحد ہو کر سکھوں کے خلاف نہ نکلے البتہ انھوں نے گوریلا جنگ جاری رکھی۔ اسی میں حزاریوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا لیکن سکھ فوجیں جو شکار پور فتح کرنے نکلی تھیں، مکمل طور پر برباد ہو گئیں اور رنجیت سنگھ کے سمندر تک پہنچنے کے خواب ادھورے رہ گئے۔
بہرام خان کی موت کے بعد میر دوست علی خان حزاری قبیلے کے سردار بنے۔ انھوں نے بھی سکھوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ ۱۸۴۹ء میں جب انگریز پنجاب پر قابض ہو گئے تو انھوں نے میر دوست علی خان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا کیونکہ وہ گوریلہ خانہ جنگی سے تنگ آ چکے تھے۔ لغاریوں کے سردار رحیم خان کے ذریعے سکھوں اور حزاریوں کی صلح ہو گئی۔ اس غرض کے لئے دیوان ساون مل نے ملتان میں ایک دربار لگایا جس میں بہرام خان خود حاضر ہوا اور اسے خلعت دی گئی۔

دوست علی خان بری عادتوں کا شکار ہو گیا، اس لئے قبیلہ کا انتظام اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خان نے سنبھال لیا۔ انھوں نے حزاریوں کو ایک بااخلاق اور باضابطہ قبیلہ بنانے کی پوری کوشش کی اور وہ انگریزوں کا مدد معاون رہا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں انھوں نے استعماری قوتوں کا پورا پورا ساتھ دیا جس کے صلہ میں ۱۸۵۹ء میں انھیں آنریری مجسٹریٹ کا اعزاز دیا گیا۔ اسی دوران انھوں نے حزاری قوم سے جرائم کے خاتمہ کے لئے پوری جدوجہد کی۔ علاقے میں اٹھنے والی بے چینی کو روکنے کے لئے انگریزوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور قدم قدم پر انگریزوں کے لئے وفاداری کے عہد و پیمان کئے۔ حزاری اور بگٹی قبیلے کو ایک جگہ اکٹھا کرنا بھی ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۷ء تک خان

آف قلات اور انگریز سرکار کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران انہوں نے جو خدمات سرانجام دی تھیں، انگریز سرکار نے ان سے خوش ہوکر انہیں سر کے خطاب سے نوازا اور وہ ۱۸۸۴ء میں انگریز سرکار کے سب سے زیادہ وفاداروں کی فہرست میں شامل ہوگئے۔ اس کے چار سال بعد انہیں "Knighthood" کے خطاب پر متمکن کردیا۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو کے رکن کے ساتھ ساتھ صوبائی درباری بھی تھے۔ انگریزوں کے نزدیک نواب سرامام بخش اس علاقے میں ایسے روسا تھے جو برطانیہ کی سرحدوں کی بہتر حفاظت کرسکتے تھے۔ ان کی موت ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ ان کا بڑا بیٹا بہرام خان جاگیر کا وارث بنا۔ ان کی خدمات اس حوالے سے اہم تھیں کہ انہوں نے اپنی تمن داری میں اور تمن داری سے باہر ہونے والے جھگڑوں کو اپنی فراست سے حل کیا۔ جیکب آباد کے قبائل انہیں اپنے جرگہ میں خصوصی طور پر سال میں دوبار شریک ہونے کی دعوت ضرور دیتے تھے۔ بہرام خان ایک اعلیٰ پائے کے منتظم تھے اور انہوں نے اپنی تمن داری کا مکمل کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور وہ کسی معاملے سے بے خبر نہیں رہتے تھے۔ وہ ہوشیار اور ڈپلومیٹ سربراہ تھے۔ انگریزوں نے انہیں ۱۹۰۴ء میں نواب اور انگریزوں کے بہترین ساتھی کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۰۸ء میں پنجاب کے جاگیرداروں اور تمن داروں کی ایسوسی ایشن کے صدر چنے گئے اور ۱۹۱۰ء میں پنجاب لیجلیٹو کونسل کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۱۳ء میں کونسل آف سٹیٹ کے رکن بھی چنے گئے۔ اس کے ایک سال بعد انہیں K.B.E. کے اعزاز سے نوازا گیا جو ہندوستان کے چند انتہائی وفاداروں اور قریبی ساتھیوں کو دیا جاتا تھا۔ نواب سر بہرام خان ضلع ڈیرہ غازی خان کے تمن داروں کے سربراہ بھی چنے گئے تھے۔ علاوہ ازیں اعزازی مجسٹریٹ اور درباری کے عہدے سے بھی نوازے گئے۔ انہیں ضلع کا اسسٹنٹ کلکٹر بھی بنا دیا گیا۔ انہوں نے اپنی بھائی کی بیوہ سے شادی کی۔ ان کا دوسرا بھائی غلام حیدر خان ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا اور عطا محمد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ اس کے دیگر رشتہ دار بھی انگریز سرکار کے وفادار تھے۔ ان کے کزن تلہ خان ڈویژنل درباری تھے اور سردار تاج محمد خان ضلع ڈیرہ غازی خان میں ۱۹۲۰ء تک پولیٹیکل تحصیل دار رہے۔ ان کے بھتیجے سردار غوث بخش خان بارڈر ملٹری پولیس میں جمعدار کے عہدے پر تعینات تھے۔ بعدازاں وہ آنریری

مجسٹریٹ بنے اور سب جج مقرر ہوئے۔ سردار عبدالرحمان خان بھی جو کہ ان کے داماد تھے، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ نواب سر بہرام خان سی۔ آئی۔ ای۔ کے۔ بی۔ ای۔ ۱۹۲۳ء میں فوت ہوئے تو دوست محمد خان جو کہ شیر محمد خان کے بیٹے تھے، مزاری قبیلے کے سردار بنے اور اسے وراثت میں نواب کا خطاب بھی ملا۔ ۱۹۲۵ء میں انہیں خان بہادر کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور اس کے چار سالوں بعد صوبائی درباری، آنریری مجسٹریٹ اور سب جج بنا دیا گیا۔ سرکار کی خدمت کے صلہ میں ان کی جاگیر کو ملنے والا انعام نقد صورت میں ۳۵,۷۵۰ ہوگیا۔ انگریز سرامام بخش کے خاندان کا رتبہ بڑھاتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزاری سرداروں پر خطابات کی بارش ہونے لگی۔ پہلے نواب، پھر سر، پھر صوبائی درباری اور پھر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن نواب سرامام بخش خان کے بھائی ان کے بیٹے پوتے اور پڑپوتے قیام پاکستان تک انگریزی راج کی مسکراہٹوں میں پروان چڑھے۔ ان کو نہ صرف اعزازات و خطابات ملے بلکہ وسیع اراضی بھی ملی۔ انگریز، دوست محمد کی جنگجو طبیعت سے اکثر خائف رہتے تھے کیونکہ اس قبیلے نے سکھوں کو سکھ کا سانس نہیں لینے دیا تھا۔ میر دوست محمد سردار بلخ شیر مزاری اور سردار شیرباز مزاری کے تایا تھے۔ سرامام بخش مزاری اولاد نرینہ سے محروم فوت ہوئے تو دوست محمد کو وہ تمام وفاداری کے صلہ میں ملنے والے اعزازات منتقل ہوگئے۔ یہ بھی ۱۹۳۲ء میں اولاد نرینہ سے محروم وفات پاگئے اور قبیلے کی سرداری اور سیاسی قیادت جناب شیر جان مزاری کے سپرد ہوئی جو ایک برس بعد ۱۹۳۳ء کو فوت ہوگئے۔ سردار شیرباز مزاری اور بلخ شیر مزاری اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ حکومت نے تمام زمین کورٹ آف وارڈ میں لے لی۔ اس وقت مزاری سردار سب سے بڑے زمیندار تھے اور پاکستان میں ان کا نمبر دوسرا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں صرف ان کے گھرانے نے ہزاروں ایکڑ زمین زرعی اصلاحات کی صورت میں حکومت کو پیش کی۔ سردار بلخ شیر مزاری کی دستار بندی کی تقریب میں گورنر پنجاب نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی تھی۔ اس دور میں کسی گورنر کا کسی تقریب میں مہمان خصوصی بن جانا کسی اعزاز سے کم نہ تھا اور اس سے انگریزوں سے مراسم کی نوعیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سیاست کے حوالے سے میر بلخ شیر مزاری خاندان کے سربراہ ہیں لیکن سردار شیرباز مزاری نے سیاست میں زیادہ نام کمایا ہے۔ سردار شیرباز مزاری قیام پاکستان سے پیشتر پانچ سال تک

پرنس آف ویلز رائل ملٹری کالج میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۴۷ء میں چیف کالج لاہور میں داخلہ لیا اور یہاں سے ۱۹۵۰ء میں فارغ ہوئے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۳ء تک شیرباز مزاری نے دنیا کی سیاحت کی اور کتابوں کی دنیا میں کھوئے رہے۔ ان کی اپنی وسیع لائبریری ہے۔ تاریخ، مشرقیات اور بین الاقوامی امور ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان دنوں نواب میر بخش مری اور نواب اکبر بگٹی ایوب خانی آمریت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ مخالفت کا بدلہ جب ایوب خان نے ان سے لیا تو یہ ملحقہ مزاری علاقے میں پناہ کی غرض سے داخل ہوگئے۔ اس سے متاثر ہو کر شیرباز مزاری نے بھی مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ ۱۹۶۸ء میں انہوں نے بھٹو کی سحرانگیز شخصیت سے متاثر ہو کر ان کی رہائی کے لئے چلائی گئی تحریک میں پیش پیش رہے۔ اس دوران انہوں نے ائر مارشل اصغر خان سے بھی رلو ورسم رکھے کیونکہ اس زمانے میں بھٹو کے ساتھ ساتھ ان کا بھی سیاسی افق پر طوطی بولتا تھا۔ ائر مارشل اصغر خان نے کشمور، راجن پور اور ڈیرہ غازی خان کا دورہ شیرباز مزاری کی دعوت پر کیا۔ سندھ کے دوروں میں بھی وہ ائیر مارشل اصغر خان کے ساتھ رہے۔ ۱۹۶۹ء میں ائیر مارشل اصغر خان نے جسٹس پارٹی کی بنیاد رکھی تو تاسیسی اجلاس شیرباز مزاری کی کوٹھی پر ہی ہوا لیکن انہوں نے اس میں شمولیت اختیار نہ کی۔ اس دوران چونکہ ائیر مارشل اصغر خان سیاسی افق سے نیچے اتر آئے تھے ان کو جب جسٹس پارٹی کے قیام سے مطلوبہ توقعات پوری نہ ہو سکیں تو انہوں نے پی ڈی پی میں شمولیت اختیار کر لی اور مغربی پاکستان کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ ائیر مارشل اصغر خان پی ڈی پی سے رخصت ہوئے تو انہوں نے بھی پارٹی چھوڑ دی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے امیدوار سے ہزاروں ووٹ زائد حاصل کئے۔ ایوان میں آزاد گروپ کے متفقہ طور پر پارلیمانی قائد چنے گئے۔ اپوزیشن نے انہیں چیف وہیپ بنا دیا۔ وہ آئینی سمجھوتے کے لئے آزاد گروپ کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ امور خارجہ کی سٹینڈنگ کمیٹی سمیت کئی کمیٹیوں کے بھی رکن رہے۔

قبائلی روایات کے مطابق قبیلے کی سرداری میر بلخ شیر مزاری کے حوالے ہوئی۔ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز مسلم لیگ سے کیا۔ ۱۹۵۱ء میں جب میاں ممتاز دولتانہ مسلم لیگ پنجاب کے صدر منتخب ہوئے تو بلخ شیر مزاری ان کے فنانس سیکرٹری تھے۔ وہ

کالعدم ڈسٹرکٹ بورڈ ڈیرہ غازی خان کے چیئرمین چنے گئے اور بلوچ جرگہ کے سردار بھی منتخب ہوگئے۔ مزاری پہلی دستوریہ کے رکن تھے۔ وہ دوسری دستوریہ کے بھی رکن منتخب ہوگئے۔ جسے غلام محمد نے پہلی دستوریہ توڑ کر منتخب کیا تھا۔ اس کے بعد آنے والی حکومتوں میں ان کی شمولیت رہی ہے ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ صدارتی انتخاب میں جب پاکستان کے عوام کے دل محترمہ فاطمہ جناح کے لئے دھڑکتے تھے، بلخ شیر مزاری نے بھی اپنی ہمدردیاں ملک کی آنے والی صدر کے ساتھ وابستہ کرلیں لیکن جب فاطمہ جناح کو دھاندلی اور ریاستی مداخلت سے شکست دی گئی تو وہ سیاست سے الگ ہوگئیں۔ میر بلخ شیر مزاری فروری ۱۹۶۵ء میں کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ کنونشن مسلم لیگ کا ٹکٹ ان کے مخالف لغاری گروپ کو دیا گیا اور ان سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں بلدیاتی سیاست میں نمایاں کیا جائے گا۔ ایوب خان نے جب جرگہ سسٹم متعارف کرانے کی کوشش کی تو لغاریوں اور مزاریوں نے اس کی مخالفت کی۔ ایوب خان کے خلاف جب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں تحریک چلی تو مزاریوں نے کنونشن مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کرلی اور وہ کونسل مسلم لیگ ممتاز دولتانہ اور ذوالفقار علی بھٹو کی جنگ میں خاموش رہے۔ ۱۹۷۰ء میں ضلع ڈیرہ غازی خان کی سیاست میں پیپلز پارٹی کی انقلابی تحریک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ پیپلز پارٹی کی تحریک نے پنجاب میں موروثی سیاست کو جس طرح روند ڈالا تھا، جاگیر داروں کے لئے یہ لمحہ فکریہ لے کر آئی تھی۔ لیکن اس ضلع میں ۱۹۷۰ء میں پیپلز پارٹی نے ایک نشست کے علاوہ تمام نشستوں پر لغاریوں اور مزاریوں کے خلاف الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ قومی اسمبلی کے حلقہ نمبر ۲ سے آزاد مزاری گروپ نے میر بلخ شیر مزاری کی بجائے ان کے چھوٹے بھائی سردار شیرباز مزاری کو امیدوار مقرر کیا۔ ان کے مقابلے میں آزاد لغاری گروپ کے ایک امیدوار محمد رمضان تھے۔ مزاریوں کے ایک چشم و چراغ عاشق محمد خان تھے جو خاندانی رنجش کی بنا پر مزاری خاندان کو پسپا دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شیرباز مزاری کے ووٹ تقسیم کرنے کے لئے کسی مزاری سردار کو آگے لانے کی ترکیب سوچی۔ لغاری گروپ کے قائد نواب زادہ محمد خان لغاری سے مشورہ کر کے انہوں نے اپنے قریبی رشتہ دار شوکت حسین مزاری کے لئے پارٹی کا ٹکٹ حاصل کر لیا۔ لغاری گروہ سے کئے گئے سمجھوتے کی رو سے عاشق مزاری نے اپنے عزیز شوکت مزاری کی انتخابی مہم کو تمن مزاری تک ہی

محدود رکھا۔ تمن مزاری سے باہر وہ محمد رمضان کی انتخابی مہم میں سرگرداں رہے۔ گویا خاندانی رقابت کی بنا پر ایک طرف پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کیا گیا اور دوسری طرف پارٹی کے خلاف لغاری گروہ کا ساتھ دیا گیا۔ پارٹی کارکنوں نے عاشق مزاری کی اس پالیسی پر شدید احتجاج کیا۔

سردار شیرباز مزاری نے ۱۹۷۰ء میں آزاد رکن منتخب ہونے کے بعد سیاسی کردار کے حوالے سے پیپلز پارٹی یا عوامی لیگ کی کشتی میں ضرور سوار ہونا تھا۔ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی اور عددی طور پر وہ قومی اسمبلی کی اکثریتی جماعت بن گئی تھی۔ اس جماعت سے مذاکرات کی غرض سے اکبر بگٹی کی سفارش پر روجھان کے مزاری سردار میر سیف الر حمان خان مراد نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی۔ وہ وہاں سے ایسے مطمئن لوٹے کہ میر بلخ شیر مزاری جو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے رکن اور شیرباز مزاری قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے، مجیب الرحمٰن کے حلقہ بگوش بن گئے۔ بعد کے حالات نے ان کی مرادیں برلانے کی اس صورت کو ختم کر دیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو پاکستان میں اکثریتی پارٹی پیپلز پارٹی ہو گئی۔ مزاری گروپ کے قائد میر بلخ شیرباز مزاری نے پیپلز پارٹی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی لغاری گروہ کے قائد محمود خان لغاری اور عطا محمد لغاری بھی پارٹی میں آ شریک ہوئے۔ میر بلخ شیر مزاری تنہا پارٹی میں نہیں گئے تھے بلکہ اپنے ساتھ اس ضلع کے بڑے بڑے جاگیردار بھی لے کر شامل ہوئے ان میں نصر اللہ دریشک ایم پی اے جو بعد ازاں آبپاشی، بجلی، خوراک اور مواصلات کے وزیر رہے۔ ذوالفقار علی کھوسہ ایم پی اے بھی پیپلز پارٹی میں میر بلخ شیر مزاری کے ساتھ شامل ہوئے تھے حالانکہ انہوں نے ۱۹۷۰ کے انتخاب میں مزاری خاندان کے رہنماؤں اور اس کے حلیف تمن داروں پر شدید تنقید کی تھی۔ پیپلز پارٹی کے انقلابی منشور نے غریب عوام میں نیا ولولہ پیدا کیا تھا اور یہ ولولہ جاگیرداروں کی سیاست پر اجارہ داری کے خاتمہ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور اس سے جاگیرداروں کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگا۔ مزاری خاندان کے عاشق مزاری نے پہلے ہی پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ عاشق مزاری کے متعلق یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے کہ یحییٰ خان کے ہاتھوں برطرف کر دیئے جانے والے بدعنوان افسروں میں یہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے

بھٹو کی زرعی اصلاحات سے بچنے کے لئے پیپلز پارٹی کے مضبوط ستون کو تھامے رکھا۔ اپنی بہت سی اراضی متفرق کمپنیوں کے نام منتقل کر دی۔ مثلاً یونائیٹڈ فارمز، پنجاب انڈس فارمز، پنجاب پروگریسو فارمز، یہ انتقال یکم فروری ۱۹۷۲ء کو ہوئے اور ان کے نمبر ۲۲ سے ۲۵ تک ہیں۔ میر بلخ شیر مزاری پر پیپلز پارٹی کی مقامی قیادت نے ۱۹۷۶ کو شدید بے ضابطگیوں کے الزامات لگائے کہ میر بلخ شیر مزاری نے پیپلز ورکس پروگرام کو سیاسی مقاصد کے تحت چلایا۔

انہوں نے عزیز و اقارب اور حلقہ انتخاب کے قریبی دوستوں کو اعلیٰ عہدوں اور ملازمتوں سے نوازا۔ اس طرح کے درجنوں الزامات تھے جو پیپلز پارٹی کی مقامی قیادت کی طرف سے مزاری خاندان کی بے ضابطگیوں کے بارے میں ۱۹۷۶ء میں عائد کئے گئے تھے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات بھی کیا خوب انداز لے کر آئے۔ جن جاگیرداروں کے خلاف عوام کو پیپلز پارٹی نے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بیدار کر دیا تھا۔ اب وہی جاگیردار پیپلز پارٹی کا سرمایہ تھے۔ مزاری، لغاری، دریشک، کھوسے، گورچانی سب تمن دار ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اور غریب کارکن پھر پس منظر میں چلے گئے۔ پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے یہاں جلسے میں بار بار کہا "لوگو! اب تمن دار نہیں آئیں گے۔ تم آگے آؤ گے۔ یہ غریبوں کی پارٹی ہے۔" اب مزاری خاندان پیپلز پارٹی میں اپنے حریف کے مقابل بہتر مقام حاصل کئے ہوئے تھا۔ اسے ضلع میں زیادہ نشستوں پر پارٹی امیدوار کھڑے کرنے کا موقع ملا تھا۔ دوسری طرف شیرباز مزاری قومی افق پر ستارہ بن کر ابھرے۔ ۱۹۷۴ء میں نیپ پر پابندی لگی تو ایک نئی سیاسی جماعت وجود میں آئی اور سردار شیرباز مزاری اس کے صدر چنے گئے۔ قومی اتحاد کی بنیاد پڑی تو شیرباز خان مزاری کی پارٹی این ڈی پی اس کی ایک رکن تھی۔ اس طرح انہوں نے قومی لیڈر کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھائے۔ بھٹو کے اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی پاکستان قومی اتحاد بھی انتشار کا شکار ہوا تو ان کی پارٹی بھی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ جس تیزی سے وہ قومی افق پر ابھرے تھے، اسی رفتار سے سیاست میں ان کا کردار ختم ہوتا گیا۔ ۱۹۷۷ء میں یہ قومی اتحاد کے امیدوار تھے۔ اس الیکشن میں ڈی جی خان کی تین نشستوں پر سردار فاروق لغاری، میر بلخ شیرباز مزاری دونوں اپنی اپنی نشستوں سے جیت گئے۔ جو معاشی

طاقت کی بدولت ایک یقینی امر تھا۔ شمالی نشست تحصیل تونسہ میں شامل تھی۔ یہ ضلع کی پس ماندہ ترین تحصیل ہے۔ پیپلز پارٹی کا امیدوار منظور لنڈ تھا۔ قیصرانی سردار کا بھی اسی تحصیل سے تعلق تھا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کی حمایت کی تھی۔ منظور لنڈ مقامی جاگیرداروں کی طرح نہیں تھے۔ دیگر سرداروں کی طرح اپنے قبیلے کے ووٹ حاصل نہ کر سکے۔ ان کا مقابلہ جمعیت علماء اسلام کے جنرل سیکرٹری اور پاکستان قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود سے تھا۔ صوبائی اسمبلی میں ضلع کی سات نشستیں تھیں۔ پیپلز پارٹی نے تقسیم اس طرح کی تھی کہ چار ٹکٹیں لغاریوں کے حصہ میں، دو مزاریوں کے اور صرف ایک سیٹ بشیرالدین سالار کو ملی جو قلفص کلر کن تھے۔ پاکستان قومی اتحاد نے اپنی شکست کو تسلیم نہ کرتے ہوئے جب ملک بھر میں دھاندلیوں کے خلاف ایک کونے سے دوسرے کونے تک تحریک چلائی اور بھٹو کا اقتدار جاتا نظر آیا تو میر بلخ شیر مزاری ایم این اے، سردار نصر اللہ خان دریشک ایم پی اے، سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ ایسا واقعہ ضلع کی سیاست میں پہلی بار ہوا کہ لغاری اور مزاری گروپ پہلی مرتبہ الگ ہوئے۔ اس سے قبل ایوب خان کے دور میں ۱۹۶۵ء میں نواب امیر محمد آف کالاباغ نے دونوں گروپوں میں صلح کرا دی تھی۔ لغاری گروپ کو قومی اسمبلی کی ٹکٹ دی گئی تھی اور میر بلخ شیر مزاری کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا تھا کہ بلدیاتی سیاست کی قیادت ان کے حوالے کر دیں گے۔ لغاری خاندان کو قومی سیاست میں نواب آف کالاباغ اس لئے نمایاں کرنا چاہتے تھے کیونکہ لغاری خاندان سے نواب آف کالاباغ کی رشتہ داری بھی تھی۔ پیپلز پارٹی سے علیحدگی کے بارے میں یہی خیال تھا کہ میر بلخ شیر مزاری کے خاندانی حریف سردار شوکت مزاری کو صوبائی وزارت میں اہمیت دی گئی تھی۔ فاروق لغاری کو وفاقی وزیر بنا دیا گیا تھا۔ اب میر صاحب کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے تشخص اور سیاست کو برقرار رکھنے کے لئے پیپلز پارٹی سے علیحدگی اختیار کرتے۔ قومی اتحاد کی تحریک میں میر بلخ شیر مزاری نے کھل کر تو حصہ نہیں لیا البتہ اندرون خانہ وہ ان کی پالیسیوں کی حمایت کرتے رہے۔ مزاری خاندان کی پوزیشن اس قدر مضبوط ہے جس میں انہیں کسی بھی سیاسی مظاہرے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ضیاء الحق نے جب مرکزی شوریٰ بنائی تو سردار بلخ شیر مزاری مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوگئے اور ضیاء الحق کی پالیسیوں کی تائید کرتے رہے۔ ضیاء الحق نے صدارتی

ریفرنڈم کرایا تو بلخ شیر مزاری اس کو کامیاب کرانے میں لگ گئے۔ اس کے حق میں ووٹ ڈلوانے کے لئے دن رات کام کیا۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے پاکستان بھر میں سب سے زیادہ ۸۴۴۴۳ ووٹ حاصل کئے۔ ان کے مقابلے میں ان کے خاندانی حریف مسٹر عاشق حسین مزاری ناکام ہوگئے۔ سردار عاشق مزاری سابق بیورو کریٹ ہیں جنہوں نے محکمہ صنعت کے صوبائی سیکرٹری کے طور پر اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے مختلف خاندانوں کو اس طرح ابھارا کہ وہ ملک کے صف اول کے اہم صنعتی گھرانے بن گئے۔ ان دو سرکردہ خاندانوں کی کہانی زیادہ پرانی نہیں۔ ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی نے سردار عاشق محمد خان کے داماد مسٹر شوکت مزاری کو صوبائی انتخاب میں اپنا ٹکٹ دیا تھا۔ ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء تک وہ پیپلز پارٹی کے وزیر رہے۔ دونوں خاندانوں میں ضلع راجن پور کی بلدیاتی سیاست میں محاذ آرائی بھی چلی آرہی ہے۔ اس سے قبل بھی میر بلخ شیر مزاری، میاں ممتاز دولتانہ سے ذاتی مراسم کی وجہ سے ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء سے پہلے آئین ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ محمد خان جونیجو کی حکومت کو جب برطرف کیا جانے والا تھا اس سے کچھ عرصہ پہلے یہ افواہیں گردش کررہی تھیں کہ میر بلخ شیر مزاری کو وزیر داخلہ بنایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسلام آباد کے کئی چکر بھی لگائے۔ افسوس کہ یہ اسمبلی برخاست ہوگئی۔ ۱۹۸۸ء کے انتخابات مزاری خاندان کے لئے کوئی اچھا شگون ثابت نہیں ہوئے۔ اگرچہ ان کے گروپ کے کئی امیدوار کامیاب ہوگئے مگر مزاری خاندان پس منظر میں چلا گیا۔ جس حلقے سے میر بلخ شیر مزاری الیکشن میں کامیاب ہوتے رہے تھے، ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے سردار عاشق محمد مزاری کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے ۵۲۹۳۶ ووٹ حاصل کئے۔ ان کے مدمقابل اسلامی جمہوری اتحاد کے نصر اللہ دریشک نے ۵۲۵۴۴ ووٹ حاصل کئے اور ایک قومی رہنما اور مزاری خاندان کے سرخیل سردار شیرباز مزاری آف این ڈی پی نے صرف ۱۰۵۶۵ ووٹ حاصل کئے۔ اگر نصر اللہ دریشک یا سردار شیرباز مزاری دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہوجاتے تو اس الیکشن کو آسانی سے جیتا جاسکتا تھا۔ سردار عاشق مزاری ۱۹۸۵ء میں میر بلخ مزاری کے مقابلے میں بری طرح شکست کھا گئے تھے۔ سردار عاشق محمد مزاری نے ۱۹۸۵ء کے صوبائی انتخاب میں بھی حصہ لیا۔ قومی اسمبلی میں عبرتناک شکست کے بعد میر

بلخ شیر مزاری کے صاحب زادے ریاض محمد مزاری کے مقابلے میں زیادہ پرجوش نہ رہے۔ دونوں ناکامیوں کے باوجود انھوں نے اپنی اہلیہ بیگم در شہوار مزاری کو خواتین کی مخصوص نشستوں پر نیشنل اسمبلی کا ممبر منتخب کروالیا تھا۔

ڈیرہ غازی خان کی بلدیاتی سیاست میں لغاریوں کی برتری برسوں قائم رہی ہے۔ ۱۹۹۱ء کے بلدیاتی انتخابات میں میر بلخ شیر مزاری کا گروپ کامیاب ہو گیا کیونکہ الیکشن سے چند دن پہلے شوکت حسین مزاری جو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۳ء تک میر بلخ شیر مزاری خاندان سے کئی سیاسی معرکے کر چکے تھے، کے چھوٹے بھائی لیاقت حسین مزاری، بلخ شیر مزاری کے حلیف بن گئے اور بلدیاتی قیادت ۱۹۹۶ء تک مزاریوں کے ہاتھ میں آگئی۔ ۱۹۹۳ء کے لوائل میں پیر آف پگاڑا اخبارات میں مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ بلخ شیر مزاری کی قیادت میں قومی حکومت قائم کی جائے۔

خان بہادر نواب محمد جمال خان لغاری تمن دار ڈیرہ غازی خان

ڈیرہ غازی خان کے لغاری

پنجاب کے روسا میں لغاری خاندان کا نام بھی نمایاں ہے ڈیرہ غازی خان کی تمن داریوں میں حزاریوں کے بعد لغاری تمن داری نے سیاسی لحاظ سے اپنے آپ کو گزشتہ ایک صدی سے نمایاں رکھا ہوا ہے۔ لغاری بھی اپنے بلوچی بھائیوں کی طرح سولہویں صدی کے اوائل میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ لغاریوں کا ایک سردار میر چاکر ہمایوں بادشاہ کے ساتھ مل گیا تو لغاریوں نے بھی میر چاکر کی معیت میں ان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے جانشینوں کے خلاف جب فوج کشی کی تو یہ ہمایوں کی فتح کے لئے پیش پیش تھے۔ ان کا بلوچی سردار اس علاقے سے نقل مکانی کر کے ضلع اوکاڑہ کے قریب ستگھرہ کے مقام پر رہائش پذیر ہو گیا اور یہیں ان کا مقبرہ بنایا گیا۔ میر چاکر کی برسی ہر سال بلوچ دھوم دھام سے مناتے ہیں تاہم لغاریوں نے اپنے سردار میر رندو خان کی قیادت میں وادی سندھ کا رخ کیا۔ جہاں اس وقت غازی خاں ڈوڈھی نے اپنی علمداری قائم کر رکھی تھی۔ لغاریوں نے حملہ کر کے ان سے یہ علاقہ چھین لیا اور احمدانی بلوچیوں کو اس علاقے سے مار بھگایا۔ یہ قبیلہ اس کے بعد متحد نہ ہو سکا اور اب بھی اس قبیلے کے کچھ لوگ ڈیرہ غازی خان میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں لغاری خاندان کی ایک شاخ یہاں سے نقل مکانی کر کے تالپور کے علاقے میں آباد ہو گئی۔ ان کے سردار شداد خان نے شمالی سندھ کے کلھوڑا سردار غلام شاہ کے ہاں پناہ لی۔ 1772 ء میں تالپوریوں اور لغاریوں نے مل کر کلھوڑوں کا خاتمہ کر دیا اور اس علاقے کی ملکیت کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔

بلوچ خان کے زمانہ میں یہ علاقہ برخان لغاریوں کے قبضہ میں تھا اور کتھران ان کے

حلیف تھے۔ برخان لغاریوں کا علاقہ اب بلوچستان میں شامل ہے اور یہ لوگ بڑے عرصہ تک آزاد اور خود مختار زندگی بسر کرتے رہے ہیں درانیوں کی ملوکیت کے دوران اچانک یہ علاقہ شورش اور فساد کی زد میں آ گیا۔ جب سکھوں نے اس علاقے پر حملہ کر کے اپنا تسلط قائم کر لیا تو ایک لغاری سردار محمد خان بھاگ کر لغاری برخان چلا گیا جہاں ان کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام انہوں نے جمال خان رکھا۔ جب لغاری زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکے تو یہ سکھوں کے حلیف بن گئے۔

1848 ء میں جب ایڈورڈ نے ڈیرہ غازی خان پر حملہ کیا تو لغاریوں نے سکھوں کا ساتھ دیا کیونکہ سکھوں نے کھوسوں اور گورچانیوں کے خلاف لغاریوں کی بھرپور مدد کی تھی۔ اس لئے فطری طور پر وہ سکھوں کے ساتھ تھے۔ جلال خان لغاری سندھ ساگر دوآب کے مقام پر اپنے پانچ سو ساتھیوں کے ساتھ لونگا مل کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف لڑتا رہا۔ ایڈورڈ نے کھوسوں اور گورچانیوں کی مدد سے سکھوں کو عبرت ناک شکست دی اور ڈیرہ غازی خان پر آسانی سے قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر سردار جلال خان لغاری انگریزوں کی خدمت میں اپنے 80 جانثاروں کے ساتھ حاضر ہوا اور انہیں اپنی وفاداری کا مکمل یقین دلایا۔ کھوسوں کی موجودگی میں لغاریوں کو وہ عزت نہ مل سکی جو وہ انگریز سرکار سے چاہتے تھے۔ بعدازاں وہ نہروں کے ٹھیکے دار بن گئے اور پٹھانوں کی مدد سے اس علاقے میں نہروں کی کھدائی کا کام شروع کر دیا اور مالا مال ہو گئے لغاریوں نے وفاداری میں انگریزوں کے دل صاف کرنے کی پوری کوشش کی۔ سردار حیدر خان لغاری 1875 ء میں سردار رابرٹ سنڈیمن کے ساتھ قلات کی مہم پر بھی گئے جس سے خوش ہو کر انہیں مجسٹریٹ کے اختیارات واپس لوٹا دیئے جو ان سے کچھ عرصہ پہلے واپس لئے تھے اور انہیں نواب کے خطاب سے بھی انگریز سرکار نے نوازا۔

اور ان سے ہر طرح کا تعاون کیا اور اپنے حریف قبائل گورچانیوں اور دریشکوں کو سبق سکھاتے رہے۔ چھاتا خان گورچانی اپنے بھتیجے سے تمن داری چھین کر خود سردار بن گیا تھا۔ وہ اپنے چچا کے خلاف شکایت لے کر لغاریوں کے پاس حاضر ہوا اور ان سے تمن داری واگزار کرانے کے لئے مدد حاصل کی کیونکہ لغاری گورچانیوں کے جانی دشمن تھے۔ اس لئے وہ دیوان ساون مل کے ساتھ مل کر چھاتا خان سے تمن داری واگزار کرانے میں

کامیاب ہو گئے۔ گورچانیوں کو ان کے ذاتی معاملات میں لغاریوں کی مداخلت گوارا نہ تھی اور اس طرح ان کے درمیان دشمنی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ رحیم خان لغاری کے ایک بیٹے کو گورچانیوں نے بہاولپور پہنچ کر قتل کر دیا۔ رحیم خان پہلے سردار کا بھتیجا تھا۔ اس نے محمد خان کی موت کے بعد تمنداری پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن مزاریوں کی مدد سے اسے بہاولپور بھگا دیا گیا، جہاں نواب نے اسے صادق آباد کی تحصیل میں رحیم یار خان کے مقام پر ایک جاگیر دے دی۔

1881 ء میں جلال خان فریضہ حج کے لئے چلے گئے، فریضہ حج سے واپسی پر اپنے گاؤں چوٹی میں پہنچنے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی موت کے بعد نواب محمد خان نے اعلیٰ درجے کے منتظم کی حیثیت سے اپنے قبیلے کا نظام چلایا۔ انہیں 1887 ء میں نواب کا لقب دیا گیا۔ تاج برطانیہ کی جوبلی تقریبات کے موقع پر انہوں نے اپنی تمن داری میں ایک تقریب بھی منعقد کی۔ نواب محمد خان نے اپنی زندگی کا ایک خاص حصہ بلوچستان کے کچھ علاقے اور فورٹ منرو پر اپنی ملکیت حاصل کرنے پر صرف کر دیا لیکن انگریزوں نے ان کا یہ دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یہ جھگڑا 1896ء تک برٹش گورنمنٹ کے ساتھ چلتا رہا۔

نواب محمد خان کے اکلوتے بیٹے جمال خان ان کی جاگیر کے مالک بنے جب تک آپ تمن داری کو پوری طرح سنبھالنے کے اہل نہیں ہو گئے۔ ان کے کزن تکیہ خان نگران تمن دار مقرر ہوئے۔ تکیہ خان 1905ء میں فوت ہوئے تو اس وقت تمن داری پر دو لاکھ کا قرض واجب تھا۔

نواب جلال خان کے بعد محمد خان اور پھر جمال خان کے جاگیر کا انتظام سنبھالتے ہی ورثاء میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تو سرداروں نے ایک کانفرنس بلائی جس میں سردار بہرام خان، سی، آئی، ای، سردار جلاب خان سی، آئی، ای اور خان بہادر جندوڈا (جو بہاول پور ریاست کے وزیر اعلیٰ بھی رہے) پر مشتمل کمیٹی نے سردار دین محمد لغاری کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ وہ لغاری تمن داری کا نظام ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں سنبھالیں گے۔ وہ تین مہینے کے اندر اندر ساٹھ ہزار روپیہ لغاری خاندان کے اخراجات کے سلسلہ میں بغیر کوئی جائیداد فروخت کئے ادا کریں گے۔ گورنمنٹ کے ٹیکس بھی وہ خود ہی ادا کریں گے۔ 1909ء تک اس

نے اپنی تمن داری کا نظام احسن طریقے سے چلایا اور وہ 90 ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہے۔ انہیں آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات بھی حاصل تھے اور انہیں صوبائی درباری کی حیثیت بھی حاصل تھی۔

سردار جمال خان لغاری کو تمن داری کے سیاسی معاملات چلانے کی خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ جنگ عظیم کے دوران انہوں نے دس ہزار روپیہ گورنمنٹ فنڈ اور اسی افراد فوج میں بھرتی کرائے تھے۔ 1915ء میں قیصرانیوں اور بزداروں میں ہونے والی خوفناک محاذ آرائی کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد انہیں خلعت اور تعریفی سند جاری کی گئی۔ خان بہادر سردار دین محمد سی، آئی، ای، کے بعد انہوں نے 1916ء میں لغاری قبیلے کی قیادت سنبھالی۔ میرانیوں اور کھترانوں کے درمیان ہونے والی قبائلی جنگ میں انہوں نے پولیٹیکل آفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور 1919ء میں انہیں فرنٹیر وار میڈل دیا گیا۔ اسی سال انہیں خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا اور چھ سال بعد انہیں نواب کا خطاب دیا گیا۔

سردار جمال خان لغاری، سردار بہرام خان مزاری کی موت کے بعد ڈیرہ غازی خان ضلع کے جرگہ کے صدر منتخب ہوئے اور انہیں بلوچستان اور پنجاب کا چیف جرگہ بھی چنا گیا۔ یہ مزاریوں پر لغاریوں کی برتری کا ثبوت تھا۔ 1921ء تک وہ پنجاب لیجلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ 1936ء میں انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ صوبائی درباری آنریری مجسٹریٹ، سول جج اور محکمہ مال کے اختیارات کے بھی حامل تھے۔ وہ ضلع کے پہلے تمن دار تھے جنہوں نے اپنے ضلع میں پرائمری تعلیم لازمی قرار دی۔ محمد جمال لغاری صوبائی وزیر بھی رہے۔ فروری 1946ء کی شاندار کامیابی سے متاثر ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ پہلے پکے یونینسٹ تھے۔ ان کے بیٹے محمد خان لغاری کو بھی مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل تھے۔ لغاری خاندان کی پرائیویٹ ریاست کا رقبہ 115,000 ایکڑ تھا اور انہیں ایک لاکھ دس ہزار روپے سالانہ تمن داری کے الگ ملتے تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے وہ اپنے والد کی تمن داری میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ گورنر پنجاب کے مشیر بھی رہے۔ ممدوٹ اور دولتانہ کشمکش میں محمد خان لغاری، ممدوٹ کے

قریبی ساتھی تھے اور اسی وجہ سے اسے مشیر کا درجہ ملا تھا۔ 1951ء کے انتخابات میں ضلع ڈیرہ غازی خان سے بلا مقابلہ منتخب ہوگئے تھے۔ ان کے مقابلہ میں اخوند عبدالکریم ایڈووکیٹ نے مسلم لیگ کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی تھی۔ اسے ٹکٹ نہ ملی تو آزاد حیثیت سے کھڑے ہوگئے۔ ڈپٹی کمشنر کی عدالت کے باہر اپنے ووٹروں سے عہد کیا کہ وہ محمد خان لغاری کا مقابلہ کریں گے کیونکہ میں غریبوں کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ تمن داروں نے عوام کو تباہ کر دیا ہے۔ اس موقعہ پر اس نے حلف بھی اٹھایا۔ پھر وہ اچانک محمد خان لغاری کے حق میں دستبردار ہوگئے۔ 1951ء کے انتخابات میں ڈیرہ غازی خان میں مسلم لیگ کو فقید المثال کامیابی حاصل ہوئی تھی جس میں سردار محمد خان لغاری، سردار محمد خان گشکوری، سردار بہادر خان دریشک، سردار امیر محمد خان، معین اعظم خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوگئے تھے۔ صرف تونسہ شریف کے خواجہ صدید الدین جناح عوامی لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ لغاری خاندان کے ساتھ گشکوری سرداروں کی طویل سیاسی رفاقت رہی ہے اور انہوں نے سیاسی حوالے سے ہمیشہ لغاری خاندان کا ساتھ دیا ہے سردار محمد خان گشکوری ایک با اصول سیاستدان تھے انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز مسلم لیگ سے کیا تھا اور زندگی کی آخری سانس تک مسلم لیگی ہی رہے وہ سیاست میں بدلتی ہوئی وفاداریوں کو پسند نہ کرتے تھے سردار محمد خان گشکوری کے والد پیر کوٹ مٹھن کے خواجہ غلام فرید کے مرید خاص تھے انہوں نے خواجہ غلام فرید کی گدی کے وارث خواجہ شریف محمد اور ان کے فرزند خواجہ احمد علی جن کو نواب آف بہاولپور نے اپنی ریاست سے ملک بدر کر دیا تھا نے اپنے ہاں بمعہ خاندان آباد کیا انھیں محلات بنا کر دیئے اور اپنی زمینوں کا ایک تہائی رقبہ جو تقریباً ایک ہزار ایکڑ تھا پیر گھرانے کے نام منتقل کر دیا سردار حق نواز گشکوری۔ سردار سلطان محمود گشکوری، سردار کریم داؤد خان اور سردار شاہ نواز گشکوری بھی لغاری خاندان کی سیاست کے ہم نوا رہے ہیں۔

محمد خان لغاری کے پنجاب کے جاگیرداروں کے ساتھ گہرے سیاسی روابط رہے ہیں، اس لئے قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں کہ یہ بھی وزارت اعلیٰ کے امیدوار ہیں۔ میاں ممتاز دولتانہ جب وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے تو انہوں نے انھیں تعمیرات عامہ بجلی اور سڑکوں کی وزارت دی۔ جب میاں ممتاز دولتانہ کا سنگھاسن ڈولا تو سردار عبدالحمید دستی اور محمد خان

لغاری 1953ء میں قادیانی تحریک کے دوران پراسرار طور پر کراچی گئے جہاں انہوں نے خواجہ ناظم الدین مرحوم (وزیر اعظم) اور میاں مشتاق گورمانی (وزیر داخلہ) سے ملاقات کر کے انھیں پنجاب میں دولتانہ وزارت توڑنے پر آمادہ کرلیا۔ یہ دونوں حضرت خواجہ ناظم الدین اور میاں مشتاق گورمانی کے ساتھ لاہور آئے۔ اسی روز دولتانہ کی وزارت توڑ دی گئی۔ اس کے بعد فیروز خان نون کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تو سردار محمد خان نون وزارت میں وزیر مال کی حیثیت سے شامل رہے۔ جب ملک نون کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک ناکام ہوگئی تو عبدالحمید دستی، محمد خان لغاری، سید علمدار حسین گیلانی سے میاں مشتاق گورمانی نے استعفیٰ لے کر نون وزارت کو برطرف کر دیا۔

جب سردار عبدالحمید دستی نے نئی وزارت بنائی تو محمد خان لغاری مال آبکاری، محصولات، نو آبادیاں اور آب پاشی کے وزیر بنائے گئے۔ دوسری دستوریہ میں جن سیاسی خاندانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، ان میں میجر مبارک، کرنل عابد حسین جھنگ، سید علمدار حسین گیلانی ملتان اور محمد خان لغاری شامل تھے۔ ری پبلکن میں شامل ہونے کا واضح فیصلہ نہ کرسکا کیونکہ ری پبلکن پارٹی میں ملک فیروز خان نون کو اہم مقام حاصل تھا۔

ایوب خان نے جب مارشل لاء نافذ کیا تو محمد خان لغاری نے الزامات قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان پر نااہلی کے ٹریبونل کے تحت بدعنوان اور اقربا پروری کے الزامات عائد کر کے 31 دسمبر 1966ء تک سیاست سے نااہل قرار دے دیا۔ ان کی ہزاروں ایکڑ زمین زرعی اصلاحات کی زد میں بھی آگئی۔

ایوب خان نے جب کنونشن لیگ کی بنیاد رکھی تو لغاری خاندان کے سربراہ محمد خان لغاری سیاست میں نااہل ہونے کی وجہ سے سیاست میں حصہ نہ لے سکے تو 1962ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ان کا مخالف گروپ میر بلخ شیر مزاری قومی اسمبلی اور ذوالفقار کھوسہ صوبائی اسمبلی میں پہنچ گئے جب ایوب خان نے کنونشن لیگ کی بنیاد رکھی تو لغاری خاندان اس میں شامل ہوگیا۔ نواب آف کالاباغ کی لغاریوں سے رشتہ داری بھی تھی جس کی وجہ سے نواب آف کالاباغ نے میر بلخ شیر مزاری کو 1965ء کے انتخابات میں حصہ نہ لینے پر راضی کرلیا اور کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر نواب محمود خان لغاری کو بلا مقابلہ منتخب کرالیا۔ اس طرح ڈیرہ غازی خان کی سیاست میں پہلی مرتبہ دونوں خاندانوں میں مفاہمت کا راستہ نکلا۔

12 اگست 1965ء کو سر جمال خان لغاری معائنہ کے لئے سوئیزرلینڈ گئے۔ روم میں رات ٹھہرے اور معدے میں شدید درد ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ محمد خان لغاری کے بھائی سردار محمود خان لغاری ملتان ڈویژن کے کمشنر رہے ہیں۔ سر جمال خان لغاری کی بیٹی عفیفہ ممدوٹ بھی ضیاالحق کے مارشل لاء دور میں وزیر رہی ہیں۔ 1970ء کے انتخابات میں نہ تو لغاری خاندان اور نہ ہی حزاری خاندان نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ 1970ء میں محمد خان لغاری صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیت گئے۔ کچھ عرصے بعد وہ فوت ہوگئے۔ تو ان کی خالی نشست پر ان کے چھوٹے بھائی سردار عطا محمد ایم پی اے منتخب ہوگئے۔ 1970ء میں ان کا مخالف دھڑا بھر بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگیا جن میں سردار شیرباز حزاری اور ڈاکٹر نذیر احمد حزاریوں کی حمایت سے نصر اللہ دریشک اور ذوالفقار کھوسہ آزاد امیدواروں کی حیثیت سے کامیاب ہوگئے۔ لغاریوں اور حزاریوں دونوں دھڑوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی حالانکہ 1970ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے دورہ ڈیرہ غازی خان کے دوران اس بات کا اعلان کیا تھا کہ غریب عوام اب آپ پر ظلم کرنے والا کوئی تمن دار نہیں رہے گا۔

محمد خان لغاری کے بعد ان کے صاحب زادے سردار فاروق لغاری قبیلے کے سردار بنے۔ وہ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہوئے تھے۔ 1973ء کے آئین کے تحت جب سینٹ کا ادارہ معرض وجود میں آیا تو سردار محمد فاروق لغاری سینٹر منتخب ہوئے۔ اسی دوران پیپلز پارٹی پنجاب کے فنانس سیکرٹری بھی رہے۔ 1977ء میں ڈاکٹر نذیر کی نشست سے قومی اتحاد کے صدر مفتی محمود اور پیپلز پارٹی کے منظور لنڈ کو جو پیپلز پارٹی چھوڑ کر دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے. امیدوار تھے۔ دوسری نشست پر فاروق لغاری اور تیسری پر سردار بلخ شیر حزاری کو پیپلز پارٹی کا ٹکٹ دے کر دونوں دھڑوں کو راضی کرلیا گیا تھا۔ صوبائی اسمبلی کی ٹکٹوں کی تقسیم اس طرح تھی۔ چار لغاریوں کو اور دو حزاریوں کو دی گئیں۔ ایک سیٹ مخلص کارکن بشیر احمد سالار کو دی گئی۔ فاروق لغاری 1977ء میں وفاقی وزیر بنا دیئے گئے تو حزاری ناراض ہوگئے۔ قومی اتحاد کی چلنے والی عوامی تحریک کا بہانہ بنا کر سردار نصر اللہ دریشک. سردار ذوالفقار کھوسہ اور میر بلخ شیر حزاری نے پیپلز پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ ملکی سیاست میں پہلی مرتبہ دونوں گروہوں کی راہیں الگ ہوئی تھیں۔ کیونکہ

دونوں متحارب گروہ برسراقتدار جماعتوں میں شامل رہے ہیں۔ دونوں گروپوں کی سیاسی پوزیشن اس قدر مضبوط ہے کہ انہیں کسی سیاسی مظاہرے کی ضرورت نہیں، 1979ء اور 1983ء کی بلدیاتی سیاست پر بھی لغاریوں کا قبضہ رہا ہے۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں سردار مقصود خان لغاری کامیاب ہوئے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ان کے چچا عطا محمد لغاری رکن وفاقی مجلس شوریٰ. نے بھی کاغذات جمع کرائے اور سردار عطا لغاری کے بیٹے سردار محمد جعفر لغاری بھی حلقہ این اے 125 سے امیدوار تھے۔ سردار مقصود احمد کے والد سردار محمود احمد خان لغاری 1965ء میں بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ سردار مقصود لغاری کے تایا محمد خان لغاری پنجاب کے صوبائی وزیر رہے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سردار عطا محمد خان ضمنی نشست پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ سردار مقصود لغاری کے کزن سردار فاروق لغاری پیپلز پارٹی کی صف اول کی قیادت میں شامل ہیں۔ 1985ء میں سردار مقصود احمد صوبائی نشست سے بھی کامیاب ہوگئے تھے اور ان کے ایک کزن سردار محمد جعفر خان لغاری بھی کامیاب ہوئے تھے۔

1988ء کے انتخابات میں فاروق لغاری نے اپنی پھوپھی عفیفہ ممدوٹ اور اپنے ایک چچا سردار عطا محمد کو بھی شکست دی تھی جو 1985ء میں بھی اپنے ایک بھتیجے سردار مقصود لغاری سے شکست کھا گئے تھے۔ سردار عطا لغاری نے 1987ء کے بلدیاتی انتخاب میں سردار مقصود لغاری کو شکست دے کر بدلہ چکا دیا تھا۔ سردار عطا لغاری نظریاتی طور پر پیپلز پارٹی سے ہم آہنگ نہ ہوسکے۔ ان کے دو صاحب زادے سردار عمر خان اور سردار جعفر خان لغاری صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ 1988ء میں مقصود لغاری پھر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر پیپلز پارٹی کے امیر حسین کو شکست دی تھی۔ مقصود لغاری محمد خان جونیجو کی وفاقی کابینہ میں بھی شامل رہے ہیں۔ انہوں نے 1988ء کے انتخابات میں اپنے چچا سردار عطا لغاری کو ایک بار پھر شکست دی۔ البتہ ان کے صاحب زادے جعفر خان لغاری کامیاب ہوئے۔ فاروق لغاری جو لغاری قبیلے کے سردار ہیں، پنجاب اسمبلی میں قائد ایوان کے امیدوار کی حیثیت سے چند ووٹوں سے شکست کھا گئے۔ انہوں نے اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے کی بجائے

مرکز میں جہاں محترمہ بے نظیر بھٹو بر سر اقتدار تھیں، جانا پسند کیا اور اپنے علاقے سے دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے اور وفاقی وزیر بنا لئے گئے۔ مرکز اور پنجاب محاذ آرائی میں جب میاں نواز شریف کے خلاف پنجاب میں عدم اعتماد کی زور دار تحریک چلائی گئی تو مقصود لغاری سے جو میاں نواز شریف کی کابینہ میں وزیر کی حیثیت سے شامل تھے، استعفیٰ دلوا دیا۔

1988ء کے انتخاب میں لغاری خاندان کو ایک اور زبردست کامیابی حاصل ہوئی جب راجن پور، روجھان کی نشست سے مزاری خاندان کے سرخیل سردار شیرباز مزاری اور ان کے قبائلی حریف نصر اللہ دریشک کو قومی اسمبلی کی نشست پر چند سو ووٹوں سے شکست ہوئی۔

1990ء میں بھی لغاری خاندان نے اپنی کامیابی کو برقرار رکھا۔ پیپلز پارٹی جہاں پنجاب میں بری طرح شکست کھا گئی وہاں لغاری خاندان کے سردار فاروق لغاری، سردار مقصود لغاری اور سردار منصور احمد لغاری نے کامیابی حاصل کی۔ 1990ء سے فاروق لغاری قومی اسمبلی میں ڈپٹی اپوزیشن لیڈر ہیں۔ 1991ء کے بلدیاتی انتخابات میں لغاری خاندان کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ لغاری خاندان کی ضلع ڈیرہ غازی اور راجن پور میں بلدیاتی برتری کو ختم کیا گیا ہے۔ 1992ء کے انتخابات کے حوالے سے ضلع ڈیرہ غازی خان کی بلدیاتی سیاست سے لغاری خاندان کا صفایا ہو گیا۔ قومی اسمبلی میں ڈپٹی لیڈر آف دی اپوزیشن فاروق لغاری قومی سیاست میں دن بدن نمایاں ہو رہے ہیں۔ 1990ء اور 1988ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے ٹکٹ تقسیم کرتے ہوئے ان کی رائے کو بڑی اہمیت دی تھی۔

ڈیرہ غازی خان کے دریشک

دریشک "ہوت" قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ میر چاکر خان رند کے ساتھ ساتھ وفادار ساتھی کی حیثیت سے نمایاں رہے تھے۔ ایک مرتبہ میر چاکر نے مغل بادشاہ سے لشاری سرداروں کی عورتوں کو رہا کرایا ان کے لئے شامیانے لگائے تاکہ وہ ان میں رات بسر کر سکیں اور دریشکوں کو ان عورتوں کی پہرہ داری کے لئے متعین کر دیا۔ اسی رات ایسا زور کا جھکڑ چلا جس نے ہر چیز کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور خیمے اکھڑ گئے لیکن دریشک جوانوں نے ساری رات خیمے کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھا اور اسے گرنے نہ دیا۔ جب میر چاکر نے دریشکوں کی بہادری کا یہ قصہ سنا تو انہیں ""گولڈن دریشک" کا خطاب دیا۔

دریشک پہلے پہاڑوں پر رہتے تھے۔ حزاری میدانی علاقے میں آکر آباد ہوئے تو دریشک بھی پہاڑوں سے اتر کر میدانی علاقے میں آباد ہو گئے۔ میدانی علاقے میں آباد ہونے کی دعوت انہیں اسلام خان نے دی تھی جو اس زمانے میں اس علاقے کے گورنر تھے۔

انہوں نے آسنی Asni کے علاقے میں رودھن خان کو زمین دے دی پہاڑی علاقے کے ارد گرد حزاریوں کا وسیع علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ داؤد خان کے زمانہ میں چار نسلوں بعد دریشکوں اور جسکانیوں کے درمیان خوفناک لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ جسکانیوں کو ان لڑائیوں میں بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا جس میں تقریباً ایک سو جسکانی مارے گئے اور انہوں نے لڑائیاں بند کر دیں۔

سردار عظمت خان کے زمانہ میں نواب محمود خان ڈیرہ غازی خان کا ایک طاقت ور

حکمران تھا۔ اس نے دریشکوں کے خلاف چڑھائی کی اور اس نے آسنی کے مقام پر قلعہ بنایا۔

عظمت خان کے بیٹے حیات خان نے بروہیوں کی مدد سے ناصر خان آف قلات کی آشیرباد سے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ خان آف قلات دریشکوں کی مدد کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ جب ایڈورڈز نے 1848ء میں ڈیرہ غازی خان پر چڑھائی کی تو بجاران خان دریشک نے ان کی ہر طرح سے مدد کی اور انہوں نے اپنے کزن بخش خان کی قیادت میں ایک سو سپاہی ایڈورڈز کی مہم جوئی میں بھیجے۔ ملتان کے محاصرے کے دوران بجاران خان کے بھیجے ہوئے سپاہیوں نے بہادری کے جوہر دکھائے اور بہت سے مزاحمتی کرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایڈورڈز نے انہیں سونے کی دو قیمتی زنجیریں، ایک ہزار روپیہ اور خلعت انعام میں دیں۔

آسنی جو دریشکوں کا صدر مقام تھا اور جسے کنٹونمنٹ کا درجہ حاصل تھا، جب 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے یہاں سے ایک خصوصی دستہ انگریزوں کی مدد کے لئے روانہ کیا گیا۔ بجاران خان کو رسالدار کا عہدہ دیا گیا۔ میرانیوں نے جب دریشکوں کو مصروف دیکھا تو میدانی علاقے میں چھاپہ مار کر دریشکوں کے مویشی اٹھا کر لے گئے اور کئی گلہ بانوں کو قتل کر گئے۔ جب بجاران خان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ اور انہوں نے مرانیوں پر چڑھائی کی۔ اس خوفناک اور خونی لڑائی میں بجاران خان اور اس کا بڑا بیٹا درہین خان مارا گیا اور یہ دریشکوں کے لئے بہت بڑا نقصان تھا۔ ان کا بیٹا میران خان جو ابھی چھوٹا تھا، کو والد کی خدمات کے صلہ میں ملنے والی ایک ہزار سالانہ پنشن بڑھا دی گئی۔

میران خان نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ قبائلی جھگڑوں میں گزار دیا اور یہ جنگ طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ عدالتوں کے کٹہرے میں لڑی گئی۔ میران خان کے بعد ان کا بیٹا درہین خان قبیلے کا سربراہ بنا۔ انہوں نے اپنے باپ کی جنگجویانہ طرز زندگی کے بجائے تمام تر توجہ اپنے قبیلے کی اصلاح پر صرف کر دی۔ حزاریوں اور دریشکوں کی دشمنی بھی مثالی رہی ہے۔ حزاریوں اور دریشکوں میں دشمنی کی ابتداء اس طرح ہوئی تھی کہ حزاری اپنی بھیڑ بکریاں گنڈاری کی پہاڑیوں پر چرایا کرتے تھے۔ دریشک آتے اور ان کے

جانور اٹھا کر لے جاتے۔ جمال خان نے ایک مرتبہ ان پر چڑھائی کی اور ایک درجن دریشک مارے گئے۔ دونوں قبائل ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے رہے جن میں جمال خان حزاری کی بیوی ماری گئی اور ماں زخمی ہو گئی۔ حزاری آج تک سمجھتے ہیں کہ دریشکوں نے ان کی بے عزتی کی ہے۔ دریشک اس کا جواز یہ بتاتے ہیں کہ جمال خان کی بیوی کا قتل اور ماں کا زخمی ہونا اتفاقیہ تھا۔

درہین خان نے اپنے باپ کے برعکس جس طرز کا انداز اپنایا تھا، اس کی انگریزوں کی نگاہ میں گہری قدر تھی اور انہیں انعام و کرام سے نوازا۔ سربراہ کا انعام 2932 روپے مقرر کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دریشکوں کے ساتھ انگریزوں نے ایک معاہدہ کیا تھا کہ وہ مشکل وقت میں انہیں گھوڑے اور سوار مہیا کریں گے جن کا معاوضہ فی سوار مقرر تھا اور یہ رقم آٹھ سو روپیہ سالانہ بنتی تھی۔ سردار درہین خان کو صوبائی نشست الاٹ کی گئی اور 1910ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ جنگ عظیم میں انہوں نے جنگی قرضہ میں چار ہزار قرضہ دیا اور درجنوں سپاہی بھرتی کرائے۔ میرانیوں نے جب فساد برپا کیا تو درہین خان نے اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ درہین خان کے ایک بھائی سردار بہادر خان کو ترقی دے کر 1919ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ڈیرہ غازی خان ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے کیا تھا۔ ان کے ایک اور بھائی سردار مرید خان کو 1916ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ سردار افضل خان جو کہ سردار جھارا کے نام سے مشہور تھے، 1922ء میں سب انسپکٹر کے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ سردار باچا خان بارڈ ملٹری پولیس میں شامل تھے۔ پنجاب میں جب یونینسٹ کی بنیاد رکھی گئی تو بڑے بڑے جاگیردار اس میں شامل ہو گئے تھے لیکن سردار بہادر خان نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ 1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن نامزد ہوئے۔ 1951ء میں سردار بہادر خان دریشک نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی تھی۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے غلام علی اور محمد صادق آزاد کو شکست دی تھی۔ بدلتے ہوئے حالات پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ ری پبلکن، کنونشن مسلم لیگ میں بھی شامل رہے۔ 1970ء میں ان کے بیٹے نصر اللہ خان دریشک نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور کامیابی حاصل کی۔ علاقائی دھڑے بندی میں نصر اللہ دریشک نے

حزاری گروپ سے وابستگی اختیار کی۔ میر بلخ شیر حزاری کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے۔ انہیں پانی اور آبپاشی کا وزیر بنایا گیا اور میر بلخ شیر حزاری پیپلز ورکس پروگرام ضلع ڈیرہ غازی خان کے صدر تھے۔ دونوں نے مل کر لغاریوں کے خلاف مضبوط محاذ بنایا۔ لغاری بھی پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ 1977ء میں نصر اللہ خان دریشک نے پیپلز پارٹی کے قائدین کے ساتھ مل کر زور دار انتخابی مہم چلائی اور انتخابی مہم میں انہوں نے بھٹو کو غریبوں کا نجات دہندہ اور ایک عظیم لیڈر کا خطاب دیا۔ 1977ء میں ان کا مخالف دھڑا بھی پیپلز پارٹی کی کامیابی کے لئے سرگرم رہا۔ 1977ء کے انتخابات میں دھاندلیوں کے خلاف جب زور دار تحریک چلی تو میر بلخ شیر حزاری کے ساتھ نصر اللہ دریشک نے بھی پیپلز پارٹی کو الوداع کہہ دیا۔ 1979ء کے بلدیاتی انتخابات میں حزاری، لغاریوں کی بلدیاتی سیاست میں برتری کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور 1987ء تک اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات میں حزاری گروپ نے واضح کامیابی حاصل کی تو انہیں ضلع ڈیرہ غازی خان کی نمائندگی دیتے ہوئے وزیر بنا دیا گیا۔ میاں نواز شریف سابق وزیر اعلیٰ کے خلاف جب عدم اعتماد کی تحریک شروع ہوئی تو نصر اللہ دریشک، ملک اللہ یار اور پرویز الٰہی کے گروپ میں نمایاں تھے جس کا میاں نواز شریف کو بہت رنج تھا۔ یہ واحد ایم پی اے تھے جنہیں میاں نواز شریف نے سب سے زیادہ انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا۔ مگر بعد میں ان کی وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف سے صلح ہو گئی اور انہوں نے انہیں نگران وزارت میں لے لیا۔ 1988ء میں مرکز میں پیپلز پارٹی برسراقتدار آئی اور میاں نواز شریف صوبہ پنجاب میں وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے تو ایک موقع پر پیپلز پارٹی کا ایک گروہ ایک بار پھر انہیں وزارت اعلیٰ کے طور پر متعارف کرانے لگا۔ ماضی کے تجربہ کی روشنی میں انہوں نے بار بار تردید کی کہ وہ میاں نواز شریف کے وفادار ساتھی ہیں۔ 1988ء میں نصر اللہ دریشک گرچہ صوبائی حلقہ سے جیت گئے تھے، البتہ قومی اسمبلی میں سردار عاشق حزاری سے چند سو ووٹوں سے شکست کھا گئے تھے۔ چند سالوں میں نصر اللہ دریشک نے صوبائی سیاست میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ 1991ء کے بلدیاتی انتخابات میں میر بلخ شیر حزاری اور نصر اللہ دریشک کے درمیان اختلافات بھی ابھرے ضلع راجن پور میں انہوں نے اپنا گروپ مضبوط کر لیا ہے، نصر اللہ دریشک نے میر بلخ شیر حزاری کے خاندانی حریف شوکت حسین حزاری کے بھائی لیاقت

حزاری کو اپنے گروپ میں شامل کر لیا ہے۔ اس طرح بلدیہ راجن پور میں میر بلخ شیر حزاری کو بری طرح پسپائی اختیار کرنا پڑی ہے۔ 1991ء میں صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں نصر اللہ دریشک نے جب ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں جارحانہ تنقیدی انداز اختیار کرتے ہوئے زوردار تنقید کی تو اسمبلی فلور میں ایسے کئی چہرے موجود تھے جنہوں نے پیپلز پارٹی اور ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں نصر اللہ دریشک کے تعریفی ارشادات سنے تھے۔ انہوں نے اس موقعہ پر زوردار قہقہے لگائے۔

1992ء میں ضلع کونسل اور بلدیہ میں دریشک گروپ نے برتری حاصل کر لی۔ جاوید احمد خان گورچانی چیئرمین، محمد افضل خان حزاری وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔ اس طرح میونسپل کمیٹی راجن پور کے چیئرمین محمد اسلم اور وائس چیئرمین عبدالکریم دریشک کو ضلع کونسل میں برتری حاصل رہی ہے۔

ڈیرہ غازی خان کے کھوسے

چودھویں صدی میں دوسرے بلوچ قبیلوں کی طرح کھوسے بھی ڈیرہ غازی کے علاقے میں آکر آباد ہوئے۔ اس قبیلے کی ایک شاخ سکھر اور سندھ میں بھی آباد ہے۔ روجھان کے مشرق میں اس قبیلے کا ایک فرد (Balel) بلیل خان ڈیرہ غازی خان میں آکر آباد ہوا۔ اس نے اپنے قبیلے کا پڑاؤ ایک ایسے پہاڑ پر ڈالا جس کا نام بعد میں کوہ بلیل پڑ گیا۔ ان کے قریب ہی کتھرانوں کا قبیلہ آباد تھا۔ بعد ازاں دونوں قبائل پہاڑوں سے میدانی علاقے میں اتر آئے۔ غازی خان میرانی نے بلیل خان کو لگان معاف کر دیا۔ کھوسوں کو میدانی علاقے میں آکر آباد ہونے میں خاصا وقت لگا۔ بالآخر وہ لنڈی ضلع ڈیرہ غازی خان میں آباد ہوگئے۔ کھوسوں کا زیادہ تر وقت قبائلی لڑائیوں میں ہی گزرا۔ ان کے سب سے بڑے دشمن میرانی تھے۔ کھوسوں نے ان کے خلاف بھرپور حملہ کیا اور ان کے لیڈروں کو قیدی بنا لیا۔ میرانیوں کے تین سرداروں کی بیٹیوں سے کھوسوں نے شادی کر لی تاکہ وہ کھوسوں کی حاکمیت تسلیم کر کے علاقے میں امن قائم رکھیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1819ء میں جب ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کیا تو لال خان تنگانی جو کہ اپنے قبیلے کا معزول چیف تھا، اس نے کھوسوں کے خلاف نواب آف بہاولپور سے مدد حاصل کی۔ نواب صادق آف بہاولپور نے لال خان کی مدد کے لئے دو ہزار افراد کی فوج بھیجی۔ اس موقع پر کھوسوں کی ہمدردیاں سکھوں کے ساتھ تھیں۔ اس خوفناک لڑائی میں لال خان مارا گیا اور نواب آف بہاولپور کی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ نواب آف بہاولپور نے شرمندگی مٹانے کے لئے غلام حیدر خان کو مجبور کیا کہ امن صرف اور صرف اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی شادی کے لئے نواب خاندان کو دے۔ یہ مطالبہ نواب آف بہاولپور نے یہ

جانتے ہوئے کیا تھا کہ اسے اس مطالبے کے جواب میں انکار کا سامنا ہی کرنا پڑے گا۔ غلام حیدر نے مشکل وقت میں لغاریوں، گورچانیوں اور تنگانیوں سے مدد مانگی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ قبیلے کی برتری قائم کرتے ہوئے غلام حیدر نواب آف بہاولپور کے دستوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد ان کا بیٹا کوڑا خان کھوسے قبیلے کا سردار بنا۔ اس نے مجبور ہو کر نواب آف بہاولپور کو اپنی بیٹی شادی کے لئے دے دی۔ اس کے بعد نواب آف بہاولپور نے سردار غلام حیدر سے دشمن داری کی جو سوغاتیں چھینی تھیں، وہ کوڑا خان کو واپس کر دی 1830ء میں کوڑا خان راجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوا اور انہیں ایک ہزار روپیہ سالانہ پنشن دی گئی۔ 1832ء میں ملتان کے گورنر دیوان ساون مل کے ساتھ کوڑا خان مکمل تعاون کرتے رہے ہیں۔ بزداروں اور کتھرانوں نے سکھوں کے خلاف جو محاذ آرائی شروع کر رکھی تھی، کوڑا خان کے عملی تعاون سے ساون مل گھبرا گئے کہ کوڑا خان کی اتنی مہربانیاں کیوں ہیں۔ آہستہ آہستہ دیوان ساون مل کے ساتھ کھوسوں کے ماضی جیسے تعلقات برقرار نہ رہے اور غلط فہمیاں بڑھتی رہیں۔ جب ایڈورڈز نے ڈیرہ غازی خان کے علاقے کی طرف مارچ کیا تو کوڑا خان نے اپنے بیٹے غلام حیدر خان کو ڈیرہ فتح خان میں انگریزوں کی مدد کے لئے بھیجا۔ شہر کا حکمران لونگا رام تھا جو دیوان ساون مل کے ماتحت تھا۔ غلام حیدر خان نے دوسرے حواریوں کے ساتھ مل کر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی میں سکھوں کے اسی آدمی مارے گئے۔ لونگا رام کو قیدی بنا لیا گیا اور اسے ایڈورڈز کے حوالے کر دیا گیا۔ کوڑا خان ایڈورڈز کے ساتھ ملتان آیا اور ان کے ساتھ تین سو کھوسے تھے جنہوں نے سکھوں کا محاصرہ کر کے انہیں شکست دی۔ اب کوڑا خان کی پنشن بڑھا کر 2200 روپے سالانہ کر دی گئی اور انہیں ایک باغ تحفہ میں دیا گیا۔ بعد ازاں غلام حیدر کو رسالدار بنا دیا گیا۔ غلام حیدر نے اپنے قبیلے کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ نوکری کے دوران وہ خود کو اچھا منتظم ثابت نہ کر سکا۔ ان کے ماتحت اس سے اکثر نالاں رہتے تھے۔ آخر کار اسے نوکری سے جواب دے دیا گیا۔ اسے سیر و سیاحت اور مہم جوئی کا بہت شوق تھا۔ اس شوق میں اس نے ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا۔ کئی مرتبہ اس شوق میں اسے گھوڑے اور ضروری سامان اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے فروخت کرنا پڑے۔ اسی شوق میں اس نے قبیلے کے معاملات میں بھی رہنمائی نہ کی

جس سے قبیلے کی اجتماعیت بکھر گئی۔ کوڑا خان کا سب سے بڑا بیٹا احمد خان نشے کا عادی تھا اور اسی لت میں اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ احمد خان کا بیٹا سکندر خان تمن داری کے معاملات کی نگرانی کرتا رہا لیکن اس نے بھی خود کو اہل ثابت نہ کیا تو چیف شپ غلام حیدر خان کے بیٹے سردار بہادر خان کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ سردار کوڑا خان نے بہت لمبی عمر پائی تھی۔ انہوں نے اپنے پوتے کی دستار بندی خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ سکندر خان جو نا سمجھداری کی وجہ سے تمن داری نہ چلا سکتا تھا. جب اس کو نظر انداز کر کے غلام حیدر کے بیٹے سردار بہادر کو تمن داری دی گئی تو اسے اس بات کا شدید رنج ہوا۔ کوڑا خان کی موت تک وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد قیادت کے مسئلہ پر وہ لڑتا جھگڑتا رہا۔ 1857ء میں جب قبیلے کے حالات دگرگوں ہوگئے تو تمن داری کا انتظام کورٹ آف وارڈ میں چلا گیا کیونکہ فالج کے حملے کی وجہ سے سردار خان بھی تمن داری کے قابل نہ رہا تھا۔ اس نے آٹھ سال تک قبیلے کا انتظام چلایا۔ سکندر خان نے اب خود کو اہل ثابت کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے 1862-63ء میں اپنے خرچے پر زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے نہر کھدوائی۔ ایک اور نہر فضل علی خان لنڈ چیف نے بنائی تھی۔ 1881ء میں دونوں نہروں پر حکومت نے قبضہ کر لیا جس کے عوض سکندر خان کو 500 ایکڑ اراضی اور سردار بہادر خان کو 300 ایکڑ اراضی دی گئی۔ سردار بہادر خان کو آنریری مجسٹریٹ اور صوبائی درباری بھی بنا دیا تھا۔ وہ 1906ء میں فوت ہوئے۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ تمن داری سکندر خان کے بیٹے مبارک خان کو مل گئی۔ وہ 1906ء سے 1916ء تک تمن دار رہے۔ وہ صوبائی درباری کی لسٹ میں بھی شامل تھے۔ اس کی بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کے کزن سردار غلام حیدر تمن دار بنے۔ وہ تمن داری کے دوران صوبائی درباری، خان بہادر، آنریری مجسٹریٹ اور سب جج کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ بھی ہوتے رہے انہوں نے 1936ء میں سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنے سب سے بڑے بیٹے سردار دوست محمد کو تمن داری دے دی۔ اس وقت سردار دوست محمد کی عمر صرف 26 سال تھی۔ وہ بارڈر ملٹری پولیس میں دفعدار تھے۔ اس نے اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود قبیلے کا بھرپور اعتماد حاصل کر لیا۔ انہیں آنریری مجسٹریٹ کی اتھارٹی بھی دی گئی۔ کھوسہ سرداروں کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ زیادہ تر سرداروں کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہوئی۔ سردار حیدر خان کے زمانے میں تمن داری انتہائی زوال کے دور میں تھی اور

اس پر بہت سا قرضہ واجب الادا ہو گیا جس کی وجہ سے تمن داری کورٹ آف وارڈ میں چلی گئی۔ سردار دوست محمد کے سب سے بڑے بیٹے سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے 1962ء میں کامیابی حاصل کی۔ 1951ء میں کھوسہ خاندان کے بزرگ سردار عطا محمد کھوسہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ڈیرہ غازی خان کی سیاست پر لغاریوں اور حزاریوں کا ہی سیاسی تسلط رہا ہے لیکن سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے سیاسی وابستگیاں حزاری خاندان سے استوار رکھیں۔ 1972ء میں وہ جماعت اسلامی کے امیدوار کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ بلخ شیر حزاری اور نصر اللہ دریشک کے ساتھ پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ جب پیپلز پارٹی اقتدار سے الگ ہوئی تو حزاری گروپ نے پیپلز پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ سردار ذوالفقار علی کھوسہ بھی پیپلز پارٹی سے علیحدہ ہوگئے۔ 1983ء اور 1987ء کے بلدیاتی انتخابات میں کھوسہ خاندان نے نمایاں ہونے کی ایک بار پھر کوشش کی جس میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سردار ذوالفقار علی کھوسہ 1985ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جب میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے تو انہوں نے انہیں وزیر بنا لیا۔ مارشل لاء دور میں مسلم لیگ کی بحالی ہوئی تو ذوالفقار علی کھوسہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔

سردار ذوالفقار علی کھوسہ کے علاوہ 1985ء میں ان کے کزن امجد فاروق کھوسہ بھی کامیاب ہوئے تھے۔ 1988ء میں سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے پیپلز پارٹی کے سردار عالم خان کھیتران کو شکست دی تھی۔ سردار محمد احمد کھوسہ بھی اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے حالانکہ پیپلز پارٹی نے کھوسہ خاندان کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر و رسوخ کو تقسیم کرنے کے لئے سردار صلاح الدین کھوسہ کو ٹکٹ دیا تھا جس میں پیپلز پارٹی کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ 1990ء میں کھوسہ خاندان نے اپنی برتری برقرار رکھی البتہ سردار ذوالفقار علی کھوسہ نے پہلی بار اپنے بیٹے سیف الدین کھوسہ کو 1990ء کے انتخابات میں متعارف کرایا تھا مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے البتہ کھوسہ خاندان نے 1991ء کے بلدیاتی انتخابات میں لغاری خاندان کا برسوں پرانا اقتدار ضلع ڈیرہ غازی خان سے ختم کر دیا۔ 1992ء میں سردار ذوالفقار علی کھوسہ کا بیٹا سیف الدین کھوسہ 33 ارکان کی رائے اپنے حق میں کر کے بھاری اکثریت سے ضلع کونسل کے چیئرمین منتخب ہوگئے۔ ان

کے بالمقابل لغاری گروپ کے امیدوار سردار شبیر خان لغاری سمیت دس ارکان نے اجلاس میں شرکت نہ کی۔ بلدیہ کی قیادت بھی کھوسہ خاندان کے ہاتھ میں رہی۔ سردار دین محمد خان کھوسہ چیئرمین بلدیہ منتخب ہوگئے۔ لغاریوں کی بارہ سالہ بلدیاتی برتری کا خاتمہ کھوسہ خاندان کے ہاتھوں ہوا۔

بہاولپور کے نواب

پنجاب کے جنوب مغرب اور سندھ کے شمال مشرق میں دریائے سندھ اور ستلج کے درمیان تین سو میل لمبی اور پچاس میل چوڑی ریاست بہاولپور کی بنیاد گرچہ اٹھارویں صدی کے اوائل میں رکھی گئی تاہم اسے نوابی اور جاگیر کا درجہ انگریزی ہی کے زمانے میں عطا ہوا۔ اس ریاست پر داؤد پوتوں کی حکمرانی تھی جو اپنے آپ کو حضرت عباسؓ کی اولاد کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں حضرت عباسؓ کے بیٹے عرب سے ہجرت کرکے خراسان کے راستے سندھ میں آکر آباد ہوگئے۔ یہاں انہوں نے دریائے سندھ سے نہریں نکالیں اور وسیع رقبہ پر قابض ہوکر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ بہاولپور کا علاقہ جسے پہلے ریاست کا درجہ حاصل تھا، 1739ء میں نادر شاہ نے صادق محمد خان اول کو تحفہ میں دیا تھا اور صادق محمد خان کو نواب کے خطاب سے سرفراز کیا۔ یہ ریاست شروع میں چھوٹے چھوٹے حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی اور اس طرح ایک ریاست میں کئی نوابیاں قائم تھیں۔ صادق محمد خان کے پوتے بہاول خان دوم نے ریاست کے بکھرے ہوئے عناصر کو اجتماعیت کا رنگ دے کر قبیلے کے تمام سرداروں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرلیا۔ بہاول خان نے جب بہت طاقت حاصل کرلی تو ملتان کے کئی اضلاع پر بھی قبضہ کرلیا۔ 1802ء میں انہوں نے ایک ٹکسال قائم کی اور ریاست بہاولپور کا الگ سکہ چلا دیا۔ کچھ عرصہ بعد سکھوں نے جب طاقت پکڑی تو انہوں نے بہاولپور پر حملہ کرکے بہاول خان کو نواب کے عہدے سے الگ کردیا، تاہم بہاول خان سوم نے 1825ء میں انگریزوں سے مدد حاصل کرکے بہاولپور کو سکھوں سے واگزار کرالیا۔ انگریزوں نے نواب بہاول پور کی امداد اس لئے کی کیونکہ برصغیر میں سکھ انگریزوں کے لئے بہت بڑا چیلنج بنتے

جارہے تھے اور انہیں علاقے میں اپنے ہم نواؤں کی شدت سے کمی محسوس ہورہی تھی۔ 1838ء میں جب انگریزوں نے افغانستان سے جنگ کی تو بہاول خان نے بدلہ چکانے کے لئے ان کی بڑی مدد کی۔

1848ء میں جب انگریزوں کو سکھوں کے ساتھ دوسری بار معرکہ پیش آیا تو ملتان میں انگریزوں کے خلاف اس موقع پر بڑی خوفناک شورش برپا ہوئی۔ نواب آف بہاولپور نے اپنے نوجوان اور فوج ایڈورڈز کی قیادت میں دے دیئے جنہوں نے مل راج سے کئی معرکے کئے اور یوں جنرل والش نواب کے عملی تعاون سے بڑا خوش تھا۔

انہیں لائف پنشن، ایک لاکھ کی رقم اور آٹھ لاکھ روپے ان کے نوجوانوں اور فوجی دستوں کی گراں قدر خدمات کے عوض انعام دیئے۔

1850ء میں نواب بہاول خان نے اپنے بڑے بیٹے کی بجائے اپنے چھوٹے بیٹے یار خان کو نواب بنا دیا۔ انگریز سرکار نے بھی نواب بہاول خان کے اس فیصلہ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ 1852ء میں نواب بہاول کے بڑے بیٹے نواب فتح خان کو نواب بہاول خان کے اس فیصلے کے خلاف اکسا کر داؤد پوتوں نے بغاوت کرادی۔ نواب سعادت خان نے اندرونی خلفشار کے موقع پر انگریزوں سے مدد کی درخواست کی۔ گورنر جنرل نے اس موقع پر نواب سعادت خان کو جواب دیا کہ ہماری حکومت ریاست کے دشمنوں کو کچلنے کے لئے صرف حقیقی نواب کی ہی امداد کرے گی۔ اس طرح انگریز نے نواب فتح خان کو بھی ایک طرح سے نواب تسلیم کرلیا تھا۔

1863ء میں داؤد پوتوں نے نواب بہاولپور خان چہارم کے خلاف بغاوت کی لیکن اسے سختی سے کچل دیا گیا۔

1865ء میں اس کے دشمنوں نے ایک بار پھر بغاوت کردی۔ موسم خزاں میں ہونے والی بغاوت کو صرف ایک مہینے کی مختصر مدت میں کچل دیا گیا اور اس کے فوراً بعد ان کی پراسرار موت واقع ہوگئی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کے دشمنوں نے انہیں موت کی نیند سلادیا تھا۔ اس کے بعد ریاست بہاولپور کا نواب نابالغ ہونے کی وجہ سے ریاست کا نظام سنبھالنے سے قاصر تھے۔ ریاست کا نظام حکومت کے کنٹرول میں چلا گیا۔ صادق خان چہارم کے بالغ ہونے تک ریاست کا انتظام انگریزوں کے ہی سپرد رہا۔ 1879ء میں جب

نواب بالغ ہوا تو اسے نوابی واپس کر دی گئی۔ اسی دوران ریاست کو ہر لحاظ سے ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ ریاست کی آمدن چودہ لاکھ سے بڑھ کر بیس لاکھ ہو گئی تھی۔

اس دوران نگران انتظامیہ نے ریاست میں سڑکوں کے جال بچھا دیئے۔ پل بنائے اور عوامی اداروں کی بلڈنگیں تعمیر کیں۔ سب سے بڑا کارنامہ وہاں کی قدیم نہر کی مرمت اور اس کی توسیع تھا۔

نواب صادق خان چہارم نے دوسری افغان جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ 20 ہزار سے زائد اونٹ، سینکڑوں خچر اور بیل انگریز سپاہ کی نقل و حرکت کے لئے وقف کر دیئے۔ 500 سپاہیوں کا خصوصی دستہ اور سو تلوار بردار سپاہی ڈیرہ غازی خان کے محاذ پر وقف کر دیئے اور صوبہ سرحد میں نواب نے انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے سوڈان اور مصر میں بھی انگریزوں کی اپنی حیثیت سے بڑھ کر مدد کی۔ اس تعاون کے اعتراف میں لارڈ رپن نے 1880ء میں ریاست کا خصوصی دورہ کیا اور انہیں "Grand Cross of the star of India" کا خطاب دیا۔

وہ اپنے علاقے میں 25 سال تک عوامی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ 1889ء میں ان کی موت واقع ہوئی۔

نواب بہاول خان پنجم ریاست کے وارث بنے۔ یہ لارڈ کرزن کا عہد تھا۔ نواب کم عمری میں ہی فوت ہو گیا اور صادق محمد خان پنجم ان کے جانشین مقرر ہوئے جو کہ 1904ء میں پیدا ہوئے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد امیر بہاول نے ریاست بہاولپور کا الحاق پاکستان سے کر لیا۔

نواب بہاولپور نے حلقہ زمینداران کی طرف سے مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کو شہری اور سید غلام مرتضیٰ شاہ کو اپنی کابینہ میں شامل کیا۔

قیام پاکستان سے قبل میاں مشتاق گورمانی وزیر اعلیٰ بہاولپور کی ذمہ داری سے عہدہ براہ ہوتے رہے ہیں۔ گورمانی کے بعد کرنل اے جے ڈرنگ وزیر اعظم مقرر کئے گئے۔ انگریز وزیر اعظم کے خلاف ریاستی عوام میں شدید ردعمل پایا جاتا تھا۔ نواب آف بہاولپور نے مارچ 1949ء کو ریاست کی ہونے والی 25 سالہ سلور جوبلی کے موقع پر ریاست کے عوام کو اصلاحات دینے کا وعدہ کیا۔ 8 مارچ 1949ء عوام کو زیادہ سے زیادہ سیاسی اور

اقتصادی سہولتیں دی گئیں۔ دسمبر 1951ء کو ریاست میں انتخابات ہوئے۔ حزب اختلاف نے مخدوم زادہ حسن محمود کے خلاف دھاندلی کے الزامات عائد کیے۔ جس میں انہوں نے 40 میں سے 37 نشستوں پر اپنے امیدواروں کو بلا مقابلہ منتخب کروالیا تھا۔

امیر بہاولپور نے دوبارہ انتخابات منعقد کرائے۔ اس میں نظام الدین حیدر جیسے سیاست دان شکست کھا گئے۔ جب ون یونٹ کا اعلان ہوا تو ریاست بہاولپور کی انفرادی حیثیت ختم ہوگئی۔ اعلیٰ حضرت امیر صادق محمد خان عباسی اپنے اختیارات حکمرانی سے دستبردار ہوگئے۔ اس طرح عباسیہ خاندان کی دو سو سالہ حکمرانی کا باب بند ہوگیا۔ اس موقع پر انہوں نے ریاست کے عوام کو پیغام دیتے ہوئے کہا کہ "میرے خاندان اور آپ کے مابین جو تعلقات پچھلے چند سو سالوں سے چلے آرہے تھے، اس کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ میں نے اس موقع پر محبت اور احسان کے پرخلوص جذبات کے ساتھ آپ کی محبت، تعظیم، وفاداری اور تعاون کا جو آپ کم و بیش پچاس سال تک میرے ساتھ روا رکھتے رہے ہیں، دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے بھروسہ ہے کہ آپ اپنے محبوب وطن پاکستان کے ساتھ اچھی دوستی اور وفاداری میں آپ سے کسی طرح پیچھے نہیں رہیں گے۔ مجھے آپ کی ترقی، خوشحالی سے انشاء اللہ تادم زیست اک گونا دلچسپی رہے گی۔ میری دلی دعا ہے کہ رحمن و رحیم آپ پر ہمیشہ اپنا فضل و کرم فرمائے۔ آپ کا حامی و ناصر اور آپ کو سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

امیر بہاولپور کا خاندان الحاق کے بعد سیاست کے سیاسی منظر سے ہٹ گیا۔ 23 اپریل 1956ء کو جب ری پبلکن پارٹی کی بنیاد پڑی تو بہاولپور کے بڑے بڑے سیاستدان اس میں شامل ہوگئے۔ ایوب خان کے دور میں نواب آف بہاولپور کے صاحب زادے محمد عباس خان عباسی بلا مقابلہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔

ایوب خان کے زوال کے بعد جب ون یونٹ کو توڑ کر سابقہ صوبے بحال کیے گئے تو بہاولپور کو صوبہ پنجاب کا ہی حصہ بنا دیا گیا جس پر ریاست کے عوام اور سیاستدانوں نے صوبہ کی سابقہ حیثیت بحال کرنے کی تحریک شروع کی اور 1970ء کے انتخابات کو سیاستدانوں نے ریاست کی بحالی کے ریفرنڈم کا نام دیا۔ میاں نظام الدین حیدر کے علاوہ بہاولپور کے سرفہرست رہنما علامہ رحمت اللہ ارشد نے اس وقت کے گورنر سے ملاقاتیں

کیں اور انھیں اپنا ماضی الضمیر بتایا۔ نظام الدین حیدر، مخدوم نور محمد ہاشمی اور مخدوم سعید الرشید عباسی کی عظیم الشان کامیابیوں نے یہ ثابت کر دیا کہ عوام صوبے کی بحالی کے لئے کسی طرح بے چین ہیں۔ ان رہنماؤں کی سیاسی وابستگیاں اپنی جگہ تھیں لیکن علیحدہ صوبہ بنانے کی جدوجہد کے دوران ان کو ذاتی مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی قیادت پر عوام نے اعتماد کیا تھا۔ اس کا شاخسانہ علیحدہ صوبہ کی تحریک ہی تھی۔

پیپلز پارٹی نے بر سر اقتدار آتے ہی عوام میں علیحدہ صوبے کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو ختم کرنے کے لئے یہاں کے نواب عباس احمد عباسی کو صوبہ پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔
اس کے ساتھ ہی عباسی خاندان کی سیاسی وابستگی پیپلز پارٹی کے ساتھ ہو گئی اور پیپلز پارٹی نے نواب سعید الرشید عباسی کو وفاقی وزیر مملکت بنا دیا۔ 1977ء کے انتخابات میں تین میں سے دو نشستیں عباسی خاندان کے حصہ میں آئیں۔ ایک سابق گورنر کے بیٹے پرنس صلاح الدین اور دوسری عباسی خاندان کے پرنس سعید الرشید عباسی کے حصہ میں آئی۔ پیپلز پارٹی کا جب سنگھاسن ڈولا تو عباسی خاندان پیپلز پارٹی سے الگ ہو گیا۔ بعد ازاں شہزادہ سعید الرشید عباسی کو وفاقی شوریٰ کا رکن بنا دیا گیا۔ غیر جماعتی انتخابات میں شہزادہ سعید الرشید عباسی مسلسل تیسری بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جب اسمبلی میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تو یہ سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔
1988ء کے انتخابات میں شہزادہ صلاح الدین عباسی این اے 141 سے قومی اسمبلی کے امیدوار بنے۔ انھیں اسلامی جمہوری اتحاد کی حمایت بھی حاصل تھی۔ 1988ء کے انتخابات سے چند دن پہلے شہزادہ سعید الرشید عباسی نے پیپلز پارٹی میں پھر شمولیت اختیار کر لی۔ انھیں شہزادہ صلاح الدین نے بھاری اکثریت سے شکست دی۔
1985 کے انتخابات میں شہزادہ سعید الرشید عباسی کے علاوہ نواب آف بہاولپور کے پوتے صاحب زادہ محمد عثمان عباسی بھی کامیاب ہوئے تھے۔ 1988ء کے انتخابات میں انھیں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر شکست ہوئی تھی اور ان کے مقابلہ میں مسٹر عبداللہ خان ڈاہر اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ 1985ء میں عباسی خاندان کے صاحب زادہ فاروق انور عباسی بھی کامیاب ہوئے تھے، بعد ازاں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور صوبائی پارلیمانی سیکرٹری بھی بنائے گئے۔ 1988ء کے انتخابات

میں انھیں اسلامی جمہوری اتحاد نے ٹکٹ نہیں دیا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے شکست کھائی تھی۔ 1990ء کے انتخابات میں فاروق انور عباسی اور پرنس صلاح الدین عباسی اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گئے جبکہ صاحب زادہ عثمان عباسی اور پرنس صلاح الدین عباسی شکست کھا گئے۔

خان گڑھ کے نواب زادے

نواب زادہ خان محمد عبداللہ خان ملتانی پٹھانوں کی بابر برانچ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں اس علاقے میں آکر آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے اس علاقے میں اپنے رشتہ داروں کو بھی آباد کیا۔ مظفر خان اس خاندان کے اثر و رسوخ کے حوالے سے اہم فرد تھے۔ البتہ اس خاندان کو عروج اللہ داد خان سے حاصل ہوا تھا جنہوں نے سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے ایڈورڈز کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد 1857ء میں حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی انگریزوں سے وفاداری کو سراہنے کے لئے خصوصی طور پر دو مرتبہ دربار لگایا گیا اور انہیں دو بار خدمات کے صلہ میں خلعت دی۔ وہ اپنے علاقہ خان گڑھ میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ان کی وفات 1885ء میں ہوئی۔ ان کی موت کے بعد ان کے ہونہار بیٹے نواب سیف اللہ کو انگریزی حکومت نے درجہ اول کے اختیارات کے ساتھ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور درجہ دوم کے اختیارات کے ساتھ منصف کے عہدہ پر تعینات کیا۔ وہ صوبائی درباری بھی تھے۔ 1894ء میں انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ 1910ء میں انہوں نے سرکاری عہدوں پر رہتے ہوئے انگریزوں کے لئے جو خدمات سرانجام دی تھیں، اس کے بعد انہیں نواب کے خطاب سے نوازا گیا۔ 1909ء میں انہیں گیارہ گاؤں الاٹ کئے گئے جس کے عوض انہیں سالانہ چھ ہزار ادا کرنے پڑتے تھے۔ نواب سیف اللہ 1924ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد ان کے خاندانی معاملات نواب زادہ خان محمد عبداللہ کے پاس چلے گئے۔ وہ آنریری مجسٹریٹ اور چار موضع کے نمبردار تھے۔ وہ زمیندار بنک کے صدر بھی تھے، انہوں نے دوسری خدمات کے علاوہ جنگ عظیم میں بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ جس کے

صلہ میں انہیں سندیں اور ایک گن انعام میں دی گئی۔ انہوں نے اپنے علاقے میں مالیہ اکٹھے کرنے کے لئے مقامی انتظامیہ کی بڑی مدد کی جس کے عوض انہیں 175 روپے گرانٹ سالانہ ملتی تھی اور یہ گرانٹ زندگی بھر کے لئے تھی۔ ان کے چھ بیٹے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس خاندان کے ایک ہونہار سپوت نواب زادہ نصر اللہ خان کی صورت میں صاحب عروج ہوئے جن کی شخصیت نے حکومتوں کو بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی پچاس سالہ سیاسی زندگی حزب اختلاف کے بنچوں پر بیٹھ کر گزری ہے۔ وہ برصغیر کی سیاست میں نصف صدی سے حصہ لے رہے ہیں۔ گرچہ انہوں نے نواب خاندان میں آنکھ کھولی لیکن ان کی سیاست نواب زادوں، جاگیرداروں اور معروف سیاستدانوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی لغت میں جھکنے، بکنے اور دبنے کے الفاظ ہی نہیں۔ نواب زادہ نصر اللہ خان ہر طاقت ور کے سامنے جھک جانے کا نام نہیں بلکہ سینہ تان کر کھڑے رہنے کا نام ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی میں ٹھوکریں بھی کھائیں اور غلط اندازے بھی لگائے اور غلط فیصلے بھی کئے۔ ماضی بعید اور قریب میں ان کے بعض فیصلے تو اس قدر غلط ٹھہرے کہ ان سے قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ گیا۔

نواب زادہ نصر اللہ خان نے 1933ء سے طالب علم کی حیثیت سے ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس دور میں سر فضل حسین کی قیادت میں یونینسٹ پارٹی تشکیل پاچکی تھی۔ پنجاب کے مسلمان، ہندو، جاگیردار اور انگریزوں کے خطاب یافتہ اس پارٹی میں شامل تھے اور خود نواب زادہ نصر اللہ خان کا خاندان یونینسٹ پارٹی کا ہم نوا تھا۔ انہوں نے خاندان سے بغاوت کرتے ہوئے احرار پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ احرار مکتب فکر میں کانگرسی مسلمان، جمعیت العلمائے ہند اور مجلس احرار کے اکابرین کا موقف تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کا انخلاء نہ صرف مسلمانوں کو آزادی دلائے گا بلکہ مشرق وسطیٰ کے عرب بھائیوں کو بھی برطانوی فرانسیسی استعمار سے نجات دلانے کا باعث بنے گا۔ اس لئے وہ ہندوؤں سے مل کر انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو تیز رکھنا ملی فریضہ سمجھتے تھے۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ احرار پارٹی نے مسلم لیگ اور مسلمانوں کی رائے کے خلاف کئی بار مخالفانہ موقف اختیار کیا۔

قیام پاکستان کے بعد نواب زادہ نصر اللہ خان نے احراری طرز فکر کو خیرباد کہہ دیا اور

مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ 1951ء کے انتخابات میں وہ خان گڑھ حلقہ نمبر 6 اور حلقہ نمبر 7 سے مسلم لیگ کے امیدوار تھے۔ انہوں نے دونوں نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ حلقہ نمبر 6 میں انہوں نے اعجاز الحق کو اور حلقہ نمبر 7 سے فیض محمد خان جتناح عوامی لیگ کے امیدوار کو شکست دی۔

ان کی سیاسیات پاکستان پر شروع ہی سے گہری نظر رہی ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم کے بارے میں ان کی رائے تھی نواب زادہ لیاقت علی خان اگرچہ قائداعظم کے بعد مسلم لیگ میں سب سے زیادہ نمایاں اور قد آور شخصیت تھے لیکن وہ قائداعظم جیسی بصیرت اور خود اعتمادی سے بہرہ ور نہیں تھے۔ ان کے دور اقتدار میں پنجاب، سرحد اور بہاولپور میں جو صوبائی الیکشن کرائے گئے، ان میں جمہوری روایات کو پامال کیا گیا اور بیلٹ بکس کے تقدس کو اس قدر مجروح کیا کہ عوام کا جمہوری اداروں اور روایات سے اعتماد متزلزل ہو گیا۔ اس کے علاوہ مسلم لیگ کو بھی متحرک اور فعال جماعت کے طور پر بھی باقی نہ رہنے دیا گیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان نے خود صدارت کا عہدہ سنبھال کر جمہوری روایات کو ختم کر دیا تھا۔ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ جس نے شہری آزادیوں پر پابندیاں عائد کرنے پر خضر وزارت کے خلاف پنجاب میں انتہائی متوثر اور جاندار تحریک چلائی تھی، اس نے اپنے دور اقتدار میں انہی پابندیوں کو اپنے عوام پر عائد کرنا شروع کرنا مناسب سمجھا۔ 1950ء میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں پنجاب کے مسلم لیگی ارکان دستور ساز اسمبلی نے ان پابندیوں کے خلاف قرار داد پیش کی اور میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات نے ان پابندیوں کے خلاف اسمبلی میں تقاریر کیں تو ان دونوں حضرات کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔

مسلم لیگ میں جب قول و فعل کا تضاد نمایاں ہو گیا تو نواب زادہ نصر اللہ خان نے مسلم لیگ کی ان کی پالیسیوں پر شدید نقطہ چینی کی اور بالآخر مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حزب اختلاف کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے حکومتی پالیسیوں پر بھی شدید نقطہ چینی کی۔ 1956ء کی دستور سازی میں انہیں مسلم لیگ کی کھلم کھلا مداخلت نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ البتہ انہوں نے دستور سازی سے باہر رہتے ہوئے بھی حکومتی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی

کی۔ نواب زادہ نصراللہ خان سازشوں کے دور میں بھی ایک باخبر سیاستدان تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ کے بعد یہ واحد سیاستدان تھے جو سکندر مرزا کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسیوں سے باخبر تھے۔ ملک فیروز خان نون کے آخری دنوں میں جب بہاولپور کے رکن اسمبلی احمد نواز گردیزی کو نائب وزیر مقرر کیا گیا تو اس موقع پر انہوں نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں سکندر مرزا، نواب افتخار ممدوٹ، نواب مظفر خان قزلباش اور مخدوم زادہ حسن محمود شامل تھے۔ اس میں نواب زادہ نصراللہ خان کو بھی مدعو کیا گیا۔ سکندر مرزا نے ملک کے سیاسی حالات پر اظہار خیال کیا کہ عبدالقیوم خان آزاد انتخابات کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ اس شخص نے اپنے دور اقتدار میں بیلٹ بکس توڑنے کی رسم ڈالی۔ یوسف خٹک جنرل سیکرٹری پاکستان مسلم لیگ اور ابراہیم جھگڑا کو دھاندلی سے ہرا دیا۔ اس پر نواب زادہ نصراللہ خان نے سکندر مرزا کو کہا کہ اگر قیوم خان نے ایک غلط رسم ڈالی ہے تو یہ بات آپ کے لئے وجہ جواز نہیں بنتی کہ انتخابات میں وہی حربے استعمال کریں۔ اس بات پر سکندر مرزا سے تلخی ہوگئی۔ انہوں نے غصے میں آکر نواب زادہ نصراللہ خان کو کہا کہ آپ نے دیکھا کہ 1953ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران ہماری فوج نے اس عوامی تحریک کو چند گھنٹوں میں کچل دیا۔ اس پر نواب زادہ نصراللہ خان نے جواب دیا کہ فوج نے نہتے عوام پر گولیاں چلا کر اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد نہ تو صوبائی حکومت بچ سکی بلکہ خواجہ ناظم الدین کو بھی لے ڈوبی اور اس وجہ سے آج تک ملک کو سیاسی استحکام حاصل نہ ہوسکا۔ اس لئے عوام کی سیاسی تائید حاصل کئے بغیر اگر آپ نے صرف فوجی طاقت پر انحصار کیا تو آپ بھی باقی نہ رہیں گے اور ملک کا مستقبل بھی مخدوش ہوجائے گا اس دعوت میں ری پبلکن وزراء کی حالت قابل رحم تھی۔ سازشوں کے دور نے آخر کار دم توڑ دیا اور ملک کو سکندر مرزا اور اس کے سازشی ٹولے سے نجات مل گئی۔ 1962ء کے آئین کے تحت جب انتخابات کرائے گئے تو اس میں سیاسی جماعتوں کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ پاکستان کی سیاست میں ایسی بےہودہ روایت تھی جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان نے 1962ء کے آئین کو لائل پور کا گھنٹہ گھر قرار دیا۔ اس کے خالق منظور قادر تھے اور ذوالفقار علی بھٹو بھی اس آئین کی تخلیق کا کریڈٹ لیتے ہیں۔ 1962ء کے انتخابات میں نواب زادہ نصراللہ خان نے قومی اسمبلی کے

انتخاب میں کامیابی حاصل کی تھی۔ 8 جون 1962ء کو مارشل لاء ختم کرکے آئین نافذ کیا۔ اس آئین کے نفاذ کے سولہ دن بعد حزب اختلاف کے نو رہنماؤں کا بیان جسے Nine Leaders Statement کا نام دیا گیا تھا، اخبارات میں شائع ہوا بیان دینے والوں میں نورالامین، حمید الحق چوہدری، عطاءالرحمان خان، مجیب الرحمان، محمود علی اور نواب زادہ نصراللہ نمایاں تھے۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ نئی دستور ساز اسمبلی بنا کر نیا آئین تیار کیا جائے۔

اس دور سے نواب زادہ نصراللہ خان کی جدوجہد کا یادگار دور شروع ہوتا ہے۔ ان کی کوششوں سے ملک کی حزب مخالف کی تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل ڈیموکریٹک فرنٹ (N-D-E) قائم کیا گیا۔ مغربی پاکستان سے نوابزادہ نصراللہ خان اس کے کنوینر بنے۔ انہوں نے اس حیثیت سے جب ایوب خان سے ملاقات کی تو ایوب خان نے بالواسطہ طریق انتخاب کے حق میں دلائل دیئے تو نوابزادہ نصراللہ خان بھی ان کو مسلسل دلائل دیتے رہے۔ ایوب خان نے چلانا شروع کر دیا۔ کہ آپ لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ سب اپنے لئے یا اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لئے کرنا چاہتا ہوں، اس میں میری کوئی خود غرضی نہیں۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے بھی انہیں اسی لہجے میں جواب دیا۔ صدر مملکت سے جس متانت اور سنجیدگی کی عموماً توقع کی جاتی ہے۔ وہ آپ کے ہاں مفقود ہے۔ آپ کو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم بھی اپنی کوئی غرض لے کر آپ کے پاس کبھی نہیں آتے۔ یہ قومی مسئلہ ہے۔ اس کی خاطر ہم نے اپنی جماعتوں کے نقطہ نظر سے آپ کو آگاہ کرنا مناسب سمجھا ورنہ ہم نے کبھی آپ سے ملنے کی خواہش نہیں کی۔ "

1965ء کے صدارتی انتخابات میں حزب اختلاف نے محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور ان کے انتخابی جلسوں میں ایک بار پھر تحریک پاکستان کے مناظر دیکھنے کو ملے لیکن افسوس کہ ان کے ووٹ چرا لئے گئے حزب اختلاف کی قوت کو ایک جگہ پر متحد رکھنے کا کریڈٹ نواب زادہ نصراللہ خان کو جاتا ہے۔ ایوب خان اور نواب آف کالا باغ نے اس بات کا تہیہ کر لیا تھا کہ نوابزادہ نصراللہ خان کو کسی صورت میں قومی اسمبلی کا رکن منتخب نہ ہونے دیا جائے۔ مداخلت کے باعث وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد

نوابزادہ نصراللہ کے دل میں حکومت کے خلاف گرہ پڑ گئی۔ وہ پہلے سے زیادہ جوش اور جذبے کے ساتھ حزب اختلاف کی سیاسی قیادت کی ذمہ داری احسن طریقے سے سنبھالتے رہے۔ انہی کی کوششوں سے پانچ جماعتوں کا اشتراک معرض وجود میں آیا۔ ان میں مسلم لیگ، جماعت اسلامی، نظام اسلام، آٹھ نکاتی عوامی لیگ اور نیشنل ڈیمو کریٹک فرنٹ شامل تھیں۔ فرنٹ کے قائدین نے جس میں چوہدری محمد علی، نوابزادہ نصراللہ خان، مولانا مودودی، میاں ممتاز دولتانہ، عطاء اللہ خان، عبدالسلام خان، مولوی فرید احمد، پروفیسر غلام اعظم، خواجہ خیرالدین شامل تھے مشرقی اور مغربی پاکستان کا طوفانی دورہ کیا۔

نوابزادہ نصراللہ خان نے محسوس کیا کہ پاکستان تحریک جمہوریت سے باہر کی جماعتوں کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے شیخ مجیب کی چھ نکاتی عوامی لیگ اور جمعیت علمائے اسلام کے ساتھ ڈھاکہ میں مذاکرات کئے۔ ان جماعتوں کے ساتھ صرف دو نکات پر اتفاق ہو سکا۔ صدارتی کی بجائے وفاقی پارلیمانی نظام کا قیام اور بی ڈی سسٹم کے بالواسطہ انتخاب کی بجائے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات اس نئی تنظیم کا نام نوابزادہ نصراللہ خان نے ڈیمو کریٹک ایکشن کمیٹی (D-A-C) رکھا اور وہ ان کے کنوینر چنے گئے۔

جمہوری مجلس عمل نے ایوبی آمریت کے خلاف جو زور دار عوامی رابطہ مہم چلائی تھی، اس میں سب سے اہم کردار نواب زادہ نصراللہ خان کا ہی تھا جس سے مجبور ہو کر کہ ایوب خان نے گول میز کانفرنس کے ذریعے سیاسی رہنماؤں سے مذاکرات کے ذریعے سیاسی مسائل حل کرنے کا راستہ نکالا اور یہ مذاکرات نصراللہ خان کی فتح تھی کہ اس نے ایوب خان کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر ایوب خان کو اعلان کرنا پڑا کہ وہ آئندہ الیکشن میں صدارتی امیدوار نہ ہوں گے۔ یہ ایک طرح سیاست سے کنارہ کشی کا کھلا اعتراف تھا۔ مجلس دستور عمل نے اپنے دو نکات پر الحاق کیا تھا۔ ان کے پورا ہو جانے کے بعد اپوزیشن کا شیرازہ بکھر گیا مجلس دستوری عمل نے عوام کو سیاسی شعور دیا تھا لیکن قوم مجیب الرحمان کے چھ نکات اور ذوالفقار علی بھٹو کے روٹی، کپڑے اور مکان کے نعرے میں بہہ گئی۔ ان کی پاکستان جمہوری پارٹی 1970 ء کے عام انتخابات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی اور نوابزادہ نصراللہ خان خود بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ نوابزادہ نصراللہ خان نے دو حلقوں سے شکست

کھائی تھی البتہ ان کی پارٹی کے چار صوبائی رکن منتخب ہو گئے۔ پیپلز پارٹی کے دور میں بھی نوابزادہ نصراللہ خان نے اپوزیشن رہنما کی حیثیت سے حکومتی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ تحریک ختم نبوت میں انہوں نے تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپوزیشن رہنماؤں کو پیر آف پگاڑا کی قیادت میں متحد کر کے متحدہ حزب اختلاف کی بنیاد رکھی اور بھٹو کی آمرانہ پالیسیوں کے خلاف تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو شکست دینے کے لئے پاکستان قومی اتحاد کی بنیاد ڈالنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے جنہوں نے نو مختلف نظریات کی حامل سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا تھا۔ خاص طور پر ولی خان، جماعت اسلامی اور مولانا شاہ احمد نورانی کو جس طرح قومی اتحاد میں شامل کیا گیا، ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ انہوں نے ملک میں ذوالفقار علی بھٹو کی مخالف قوتوں کو ملک کی سب سے بڑی سیاسی قوت بنا دیا۔ 1977 ء کے انتخابات میں انہوں نے پیپلز پارٹی کے امیدوار سردار امجد حمید دستی کو شکست دی تھی۔ امجد حمید دستی کے والد عبدالحمید دستی صدا بہار اسمبلی کے رکن رہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی میں بہت کم وقت حزب اختلاف میں گزارا جبکہ نواب زادہ نصراللہ خان کا زیادہ تر وقت حکومتوں کی مخالفت میں گزرا۔ انہوں نے کسی حکومت کو سکون اور چین سے چلنے نہ دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر دھاندلی کی تو ان کے خلاف تحریک چلانے کی تجویز بھی نواب زادہ نصراللہ خان نے دی تھی جس کے نتیجہ میں بالآخر ملک میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ اس کے بعد نواب زادہ نصراللہ خان نے پیپلز پارٹی سے مل کر جمہوریت کی بحالی کے لئے کام شروع کیا۔ تحریک بحالی جمہوریت کے نام سے پلیٹ فارم کی تشکیل بھی انہی کے ذہن کی اختراع تھی۔ ضیاء الحق کی پالیسیوں پر تنقید کرنا ایک جرم تھا تو اس وقت نواب زادہ نصراللہ خان کی آواز ہی تھی جس نے حق گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا

کتنے بے درد ہیں کہ صَرصَر کو صبا کہتے ہیں
کتنے ظالم ہیں کہ ظلمت کو ضیا کہتے ہیں

ایوب خان کی طرح جب ضیاء الحق نے اقتدار پر قابض رہنے کے لئے صدارتی ریفرنڈم کرایا تو نوابزادہ نصراللہ خان نے اس کے خلاف شدید رد عمل ظاہر کیا اور خاص طور پر جب ضیاء الحق نے آٹھویں آئینی ترمیم کی تو نوابزادہ نصراللہ خان نے ارکان اسمبلی کو

خبردار کیا کہ وہ ضیاء الحق کی آمریت پر مہر ثبت کریں گے۔ 1985 ء کے غیر جماعتی انتخابات کو عوام اور جمہوریت کے لئے زہر قاتل قرار دیتے ہوئے اس کا بائیکاٹ کیا۔ 10 اپریل 1986 ء کو جب محترمہ بے نظیر بھٹو لاہور پہنچیں تو ان کا تاریخ ساز استقبال کیا گیا۔ عوام کے جذبات کو دیکھتے ہوئے بے نظیر بھٹو نے ایم آر ڈی اور نوابزادہ نصراللہ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے بے نظیر کے آمرانہ رویے پر نکتہ چینی کی۔ نومبر 1988 ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی سیاسی حوالے سے بہتر پوزیشن میں تھی۔ اس نے ایم آر ڈی کے قائدین ولی خان، مولانا فضل الر حمان اور نوابزادہ نصراللہ خان سے انتخابی اتحاد کی بجائے تنہا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو ایم آر ڈی کے قائدین نے بے نظیر کو موقع پرست سیاست دان قرار دیا۔ پیپلز پارٹی نے ایم آر ڈی سے الحاق تو نہ کیا البتہ اس کی مرکزی قیادت کے خلاف امیدوار کھڑے نہ کئے البتہ اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار میاں عطا محمد قریشی جو ضلعی مسلم لیگ کے صدر تھے, ان کے مقابلے میں شکست کھا گئے۔

نوابزادہ نصراللہ نے بے نظیر بھٹو کی سیاسی رفاقت کے باوجود اس کے اقتدار میں شریک ہونا پسند نہ کیا اور ان کے مقابلے میں وہ اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتے رہے اور خاص طور پر جب سلمان رشدی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو نواب زادہ نصراللہ خان اور دوسری اپوزیشن جماعتوں نے سلمان رشدی کے خلاف اسلام آباد میں مظاہرہ کیا تو ان کے جلوس پر پیپلز پارٹی نے تشدد کیا جس سے نواب زادہ نصراللہ خان نے نتیجہ اخذ کیا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو باپ کی طرح آمرانہ رویے کی طرف گامزن ہیں تو انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ الحاق کر کے متحدہ اپوزیشن کی بنیاد رکھی اور ان کے خلاف تحریک عدم اعتماد میں بھرپور کردار ادا کیا۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ اگر ہارس ٹریڈنگ سے کام نہ لیتیں تو وہ اقتدار سے باہر ہو جاتیں۔ نوابزادہ نصراللہ خان کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت کا احساس اسی وقت ہو گیا تھا جب صدارتی انتخابات میں انہوں نے غلام اسحاق خان کا ساتھ دیا۔ بے نظیر اور پیپلز پارٹی کی متضاد پالیسیوں کی وجہ سے وہ ان سے دور ہوتے چلے گئے۔ 1990 ء میں جب بے نظیر بھٹو کو بد عنوانیوں اور نااہلیوں کی بنیاد پر اقتدار سے الگ کیا گیا تو انہوں نے ایک بار پھر حزب مخالف کا کردار ادا کیا اور آل پارٹی کانفرنس کی بنیاد رکھی اور اسلامی جمہوری اتحاد کی پالیسیوں پر کڑی تنقید کی۔ اس طرح

سیاسیات پاکستان میں ان کا کردار تاریخ ساز ہے۔ اب ان کے بیٹے نوابزادہ منصور علی خان سیاست میں نمایاں ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پیر آف پگاڑہ نے انہیں صدر پاکستان کی نوید بھی سنائی ہے۔

مظفرگڑھ کے گورمانی

پنجاب کے جاگیرداروں میں ضلع مظفرگڑھ کے گورمانیوں کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ گرچہ گورمانیوں کی شہرت ان کی روحانی خدمت کے حوالے سے ہے لیکن یہ خاندان کوچہ سیاست میں انگریز سرکار کی مہربانیوں سے آیا۔ اس وقت ضلع مظفرگڑھ میں گورمانیوں کے مرید تو بہت ہیں لیکن گورمانی ٹھٹھہ اب خانقاہ کی حیثیت سے اتنا اہم نہیں رہا۔ اس گاؤں کی بنیاد اس طرح پڑی تھی کہ جب حاکم ملتان بہلول خان 1450ء میں سلطان دہلی بنا تو اس نے دریائے سندھ اور کوہ سلیمان کے درمیان کا علاقہ اپنے بھتیجے اسلام خان کے سپرد کر دیا۔ اسلام خان کے پوتوں نے یہ اراضی آپس میں تقسیم کر لی۔ طاہر خان کے حصے میں "سیت پور" کا علاقہ آیا جو آج کل علی پور تحصیل کہلاتی ہے۔ اس کے بھائیوں کو ڈیرہ غازی خان کے بانی بلوچ نے مار بھگایا اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا لیکن طاہر خان کی اولاد اپنی جائیداد پر قابض رہی تاہم ڈیرہ غازی خان کے بلوچوں نے انہیں اتنا تنگ کیا کہ طاہر خان کی اولاد جائیداد پر قبضہ نہ رکھ سکی اور ان کی ساری زمینیں ہتھیالی گئیں گورمانی طاہر خان کی نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں ان میں سے میاں محبوب بڑے زمیندار تھے۔ وہ مجسٹریٹ اور درباری بھی تھے۔ 1884ء میں انہیں سر کے خطاب سے نوازا گیا۔ میاں محبوب اپنے باپ دادا کے مزاروں کے متولی تھے۔ اس کے مرید پنجاب کے جنوبی علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں خان بہادر میاں محبوب کے بعد میاں شیخ احمد ان جاگیروں کے سربراہ بنے۔ انہوں نے انگریزوں کی وفاداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جس کے عوض انہیں خلعت اور پنشن دی گئی۔ جنگ عظیم اور برصغیر میں برپا ہونے والی شورشوں میں انگریزوں کے ساتھی رہے۔ میاں مشتاق گورمانی، شیخ احمد کے بھتیجے تھے۔ میاں مشتاق گورمانی قیام پاکستان سے پہلے
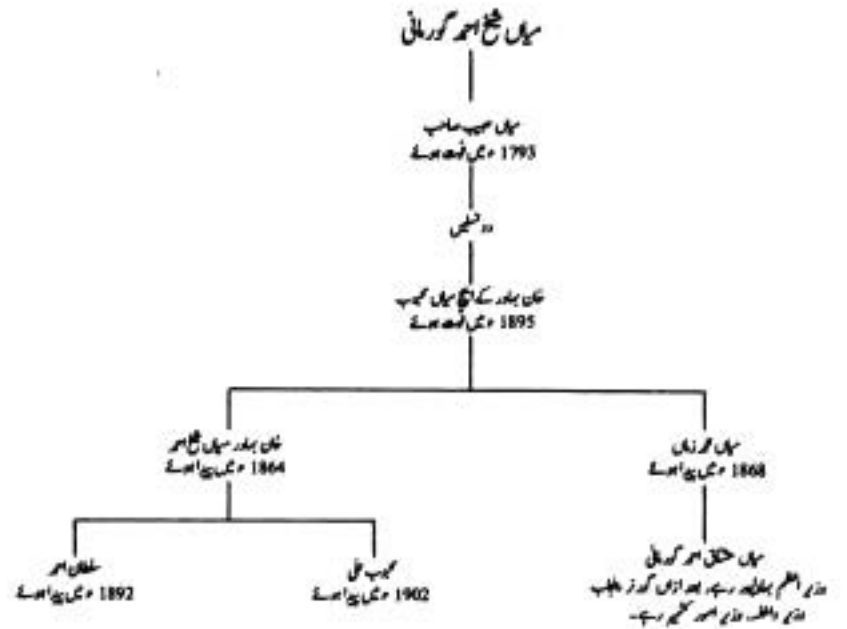
بہاولپور کے وزیر اعظم رہے۔

مغربی پاکستان کے سابق گورنر میاں مشتاق کی زندگی کے بارے میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کیا رخ اختیار کرے گی۔ ان کی سیاسی زندگی کی ابتداء یونینسٹ پارٹی سے ہوئی تھی۔ اس زمانے میں یہی کہا جاتا تھا کہ ان کی سیاسی انتہا بھی یہی ہو گی۔ جب سے وہ دور ختم ہوا، آپ نے کھلے بندوں سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن ہر قدم پر قسمت نے ان کا ساتھ دیا۔ بڑے بڑے سیاسی کھلاڑی ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ان سے ملنے کے بعد کوئی شخص قطعاً یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ آپ مظفر گڑھ جیسے پس ماندہ علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاقے کے بلوچ جب ان سے ملتے تو انہیں بلوچ سردار سمجھ کر ہی مخاطب ہوتے تھے۔ ان ملاقاتوں میں علی گڑھ یا چیف کالج کی قطعاً کوئی جھلک ظاہر نہیں ہوتی تھی۔

جنگ عظیم میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے پبلسٹی کے محکمے میں ملازم ہو گئے اور جنگ کے دوران ہی لیبر ڈیپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر کے عہدے تک جا پہنچے تھے۔ ان دنوں ملک فیروز خان نون وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ یہ محکمہ ان کے ماتحت تھا اور مسٹر گورمانی کی ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ تھا مگر ایک وقت وہ بھی آیا کہ وہی فیروز خان نون گورنر گورمانی کے ہاتھوں ڈسمس ہوئے۔ ملک فیروز خان نون کی وزارت برخاست کرنے کا معاملہ گورنر گورمانی کے لئے ایک امتحان کی حیثیت رکھتا تھا اور انہوں نے اپنے محسن کے محضر نامہ پر دستخط کرنے سے پہلے کئی بار استخارہ کیا جب قدرت کاملہ نے اشارہ کر دیا تو نون وزارت ڈسمس کر دی گئی۔ اس طرح گورمانی نے اپنے فیصلے میں رضائے الٰہی کو بھی شامل کر لیا۔

ون یونٹ کی تشکیل میں ان کا قابل قدر حصہ ہے۔ بیسویں صدی کے اس دور میں جب سیاسی جتھہ بندیاں واضح شکل و صورت اختیار کر چکی تھیں، پاکستان کے مغربی حصہ میں ایک ایسی جماعت نمودار ہوئی جسے دور جدید کا عجوبہ تصور کرنا چاہیے۔ اس جماعت کی تشکیل راتوں رات عمل میں آئی اور صبح ہوتے ہی اس جماعت کے سر پر اقتدار کا تاج رکھ دیا گیا۔ بڑے بڑے سیاسی گھاک اس نوزائیدہ جماعت کی پاسبانی پر مقرر ہوئے اور اس طرح اس جماعت کے سر پر اقتدار اعلیٰ کا سایہ ہما پایہ قائم ہو گیا۔ اس کی قیادت ڈاکٹر خان صاحب کے سپرد ہوئی تھی جنہیں گمنامی کے گڑھے سے محض اس لئے نکالا گیا تھا کہ ان کی

شخصیت مغربی پاکستان میں سیاسی استحکام کا باعث بنے گی، چنانچہ انہیں محمد علی بوگرہ کی دوسری وزارت میں وزیر مواصلات کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔ وہ اس وقت نئے انتخابات کے سب سے بڑے حامی تھے وہ ہر تقریر میں چھ ماہ کے اندر انتخابات کا سندیسہ سنایا کرتے تھے۔ جب یہ مدت گزر گئی تو برسر اقتدار طبقہ کی نگاہیں مغربی پاکستان کی وحدت کے لئے ڈاکٹر خان صاحب پر پڑیں اور وہ ون یونٹ کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ اس عرصہ میں بھی ان کی زبان پر غیر جانبدرانہ انتخابات کا نعرہ جاری رہا۔ اس وقت تک ری پبلکن پارٹی کا کوئی وجود نہ تھا مگر جب مسلم لیگی قیادت کے ساتھ اختلافات ابھرے تو ڈاکٹر خانصاحب نے گورنر گورمانی سے مل کر ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی۔

جہاں تک نئی سیاسی جماعت کے کریڈٹ کا تعلق ہے، مسٹر مشتاق گورمانی نے اسے کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ ان کے کریئر کی سب سے بڑی خوبی یہی رہی ہے کہ وہ کبھی بھی میدان میں نہیں لڑے بلکہ اپنی ترقی اور کامیابی کے لئے محلاتی سازشوں اور جوڑ توڑ کا سہارا لیتے رہے ہیں مسلم لیگ کی طرف سے بار بار میاں مشتاق گورمانی کو خانصاحب کی حمایت پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے بارے میں یہی کہا گیا کہ

"مغربی پاکستان کی موجودہ حکومت جسے میاں مشتاق احمد گورمانی جیسے زیرک گورنر اور ڈاکٹر خانصاحب جیسے دیانت دار وزیر اعلیٰ کی سرپرستی حاصل ہے، چھوٹے طبقوں کی عملی نقطہ نگاہ سے اس قدر اچھی یا بری ہے جتنی متحدہ محاذ پنجاب کی وہ حکومت جو سر برٹرنڈ گلینسی جیسے پست دل گورنر اور ملک خضر حیات خان ٹوانہ جیسے غیر جمہوری وزیر اعلیٰ کی سربراہی میں قائم تھی۔ میاں مشتاق گورمانی اور ڈاکٹر خانصاحب کے دور حکومت میں اونچے طبقات کو وہ تمام مراعات حاصل تھیں جو کل سر برٹرنڈ گلینسی اور ملک خضر حیات خان ٹوانہ کے راج میں بڑے زمینداروں، فوجی افسروں، کارخانے داروں اور حکومت کے دوسرے اکابرین کو حاصل تھیں۔ ان کے عہد میں چھوٹے طبقوں کو اسی طرح پسپائی ہوئی جس طرح کل سر برٹرنڈ گلینسی اور ملک خضر حیات خان کے ناقابل رشک زمانے میں کسانوں، کاشت کاروں، مزدوروں، کارکنوں اور چھوٹے طبقوں کو پسپا کیا جاتا تھا۔ ان کے دور میں فرق صرف اس قدر ہے کہ آج کل چھوٹے طبقے کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ان کی کوئی جتھہ سازی نہیں لیکن اس زمانے میں رائے عامہ بیدار تھی اور اخبارات صحیح معنوں میں عوام کے

حقوق کے محافظ تھے۔ سر برٹرنڈ گلینسی ، سر اپوز جکنز اور ملک خضر حیات کو ہر وقت یہ خوف رہتا تھا کہ اگر ہماری بد عنوانیاں اور بد کرداریاں لوگوں کے سامنے آ گئیں تو احتجاج سے نہ صرف لاہور کے در و دیوار ہلا دیئے جائیں گے بلکہ وائسرائے کی لاج دہلی اور پارلیمنٹ کے ایوانوں میں بھی تزلزل برپا ہو جائے گا لیکن میاں مشتاق احمد گورمانی اور ڈاکٹر خانصاحب دونوں مطمئن تھے کہ صوبے میں جو چاہے جو کچھ مرضی ہوتا رہے، ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں اور اگر کسی نے احتجاج کی زبان کھولی تو اسے کیمونسٹ غیر محب الوطن کہہ کر خاموش کرا دیا جائے گا۔"

آخر کار سازشوں کا دورہ ختم ہوا۔ میاں مشتاق گورمانی نے مرکزی کابینہ کے فیصلہ کے مطابق مغربی پاکستان کی گورنری سے استعفیٰ دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ میں جب تک گورنر رہا اس عہدے کی شاندار روایات کا محافظ اور علم بردار رہا اور اسے میں نے پارٹی کی آلودگیوں میں ملوث نہیں ہونے دیا تھا مشتاق گورمانی صاحب قیام پاکستان ہی سے برسر اقتدار تھے، کسی بھی دور میں ان کا ستارہ اقتدار غروب نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے اس وقت انہیں علیحدہ کرنے پر اصرار کیا، وہ انہی کی بدولت سیاست کے افق پر چمکے۔ اگر گورمانی ان لوگوں کی پشت پناہی نہ کرتے اور جمہور کی آواز کے برخلاف ان کے وجود کو سیاسی اقتدار سے جنم دینے کے لئے مساعی نہ کرتے تو شاید ان میں سے بیشتر سیاست سے کنارہ کش ہو چکے ہوتے۔ جب گورمانی کا ستارہ عروج پر تھا تو گورمانی صاحب نے حکومت کی خرابیوں اور سیاسی بے اصولیوں کے خلاف اٹھنے والی آوازوں پر کان نہ دھرا لیکن وہ ان کے حق میں اپنی فراست، ذہانت اور طاقت کے بل پر ایک ایسی فضا پیدا کر دیتے کہ مخالف لا جواب ہو جاتے۔ جن لوگوں کے دفاع کے لئے انہوں نے ہر اصول کو پامال کیا تھا، گورمانی صاحب کے خلاف سازش کی عمارت استوار کرنے میں سب سے زیادہ ہاتھ اسی مخلوق کا تھا اور جو لوگ سیاست میں ان کے لے پالک تھے، انہوں نے ہی سب سے پہلے ان کی سبکدوشی پر دستخط کئے۔

ہماری سیاست کا یہ المیہ رہا ہے کہ آنے والے حکمران جانے والوں پر بد عنوانی اور اختیارات کے غلط استعمال کے الزامات عائد کر کے وائٹ پیپر شائع کیا کرتے ہیں۔ ایک

آدھ حکومت کے بعد ملک میں جب مارشل لاء نافذ ہو گیا تو قیام پاکستان کے بعد محلاتی سازشوں کے جتنے بھی کردار تھے، سب ایبڈو کی زد میں آ گئے۔ میاں مشتاق گورمانی بھی نااہلوں کے ٹریبونل کی طرف سے جاری کردہ چھ الزامات میں دھر لئے گئے۔ انہوں نے بد عنوانیوں اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزامات کے خلاف دفاع کے لئے میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:-

— مارچ 1957ء ری پبلکن حکومت کی امداد کرنے کے لئے صوبہ میں صدر راج نافذ کرنے کی سفارش کی تھی۔
— اپریل 1956ء میں سردار بہادر خان نے اکثریت کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ انہیں حکومت سازی کی اجازت دیں اور آپ نے ڈاکٹر خانصاحب کی وزارت کو غیر قانونی طور پر تحفظ دیا۔
— 1948ء میں بہاولپور کے وزیر اعظم کی حیثیت سے روئی کی ایک سو متروکہ گانٹھیں ریاست کی حدود سے برآمد کرنے کی ناجائز طور پر اجازت دی۔ اس طرح میسرز رالی برادرز کو ناجائز مالی فائدہ پہنچایا۔
— 1956-57ء میں صوبائی گورنر کی حیثیت سے صوبہ کی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔
— امپروومنٹ ٹرسٹ کے ذریعے گلبرگ میں زمین خرید کر لاکھوں کا فائدہ حاصل کیا، صوبائی گورنر کی حیثیت سے اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس طرح انہوں نے لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ سے گلبرگ کالونی میں ایک مکان موسومہ "اوپیم ہاؤس" سستے داموں خریدا۔
— میاں مشتاق گورمانی نے 1954ء میں حکومت پاکستان کے وزیر داخلہ اور 1954-55ء میں بطور گورنر پنجاب اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس طرح انہوں نے ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل کوٹ ادو کے مخصہ گورمانی اور گورمانی میں اپنی اور اپنے خاندان کی ملکیتی زرعی زمین کو سیم سے بچانے کے لئے تونسہ بیراج پروجیکٹ کی مظفر گڑھ نہر کی گزرگاہ کو مشرق کی طرف تبدیل کرا دیا حالانکہ محکمہ نہر کے ماہرین کی رائے اس کے برخلاف تھی، نئی گزرگاہ کے باعث نہر کی لمبائی بڑھ گئی، دو زائد

ریلوے کراسنگ اور دو روڈ کراسنگ بنانے پڑے۔ اس طرح تقریباً ۳۰ لاکھ ۵۷ ہزار روپے کا غیر ضروری خرچہ ہوا۔ اگر مسٹر مشتاق گورمانی اس گزرگاہ کو تبدیل نہ کرتے تو سرکاری خزانے کی اس کثیر رقم کی کفالت ہو سکتی تھی۔

— ری پبلکن پارٹی کے قیام میں مدد دی، اس کا منشور لکھا اور ارکان اسمبلی کو اس پارٹی میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ صوبائی اسمبلی مئی 1956 ء کا اجلاس اس لئے طلب نہ کیا گیا تاکہ ڈاکٹر خانصاحب غیر آئینی طریقوں سے اپنی طاقت میں اضافہ کر سکیں۔ اس سلسلہ میں صوبائی سیاست میں سرگرم حصہ لے کر ری پبلکن پارٹی کی تشکیل کے لئے اہم کردار ادا کیا، پھر آپ نے پارٹی کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے صوبائی کابینہ میں توسیع کی اور اسمبلی کے ارکان پر بلاواسطہ یا بالواسطہ دباؤ ڈالا اور انہیں اعلیٰ عہدوں اور سرکاری اراضی کی الاٹمنٹ کا لالچ دیا اور اس طرح خزانہ پر تین لاکھ چونسٹھ ہزار پانچ سو بیس روپے کے ، خرچ کا ناجائز بوجھ ڈالا۔

صوبائی اسمبلی کے گرمائی اجلاس 1956 ء کی کارروائی پر اثر انداز ہونے کے لئے ایوان میں ایک وائرلیس آپریٹس لگوایا جس کے ذریعے اسمبلی کی کارروائی گورنر ہاوس میں سنائی دیتی تھی. ان کا یہ اقدام سرکاری پالیسی کے منافی تھا۔

جب ڈاکٹر خانصاحب کو برسر اقتدار رکھنے میں ناکامی ہوئی تو آپ نے ایک غیر آئینی اقدام کرتے ہوئے صدر پاکستان کو رپورٹ دی کہ صوبائی حکومت آئین کے مطابق کام کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس طرح آپ نے آئین کے آرٹیکل 193 کے تحت بارہ مارچ 1957 ء کو صوبہ میں صدر راج نافذ کر دیا۔ پھر 15 جون 1957 ء کو جب صدر راج ختم ہوا تو حزب مخالف کے قائد سردار خان بہادر کو ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے ان کی بجائے ری پبلکن پارٹی کے رکن سردار عبدالرشید کو کابینہ کی تشکیل کی اجازت دی۔

— 11 جنوری 1960 ء کو ٹریبونل کے سامنے چار ارکان اسمبلی نے بھی اس کیس میں شہادتیں دیں۔

— رکن اسمبلی حافظ حبیب اللہ نے کہا بلاشبہ میں نے گیارہ اپریل 1956 ء کو ایک بیان جاری کیا جو لاہور کے نوائے وقت میں شائع ہوا. میں نے بیان میں الزام عائد کیا

تھا کہ مسٹر گورمانی غیر قانونی ذرائع سے ڈاکٹر خان صاحب کو برسر اقتدار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اس بیان میں گورنر سے اپیل کی تھی کہ وہ مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی قوت کا اندازہ کرنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس طلب کریں۔ میرے خیال میں ان دنوں مسلم لیگ کو ایوان میں اکثریت حاصل تھی۔ رکن اسمبلی زین نورانی نے کہا کہ میں نے 26 اپریل 1956 ء کو ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ گورنر گورمانی کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا جائے کیونکہ وہ صوبہ کی سیاسی زندگی میں انتشار پیدا کر رہے ہیں، میرا یہ بیان صحت پر مبنی تھا۔ آپ نے کہا کہ میں مغربی پاکستان کی جمہوری اسمبلی میں مسلم لیگ کا چیف وہپ تھا، اس دوران کئی ایک مسلم لیگی ارکان نے مجھ سے شکایت کی کہ گورنر مشتاق گورمانی انہیں مسلم لیگ میں شمولیت کی ترغیب دیتے ہیں۔ دوسرے گواہوں میں سابق مسلم لیگی رکن مسٹر علی شیر خان اور فتح شیر لنگڑیال تھے۔ اس طرح میاں ممتاز دولتانہ نے ٹریبونل کے سامنے جواب دیا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ارکان اسمبلی کو گمراہ کرنے میں مسٹر گورمانی کا ہاتھ ہے، میں 1956 ء، 1957 ء میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا سیکرٹری تھا۔ ان دنوں مجھ سے کسی مسلم لیگی رکن نے یہ شکایت نہیں کی تھی کہ میاں مشتاق گورمانی نے بحیثیت گورنر اسے اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کی ترغیب دی تھی۔

ان کے علاوہ تقریباً پچاس کے قریب گواہ جن میں سرکاری افسر اور سیاست دان شامل تھے. میاں مشتاق گورمانی کے مقدمے میں پیش ہوئے۔ ان الزامات کو رد کرتے ہوئے گورمانی نے عدالت میں اپنے دفاع میں یہ موقف اختیار کیا:۔

"پاکستان کے موجودہ ارباب اختیار بعض افراد کو ان کے بنیادی شہری حقوق سے محروم کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو غالباً اس مقصد کے لئے مارشل لا ریگولیشن کا نفاذ زیادہ آسان اور قابل فہم ہوتا کیونکہ اس طرح ساری دنیا میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہنگامی قانون کے تحت بعض ہنگامی اقدامات کئے گئے ہیں. اور آئندہ کے لئے یہ خطرناک مثال قائم نہ ہوتی کہ ایک غیر معمولی قانون "ایبڈو" کے تحت کارروائی کے لئے نیم عدالتی طریق کار اختیار کیا گیا اور اسے مکمل عدالتی کارروائی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

صدارتی راج کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا "سیاسی انتشار کی زیادہ تر ذمہ داری آزاد پاکستان پارٹی کے بعض ایسے لیڈروں پر عائد ہوتی تھی جن کی حب الوطنی پر بھی شبہ کیا جاتا ہے۔ یہ لیڈر آئے دن مسلم لیگ اور ری پبلی کن پارٹی کے اقتدار پرست زعماء سے سازش کر کے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ مغربی پاکستان کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے تحریری سمجھوتہ پر دستخط کئے مگر جب اس سمجھوتہ کو عملی جامہ پہنانے کا موقعہ نہ دیا گیا تو ری پبلی کن کے اقتدار پرست زعماء ون یونٹ توڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی حمایت سے اس سلسلہ میں ایک قرار داد بھی منظور ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں گورنری ذمہ داری سے الگ ہو چکا تھا۔ مارچ 1957 ء کے بارے میں مجھ پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں، مجھے اس کی پروا نہیں کیونکہ اس صوبہ کی تاریخ گواہی دے گی کہ میں نے ان دنوں وحدت مغربی پاکستان کا تحفظ کر کے کوئی خدمت سرانجام دی تھی یا نہیں؟"

مارچ 1957 ء میں صدر راج نافذ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ری پبلی کن پارٹی نے مجھے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا مشورہ دیا تھا اور میں آئین کے تحت اس مشورہ پر عمل کرنے کا پابند تھا۔ اس لئے اسمبلی کے اجلاس کے التواء کی کارروائی کے ساتھ صدر راج کا نفاذ ضروری ہو گیا کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو 31 مارچ 1957 ء سے میزانیہ کی منظوری کی کوئی صورت نہ تھی۔ مرکزی حکومت نے نہ صرف اس کارروائی کی پوری ذمہ داری قبول کی تھی بلکہ صدر راج کی معیاد میں اضافہ کیا تھا۔ حیرت ہے کہ اس کارروائی کی قومی اسمبلی کی توثیق کے بعد مجھ پر یہ الزام کیوں لگایا گیا ہے۔

مشتاق گورمانی نے عدالت کے روبرو حلفیہ بیان میں کہا کہ "میں نے جولائی 1957 ء میں وزیر اعظم سہروردی کو بذریعہ چٹھی باقاعدہ مطلع کیا تھا کہ اگر ری پبلکن پارٹی ایوان میں اپنی اکثریت برقرار نہ رکھ سکی تو میں حزب مخالف کے قائد کو دعوت دوں گا کہ وہ صوبائی حکومت کی ذمہ داری سنبھالیں، اس طرح آئینی طریق کار کی پابندی ہوگی۔ دوسری مرتبہ صوبہ میں صدر راج کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آپ نے کہا کہ مسٹر سہروردی ان دنوں لندن میں تھے، اس لئے میں نے اپنے اس خط کی نقول مسٹر سکندر مرزا اور قائم مقام وزیر

اعظم ابوالمنصور کو بھیج دی تھیں۔"

میں نے یہ خط گیارہ جولائی 1957 ء کو لکھا تھا اس کے دو دن بعد مسٹر سہروردی کا ایک تار موصول ہوا جو انہوں نے واشنگٹن سے میرے خط کی وصولی سے پہلے بھیجا تھا۔ اس تار میں انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مغربی پاکستان میں ان کی واپسی سے پہلے صدر راج ختم نہ کیا جائے۔ تاہم اس تار کی وصولی کے ایک آدھ دن بعد مجھے صدر مملکت کی طرف سے اطلاع ملی کہ انہوں نے مرکزی کابینہ کے مشورہ پر صدر راج ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اسی فیصلہ کے مطابق 16 جولائی 1957 ء کو صوبہ میں صدر راج ختم کر دیا گیا اور ڈاکٹر خانصاحب کی کابینہ پھر برسر اقتدار آ گئی۔

صوبے کی سیاست میں حصہ لینے کے الزام کے بارے میں انہوں نے عدالت کو بتایا کہ یہ "اگست 1957 ء کی بات ہے۔ مجھے صدر مملکت نے کراچی بلا کر بتایا کہ ری پبلکن پارٹی کے قائدین کو شبہ ہے کہ وہ صوبائی ایوان میں اپنی اکثریت برقرار نہیں رکھ سکیں گے کیونکہ ون یونٹ توڑنے کے مطالبہ کی بنیاد پر بعض جماعتوں میں گٹھ جوڑ ہو رہا تھا۔ صدر نے مزید بتایا کہ ری پبلکن قائدین کی خواہش ہے کہ میں انہیں اس صورتحال کے پیش نظر یہ یاد دلاؤں کہ اگر ایوان میں وہ اکثریت برقرار نہ رکھ سکے تو میں ان کی اس درخواست کی تائید کروں گا کہ صوبہ میں دوبارہ صدر راج نافذ کر دیا جائے اور اس طرح حزب مخالف کو برسر اقتدار آنے کا موقع نہیں دوں گا۔ اس موقع پر میں نے صدر پر یہ واضح کر دیا تھا کہ میں ری پبلی کن قائدین کی اس ناجائز خواہش کی تکمیل نہیں کر سکوں گا۔ صدر نے کہا کہ میں انہیں اس تجویز کے بارے میں سوچ کر جواب دوں کیونکہ اگر اس موقع پر ری پبلی کن قائدین کی حمایت نہ کی گئی تو وہ مرکزی حکومت کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں گے اور اس طرح مرکزی حکومت کی تبدیلی ناگزیر ہو جائے گی۔ میں صدر کی بات سن کر لاہور آ گیا۔ تین چار دن کے بعد مجھے پھر کراچی بلایا گیا اور یہ کہا گیا کہ اگر میں ری پبلکن قائدین کو متذکرہ نوعیت کی یقین دہانی نہیں کراؤں گا تو وہ میرے استعفیٰ کا مطالبہ کریں گے۔ میں نے اس موقع پر بھی ناجائز یقین دہانی سے معذوری ظاہر کی چنانچہ اس شام مجھے صدر کی طرف سے چٹھی موصول ہوئی جس میں یہ بتایا گیا کہ مرکزی کابینہ نے ایک قرار داد کے ذریعے میرے استعفیٰ کا مطالبہ کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس چٹھی کے پیش نظر اسی وقت گورنر کے عہدہ سے

استعفیٰ دے دیا۔ یہ استعفیٰ میں نے 25 اگست 1957 ء کو صدر کو بھیج دیا۔

جب اپریل 1956 ء میں مسلم لیگ پارٹی کے قائد سردار خان بہادر خان نے اکثریت کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا تھا کہ میں انہیں تشکیل وزارت کی دعوت دوں، اس وقت آئین کے تحت، جب 23 مارچ 1956 ء کو نیا آئین نافذ ہوا، تو ڈاکٹر خانصاحب کی وزارت کا برقرار رہنا ضروری تھا۔ ڈاکٹر خانصاحب کی وزارت کو برطرف نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ایک خط میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ میں انہیں ایوان میں اعتماد کے جمہوری حق سے محروم نہ کروں۔ ڈاکٹر خانصاحب کا یہ مطالبہ جمہوری اصولوں اور آئین کے عین مطابق تھا۔ اس لئے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ان کے اس مطالبہ کی تکمیل کروں۔

جہاں تک ری پبلکن پارٹی کی تشکیل کا تعلق ہے، مسلم لیگ پارٹی کے قائد سردار بہادر خان، سیکرٹری احمد سعید کرمانی، میاں ممتاز دولتانہ اور کئی دوسرے گواہوں نے اس الزام کی تائید نہیں کی۔ میری جانبداری کی سب سے زیادہ شکایات خان بہادر کو ہی ہو سکتی تھیں مگر ان کا کہنا ہے کہ "میری پارٹی کے کسی رکن نے میرے روبرو کبھی شکایت نہیں کی تھی کہ مسٹر گورمانی نے انہیں کبھی ری پبلکن پارٹی میں شامل ہونے کی ترغیب دی ہے۔"

میں صوبائی گورنر کے عہدے پر رہتے ہوئے مسلم لیگ کا رکن تھا۔ اکتوبر 1958 ء تک اس جماعت میں شامل رہا ہوں، اس لئے میں مسلم لیگی کی حیثیت سے لوگوں کو کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ مسلم لیگ چھوڑ کر ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ مخدوم زادہ حسن محمود نے ری پبلکن پارٹی کی تاریخ کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے، اس میں اس پارٹی کا سہرا اسکندر مرزا اور ڈاکٹر خان صاحب کے سروں پر باندھتے ہیں۔

29 مارچ 1957 ء کو وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خانصاحب نے مجھے اسمبلی توڑنے کی درخواست کی تھی۔ ان کا مشورہ اس بنا پر تسلیم نہ کیا گیا کہ صوبائی گورنر آئین کے تحت عبوری اسمبلی کو توڑنے کے مجاز نہ تھے۔ ڈاکٹر خانصاحب نے مجھے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کی بھی درخواست کی، میں نے انہیں بتایا کہ اگر اجلاس ملتوی کیا گیا تو صدر راج کا نفاذ ضروری ہو جائے گا کیونکہ میزانیہ کی کارروائی کے لئے صدر راج کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

سردار خان بہادر خان نے تین اپریل کو جو مجھے چٹھی لکھی تھی، اس وقت وہ ڈاکٹر خانصاحب کی کابینہ میں وزیر ترقیات کے عہدہ پر فائز تھے۔ چنانچہ میں نے یہ چٹھی آئین کے تحت وزیر اعلیٰ کو برائے تبصرہ بھیج دی۔ میرے لئے ضروری نہیں تھا کہ میں اپریل 1956 ء کے اوائل میں مسٹر سردار بہادر خان کو محض اس بنا پر تشکیل وزارت کی دعوت دیتا کہ انہوں نے اپنی چٹھی میں اکثریتی پارٹی مسلم لیگ کے قائد ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ پارلیمانی نظام کے تحت کسی سیاسی جماعت کی قوت کا اندازہ دو موقعوں پر ہوتا ہے۔ اول جب کسی اسمبلی کے انتخابات مکمل ہوں۔ دوم جب اسمبلی میں مختلف پارٹیوں میں طاقت آزمائی ہو۔

مغربی پاکستان کی عبوری اسمبلی کے انتخابات جماعتی بنیادوں پر نہیں ہوئے تھے، اس لئے بحیثیت گورنر مجھے یہ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ انتخابات میں کون سی جماعت اکثریتی جماعت کی حیثیت سے کامیاب ہوئی تھی۔ اپریل 1956 ء تک مختلف جماعتوں میں قوت آزمائی نہیں ہوتی تھی، اس لئے مجھے کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ اس وقت مسلم لیگ کو فی الحقیقت اکثریت حاصل ہے۔"

دیگر الزامات کے سلسلے میں مسٹر مشتاق گورمانی نے یہ موقف اختیار کیا " 1955 میری طرف سے صوبائی گورنر کی حیثیت سے نہر کی گزر گاہ تبدیل کرنے کے لئے حکم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی میں نے جولائی 1954 ء میں پاکستان کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے مظفر گڑھ نہر کی گزر گاہ تبدیل کرنے کی کوئی ہدایت کی تھی۔ میں 9 جولائی 1954 ء کو سرکاری دورہ پر لاہور آیا تو مجھ سے متعلقہ صوبائی وزیر سردار محمد خان لغاری نے ایک ڈنر کے موقع پر کہا تھا کہ اگلے دن دس جولائی کو مظفر گڑھ نہر کی گزر گاہ کے بارے میں اس ضلع کے بعض زمینداروں سے تبادلہ خیال ہو گا۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس میٹنگ میں ضرور شریک ہوں۔ چنانچہ اگلے دن میں جب دفتر گیا تو زمینداروں نے مجھ سے شکایت کی کہ اگر یہ نہر تونسہ بیراج کی مجوزہ گزر گاہ کے مطابق کھودی گئی تو تحصیل کوٹ ادو کا گنجان آباد زرخیز علاقہ سیم سے تباہ ہو جائے گا۔ اس پر صوبائی وزیر نے چیف انجینئر کو ہدایت کی تھی کہ اگر زمینداروں کی یہ شکایت مبنی بر صداقت ہے تو اس نہر کی متبادل گزر گاہ کے بارے میں تجاویز پیش کرنی چاہئیں۔ میں نے ضلع مظفر

گڑھ کے زمینداروں اور صوبائی وزیر کی میٹنگ میں اس ضلع کے ایک زمیندار کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ میرا اس نہری گزر گاہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ "

تحصیل کوٹ ادو میں میری اور میرے خاندان کے دوسرے افراد کی ملکیتی اراضی تقریباً چودہ ہزار ایک سو پینتیس ایکڑ ہے۔ یہ رقبہ تحصیل کے تقریباً سب علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ تھٹہ گورمانی غربی اور تھٹہ گورمانی شرقی کا کل رقبہ 19,277 ایکڑ ہے۔ یہاں میرا اور میرے خاندان کا رقبہ 5,233 ایکڑ ہے۔ ان دیہات میں ہمارا رقبہ 27 فی صد ہے۔ 73 فی صد رقبہ چھوٹے زمینداروں کا ہے جو اپنی زمین کی خود کاشت کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پرانی گزر گاہ کے مطابق کھدائی ہوتی تو ہمارا تقریباً کئی ہزار ایکڑ رقبہ نہری زد میں آتا۔ اس کے برعکس نئی گزر گاہ کے مطابق کھدائی ہونے سے ہمارا کئی ہزار ایکڑ رقبہ بحق سرکار ضبط کیا گیا ہے۔ ہمارے خاندان میں عوامی مقاصد کے لئے اپنی ملکیتی اراضی حکومت کے سپرد کرنے کی کئی مثالیں ہیں۔ صوبائی محکمہ انہار نے 1943 ء میں میرا بانوے ایکڑ رقبہ حاصل کیا تھا اور آج تک مجھے اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔

انہوں نے روئی کی گانٹھوں کے سکینڈل کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا " ان دنوں پاکستان کی حکومت کو ریاست بہاولپور کے تین اختیارات امور دفاع، خارجہ اور مواصلات پر اختیار حاصل تھا۔ حکومت ہندوستان نے روئی کی یہ گانٹھیں کراچی کی ایک فرم سے مارچ 1947 ء میں خریدی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان گانٹھوں کو متروکہ جائیداد قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ متروکہ جائیدادوں سے متعلق قانون 15 اگست 1947 ء سے لاگو ہوا تھا۔ چونکہ روئی کی یہ سو گانٹھیں متروکہ نہیں تھیں، اس لئے گانٹھوں کی برآمد کا فیصلہ کرنے سے قبل اس سلسلہ میں کسٹوڈین سے استفسار کی ضرورت نہیں تھی۔ "

لاہور امپروومنٹ کی طرف سے خریدی گئی کوٹھی کے بارے میں انہوں نے عدالت کو بتایا کہ مجھے ٹرسٹ کے سیکرٹری نے بھی اس کی رجسٹری فوری کروانے کی درخواست کی تھی۔

ان تمام الزامات کی چھ ماہ تک عدالت میں مسلسل سماعت ہوتی رہی۔ 21 مئی

1960 ء کو مغربی پاکستان کے گورنر نے ایک سرکاری اعلان کے ذریعے میاں مشتاق گورمانی کو 31 دسمبر 1966 ء تک سیاست میں حصہ لینے کا نااہل قرار دے دیا۔ سرکاری اعلان کے مطابق ان کے خلاف تین الزامات سچ ثابت ہوئے تھے جن میں مظفر گڑھ نہری تبدیلی جس میں انہوں نے رولز آف بزنس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بد انتظامی کا ارتکاب کیا۔ انہوں نے بطور صوبائی گورنر کی حیثیت سے ری پبلکن پارٹی کے لئے دانستہ طور پر کنوینگ کر کے اور منشور تیار کر کے اس جماعت سے اپنے آپ کو وابستہ کیا اور اس طرح مروجہ آئین کی خلاف ورزی کی تھی۔ انہوں نے گورنر کے عہدہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر گلبرگ میں مکان خریدنے کے لئے لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ سے پرائیویٹ سودا کیا تھا۔

میاں مشتاق گورمانی نے سیاست سے جبری کنارہ کشی کے بعد اپنی زمینوں کی دیکھ بھال پر توجہ دی۔

1967 ء میں جب بحالی کی گرفت سے نکلے تو مطلع سیاست پر نئے چہرے نمودار ہو چکے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ جیسی محترم شخصیت سیاست دانوں کے ہاتھوں شکست کھا چکی تھیں۔ اس موقع پر انہیں ری پبلی کن کے قیام کا زمانہ یاد آیا کہ ارکان اسمبلی نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے اسے پاکستان کی بہت بڑی سیاسی جماعت بنا دیا تھا۔ کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد بھی اسی طرح پڑ چکی تھی۔

پابندی ختم ہونے کے بعد جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔ 1970 ء کے انتخابات کے بارے میں جماعت اسلامی سے انہوں نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں، وہ پوری نہ ہو سکیں ان کی پوری کوششوں کے باوجود جماعت اسلامی پنجاب میں صرف ایک نشست حاصل کر سکی۔ اس عبرتناک شکست کے بعد میاں مشتاق گورمانی مطلع سیاست سے چھٹ گئے۔ عوام روٹی، کپڑے اور مکان کے نعروں میں بہہ گئے۔ 1990 ء کے انتخابات تک کتنے ماہ و سال چپکے سے گزر گئے لیکن ان کے خاندان کا کوئی فرد سیاست میں اپنے لئے ان جیسا کوئی مقام حاصل نہ کر سکا۔ عمر احمد گورمانی نے قومی اور صوبائی سیاست میں نمایاں ہونے کی کوشش کی تھی۔ بار بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مشتاق گورمانی کے دور کو سازشوں کے حوالے سے سیاسیات پاکستان میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے ایک قریبی رشتہ دار غلام جیلانی گورمانی بھی صوبائی سیاست میں نمایاں حصہ لیتے رہے ہیں۔ وہ 1951 ء میں

مسلم لیگ۔ پھر ری پبلکن اور بعد ازاں کونشن مسلم لیگ میں شامل رہے ہیں۔

میاں ممتاز احمد دولتانہ آف لڈھن

میاں ممتاز دولتانہ کو سیاسیات پاکستان میں لیجنڈ ان پالیٹکس کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے ہاں قدرت کی طرف سے چار نسلوں سے اکیلے بیٹے کی روایت چل رہی ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ اپنے باپ احمد یار دولتانہ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ کے دادا اپنے والد نواب غلام محمد عرف گھوگھا کے اکلوتے بیٹے تھے۔ میاں جاوید ممتاز دولتانہ بھی میاں ممتاز دولتانہ کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں۔

لڈھن کے دولتانے

دولتانہ خاندان کی تاریخ کے بغیر پنجاب کی سیاست کا باب مکمل نہیں ہو سکتا یہ خاندان سیاست اور جاگیرداری کے حوالے سے ہمیشہ نمایاں رہا ہے، اگرچہ ان کا ذکر روسا پنجاب میں نہیں ہے۔ دولتانوں کا مورث اعلیٰ بڈھن شاہ تھا جس نے اپنے نام پر بڈھن نامی ایک گاؤں بھی آباد کیا دولتانے ان قبائل میں سے ہیں جو سکندر اعظم کے حملہ سے بہت پہلے دریائے ستلج کے کنارے آ کر آباد ہوئے قیام پاکستان سے پہلے اس خاندان کے جس فرد نے شہرت حاصل کی، وہ میاں احمد یار خان دولتانہ تھے۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر پنجاب کی سیاست پر اثرانداز ہوئے۔ وہ یونیسٹ پارٹی کے قد آور لیڈر تھے احمد یار خان دولتانہ کے صاحب زادے میاں ممتاز دولتانہ نے پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ میاں ممتاز دولتانہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس میں گذشتہ چار پشتوں سے قدرت کی طرف سے Law of Primogeniture جاری ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ اپنے والد کے اکلوتے صاحب زادے ہیں۔ میاں احمد یار خان دولتانہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ کے دادا اپنے والد نواب غلام محمد عرف گھوگھا کے اکلوتے بیٹے تھے اس وجہ سے میاں ممتاز دولتانہ کو چار پشتوں کے بعد جو جاگیر ملی، وہ تقسیم در تقسیم ہونے کے باوجود بے حد وسیع و عریض تھی۔ اتفاق سے نواب میاں ممتاز دولتانہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ہی صاحب زادے میاں جاوید ممتاز دولتانہ سے نوازا۔ پنجاب کی نہایت محبوب شخصیت یعنی آنریبل چوہدری سر شہاب الدین نے بھی جو کہ میاں ممتاز دولتانہ کے سگے خالو تھے اور جن کی کوئی اولاد نہیں تھی، میاں صاحب کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا کہا جاتا ہے کہ اگر میاں ممتاز دولتانہ سیاسی جھمیلوں میں پڑنے کی بجائے سیاست میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیتے تو وہ

پروفیسر لاسکی سے بھی زیادہ شہرت حاصل کرتے، اگر صرف کاروبار کی طرف توجہ دیتے تو راک فیلر سے بھی زیادہ دولت کماتے لیکن انہوں نے اپنے لئے عملی سیاست کا خارزار پسند کیا۔ دولت کی طرح سیاست بھی انہیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کو تحریر و تقریر پر کامل عبور تھا۔ وزارت کے زمانے میں ان کی فائلوں پر اکثر نوٹ مضمون کی صورت اختیار کر لیتے تھے وہ ملک کے واحد سیاست دان ہیں جنہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تو سیاست سے کنارہ کشی تک مسلم لیگی ہی رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے بڑے بڑے سیاسی معرکے سر کئے۔

میاں ممتاز دولتانہ 23 فروری 1916 ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی 1929 ء میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور جب بی اے کے امتحان کا نتیجہ نکلا تو آپ تاریخ میں صوبہ بھر میں اول رہے 1933 ء میں آپ آکسفورڈ چلے گئے سیاسیات، فلسفہ، اور اقتصادیات ان کے پسندیدہ مضامین ہیں۔

ان میں وہ بڑے اعزاز کے ساتھ پاس ہوئے۔ 1939 ء میں بیرسٹری کے امتحان میں اول آئے، آکسفورڈ قیام کے دوران آپ انڈین مجلس کے صدر منتخب ہوئے۔ 1943 ء میں ممتاز دولتانہ پہلی مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کی تحریک کل پرزے نکال رہی تھی۔ پنجاب کے نوجوان طبقہ نے انہیں 1944 ء میں پنجاب مسلم لیگ کا سیکرٹری منتخب کیا۔ جب قائداعظم نے 1946 ء میں الیکشن کمیٹی کی تشکیل کی تو میاں ممتاز دولتانہ بھی اس کمیٹی کے سات ارکان میں سے ایک تھے۔ مسلم لیگ کی تحریک میں آپ مرحوم لیاقت علی خان کے دست راست تھے اور جب تک وہ زندہ رہے ممتاز دولتانہ کا ستارہ بڑے عروج پر رہا۔

نواب افتخار ممدوٹ پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ چنے گئے تو سردار شوکت حیات اور میاں ممتاز دولتانہ ان کے اہم وزیر تھے۔ ممدوٹ دولتانہ کشمکش عروج پر تھی۔ قائداعظمؒ کی کوششوں کے باوجود ان میں مصالحت نہ ہو سکی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ اب دولتانہ صاحب مستعفی ہو کر ممدوٹ صاحب کی قیادت کے لئے چیلنج بننے والے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میاں ممتاز دولتانہ نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے ساتھ سردار شوکت کو بھی لے گئے۔ خان ممدوٹ کی کابینہ کی اصل طاقت اس کے پرائیویٹ مشیر تھے۔ میاں ممتاز

دولتانہ نواب ممدوٹ کی شکایت اکثر قیادت سے کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پنجاب کی ایڈمنسٹریشن ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کا تھوڑا بہت جو بھرم ہے وہ صرف اور صرف انگریز سرکار کے زمانے کی یادگار ہے، جو زیادہ دیر پا نہیں ممتاز دولتانہ کی رائے تھی کہ اگر ممدوٹ حکومت کا چلن اسی طرح رہا تو یہاں کا مزارع زمیندار کی گردن ناپے گا اور اسے زرعی اصلاحات کے ذریعے مطمئن نہ کیا تو پنجاب میں زور دار طبقاتی جنگ شروع ہو جائے گی۔

میاں ممتاز دولتانہ کا خیال تھا کہ اگر وہ ممدوٹ کابینہ سے مستعفی ہو گئے تو پنجاب میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور پنجاب کے عوام کی طرف سے خان ممدوٹ سے زور دار مطالبہ ہو گا "دولتانہ کا استعفیٰ واپس لو ورنہ تم بھی جاؤ" سردار شوکت حیات اور میاں ممتاز دولتانہ نے مستعفی ہونے پر جو بیان دیئے تھے، لوگوں نے اسے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا اور جہاں تک اخبارات کا تعلق تھا، انہوں نے میاں دولتانہ اور شوکت حیات کے استعفوں کا نوٹس ہی نہ لیا۔

عوام اور ان کے ساتھ خواص کی اس بے مہری سے دل شکستہ ہو کر میاں ممتاز دولتانہ مری چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد اچانک میاں ممتاز دولتانہ مری کی پہاڑیوں سے ایک بار پھر ممدوٹ وزارت کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ اس موقع پر صف اول کے ایک صحافی نے خان ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کے درمیان صلح کرانے کی کوشش بھی کی۔ میاں ممتاز دولتانہ نے ان صحافی کو بلا بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ دونوں میں مفاہمت کی راہ پیدا کریں اور خود ہی ایک مسودہ تیار کریں جس میں اس بات کا عہد ہو کہ ہم نے اپنے جزوی و فروعی اختلافات ختم کر دیئے ہیں اور اب خان ممدوٹ کی قیادت میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے ممتاز صاحب کی خواہش کے مطابق مسودہ تیار کیا۔ جب یہ مسودہ خان ممدوٹ کو بھیجا انہوں نے ایک دوست کو ممتاز دولتانہ کے پاس بھیجا کہ وہ واقعی اس مسودے پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن کچھ جواب نہ ملا اور بات آئیں بائیں شائیں ہو گئی۔

اس دوران ممتاز دولتانہ نے ایک اور کراچی کا چکر کاٹا۔ مئی میں میاں ممتاز دولتانہ سردار شوکت حیات کو وزیر اعظم بنانے کا تہیہ کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ جب خان ممدوٹ کے متعلق یہ وہم یا خیال رفع ہو گیا کہ وہ اور اس کے ساتھی ممتاز دولتانہ کی ذہانت اور صداقت کے بغیر وزارت کا کاروبار نہیں چلا سکتے تو صلح کا سلسلہ ایک بار پھر شروع

ہوا۔ لیاقت علی خان نے خان ممدوٹ کو کراچی بلایا اور مشورہ دیا کہ دولتانہ صاحب کو دوبارہ شریک وزارت کر لو۔ ممدوٹ صاحب نے آمادگی ظاہر کی لیکن اسی روز حضرت ناظم الملک خواجہ ناظم الدین نے ممدوٹ کو مشورہ دیا کہ فیروز خان نون کو بھی شامل کر لو یہ نام سنتے ہی میاں ممتاز دولتانہ بیچ پا ہو گئے۔ حد کمال یہ کہ کشمکش کے اس نقطہ عروج پر پنجاب اسمبلی کے ارکان کی اکثریت خان ممدوٹ کے ساتھ تھی۔

بالآخر خان ممدوٹ کے خلاف 26 جنوری 1949 ء کو عدم اعتماد کی قرار داد کا نوٹس دے دیا گیا۔ جب جناب دولتانہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ارکان اسمبلی کی اکثریت توڑنے سے قاصر ہیں۔ جو ان کے ہم نوا بنتے ہیں، ان میں ہر کوئی وزارت عظمیٰ کا امیدوار ہے تو انہوں نے لیاقت علی خان کو ایک خط لکھا جس میں اسمبلی توڑنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ 26 جنوری 1949 ء کو ارکان اسمبلی کی رائے کا حال معلوم ہوتا، یکایک 24 جنوری 1949 ء کو گورنر جنرل نے پنجاب اسمبلی کی فاتحہ پڑھا دی۔

1951 ء کے شروع میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو اس وقت تک میاں ممتاز دولتانہ پنجاب مسلم لیگ سے ہر اس شخص کو نکلوا چکے تھے جو ان کے مقابلے میں کبھی آنے کی جرات کر سکتا تھا۔ ملک فیروز خان نون بنگال کے گورنر ہو کر جا چکے تھے۔ میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات کو سیاسی پٹخی دی۔ پہلے سردار شوکت حیات کو ساتھ لے کر مستعفی ہوئے کچھ دنوں بعد شوکت صاحب سے الگ ہو گئے۔ خان ممدوٹ کو وزارت عظمیٰ سے معزول کرایا تو شیخ کرامت علی سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ پھر ان سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے میاں افتخار الدین کو بھی چت کر دیا۔ اور یوں پنجاب مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ صدر بننے کے بعد نواب ممدوٹ سے جنگ چھیڑ دی۔ میاں صاحب خود تو وزیر اعلیٰ نہیں بن سکتے تھے کیونکہ ان دنوں مسلم لیگ نے عہدے داروں پر حکومتی عہدے لینے پر پابندی عائد کر رکھی تھی وہ خان ممدوٹ کے مقابلے میں فیروز خان نون کو آگے بڑھاتے رہے۔ بعد ازاں میاں عبدالباری کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا۔ نواب ممدوٹ دوستی کی سزا میں میاں عبدالباری کی صدارت کا دھڑن تختہ کر دیا۔

ممتاز دولتانہ کی سیاسی زندگی کا سب سے زور دار دور افتخار ممدوٹ کی وزارت اعلیٰ کا زمانہ ہے۔ اس جنگ کا خمیازہ آج تک پنجاب کو بھگتنا پڑا ہے۔ اس دور میں ایم ایل اے کو

یکایک اپنی طاقت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ نواب ممدوٹ کو آنکھیں دکھانے لگے۔ صبح ایم ایل اے جتھہ بنا کر جاتے اور مطالبہ کرتے کہ ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا سپرنٹنڈنٹ ہمارا مخالف ہے، اس کا تبادلہ کر دیا جائے ورنہ ہم آپ کے مخالف کیمپ میں جا رہے ہیں۔ تار کے ذریعے ٹرانسفر کا حکم جاری ہو جاتا۔ شام کو دوسرے چار پانچ ایم ایل اے ممدوٹ کو پکڑ لیتے کہ ٹرانسفر کا آرڈر واپس لیں ورنہ ہم مخالف دھڑے میں جا رہے ہیں۔ اس پر چیف سیکرٹری عبدالمجید نے احتجاج کیا تو نواب صاحب کے دوستوں نے پٹی پڑھائی کہ چیف سیکرٹری دولتانہ سے ملا ہوا ہے۔

پنجاب کے نظم و نسق کا معیار اور افسروں کا مورال اس سے پہلے کبھی اس حد تک تباہ نہیں ہوا تھا۔ بیورو کریسی بہت کرپٹ ہو چکی تھی۔ یا یوں کہئے سیاسی انتشار کی وجہ سے سیاست دان ان کے تعاون کے بغیر چل ہی نہیں سکتے تھے۔ مارچ 1949 ء میں گورنر راج کے بعد پنجاب میں نئی سیاسی جنگ شروع ہو گئی۔ پنجاب میں گورنر راج کے بعد میاں ممتاز دولتانہ نے مصالحت کنندوں کی اپیل پر صوبائی لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور پیش کش کی کہ وہ کسی متفق علیہ غیر جانب دار شخص کو اس عہدے پر بٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ دونوں گروپوں کا اتفاق میاں عبدالباری پر ہو گیا اور وہ اتفاق سے صوبائی لیگ کے صدر چن لئے گئے۔ ادھر گورنر موڈی نے دفعہ 92 الف کے تحت صوبائی نظم و نسق کا چارج سنبھالنے کے بعد سرکاری افسروں کو یہ ہدایات بھیج دی تھیں کہ اب وہ اپنے کام میں کسی سرکاری پارٹی کے ممبروں اور کارکنوں کی سفارشیں قبول نہ کریں بلکہ اپنا کام بلا رورعایت کریں۔ افسروں نے گورنر کا اشارہ پا کر مسلم لیگی لیڈروں کی سفارشوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکنا شروع کر دیا اور پچھلے زمانے کی طرح نوکریاں، مراعات، لائسنس اور روٹ پرمٹ وغیرہ اپنی ذاتی صوابدید کے مطابق تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ میاں عبدالباری نے صوبے کا دورہ کیا تو ہر جگہ اضلاع کے مسلم لیگی لیڈروں نے ان سے شکایت کی کہ افسروں نے ہمارا اثر و رسوخ ختم کر دیا ہے اور یہ سب کچھ گورنر کے حکم سے ہو رہا ہے۔ وہ صوبے کی لیگ کے وقار کو تباہ کر رہے ہیں۔ میاں عبدالباری یہ سن کر گورنر کے خلاف جدوجہد کرنے لگے۔ گورنر نے نواب ممدوٹ کے خلاف پیروڈا کا مقدمہ قائم کرنے کا حکم دیا۔ یہ سن کر میاں افتخار ممدوٹ بھی میاں عبدالباری کے ساتھ مل گئے۔ جب

لیاقت علی خان واپس آئے تو صوبائی مسلم لیگ کے صدر گورنر موڈی کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے تھے اس مطالبے کے حق میں سول نافرمانی کی چلانے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ نواب افتخار ممدوٹ میاں عبدالباری کے قریب ہو گئے تھے۔ جب گورنر موڈی پریشان ہو گئے تو دولتانہ صاحب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میاں عبدالباری اب جانبدار نہیں رہے اور صوبے میں گورنر کے مشیروں کے اب مخالف دھڑے کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔

چنانچہ ممتاز دولتانہ نے مشیروں کے تقرر کے خلاف صوبائی لیگ کے اندر ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا۔ 24 جولائی 1950 ء کو صوبائی لیگ کونسل کے ہنگامہ خیز اجلاس میں ایک مشیر کے خلاف قرارداد پاس ہوئی یہ قرارداد بالواسطہ میاں عبدالباری کے خلاف تھی لہذا اگلے ہی دن میاں عبدالباری نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا یہ سب کچھ میاں ممتاز دولتانہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہے تھے 20 اگست 1950 ء کے صوبائی لیگ کے اجلاس میں ان کے نامزد امیدوار صوفی عبدالحمید کو مسلم لیگ پنجاب کا صدر چن لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ پنجاب کے انتخاب میں عددی طور پر ان کی جیت ہو گئی۔ لیکن انہیں اخلاقی فتح حاصل نہیں ہوئی 1951 ء کے الیکشن میں جھرلو کی اصطلاح پہلی بار منظر عام پر آئی کہ 1951 ء کی اسمبلی جھرلو کی پیداوار ہے۔

آخر کار دفعہ 92 الف کی حکومت ختم ہو گئی۔ میاں محمد ممتاز دولتانہ نے وزارت ترتیب دی اس طرح انہوں نے ایک نئے دور کا آغاز کیا جب انہوں نے اقتدار سنبھالا تو گزرے ہوئے دو سالوں میں تلخیوں اور شکایتوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ان کا اقتدار عوامی اعتبار سے ایک میزان بن گیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس ترازو میں کس فریق کا پلڑا عوامی خدمت کے اعتبار سے بھاری رہتا ہے۔ اب پنجاب میں میاں ممتاز دولتانہ کا طوطی بولنے لگا تھا۔ مرکز میں ان کے مربی وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کا اقبال نصف النہار پر تھا۔ پنجاب مسلم لیگ کی صدارت میاں ممتاز دولتانہ کی جیب میں تھی ان کے نامزد وزراء کی ٹیم چوہدری محمد حسین چٹھہ، نوابزادہ محمد خان لغاری، شیخ فضل الہٰی پراچہ، سردار عبدالحمید دستی اور سید علی شاہ گردیزی جیسے سیاست دانوں پر مشتمل تھی انسپکٹر جنرل پولیس چچا قربان علی خان تھے اور ڈی آئی جی (سی آئی ڈی) یار خاص میاں انور علی تھے اور میاں محمد شفیع م ش زمینداروں،

جاگیرداروں اور خطاب یافتگان کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے اس کامیابی کے بعد اپنے پسماندہ حلقہ انتخاب کی تحصیل وہاڑی میں جن خیالات کا اظہار کیا. اس کے متعلق اخبارات نے اتنا ہی کہا کہ دولتانہ صاحب وزارت کا پیالہ اٹھانے سے پہلے ہی بہک گئے تھے۔ یہ اقتدار کوئی مستقل شے نہیں یہ ایک آنی جانی شے ہے پنجاب میں کیسے کیسے لوگ اقتدار کی گدی پر نہیں تھے۔ ان کا کتنا ٹھاٹھ اور دبدبہ، میاں دولتانہ کی وزارت سے کسی طور پر بھی کم نہیں تھا میاں ممتاز دولتانہ نے وزارت کی گدی پر بیٹھ کر اپنے کمزور بلقدوں کا اس طرح کس بل نکالا کہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں سوائے ناراضگی کے کچھ نہیں ہوا یکایک حالات میں ایک زلزلہ برپا ہوا قائد ملت لیاقت علی خان راولپنڈی میں شہید ہوئے مرکز میں تبدیلیاں رونما ہوئیں خواجہ ناظم الدین مرحوم گورنر جنرل کی گدی سے اتر کر وزارت عظمیٰ کے منصب پر فروکش ہو گئے۔ ان کی جگہ غلام محمد گورنر جنرل کی گدی پر برا جمان ہو گئے۔ لیاقت علی خان کی موت کے بعد میاں ممتاز دولتانہ سیاست میں تنہا تنہا سے رہ گئے ان کی مسٹر عبدالقیوم سے دوستی نہ تھی جبکہ مسٹر عبدالقیوم کی خواجہ ناظم الدین سے گاڑھی چھنتی تھی ممتاز دولتانہ کا عقبی محاذ جو کہ لیاقت علی خان کے دور میں مضبوط اور محفوظ سمجھا جاتا تھا یکایک کمزور ہو گیا۔ ختم نبوت کے مسئلہ پر مجلس عمل نے راست اقدام کا الٹی میٹم دے دیا۔ پنجاب کے لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے اس ایجی ٹیشن سے پولیس کے ذریعے نمٹنے کی کوشش کی تاکہ خواجہ ناظم الدین کی چھٹی ہو جائے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ان کی جگہ دولتانہ صاحب وزیر اعظم بن جاتے دیکھتے ہی دیکھتے احمدیوں کے خلاف تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ تحریک اپنی شدت اور قوت میں بلا خیز تھی اور پورے پنجاب میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ مرکزی حکومت سخت پریشان ہو گئی جسٹس منیر رپورٹ میں اس کی ذمہ داری دولتانہ صاحب پر بھی ڈال دی مارشل لاء بظاہر لاہور میں نافذ ہوا مگر اس نے پورے ملک کی سیاسی اور آئینی زندگی کو متاثر کیا۔ اور یوں دولتانہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ میاں ممتاز دولتانہ پنجاب کے ایک ایسے سیاستدان ہیں جنہیں ناکام بنانے کے لئے بہت سے طاقت ور گروہ لیا کردار ادا کرتے رہے ہیں لیکن ان کے حامیوں کی تعداد ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ ایوب دور میں انہیں سیاسی اعتبار سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہزاروں ایکڑ اراضی زرعی اصلاحات کی زد میں آ گئی۔

دوسری زد ایوب خان نے سیاسی نااہلی کے قانون ایبڈو کی صورت میں لگائی تو میاں ممتاز دولتانہ نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا دفاع کرنے کی بجائے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب ان کی نااہلی کی مدت ختم ہونے والی تھی تو انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو خط لکھا کہ وہ مسلم لیگ کے صرف دو آنے کے ممبر بننا چاہتے ہیں اور پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد محترمہ فاطمہ جناح کی جگہ میاں ممتاز دولتانہ کونسل مسلم لیگ کے صدر تھے۔

محترمہ فاطمہ جناح کے بعد انہوں نے کونسل مسلم لیگ کا صدر بن کر بڑے زور شور سے تنظیم نو شروع کی۔ موجودہ تنظیم میں جو کچھ ملا تھا. اس میں سے بہتر لوگ تنظیمی ڈھانچے میں شامل کر لئے۔ یہ حقیقت ہے کہ بار بار ایسے بحران سے بھی انہیں واسطہ پڑا جنہیں یہ حل نہ کر سکے۔ کراچی زونل مسلم لیگ کی قیادت کا مسئلہ، شہزادی عابدہ سلطانہ کی علیحدگی اور پھر شمولیت اور پھر علیحدگی کے پیچھے جو داستانیں گردش کرتی رہیں، ان کا تعلق اعلیٰ قیادت کی کمزور حکمت عملی سے تھا۔ اس طرح کراچی سے غفار پاشا کی شمولیت کا مسئلہ کونسل مسلم لیگ کے بہت سے کارکن غفار پاشا کو کونسل مسلم لیگ میں شامل کرنے کے خلاف تھے وہ ممتاز دولتانہ کی گاڑی کے آگے لیٹ گئے تھے پاشا کے گھر کو گھیر لیا تھا تاکہ دولتانہ صاحب اندر نہ جا سکیں لیکن غفار پاشا کو کونسل مسلم لیگ میں شامل کر لیا گیا اس دور کا دوسرا مسئلہ جی ایم سید کے سندھ متحدہ محاذ کے ساتھ کونسل مسلم لیگ کے سیاسی الحاق کا تھا جس نے مسلم لیگیوں کو پریشان کر دیا تھا یہ معاہدہ جس طرح ہوا اسے موجودہ دور کا عجوبہ ہی قرار دیا جا سکتا تھا۔ جب اس معاہدے پر تنقید شروع ہوئی تو ممتاز دولتانہ نے وضاحتیں دینا شروع کر دیں۔ معلوم ہوا معاہدے کو جتنا خطرناک سمجھا جا رہا تھا یہ اس سے کئی گنا خطرناک تھا۔

اس کے بعد جب انتخابات کا زمانہ آیا تو کنونشن مسلم لیگ کو برا بھلا کہنے کے باوجود میاں ممتاز دولتانہ نے کنونشن مسلم لیگیوں کے لئے کونسل لیگ کے دروازے کھول دیئے انہوں نے اس کا جواب کارکنوں کو یوں دیا کہ کوئی جمہوری سیاسی پارٹی اپنے دروازے کسی شخص پر بند نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی کنونشن لیگی ہے اور ہمارے ساتھ ملنا چاہتا ہے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔

میاں ممتاز دولتانہ نے کونسل مسلم لیگ کا صدر بننے کے بعد اشتراکیوں اور علاقائیت

پرستوں پر کھلے اور جارحانہ حملے شروع کر دیئے تھے۔ 1970 ء میں مغربی پاکستان میں دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں سے اتحاد نہ کرنے سے پیپلز پارٹی کی فتح یقینی ہوئی۔ کونسل مسلم لیگ کے مرکزی رہنما جی ایچ لاری نے کہا کہ 70 ء میں کونسل مسلم لیگ کو جس شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کی ذمہ داری میاں ممتاز دولتانہ پر عائد ہوئی ہے۔

ریٹائرڈ ائیر مارشل نور خان کی کونسل مسلم لیگ میں شمولیت نے پارٹی کو فائدہ پہنچایا تھا اس کے بعد میاں صاحب نے خرابی صحت کے باعث کونسل مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا جب انہوں نے استعفیٰ دیا، اس وقت کونسل مسلم لیگ میں انتشار موجود تھا بعض ٹولیاں میاں ممتاز دولتانہ کے خلاف صف آرا تھیں۔ کونسل مسلم لیگ کی قیادت تین حصوں میں بٹ چکی تھی۔ مشرقی پاکستان کی قیادت کے خطوط کچھ اور تھے۔ سردار شوکت حیات اور ائیر مارشل نور خان ایک قیادت بنتے جا رہے تھے اور تیسری قیادت دولتانہ صاحب کے ہاتھ میں تھی گول میز کانفرنس کے موقع پر دولتانہ اور سردار شوکت حیات ایک دوسرے کے بہت قریب تھے 1970 ء کے صدارتی انتخاب میں سردار شوکت حیات نے مرکزی صدارت کا انتخاب لڑنے کی بجائے پنجاب کی صدارت پر قبضہ کر لیا۔ ان سے پہلے اس نشست پر میاں ممتاز دولتانہ کے دست راست محمد حسین چٹھہ فائز تھے۔ کونسل مسلم لیگ کی تمام تر طاقت پنجاب میں تھی اور اس طرح سردار شوکت حیات نے پنجاب کی صدارت پر قبضہ کر لیا۔ چند دنوں بعد میاں ممتاز دولتانہ نے اعلان کیا کہ وہ کونسل مسلم لیگ کا صدارتی انتخاب نہیں لڑیں گے۔ سردار شوکت حیات کو معلوم تھا کہ ون یونٹ ٹوٹ جانے اور صوبائی خود مختاری کا اصول طے ہو جانے کے بعد مرکزی صدارت غیر موثر ہو جائے گی۔ ایک طرف یہ کشمکش جاری تھی، دوسری طرف کونسل مسلم لیگ میں ایسی شخصیتیں آگئی تھیں جن کے آنے سے مخاطب کے وقار میں اضافہ ہوا تھا مگر غیر شعوری طور پر قیادت کی کشمکش اور تیز ہو گئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال میاں ممتاز دولتانہ کے بڑے مداح تھے لیکن انہوں نے پنجاب کا دورہ سردار شوکت حیات کے ساتھ ہی کیا جس سے سردار شوکت حیات کی قوت میں اضافہ ہوا۔ مشرقی پاکستان میں خواجہ خیرالدین اور ابو القاسم خاصے تیز نکلے اور وہاں یہ شعور اور پختہ ہو گیا کہ سیاسی جماعتوں کے سربراہ مشرقی پاکستان سے ہی ہونے چاہئیں۔ مشرقی پاکستان کی کونسل مسلم لیگ اپنے آپ کو آزاد اور اہم سمجھنے لگی۔

جب میاں ممتاز دولتانہ نے استعفیٰ دیا تو عام انتخابات میں صرف تین ماہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے 1967 ء سے 1969 ء کے آخری عشرے تک کونسل مسلم لیگ کو ایک امید دی تھی اور یہ ان کی قیادت ہی کا نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے جاگیر دار کنونشن مسلم لیگ کو چھوڑ کر اس میں شامل ہو رہے تھے۔ پیپلز پارٹی نے ان انتخابات میں مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت حاصل کی۔ مسلم لیگ مغربی پاکستان کی دوسری بڑی جماعت تھی۔ 1973 ء میں انہیں انگلینڈ میں سفیر مقرر کر دیا گیا ان کی چھوڑی ہوئی نشست پر میاں ریاض احمد دولتانہ جو ان کے کزن ہیں، 1973 ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ 1977 ء میں انہیں دوبارہ پیپلز پارٹی کا ٹکٹ دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت جب بر سر اقتدار نہ رہی تو میاں ریاض احمد دولتانہ مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے۔ 1985 ء تک شوریٰ کے رکن رہے۔ غیر جماعتی انتخابات میں انہوں نے علاقے کے معروف زمیندار چوہدری محمد اسحاق تارڑ کو شکست دی۔ 1979 ء کے بلدیاتی انتخابات میں ان کے کزن ریاض دولتانہ اور بیٹے جاوید ممتاز دولتانہ نے والد کی طرح سیاست میں نام کمانے کی کوشش کی لیکن وہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی سیاست سے آگے نہ بڑھ سکے۔ میاں ممتاز دولتانہ کا بیٹا جاوید ممتاز سیاست میں نمایاں ہونے کی کوشش میں مصروف ہے ان کی کئی شادیاں ہوئی ہیں لیکن ان میں سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

ملتان کے قریشی

پنجاب کے جاگیرداروں میں ملتان کے مخدوموں کو اچھی خاصی برتری حاصل رہی ہے اور اس خاندان نے اپنی وفاداریاں ہمیشہ اہل اقتدار طبقہ سے استوار رکھی ہیں۔ اس خاندان نے دنیاوی وجاہت و برتری کے حصول کے لئے سیاسی اثر و رسوخ اور گروہ بندی کی طاقت کی بجائے زیادہ تر مذہبی برتری سے استفادہ کیا ہے پنجاب میں مخدوموں کی نمایاں زندگی کا آغاز حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ آپ ۱۱۷۰ء میں کوٹ کرور ضلع لیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بزرگ محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان آئے اور کوٹ کرور میں آباد ہو گئے تھے۔ حضرت بہاؤالدینؒ تحصیل علم کے لئے ترکستان، خراسان، شام اور عرب میں کافی عرصہ تک پھرتے رہے اور ۱۲۲۲ء میں ہندوستان واپس لوٹے اور ملتان آکر مقیم ہو گئے۔ واپسی پر ان کے علم و فضل اور بزرگی کی شہرت نے دوام حاصل کر لی اور ان سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے ہزاروں افراد ان کے مرید بن گئے۔ جس کی وجہ سے مخدوم خاندان تمام ملک میں بڑی عزت و تکریم سے دیکھا جانے لگا۔ حضرت بہاؤالدینؒ نے سو سال کی عمر میں ۱۲۷۰ء میں وفات پائی اور ملتان میں ان کا عالی شان مزار تعمیر کیا گیا جو چھ، سات سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی روحانیت کے طالبوں کا مرکز ہے۔

ان کی وفات کے بعد حضرت رکن عالمؒ کو خاندان کی سربراہی سونپی گئی۔ آپ بھی اپنی علمی فضیلت کے باعث کافی مشہور تھے۔ یہاں تک کہ دہلی کے تغلق بادشاہ کئی بار ان کے پاس آئے۔ آپ ۱۳۷۲ء میں فوت ہوئے اور فیروز خان تغلق نے اپنی نگرانی میں ملتان میں ان کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ آپ کی وفات کے بعد ملک کے سیاسی انقلابات نے مسلمان کو بھی
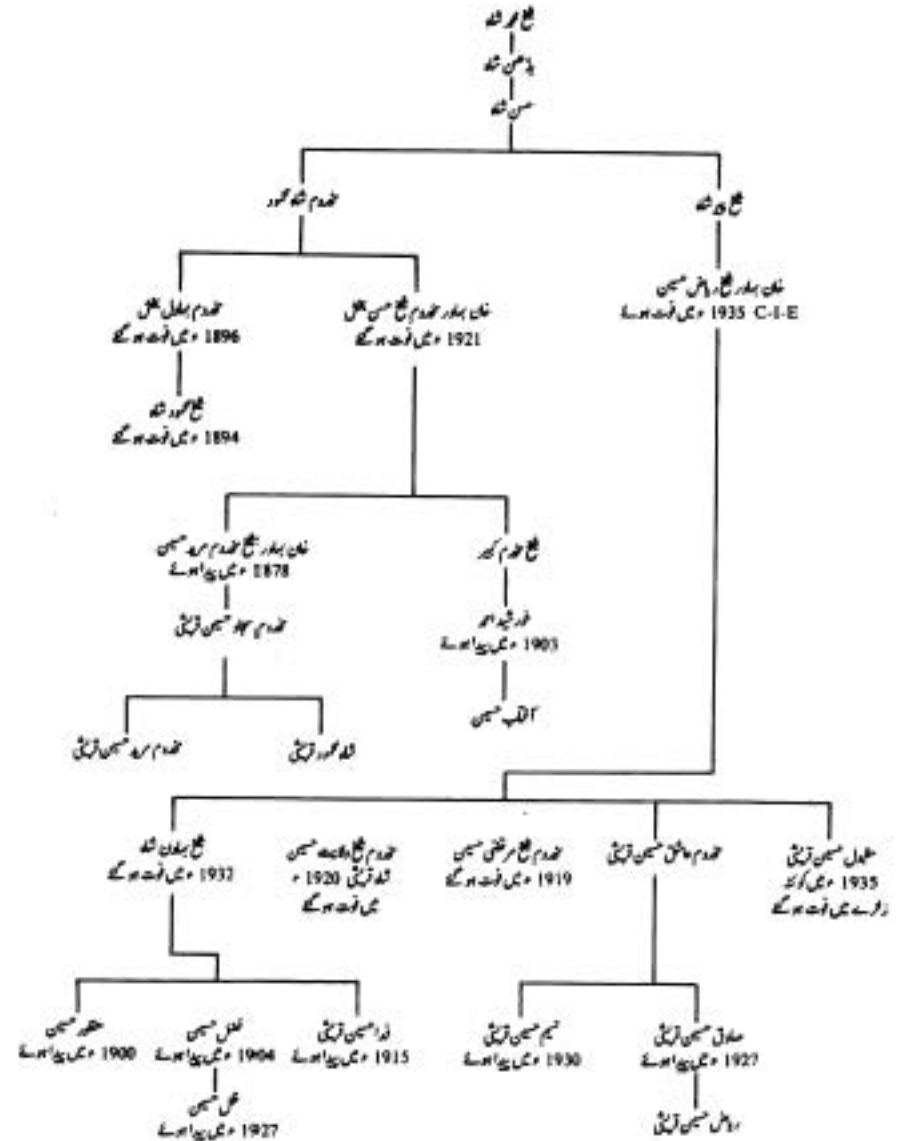
اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۴۴۳ء میں دہلی کی سلطنت پر زوال آتے ہی ملتان مرکز سے کٹ گیا۔ ملتان کے باشندوں نے متفقہ طور پر شیخ یوسف" کو اپنا سربراہ منتخب کر لیا۔ شیخ یوسف" نے اپنے زمانے میں بڑی دانائی سے انتظام و انصرام کو برقرار رکھا۔ اس اثناء میں پہلی مرتبہ ملتان میں ایک سیاسی ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ شیخ یوسف کی شادی ایک افغان لڑکی سے ہوئی تھی افغان سردار اپنی بیٹی سے ملنے آئے اور بڑی چالاکی سے مسلح آدمیوں کی امداد سے شیخ یوسف کو گرفتار کر کے ملتان پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد ملتان کی تاریخ میں کئی ہنگامے چلتے رہے اور کئی انقلاب آئے لیکن مخدوم خاندان کی شان و شوکت اور عزت و تکریم میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر مختلف ہنگاموں سے گزرنے کے بعد ملتان پھر دہلی کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ مخدوم چونکہ مذہبی اثر کے باعث ملک میں کافی طاقت رکھتے تھے، اس لئے انہوں نے وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کے زیر اثر آہستہ آہستہ سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ سکھوں کے ابتدائی دور میں مخدوم شاہ محمود اس خاندان کا سربراہ تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باقاعدہ برسراقتدار آنے سے پہلے ہی مخدوم کافی زمینوں کے مالک بن گئے تھے اور ان کا شمار ملک کے امیر ترین خاندانوں میں ہوتا تھا۔ جب ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملتان کو فتح کیا تو انہوں نے مخدوموں کی عزت و تکریم کے پیش نظر ساڑھے تین ہزار روپے کی مالیت کی جاگیر عطا کی جسے بعد میں دیوان ساون مل نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر گھٹا کر ۱۶ سو روپے کر دیا۔ اس زمانے میں اس خاندان کی کل جائیداد اڑھائی ہزار مالیت کی تھی۔

۱۸۴۸ـ۴۹ء میں جب سکھوں کی قوت لڑکھڑانے لگی تو انگریزوں نے مطلع سیاست پر یونین جیک گاڑ دیا تو مخدوم شاہ محمود نے اس زمانے میں سرکار عالیہ کو جو خفیہ خبریں دیں، وہ انتہائی مفید ثابت ہوئیں۔ جب انگریز نے پنجاب پر پوری طرح سے قبضہ کر لیا تو انہوں نے مخدوم شاہ محمود کو اعلیٰ خدمات کے معاوضے میں ایک ہزار مالیت کی مستقل جاگیر کے علاوہ تا زندگی سترہ سو پنشن دی۔ اس کے علاوہ ایک پورا گاؤں ان کے حوالے کیا۔ سیاسی کشمکش کے اس نازک دور میں ملتان کے دونوں مزاروں کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ انگریزوں سے اس سلسلہ میں امداد طلب کی گئی تھی لیکن حکومت نے امداد دینے سے صاف انکار کر دیا جس کے بعد مریدوں کی امداد سے ان مقبروں کی مرمت کرائی

گئی۔

۱۸۵۷ء کے خونی ہنگاموں میں جب ہندوستان کے کچلے ہوئے عوام نے برطانوی استعمار کے خلاف زندگی اور موت کی حدود کو توڑتے ہوئے آخری جدوجہد کی تو اس نازک مرحلے پر مخدوم شاہ محمود نے سرکار دولت مدار کی مستحسن خدمت سرانجام دی۔ وہ کمشنر کو ہر ایک قابل ذکر واقعہ کی اطلاع بڑی مستعدی سے دیتے رہے۔ اپنی وفاداری کا مزید ثبوت دینے کے لئے انہوں نے سرکاری فوج میں بیس ہزار سوار اور کافی پیادے بھینٹ چڑھائے، سرکار کے اس یار وفادار نے اس امداد کے علاوہ پچیس سواروں کی ایک پلٹن بنا کر کرنل ہملٹن کے ہمراہ باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیں اور خود لڑائیاں لڑیں۔

مخدوم شاہ محمود کی اس عملی امداد نے انگریزوں کی قوت بڑھانے میں اتنا کام نہیں کیا جتنا کہ ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے ان کے سات تعاون نے اثر کیا۔ جب عام مسلمانوں نے دیکھا کہ ایک بڑا مذہبی رہنما انگریزوں کی امداد کر رہا ہے تو ان کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے جس کا جدوجہد آزادی پر بہت برا اثر پڑا۔ مخدوم شاہ محمود قریشی کے مریدوں نے اپنے پیر کے حکم کے مطابق جنگ آزادی میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا۔ اگرچہ تاریخی طور پر اس کی واضح تصدیق تو نہیں ہو سکی لیکن کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر مخدوم شاہ محمود نے ایک فتویٰ بھی جاری کیا تھا جس کے مطابق جدوجہد آزادی میں حصہ لینا مذہب کی روح سے غلط قرار دیا گیا تھا اور انگریزوں کی امداد ضروری قرار دی گئی تھی۔

ان خدمات جلیلہ کے معاوضے میں تین ہزار روپے کی امداد مزاروں کے لئے اور اس کے علاوہ اٹھارہ سو روپے مالیت کی جاگیر اور آٹھ کنوؤں پر مشتمل زمین بھی سرکار برطانیہ کی طرف سے دی گئی۔ ۱۸۶۰ء میں جب لاہور میں وائسرائے کا دربار لگا تو مخدوم شاہ محمود کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں لاہور میں بھنگی والا باغ اور ڈیڑھ سو روپے وظیفے کا تحفہ عنایت کیا گیا۔ شاہ محمود قریشی ۱۸۶۹ء میں فوت ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد ان کا بیٹا بہاول بخش، حضرت شاہ رکن عالم" اور حضرت بہاؤالدین زکریا" کے مزاروں کا سجادہ نشین بنا۔ مخدوم شاہ محمود کو پورے اعزاز کے ساتھ بہاؤالدین زکریا کے مزار میں دفنایا گیا۔ ان کی آخری رسومات میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور مقامی عدالتیں سوگ میں بند رہیں۔ بہاول بخش کی دستار بندی ڈپٹی کمشنر کے ہاتھوں بڑی شان و شوکت سے ہوئی۔

۱۸۸۰ء میں بہاول بخش کی افغان جنگ میں پیش کی گئی خدمات کو سراہنے کے لئے لاہور میں ایک دربار لگایا گیا۔ نقل و حمل کے لئے انہوں نے اونٹوں کا ایک دستہ بھی افغان جنگ میں انگریز سرکار کی خدمت میں حاضر کیا تھا۔ انہوں نے افغان جنگ میں اپنی تمام خدمات انگریز سرکار کے حوالے کر دی تھیں اس خدمات کے صلہ میں بہاول بخش کو ۱۸۷۷ء میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا اور کچھ عرصہ وہ ملتان میونسپلٹی کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں صوبائی درباری کی نشست بھی الاٹ ہو گئی۔ بہاول بخش ۱۸۹۶ء میں وفات پا گئے تو ان کے بعد ان کے صاحب زادے شیخ محمد شاہ کی بجائے شیخ حسن بخش کو گدی نشین بنا دیا گیا۔ مخدوم شیخ حسن کو ۱۸۹۶ء میں آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا اور ان کو ۱۹۰۵ء میں انگریز سرکار نے خان بہادر کے لقب سے نوازا جیسے وہ اپنے مخصوص حواریوں کا فرمانبرداروں کو نوازتے تھے۔ انہیں بھی صوبائی درباری کی نشست الاٹ ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک یہ گدی کورٹ آف وارڈ کی نگرانی میں رہی۔ انہوں نے مجسٹریٹ اور میونسپل کے ممبر کی حیثیت سے لوگوں کی بڑی خدمت کی تھی۔ شیخ حسن بخش ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے تو مخدوم مرید حسین اس گدی کے سجادہ نشین بنے۔ انہیں اونٹوں کی نسلوں سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ کئی سال تک اونٹوں کے دستے کے رسالدار بھی رہے۔ اپنے بزرگوں کی روایات پر چلتے ہوئے انہیں بھی صوبائی درباری کی نشست الاٹ ہو گئی۔ اس کے علاوہ سر مرید حسین کو درجہ اول کے مجسٹریٹ کے تمام اختیارات بھی حاصل تھے اور وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بھی تھے اور ان کا سول عدالتوں میں مواخذہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور وہ ایک معافی دار تھے۔ انگریز سرکار نے انہیں نواب بہادر کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ خان بہادر مخدوم سید راجن بخش شاہ گیلانی کی موت سے صوبائی لیجسلیٹو اسمبلی کی خالی ہونے والی نشست پر سر مرید حسین منتخب ہو گئے۔ سر مرید حسین پکے یونینسٹ تھے۔ یونینسٹ کی شکست کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ خان بہادر سر مرید حسین کے چھوٹے بھائی شیخ احمد کبیر روحانیت کی طرف مائل تھے اور گدی کے زیادہ تر معاملات انہی کے حوالے تھے۔ ان کے ہزاروں مرید ضلع ملتان، جھنگ، لائل پور، گجرات، اور گوجرانوالہ اور شاہ پور میں پھیلے ہوئے تھے۔ شیخ احمد کبیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر نامزد ہوئے اور میونسپل کمیٹی ملتان کے منتخب صدر بھی رہے۔ شیخ احمد کبیر نے تحریک سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریکوں کے خلاف اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور اپنا تمام تر تعاون

انگریز سرکار کو پیش کیا۔ شیخ احمد کبیر کے بیٹے خورشید احمد نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی اور وہ کچھ عرصہ تک ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی ملتان کے ممبر بھی رہے۔ مخدوم شاہ محمود کے بھائی پیر شاہ بھی صوبائی درباری تھے اور وہ کچھ عرصہ تک میونسپل کمیٹی ملتان کے آنریری سیکرٹری بھی رہے۔ تحصیل میلسی کے تین دیہات میں ان کی بہت بڑی جاگیر پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی افغان جنگ میں انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی تھی۔ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے وائسرائے نے تعریفی سند اپنے دست مبارک سے انہیں عنایت فرمائی تھی۔

۱۸۹۷ء میں شیخ کبیر احمد کی موت کے بعد ان کا بیٹا شیخ ریاض حسین صوبائی دربار میں اپنے باپ کی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۸۹۷ء میں انہیں اسٹنٹ پولیٹیکل آفیسر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں انہیں اعزازی مجسٹریٹ بنا دیا گیا اور انہیں آنریری ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر مقرر کر کے بنوں میں سیاسی ڈیوٹی پر تعینات کیا گیا جہاں انہوں نے اہم معرکے سر کئے اور انہیں ۱۹۰۷ء میں خان بہادر کے لقب سے نوازا گیا۔ جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی انہوں نے انگریزوں کے لئے افرادی قوت اور مالی امداد کا دل کھول کر مظاہرہ کیا۔ ۱۹۱۵ء میں انہیں تاج برطانیہ کا انڈیا میں بہترین دوست قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں انہیں خان بہادر کے لقب سے نوازا گیا اور وہ کئی سال تک ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے وائس چیئرمین رہے۔ نواب ریاض حسین قریشی ۱۹۳۵ء کے زلزلے میں اپنے بیٹے کیپٹن مقبول حسین کے ساتھ فوت ہو گئے۔

نواب ریاض حسین کے پانچ بیٹے تھے۔ سب سے بڑا بیٹا شیخ بہاون شاہ ۳۶ جیکب ہارس میں جمعدار تھا ان کی خدمات کے صلہ میں انہیں اعزازی سند، تلوار اور بیج دیئے گئے اور ان کا نام گزٹ آف انڈیا میں شامل کر لیا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے بہت بڑی جاگیر اور تعریفی سند عنایت فرمائی۔ علاوہ ازیں کمانڈر انچیف نے بھی انہیں سرٹیفکیٹ عنایت فرمایا۔ ۱۹۳۰ء میں جب تحریک سول نافرمانی کی وجہ سے ملک کے حالات انگریزوں کے خلاف نفرت کے الاؤ میں جل رہے تھے تو بہاون شاہ نے اپنی تمام خدمات انگریزوں کے پلڑے میں ڈال دیں۔ ۱۹۳۲ء میں شیخ بہاون شاہ کا انتقال ہوا۔ اس وقت

ان کا سب سے بڑا لڑکا شیخ منظور حسین تحصیل دار تھا۔ دوسرا بیٹا ولائت حسین ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا جو اپنے باپ کی موت سے تین سال پہلے ۱۹۲۹ء میں فوت ہو گیا تھا۔ تیسرا بیٹا سکول کے زمانے میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ ان کے چوتھے بیٹے کیپٹن عاشق حسین نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہارڈ سن ہارس میں داخلہ لیا ملتان کا یہ معروف خاندان بھی یونینسٹ وزارت کے زمانے میں دولتانہ خاندان کا سرگرم حلیف رہا ہے۔

۳۶۔ ۱۹۳۵ء کے انتخاب میں ملتان کے تقریباً تمام بڑے خاندانوں نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیا۔ قریشی خاندان کے سب سے بڑے سیاسی حریف گیلانی خاندان نے قریشیوں کی مخالفت میں مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا۔ قریشی خاندان کے سربراہ نواب سرمرید حسین قریشی مرحوم نے یونی نسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر شجاع آباد کی نشست سے انتخاب میں حصہ لیا مگر انہیں گیلانی خاندان کے سربراہ مخدوم سید محمد رضا شاہ گیلانی مرحوم نے شکست دی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے چیئرمین کے انتخاب میں انہوں نے انگریز ڈپٹی کمشنر ای پی مون کو بھاری اکثریت سے شکست دی تھی۔ وہ متحدہ پنجاب کے تمام اضلاع میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے واحد غیر سرکاری چیئرمین تھے۔ قیام پاکستان کے بعد سرمرید حسین کے اکلوتے بیٹے مخدوم سجاد حسین قریشی ۱۹۵۱ء کے الیکشن میں مسلم لیگی امیدوار ولائت حسین گردیزی سے شکست کھا گئے۔ تاہم ۱۹۵۹ء میں مخدوم سجاد حسین قریشی بلدیہ ملتان کے وائس چیئرمین منتخب ہو گئے اور ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور قومی اسمبلی میں کونسل مسلم لیگ کے پارلیمانی گروپ کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہو گئے۔

نواب مخدوم سجاد حسین قریشی نے محسوس کیا کہ کونسل مسلم لیگ کے صف اول کے رہنما ایبڈو کی زد میں آ کر چھ سال کے لئے سیاست سے نااہل ہو چکے تھے انہوں نے کونسل مسلم لیگ کا دامن جھٹک دیا اور نواب آف کالا باغ کی ترغیب پر کونونشن مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء کے انتخاب میں مخدوم سجاد حسین قریشی نے محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں ایوب خان کو کامیاب کرانے کے لئے بہت کام کیا۔ جب تک ایوب خان کے اقتدار کا سنگھاسن نہ ڈولا، مخدوم سجاد حسین قریشی کونونشن مسلم لیگ میں شامل رہے۔

خضر حیات کی یونینسٹ وزارت کے سابق وزیر میجر عاشق حسین قریشی مرحوم کے بیٹے نواب صادق حسین قریشی نے بھی اپنی سیاسی زندگی میں وفاداریاں اہل اقتدار کے پلڑے

میں ڈالی ہیں۔ وہ ۱۹۶۵ء میں کونونشن مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ ان کا اگرچہ ملتان سے تعلق تھا، نواب آف کالا باغ اور ان کی کابینہ کے اہم رکن ملک محمد حیات ٹمن نے انہیں تحصیل خانیوال سے صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں ٹکٹ دیا۔ پھر اس کے بعد انہیں بلا مقابلہ کامیاب کروانے کا انتظام بھی کیا گیا۔ اس طرح ڈسٹرکٹ کونسل ملتان کے وائس چیئرمین بھی منتخب کروا لئے گئے۔ مخدوم سجاد حسین قریشی ان کے چچازاد بھائی ہیں۔

جب تک ایوب خان برسر اقتدار رہے تو قریشی خاندان ایوب خان کے ساتھ رہے۔ ملک میں مارشل لاء لگ جانے اور عام انتخابات کے اعلان تک انہیں اندازہ نہ ہو سکا کہ ملک کے اقتدار کا تاج کس کے سر پر ہو گا۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے گرچہ روٹی، کپڑے، اور مکان کا نعرہ لگایا تھا لیکن انہیں شدت سے یہ احساس تھا کہ وہ جاگیرداروں کی گروہی سیاست اور تعاون کے بغیر نہیں جیت سکتے۔ اسی غرض سے بھٹو نے ۱۹۷۰ء میں ملتان کا آٹھ روزہ طوفانی دورہ کیا اور وہ سب سے پہلے گیلانی خاندان کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایوب خان کے دور میں بھٹو کونونشن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے اور حامد رضا گیلانی مرکزی پارلیمانی سیکرٹری تھے۔ بھٹو کی ان سے گہری دوستی تھی۔ حامد رضا گیلانی ایک موقع پر تو پیپلز پارٹی میں شمولیت کے لئے آمادہ بھی ہو گئے تھے۔ پیپلز پارٹی میں شمولیت میں سب سے بڑی دیوار علمدار حسین گیلانی تھے۔ کونسل مسلم لیگ کو جب بھٹو کے عزائم کا علم ہوا تو انہوں نے مخدوم سجاد حسین قریشی سے رابطہ کیا۔ چوہدری محمد حسین چٹھہ کونسل مسلم لیگ (زونل پنجاب) کے صدر تھے۔ انہوں نے سجاد حسین قریشی کو شمولیت کے لئے آمادہ کر لیا کیونکہ ملتان میں قریشی خاندان کے تعاون کے بغیر سیاسی برتری حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ ملتان کا قریشی گروپ اس شرط پر کونسل مسلم لیگ میں شامل ہوا تھا کہ اس جماعت کے دروازے گیلانی گروپ پر بند کر دیئے جائیں۔ اس فیصلے کے خلاف کونسل مسلم لیگ کے ان کارکنوں نے شدید احتجاج کیا جنہوں نے ایوبی آمریت کے خلاف طویل جنگ لڑی تھی لیکن مسلم لیگ کے پنجابی قائدین نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ ساتھ ہی مخدوم سجاد حسین قریشی نے یہ شرط رکھی کہ انہیں قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیا جائے۔ اس کے بعد مخدوم سجاد حسین قریشی نے کونسل مسلم لیگ کو فعال بنانے کی کوشش کی لیکن بھٹو

کے روٹی، کپڑے اور مکان کے نعروں میں ان کی صدائیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ نواب صادق حسین قریشی کے اپنے کزن مخدوم سجاد حسین قریشی سے تعلقات کشیدہ تھے۔ وہ گرچہ کونسل مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے لیکن ناراضگی ختم نہ ہوئی تھی۔ گیلانیوں نے اس رنجش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں مسلم لیگ قیوم گروپ میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں ملک محمد اسلم بوسن کا خصوصی تعاون حاصل کیا گیا۔

بھٹو نے جب ملتان کا آٹھ روزہ دورہ کیا تو نواب صادق حسین قریشی اور ان کے ہمنواؤں کو، جنہوں نے چند ہفتے پہلے کونسل مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی، بھٹو کا سحر چلتا نظر آیا تو انہوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے جاگیردار اس وقت بھی اپنی روایتی اور پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں اور وہ اسمبلیوں کے انتخاب جیتنے کے لئے کوئی بھی پینترا بدلنے سے گریز نہیں کرتے۔ انہیں کسی اصول یا نظریے سے کوئی دلچسپی نہیں حالانکہ ملتان قادر پور اں وہی جگہ ہے جہاں صادق حسین قریشی کے آدمیوں نے بھٹو کے قافلے پر حملہ کیا تھا اور ان کی گاڑیوں کے ٹائر پنکچر کر دیئے تھے۔ اب صادق حسین قریشی کا مقابلہ گیلانی خاندان کے سرخیل علمدار حسین گیلانی سے تھا۔

1970 ء کے انتخابات میں قریشیوں کی سیاست پر شدید ضرب لگی تھی۔ جو برسوں سے ملتان کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے، وہ 1970 ء کے انتخاب میں ضمانتیں ضبط کروا بیٹھے ایوبی دور میں بھی قریشی اور گیلانی بر سر اقتدار گروپ میں شامل تھے اور دونوں کو ملک امیر محمد آف کالا باغ نے مراعات دے کر خوش رکھا ہوا تھا۔ 1970 ء کے انتخابات میں ایسی تلوار چلی کہ دونوں کو احساس ہوا کہ کونسل مسلم لیگ اور مسلم لیگ قیوم گروپ کی بجائے ان کی سیاسی پناہ گاہ اب پیپلز پارٹی ہی ہو سکتی ہے۔

بھٹو دور میں قریشی خاندان کو اس حوالے سے اہمیت حاصل رہی ہے کہ نواب صادق حسین قریشی کے ذریعے قریشی خاندان کا اقبال پیپلز پارٹی کے دور میں بھی بلند رہا ہے۔ سید حامد رضا گیلانی اور مخدوم سجاد حسین قریشی الیکشن میں شکست کھانے کے بعد پیپلز پارٹی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ملتان کی سرزمین نے بڑے بڑے سیاستدان پیدا کئے ہیں لیکن قریشی خاندان کا ماضی اس بات کا کھلا اظہار ہے کہ وہ ان کے رہے ہیں جو اقتدار میں

ہوتے ہیں۔ 1970 ء کے انتخابات کی نسبت پیپلز پارٹی کو ملتان کے لئے ایسی حکمت عملی اختیار کرنا پڑی کہ سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے والوں، دھڑے بندیوں اور برادری سسٹم کے جن بتوں کو خود پاش پاش کیا تھا. 1977 ء کے انتخاب میں نئی حکمت عملی کے تحت ان بتوں کو جوڑنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگی اور اسی حکمت عملی کے تحت پیپلز پارٹی کے امیدوار تقریباً تمام جاگیردار تھے جن میں مخدوم، گردیزی، اور گیلانی نمایاں تھے 1977 ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے خلاف انتخابی دھاندلیوں کے الزامات عائد ہوئے ملک میں کشت و خون کے باعث جب مارشل لاء لگا ان سیاسی خاندانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مارشل لاء آیا تو نوے دن کے لئے ہے اور جائے گا اپنی مرضی سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے اکتوبر 77 ء میں الیکشن کا اعلان کیا تو قریشی خاندان کے سربراہ کو احساس ہو گیا تھا اور وہ 1970 ء والی غلطی دہرانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے پیپلز پارٹی سے عملی تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا۔ مجبوراً پیپلز پارٹی کو مخدوم سجاد قریشی کی جگہ عبدالرحمان واہلہ کو امیدوار بنانا پڑا۔ مخدوم سجاد حسین کا یہ فیصلہ سو فی صد صحیح ثابت ہوا۔ نواب صادق حسین قریشی گورنری اور وزارت اعلیٰ کی بہاریں دیکھ چکے تھے اور ایک بار پھر اس دیار کی زیارت کی جستجو میں پیپلز پارٹی کا طواف کر رہے تھے۔

جب احتساب کا مرحلہ شروع ہوا تو نواب صادق حسین قریشی سیاست سے نااہل قرار دے دیئے گئے۔

جیسے جیسے مارشل لاء کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے، پیپلز پارٹی کو احساس ہونے لگا تھا کہ اب مارشل لاء کے خلاف طویل جدوجہد کا وقت آیا ہے تو یہ دھڑے بند جاگیردار فرار کی راہیں اختیار کر گئے۔ اگر ان کی جگہ کارکنوں کو ٹکٹیں دی جاتیں تو وہ جمہوریت کی بحالی میں آج پارٹی کے ساتھ ہوتے۔

ضیاء الحق نے 17 نومبر 79 ء کو ملک میں عام انتخابات کا جو وعدہ کیا تھا، ان انتخابات کو ٹالنے کے لئے انہوں نے بلدیاتی الیکشن کروانے کا اعلان کیا تو گیلانی اور قریشی خاندان قومی سیاست کی طرح بلدیاتی سیاست میں بھی ایک دوسرے کے خلاف بر سر پیکار ہو گئے۔ 1979 ء کے بلدیاتی انتخابات میں جب قریشیوں اور گیلانیوں کی سیاست پر پہلی ضرب پڑی اور فخر امام ملتان کی سیاست پر نمودار ہوئے تو قریشی اور گیلانی خاندان برسوں

پرانی رقابت ختم کرتے ہوئے فخر امام کو ملتان کی سیاست سے آوٹ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ سیاست کے اس کھیل میں انہوں نے ضلع ملتان کے بڑے بڑے خاندانوں اور برادریوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس سلسلہ میں تونسہ شریف، پاک پتن شریف کی گدیوں کو بھی سیاست میں لے آئے۔ خانیوال ضلع بن جانے سے ان سیاسی خاندانوں کا خوف کسی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ 57 سال قبل عوامی نمائندوں کے انتخابات ہوئے تو گیلانی خاندان کے سر مخدوم رضا گیلانی نے برطانوی انقلاب کے ہم معتقد و ڈپٹی کمشنر ای پی مون کو ووٹوں کے ذریعے شکست دی۔ قریشی خاندان اسی وقت بھی ان کا حریف تھا۔ مخدوم سر مرید حسین قریشی، نواب عاشق حسین قریشی مخدوم سجاد حسین قریشی اور گیلانی خاندان کے سربراہ مخدوم رضا شاہ گیلانی، مخدوم راجن شاہ گیلانی اور مخدوم علمدار حسین گیلانی سیاسی معرکے کرتے رہے ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان پر گیلانی خاندان کا ہی قبضہ رہا ہے۔ نواب آف کالا باغ نے نواب صادق حسین قریشی کو ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کا وائس چیرمین مقرر کیا تھا۔ مخدوم سجاد حسین قریشی نے اپنے بیٹے مخدوم شاہ محمود قریشی کو بلدیاتی سیاست کے ذریعے متعارف کروانے کی کوشش کی بلدیاتی سیاست کے حوالے سے مخدوم سجاد حسین قریشی نے گیلانیوں کے ساتھ برسوں پرانی سیاسی رقابت کو بھی کسی حد تک بھلا دیا تھا۔

1983 ء کے بلدیاتی انتخابات میں شاہ محمود قریشی کا مقابلہ جاوید ہاشمی کے بھائی سے تھا۔ سید یوسف رضا گیلانی نے شاہ محمود قریشی کی مخالفت کی اس طرح سیاست کا شہسوار پہلی ہی سواری سے گر پڑا اور ضلع کونسل کا چیئرمین تو کیا، بلدیاتی کونسلر بھی منتخب نہ ہو سکا 1985 ء کے غیر جماعتی انتخابات میں شاہ محمود قریشی نے جاوید ہاشمی کو شکست دے کر بلدیاتی شکست کا بدلہ لے لیا حالانکہ جاوید ہاشمی اس حلقے کی قومی نشست سے کامیاب ہوئے تھے اور صوبائی نشست میں شاہ محمود قریشی سے ہار گئے تھے۔ 1987 ء کے بلدیاتی انتخابات میں نوجوان شاہ محمود قریشی نے گیلانی خاندان کے 57 سالہ اقتدار کو چیلنج کیا اور ضلع کونسل ملتان کے چیرمین منتخب ہو گئے۔

نواب صادق حسین قریشی کے بڑے بھائی شاہ رکن عالم سجانی کے گدی نشین مخدوم مریدی حسین قریشی نے اپنے سابق سیاسی حریف وفاقی وزیر صنعت حامد رضا گیلانی سے 1985 ء میں دوستی کا معاہدہ کیا تھا۔ یہ دوستی طویل سیاسی جھگڑوں کے بعد ہوئی تھی۔

طرفین نے اخلاص کا ثبوت بھی دیا تھا۔ شاہ محمود کی بلدیاتی انتخاب میں یوسف رضا گیلانی کی مخالفت کے باوجود دوستی کا رشتہ قائم رہا۔ اس صورت حال میں ایک بار پھر طوفان اس وقت آیا جب حامد رضا گیلانی اور صادق حسین قریشی کا آمنا سامنا 1985 ء کے غیر جماعتی انتخاب میں ہوتے ہوتے رہ گیا۔ البتہ صادق حسین قریشی نے سید محمد رضا گردیزی کو آگے کر دیا جو سید حامد رضا گیلانی سے شکست کھا گئے۔ شاہ محمود قریشی صوبائی 164 سے امیدوار تھے اور سجاد حسین قریشی کے فرزند نسبتی پیر احسن شاہ مخدوم آف شیر شاہ تحصیل ملتان سے صوبائی اسمبلی اور دوسرے پیر شجاعت حسنین قریشی میاں چنوں سے گیلانیوں سے طے شدہ معاہدے کے تحت الیکشن لڑ رہے تھے۔ صادق حسین قریشی کی طرف سے مخدوم سجاد حسین قریشی پر خاندانی دباؤ تھا کہ گیلانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جبکہ دوستی اور رفاقت کا معاہدہ گیلانی گروپ کا تقاضا تھا۔

پیپلز پارٹی کو داغ مفارقت دینے کے بعد قریشی خاندان نے اپنی تمام تر وفاداریاں ضیاء الحق کے پلڑے میں ڈال دیں۔ جب دسمبر 1984 ء کو ریفرنڈم ہوا تو اس کی حمایت کے لئے مخدوم سجاد حسین قریشی نے دن رات کام کیا۔ جب غیر جماعتی انتخابات کی کوکھ سے جنم لینے والی مسلم لیگ سامنے آئی جس کے قائد محمد خان جونیجو چنے گئے تو انہوں نے اپنی تمام تر ہمدردیاں اور تعاون مسلم لیگ کو پیش کر دیا جس کے صلہ میں انہیں پنجاب کی نشست سے سینیٹر اور بعد ازاں ڈپٹی چیئرمین سینٹ بنا دیا گیا۔ مسلم لیگ کی تنظیم اور صدارتی ریفرنڈم کی کامیابی کے لئے مخدوم سجاد حسین قریشی نے ان تھک کام کیا۔ ضیاء الحق نے انہیں پنجاب کا گورنر بنا دیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے نواب صادق حسین قریشی جو 1977 میں وزیر اعلیٰ پنجاب تھے اور پورے پنجاب میں ان کا طوطی بولتا تھا وہ ایک بار تو بلا مقابلہ رکن اسمبلی بھی بن گئے تھے۔ 1985 ء کے غیر جماعتی انتخاب میں انہیں چند ہزار ووٹ ہی مل سکے اور انہوں نے عوام کی اس سرد مہری کو دیکھ کر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ 1988 ء کے انتخاب میں مخدوم سجاد حسین قریشی کے صاحب زادے مرید حسین قریشی اور داماد مخدوم محمد احسن شاہ آف شیر شاہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بے نظیر نے وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھایا تو اسی دن پنجاب اسمبلی نے میاں نواز شریف کو قائد ایوان منتخب کر لیا۔ بے نظیر نے
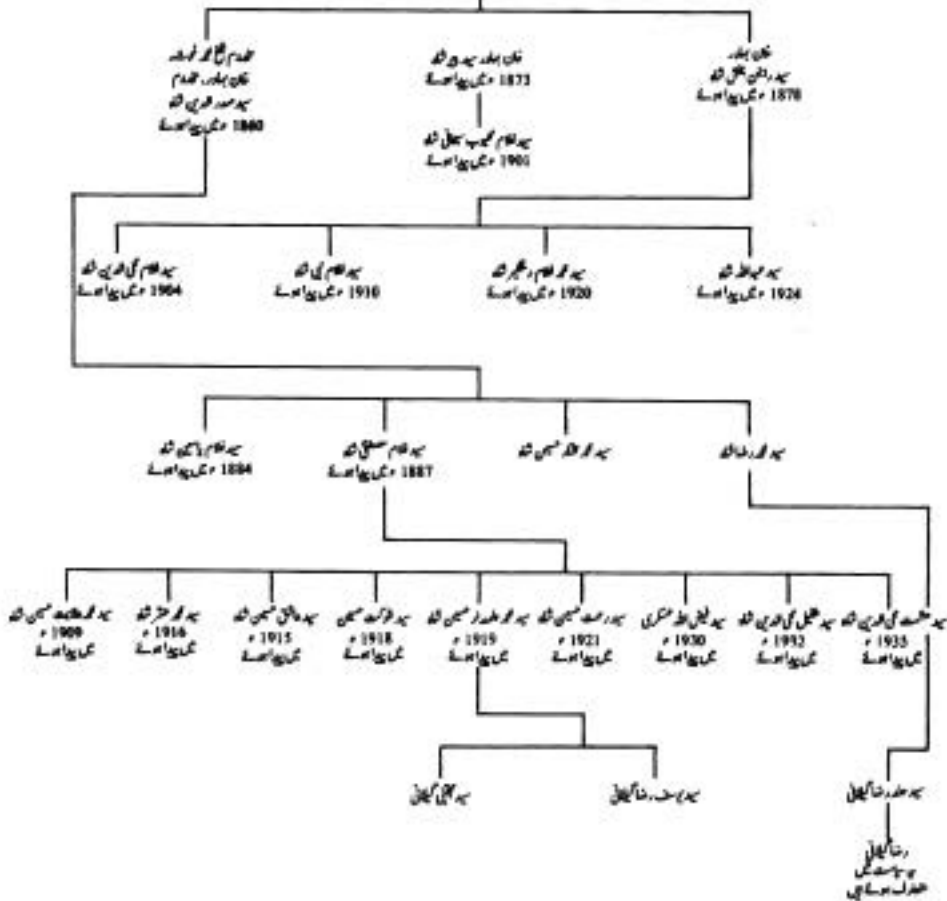
نواز شریف کا حلف رکوانے کے لئے مخدوم سجاد حسین قریشی پر زور دیا کہ وہ نواز شریف سے حلف نہ لیں۔ مخدوم سجاد حسین قریشی نے محترمہ بے نظیر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور نواز شریف سے حلف لے کر نواز شریف کے وفادار دوست ہونے کا ثبوت دیا۔ بعدازاں انہیں گورنر کے عہدے سے ہٹا کر ٹکا خان کو گورنر بنا دیا گیا۔ 1992ء کا سال قریشی خاندان کے لئے عروج کا باعث بن کر آیا جب ایک بار پھر ضلع کی قیادت قریشی خاندان کے ہاتھ آگئی۔ یہ قریشی خاندان کی فراست تھی کہ اس نے گیلانی خاندان کے یوسف رضا گیلانی اور حامد رضا گیلانی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کی سیاسی راہیں جدا کر دیں۔ اس وقت حامد رضا گیلانی اور مخدوم سجاد حسین قریشی دونوں حکمران جماعت میں ہیں۔ لیکن سیاست کے حوالے سے قریشی خاندان کا ستارہ عروج پر ہے۔ اس وقت شاہ محمود قریشی کو پنجاب کی وزارت میں اہم حیثیت حاصل ہے۔

ملتان کے گیلانی

پنجاب میں پیری مریدی اور سجادہ نشینی کے حوالے سے جن خاندانوں نے نام کمایا ہے، ان میں ملتان کے گیلانی نمایاں ہیں۔ گیلانی مخدوم زادے ملتان کی سیاست پر ایک صدی سے نمایاں رہے ہیں اور ضلع میں ان کے سیاسی حلیف اور حریف سابقہ حکومتوں میں اہم عہدوں اور وزارتوں پر فائز رہے۔ اس خاندان کا سلسلہ نسب شیخ محمد غوث" سے ملتا ہے جو پیر، پیراں کے نویں خلیفہ تھے۔ شیخ محمد غوث" سولہویں صدی میں ترکی سے ہجرت کر کے اوچ شریف میں آباد ہوئے۔ ان کے پڑپوتے کی اولاد میں سے نواب سید یحییٰ" اور نواب سید موسیٰ پاک دین" مغل بادشاہوں شاہ جہاں اور جہانگیر کے زمانے میں ملتان کے گورنر رہے۔ ان بادشاہوں نے گیلانی خاندان کی عزت و تکریم کے اعتراف کے طور پر 12,500 روپے سالانہ گرانٹ مقرر کی جو بعدازاں محمد غوث" دوم کے گدی نشین ہونے کے بعد شہنشاہ محمد شاہ نے اس میں اضافہ کر دیا۔

1848ء میں میجر ہربرٹ ایڈورسل نے جب ملتان فتح کیا تو اس مزار کے گدی نشین کو مزاروں کی حفاظت اور تعاون کے صلہ میں ایک سند عنایت کی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں مخدوم سید نور شاہ نے انگریز کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ ان کی جو مدد کی تھی انگریز سرکار اس سے بہت خوش تھی۔ 1859ء میں انہیں ایک سند عطا کی گئی جس میں 1857ء کی خدمات کو سراہا گیا۔ علاوہ ازیں انہیں 300 روپے کی خلعت بھی دی گئی۔ سر جان لارنس مخدوم سید نور شاہ کے بہت قریبی مداحوں میں شامل تھے۔ پیر سید ولائت شاہ کو 1876ء میں "گیلانی رئیس" قرار دے کر آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔

1878ء میں خان بہادر مخدوم صدرالدین گیلانی رئیس نامزد ہوئے تو انہیں ملتان کا درباری بھی بنا دیا گیا۔ علاوہ ازیں انہیں ملتان کے روسا میں اہم مقام حاصل تھا۔

1911ء میں شہنشاہ برطانیہ کی رسم تاج پوشی کے موقعہ پر ان کا تعارف شہنشاہ سے کرایا گیا اور ان کے خاندان کی انگریز دوستی کا تذکرہ بھی اس موقع پر خاص طور پر کیا گیا۔ 1916ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب اور جاگیر عطا کی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں دوستی کے اعتراف میں سونے کی گھڑی دی گئی۔ 1922ء اور 1927ء میں برصغیر میں اٹھنے والی سیاسی تحریکوں نے جب انگریز کو بہت زیادہ پریشان کر دیا تو برصغیر کے دوسرے جاگیرداروں اور روسا کی طرح خان بہادر مخدوم صدرالدین گیلانی نے بھی اپنے علاقے میں بدامنی ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جنگ عظیم میں گیلانی خاندان کا عملی تعاون انگریزوں کے لئے مشکل وقت میں غنیمت سے کم نہ تھا۔ مخدوم صدرالدین نے سلور جوبلی فنڈ میں 511 روپے جمع کرائے تھے۔ 1935ء میں انہیں سلور جوبلی میڈل انعام دیا گیا۔

ان کے دو بھائی بھی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ سید شیر شاہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے پر فائز رہے۔ جنگ عظیم دوم میں انہوں نے فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی بھی کرایا۔ اس موقعہ پر انہیں ریکروٹنگ بیج انعام میں دیا گیا۔ علاوہ ازیں دوستی کے ان رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے انگریز نے سید شیر شاہ گیلانی کو تلوار، سونے کی گھڑی اور خان بہادر کا خطاب دیا۔ ان کے دوسرے بھائی سید راجن شاہ 1921ء میں انڈین لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1936ء یعنی اپنی موت تک وہ اس کے ممبر رہے۔ وہ میونسپلٹی ملتان کے پہلے غیر سرکاری صدر تھے۔ ان کے بڑے بیٹے غلام محی الدین شاہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور دوسرے بیٹے مخدوم غلام نبی شاہ میونسپل کمشنر تھے۔

خان بہادر مخدوم صدرالدین شاہ کے چار صاحب زادے تھے۔ سید غلام یاسین شاہ میونسپل کمشنر، ایکسٹرا آنریری رسالدار اور آنریری مجسٹریٹ رہے۔ مخدوم سید مصطفیٰ شاہ ایچی سن کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ ان کے تیسرے صاحب زادے سید محمد مختار حسین شاہ 21 سال کی عمر میں فوت

ہوئے۔ سید مخدوم رضا شاہ ان کے ہونہار صاحب زادے تھے، وہ کئی سال تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر، آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر رہے۔ سید مصطفیٰ شاہ کے بڑے صاحب زادے ولایت حسین شاہ ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے ممبر، ڈائریکٹر کواپریٹو بنک، صدر انجمن اسلامیہ اور اسلامیہ ہائی سکول ملتان کے بانی رہے ہیں، قریشی اور گیلانی خاندان ایک صدی سے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہا ہے۔ مخدوم صدرالدین، مخدوم رضا شاہ، مخدوم ولائت حسین شاہ اور مخدوم علمدار حسین شاہ قریشی خاندان سے زور دار سیاسی مقابلے کرتے رہے ہیں، 1946ء میں قریشی خاندان یونینسٹوں کا ہم نوا تھا۔ ان انتخابات میں پنجاب کے سابق وزیر اعظم ملک خضر حیات ٹوانہ نے دونشستوں سے انتخاب لڑا اور دونوں نشستوں سے کامیاب ہوئے، جس میں ایک لینڈ لارڈ سیٹ ملتان کی تھی۔ گیلانی خاندان نے قریشیوں کی سیاسی مخالفت کے باعث تحریک پاکستان کا ہر مرحلے پر ساتھ دیا۔ گیلانی خاندان نے مسلم لیگ کے ٹکٹوں پر یونینسٹوں کا مقابلہ کیا۔ قریشی خاندان کے سربراہ نواب سر مرید حسین قریشی نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر شجاع آباد کی نشست سے انتخاب لڑا تھا مگر انہیں گیلانی خاندان کے سربراہ مخدوم سید محمد رضا شاہ نے شکست دی۔ اس سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر ای پی مون کو ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے چیئرمین کے انتخاب میں شکست دی تھی۔ وہ غالباً متحدہ پنجاب کے تمام اضلاع میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے واحد غیر سرکاری چیئرمین تھے۔

میجر عاشق حسین قریشی یونینسٹ پارٹی کے امیدوار تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلم لیگ کی طرف سے ملک محمد اکرم بوسن ستارہ قائداعظم تھے۔ یہ انتخابی معرکہ گیلانی خاندان کے لئے ایک چیلنج تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دولتانہ خاندان کے مقتدر افراد نے درپردہ یونینسٹوں کا ساتھ دیا۔ سردار شوکت حیات نے مسلم لیگی امیدوار کی انتخابی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ میجر عاشق حسین قریشی جیت گئے۔ اس کے بعد گیلانی خاندان اور مسلم لیگی زعماء نے ملک محمد اکرم بوسن کو انتخابی عذرداری دائر کرنے پر مجبور کیا۔ طویل سماعت کے بعد الیکشن ٹریبونل نے عذرداری منظور کرلی میجر عاشق حسین قریشی کی رکنیت کالعدم قرار دے دی گئی اور مسلم لیگی امیدوار کو کامیاب قرار دے دیا گیا۔

ضلع مظفر گڑھ سے میاں ابراہیم برق اور ضلع ڈیرہ غازی خان سے جمال خان

لغاری کامیاب ہوگئے۔ 1946ء میں خضر حیات ٹوانہ نے وزارت تشکیل دی تو میجر عاشق حسین قریشی کو ملتان سے وزیر بنا لیا گیا۔ 1951ء کے انتخابات میں گیلانی خاندان کے دو ارکان سید علمدار حسین گیلانی اور مخدوم ولایت حسین گیلانی پنجاب اسمبلی کے رکن چنے گئے۔ مخدوم سجاد حسین قریشی جو نواب مرید حسین قریشی کے اکلوتے بیٹے ہیں، صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار مخدوم ولایت حسین گیلانی سے شکست کھا گئے تھے تاہم ممتاز دولتانہ کو گیلانی خاندان کی سیاسی حیثیت کی بڑی قدر تھی۔ 1951ء کے انتخابات کے بعد جب انتخاب کا عمل شروع ہوا تو میاں ممتاز دولتانہ نے گیلانی خاندان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ایک تحریری معاہدہ قرآن کو گواہ بنا کر کیا۔ جب میاں ممتاز دولتانہ نے کابینہ تشکیل دی تو سید علمدار حسین کا نام اس وزارت میں شامل نہیں تھا بلکہ ان کے علاقائی حریف قریشی خاندان کے سیاسی حلیف سید علی حسن گردیزی کا نام وزارت میں شامل تھا۔ اس کے بعد گیلانی خاندان نے دولتانہ کی مخالفت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ 1953ء میں مرزائیوں کے خلاف پنجاب میں تحریک شروع ہوئی تو گیلانی خاندان دولتانہ کی مرزائی نواز پالیسیوں پر تنقید کرتا رہا۔ آخر کار 1953ء کے اوائل میں میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت کو جانا پڑا۔

1953ء میں ملک فیروز خان نون نے انہیں اپنی کابینہ میں شامل کر لیا لیکن پنجاب کے گورنر میاں مشتاق نے 1955ء میں ان کی وزارت کو برطرف کرکے سردار عبدالحمید دستی کو نئی کابینہ کی دعوت دی تو سید علمدار حسین گیلانی نئی کابینہ میں بھی شامل تھے۔ 1955ء کی پہلی دستوریہ میں جن بیس ارکان کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ سید علمدار حسین شاہ اس میں شامل تھے۔ آپ کے پاس صحت، بلدیات، سڑکوں اور تعمیرات کے محکمے رہے ہیں۔ پہلی دستوریہ میں سید علمدار حسین گیلانی کا نام وزیر مال محمد خان لغاری، عبدالمجید قریشی، محمد امین خان کانجو، دیوان غلام عباس اور ان کے بھائی سید رحمت حسین شاہ گیلانی نے تجویز کیا تھا۔ سید علمدار حسین گیلانی فیروز خان نون پر تنقید کرنے والوں میں شامل تھے۔ انہوں نے اس موقع پر ان کی برطرفی کو درست قرار دیتے ہوئے کہا کہ "پنجاب مسلم لیگ اور پارلیمانی نظام کو ڈسپلن کے تحت چلانے میں فیروز خان نون ناکام ہوگئے تھے۔ اب ملک صاحب کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنی برطرفی کے بعد پارٹی کے اتحاد کو

پاره پاره کرنے پر تلے رہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ یکم جون 1954ء کو ملک فیروز نون نے کراچی سے واپس آکر مشرقی پاکستان میں حق وزارت کی برطرفی کو مناسب ترین اقدام قرار دیا تھا۔ انہوں نے اس موقعہ پر مسلم لیگ میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنے کے لئے پارٹی کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ دوسری دستوریہ کے انتخابات میں برسر اقتدار خاندانوں کے بڑے بڑے برج الٹ گئے جن میں مغربی پاکستان کے سابق وزیر خوراک سید عابد حسین اور پنجاب کے سابق وزیر میجر مبارک شکست کھا گئے۔ وہاں ملتان کا گیلانی گجرات کا نوابزادہ اور ڈیرہ غازی خان کا لغاری خاندان بھی شکست سے نہ بچ سکا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ یہ خاندان جو ربع صدی سے اقتدار میں شامل رہے ہیں، پہلی مرتبہ اقتدار سے محروم ہو گئے۔ بلدیاتی سیاست میں گیلانی خاندان تو ناکام ہو گیا البتہ ضلع کی سیاست پر ان کے سیاسی حلیف کامیاب ہو گئے۔

اپنے گروپ کو ڈسٹرکٹ بورڈ کی صدارت دلوانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کے بڑے بھائی سید علمدار حسین گیلانی اس وقت وزیر صحت بلدیات اور سڑکوں کے وزیر تھے۔ ان کے گروپ کو پذیرائی حاصل نہ ہو سکی البتہ ان کا مخالف گروپ جو متحدہ محاذ کے نام سے انتخاب میں حصہ لے رہا تھا، خاطر خواہ کامیابی حاصل کر گیا۔ گیلانی پھر بھی چھوٹے گروپوں کو ساتھ ملا کر وہ ضلع کی قیادت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

گیلانی خاندان کی طرف سے ہونے والی مبینہ دھاندلیوں کے خلاف سید علی حسین گردیزی کی قیادت میں جلوس نکالا گیا اور ہونے والی ناانصافی پر احتجاج کیا۔ مخدوم سجاد حسین قریشی، پیر ظہور الدین ایم۔ ایل اے، حاجی ریحان ایم۔ ایل۔ اے، کیپٹن قطب الدین بودلہ ایم۔ ایل اے، سردار رحیم بخش میاں ایم۔ ایل۔ اے چوہدری محمد حنیف ایم۔ ایل۔ اے راؤ عبدالرحمان اور قسور گردیزی نے حکومتی مداخلت کی مذمت کی۔ وزیر اعلیٰ سردار عبدالحمید دستی نے یقین دلایا کہ وہ وزیر بلدیات سید علمدار حسین شاہ پر لگائے گئے الزامات کی تحقیقات کریں گے۔

جب ڈاکٹر خان صاحب نے ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی تو گیلانی خاندان اس میں شامل ہو گیا۔

1955ء کے بلدیاتی انتخابات میں سید رحمت حسین گیلانی 3 مارچ 1956ء کو

جب ملتان پہنچے تو سید رحمت حسین گیلانی ان کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھے کیونکہ سردار عبدالرب نے اپنے بیٹے مجید نشتر کی شادی ملتان کے مرحوم کرنل مقبول کے برادر عاشق حسین مرحوم کی لڑکی سے کی تھی۔

گیلانی خاندان 1958ء تک ون یونٹ پارٹی میں ہی شامل رہا۔ مخدوم سید علمدار حسین شاہ ایبڈو ہونے کی وجہ سے سیاست سے نااہل ہو گئے تو انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی سید رحمت حسین گیلانی کو کنونشن لیگ میں شامل کرا دیا۔

ایوب خان نے جب مارشل لاء نافذ کیا تو ان کا پہلا ٹارگٹ جاگیرداروں کے سیاسی اثر و رسوخ کا خاتمہ تھا۔ جب زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا اور گیلانی خاندان کا بہت سا رقبہ زرعی اصلاحات کی زد میں آ گیا تو مخدوم علمدار حسین گیلانی نے اپنے رقبے کو زرعی اصلاحات سے بچانے کے لئے مارشل لا کے نفاذ سے پہلے کی تاریخیں ڈال کر محکمہ مال کے کاغذات میں ردوبدل کر کے دو ہزار تین سو ستائیس ایکڑ اپنے والد بہن اور کم سن بچے کے نام منتقل کر دی۔ اس طرح سجادہ نشین کے چچا زاد مخدوم غلام قاسم شاہ نے بھی جو سابق عوامی لیگ کی مقامی شاخ کے صدر تھے، نے وسیع رقبہ اپنی بیوی، بیٹوں اور بھتیجوں کے نام منتقل کر دیا۔ مارشل لا حکام نے محکمہ مال کے ریکارڈ میں ہیرا پھیری کرنے کے جرم میں مخدوم علمدار حسین اور مخدوم غلام قاسم کو دو، دو سال قید بامشقت اور انیس انیس ہزار جرمانہ کی سزا سنائی۔

بعد ازاں مخدوم علمدار حسین گیلانی کو ایبڈو کے تحت 31 دسمبر 1966ء تک سیاست سے نااہل قرار دے دیا۔ 1962ء کے غیر جماعتی انتخابات میں گیلانی خاندان کے ابھرتے ہوئے نوجوان حامد رضا گیلانی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مخدوم حامد رضا گیلانی مخدوم محمد رضا گیلانی کے صاحب زادے ہیں، وہ بھی اپنے سیاسی حریف قریشی خاندان کے ساتھ زبردست سیاسی معرکے کرتے رہے ہیں۔ بلدیاتی سیاست میں انہوں نے قریشی خاندان کو ابھرنے کا موقعہ نہ دیا۔ مخدوم حامد رضا گیلانی 1936ء کو پیدا ہوئے اور ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی۔ جب برطانیہ میں زیر تعلیم تھے اور کانگو کا مسئلہ زیر بحث آیا تو آپ اس دوران اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ میں بھی کام کرتے رہے۔

1965ء میں انہوں نے کنونشن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی میں دوبارہ کامیابی حاصل کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے انہیں 1962ء میں پارلیمانی سیکرٹری بنوایا تھا۔ 1965ء کے انتخابات کے بعد ایوب خان نے جب ۱۶ پارلیمانی سیکرٹریوں کا اعلان کیا تو حامد رضا گیلانی کا نام ان میں شامل نہیں تھا۔ پارلیمانی سیکرٹریوں کے تقرر کے تین دن بعد جب ایوب خان غیر ملکی دورے پر روانہ ہونے کے لئے چکلالہ ایئرپورٹ پہنچے تو انہیں الوداع کہنے والوں میں حامد رضا گیلانی بھی شامل تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنے یار خاص حامد رضا گیلانی کی سفارش کے لئے ایوب خان سے ملے۔ ایوب خان نے حامد رضا گیلانی کو پارلیمانی سیکرٹری بنانے کی حامی بھرلی اور جاتے ہوئے ہدایت کر گئے کہ ان کے نام کا بھی نوٹیفکیشن جاری کر دیا جائے۔ اس طرح حامد رضا گیلانی دوبارہ پارلیمانی سیکرٹری بنائے گئے۔ بھٹو کی ایوب خان سے علیحدگی ہوئی تو حامد رضا گیلانی کنونشن مسلم لیگ میں ہی شامل رہے اور انہوں نے جواز یہ پیش کیا کہ وہ اپنے مخالف گروپ (قریشی) کی موجودگی میں مسلم لیگ سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مغربی پاکستان کے گورنر امیر محمد خان، گیلانی خاندان کی نسبت قریشی خاندان پر زیادہ مہربان تھے۔ انہوں نے صادق حسین قریشی کو ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کا چیرمین نامزد کر دیا۔ گیلانی بلدیاتی سیاست میں قریشیوں کے مقابلے میں ہمیشہ نمایاں رہے ہیں۔ 1965ء کے انتخابات میں مخدوم حامد رضا گیلانی کی کوشش تھی کہ حلقہ خانیوال سے ان کے دوست اور گیلانی گروپ کے وفادار ساتھی پیر ثناءاللہ بودلہ کو ٹکٹ مل جائے تاکہ وہ صادق حسین قریشی پر سیاسی برتری حاصل کر سکیں جو 1951ء کے انتخابات سے سیاست میں سرگرم ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ 1951ء میں ان کے کاغذات نامزدگی کم عمر ہونے کی وجہ سے مسترد ہو گئے تھے۔ 1965ء میں حامد رضا گیلانی کو اس وقت سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب نواب آف کالا باغ نے انہیں صوبائی ٹکٹ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ملتان ڈسٹرکٹ بورڈ کا وائس چیرمین بھی نامزد کر دیا۔ گیلانی گروپ نے اپنے مخالفوں کو نیچا دکھانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ڈسٹرکٹ کونسل ملتان کے چیف افسر ملک رحیم بخش بچہ جو کہ سابق صوبائی وزیر خدا بخش بچہ کے بھائی تھے، کے ذریعے نواب صادق کو ناکام بنانے کی بڑی سرگرمی دکھائی مگر وائس چیرمین نواب صادق حسین قریشی کے جاگیردارانہ مزاج کے سامنے رحیم بخش

کی دال نہ گلی۔ ضلع ملتان سے 1965ء میں قریشی اور گیلانیوں کو جو ٹکٹ جاری ہوئے تھے، ان میں تھوڑے بہت ردوبدل کے بعد سید رحمت حسین گیلانی جو کہ سید علمدار حسین کے ایبڈو ہو جانے کی وجہ سے کنونشن لیگ کے لئے گیلانی خاندان کی نمائندگی کرتے رہے ہیں، نے اپنا نام واپس لے لیا۔ اس کے علاوہ کبیروالہ سے محمد اقبال، ہراج، تحصیل خانیوال سے صادق حسین قریشی اور میلسی سے مسٹر اللہ یار لنگڑیال نے بھی اپنے نام صوبائی نشست سے واپس لئے تھے۔ اس طرح قریشی اور گیلانی ایک سیاسی جماعت میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی جنگ لڑتے رہے اور انہوں نے مخالفوں کی کمزوریوں کو خوب اچھالا۔ 16 مارچ 1968ء کو ایوب خان نے ملتان آنا تھا لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ ملتان نہ پہنچ سکے۔ اس روز بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کا جلسہ تھا۔ اس جلسہ میں حامد رضا گیلانی نے رشوت ستانی کے بڑھتے ہوئے رجحانات پر افسوس کا اظہار کر دیا۔ حامد رضا گیلانی کے مخالفین نے طوفان کھڑا کر دیا کہ حامد رضا گیلانی حکومت کے مخالف ہو گئے ہیں۔ ان دنوں بھٹو ایوب خان سے الگ ہو چکے تھے اور مخالف ایوب خان کو یہ تاثر دیتے رہے کہ حامد رضا گیلانی ذہنی طور پر بھٹو کے ساتھ ہیں۔ مخالفوں کے پروپیگنڈے سے خائف ہو کر حامد رضا گیلانی ملک سے باہر چلے گئے اور اس وقت تک واپس نہ آئے جب تک گیلانی خاندان کے سربراہ مخدوم علمدار حسین گیلانی نے ایوب خان کا دل صاف نہ کر دیا۔ جب بھٹو احتجاجی تحریک میں کامیاب ہو گئے تو مارچ 69ء میں بھٹو سے ملتان کے دورے کے دوران بند کمرے میں خاموشی سے ملے۔

پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے بھی ملتان کے نوابوں اور جاگیرداروں کی روائتی خاندانی اور گروہی سیاست عروج پر رہی۔ ہمیشہ سیاست میں گیلانی اور قریشی ہی کامیاب ہوتے رہے ہیں۔

1970ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی قائم کر کے ایوب خان کے خلاف ایک زور دار تحریک چلائی تو ایوب خان عوامی مزاحمت کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے مستعفی ہو گئے۔ مخدوم علمدار حسین گیلانی اپنے برادر نسبتی مخدوم حسن محمود سابق وزیر اعلیٰ بہاولپور کے ہمراہ مسلم لیگیوں کے اتحاد و ادغام کے لئے کوشاں ہو گئے۔ انہوں نے دونوں صوبوں کے بہت سے علاقوں کا دورہ کیا مگر کنونشن لیگ اور کونسل مسلم لیگ میں سے کسی

نے بھی مخدوم زادہ حسن محمود اور سید علمدار حسین گیلانی کو اہمیت نہ دی۔ پیپلز پارٹی کے جیالوں نے پارٹی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں گیلانیوں اور قریشیوں کی مذاحمت کا سامنا کیا تھا کیونکہ یہ دونوں خاندان کونسل مسلم لیگ اور مسلم لیگ (قیوم گروپ) میں شامل تھے۔ نواب صادق حسین قریشی کونسل مسلم لیگ میں اس لئے شامل نہ ہوئے کہ کونسل مسلم لیگ نے ان کے دست راست سید رضی شاہ گردیزی کو صوبائی ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ صادق حسین قریشی نے کونسل مسلم لیگ سے ناراضگی سید رضی گردیزی کو ٹکٹ نہ دینے کی وجہ سے مول لی تھی اور اس طرح صادق حسین قریشی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ سید علمدار حسین شاہ گیلانی کو انہوں نے شکست دے کر برسوں پرانی پے در پے خاندانی شکستوں کا بدلہ گیلانی خاندان سے لے لیا۔

دوسرا سیاسی دھچکا گیلانی خاندان کو شجاع آباد کی نشست پر لگا جب سید علمدار حسین گیلانی کے کزن حامد رضا گیلانی پیپلز پارٹی کے تاج احمد لون سے شکست کھا گئے۔ ان کے سیاسی حلیف اکرم بوسن جو قیام پاکستان سے لے کر آج تک گیلانی خاندان کے ساتھ قدم بقدم چلتا رہا ہے، وہ بھی 1970 ء کے انتخابات میں شکست سے دوچار ہو گئے۔

قریشی خاندان کو سیاسی طور پر گیلانیوں پر سبقت 1972 ء کے بعد ملی جب پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالا کیونکہ گیلانی پانچ سال کے لئے ملتان کے سیاسی منظر سے دور چلے گئے تھے۔ بھٹو کی سید حامد رضا گیلانی سے ذاتی دوستی بھی رہی ہے۔ حامد رضا گیلانی 1969 ء میں پیپلز پارٹی میں شامل ہونا چاہتے تھے لیکن ان کے خاندانی سربراہ سید علمدار حسین گیلانی نے انہیں پیپلز پارٹی میں شمولیت کو عملی جامہ نہ پہنانے دیا۔ شکست کے بعد حامد رضا گیلانی کچھ عرصہ پس منظر میں رہے اور پھر بھٹو کی دوستی کام آئی۔ انہوں نے اسے کینیا میں سفیر بنا دیا اور یوں گیلانی خاندان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا۔

1977 ء کے انتخابات میں سید حامد رضا گیلانی، ناصر علی رضوی قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی میں گیلانی گروپ اپنے حریف گروپ کے مقابلے میں زیادہ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ صوبائی انتخابات میں قریشی خاندان کے سرخیل صادق حسین قریشی جو اس وقت وزیر اعلیٰ بھی تھے، بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ مخدوم حامد رضا گیلانی نے چند سالوں میں ہی پیپلز پارٹی میں ایک مضبوط لابی قائم کر لی تھی۔ گیلانی خاندان میں سے

مخدوم حامد رضا گیلانی قومی اور فیض مصطفےٰ گیلانی کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ ملا تھا۔

ملتان کے حلقہ نمبر 164 ملتان 8 سے مخدوم رشید سے پیپلز پارٹی کے امیدوار سید محمد رضی شاہ گردیزی امیدوار تھے اور یہ قریشی گروپ کے سب سے بااثر ساتھی تصور کئے جاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں شیخ خلیل تھے جو علاقے کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ سید رضی شاہ گردیزی نے پارٹی ہائی کمان سے شکایت کی تھی کہ مخدوم حامد رضا گیلانی قومی اتحاد کے امیدوار کی حمایت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ساجد پرویز جو مخدوم حامد رضا گیلانی کے مقابلہ میں قومی اتحاد کے امیدوار تھے، انہیں اندرون خانہ قریشی خاندان کی حمایت حاصل تھی۔ پیپلز پارٹی نے جب 1977 ء کے انتخابات بھاری اکثریت سے جیت لئے تو حامد رضا گیلانی نئی وزارت میں وزیر صنعت تھے۔ ملتان کی سیاست میں اب غلام مصطفےٰ کھر کی رائے کو بھی بہت اہمیت ملنے لگی تھی۔

مصطفےٰ کھر نے 1977 ء کے انتخابات میں سابق وزیر اعلیٰ صادق حسین قریشی سے ملتان کی سیاست پر مضبوط گرفت قائم رکھنے کے لئے ایک سمجھوتہ بھی کیا تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسٹر غلام مصطفےٰ کھر حامد رضا گیلانی کی انگلی پکڑ کر سیاست میں آئے تھے۔ اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور مسٹر غلام مصطفےٰ کھر اسی کی وساطت سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے متعارف ہوئے تھے۔ نیرنگی سیاست دوراں میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سید حامد رضا گیلانی مسٹر کھر سے سیاسی حوالے سے کوسوں پیچھے رہ گئے۔

جب قومی اتحاد نے پیپلز پارٹی کے خلاف زور دار تحریک چلانے کا اعلان کر دیا اور ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیپلز پارٹی کے خلاف احتجاج زور پکڑ گیا تو سجاد حسین قریشی اور حامد رضا گیلانی پیپلز پارٹی کے معاملات سے الگ ہو کر خاموش بیٹھ گئے اور انہوں نے پیپلز پارٹی کی سیاست میں اہم رول ادا نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اکتوبر 1977 ء میں انتخابات کا اعلان ہوا تو حامد رضا گیلانی کی جگہ پیپلز پارٹی نے سابق وزیر اعلیٰ صادق حسین قریشی ۔ مخدوم سجاد حسین قریشی کی جگہ پیپلز پارٹی نے عبدالرحمان واہلہ کو ٹکٹ دیا۔ ناصر رضوی نے بھی پارٹی چھوڑ دی اور ان کی جگہ تنویر الحسن گیلانی کو ٹکٹ دیا

گیا۔

1977ء کے مارشل لا کے نفاذ نے جب سیاسی عمل کو معطل کر دیا تو دونوں خاندان خاموش ہو گئے۔ ضیاء الحق نے بلدیاتی سیاست کے ذریعے نئی قیادت سامنے لانے کا عزم کیا تو قریشی اور گیلانی ایک بار پھر میدان سیاست میں کود پڑے۔ 1979ء کو بلدیاتی انتخابات میں گیلانیوں اور قریشیوں کے علاوہ ایک اور مضبوط گروپ فخر امام بلدیاتی سیاست کے ذریعے ابھر کر سامنے آیا۔ حامد رضا گیلانی نے فخر امام کو ضلع کی سیاست سے آؤٹ کرنے کے بڑے جتن کئے جس میں حامد رضا گیلانی ایک ووٹ کی برتری سے ضلع کونسل ملتان کے چیرمین منتخب ہو گئے۔ بعد ازاں ان کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ملتان کی سیاست میں ایک حیرت انگیز واقعہ گیلانیوں اور قریشیوں کا اتحاد تھا۔ جو فخر امام کے چیرمین بن جانے کی وجہ سے سامنے آیا تھا۔ دونوں خاندانوں نے برسوں پرانی رقابتیں مٹا دیں اور ایک پلیٹ فارم پر فخر امام کا مقابلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے۔ مخدوم سجاد حسین قریشی نے بھی اپنے بڑے بیٹے مخدوم شاہ محمود قریشی کو 1983ء تک انتخاب کے لئے تیار کیا تاکہ غیر سیاسی ماحول میں ضلع ملتان کی سیاست پر کردار ادا کیا جائے۔ بدقسمتی سے مخدوم شاہ محمود قریشی ضلع کونسل کے ممبر بھی منتخب نہ ہو سکے اور اس طرح قریشیوں اور گیلانیوں نے قتال پور کے سید خاندان کو شکست دے کر سید علمدار حسین شاہ کے صاحب زادے یوسف رضا گیلانی کو ضلع کونسل ملتان کا چیئرمین بنا دیا۔

قریشیوں اور گیلانیوں کا یہ اتحاد 1985ء تک قائم رہا۔ دونوں خاندانوں نے مل کر صدارتی ریفرنڈم کو کامیاب بنانے کی کوششیں کی تھی۔ یوسف رضا گیلانی کو مجلس شوریٰ کا رکن بھی نامزد کر دیا گیا تھا۔ بھٹو نے قریشیوں اور گیلانیوں کے بارے میں اپنی حکومت کے آخری دنوں میں کہا تھا کہ میری مرکزی اور صوبائی حکومت میں ملتان ہی ملتان نظر آتا ہے۔ ان کا اشارہ قریشی اور گیلانی خاندانوں کی طرف تھا۔

پیپلز پارٹی نے جب غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کیا تو سید حامد رضا گیلانی نے یہ کہہ کر اس میں حصہ لیا کہ پیپلز پارٹی کا کوئی لیڈر پاکستان میں ہی نہیں ہے اور کوئی بھی محب وطن اپنے اندرونی معاملات اور داخلی سیاست میں بیرونی اثر قبول نہیں کر سکتا اور یوں حامد رضا گیلانی مارشل لا حکومت سے وابستہ ہو گئے۔

حامد رضا گیلانی ایک ایسی پرکشش سیاسی شخصیت ہیں جس کے پنجاب کے بڑے بڑے سیاسی گھرانوں سے قریبی تعلقات ہیں 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں جب پیپلز پارٹی نے ان میں حصہ نہ لیا اور خود مسلم لیگ باہمی انتشار کا شکار تھی تو انہوں نے آگے بڑھ کر پنجاب کی قیادت کے لئے اپنا ایک مضبوط گروپ تشکیل دینا شروع کیا تو ان کے خاندانی حریف صادق حسین قریشی کو گیلانی خاندان کی برتری کی فکر لاحق ہوئی اور وہ بھی سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ صادق حسین قریشی مخدوم حامد رضا گیلانی سے براہ راست قومی اسمبلی کے انتخابات میں اتر آئے۔ دوستوں کے سمجھانے پر انہوں نے اپنا نام واپس لے لیا اور اپنے دست راست سید رضی حسین گردیزی کو ان کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ یہ پہلا الیکشن تھا کہ قریشی گروپ انتشار کا شکار ہوا۔ سجاد حسین قریشی، پیر شجاعت حسین قریشی اور ریاض قریشی نے گیلانی گروپ سے اتحاد کر لیا تھا۔ اس طرح مجبوراً صادق حسین قریشی کو فخر امام کا سہارا تلاش کرنا پڑا۔ اس طرح گیلانی اور قریشی گروپ نے مل کر 1985ء کے انتخابات میں برتری حاصل کی۔ گیلانی خاندان اور قریشی خاندان مسلم لیگ میں اکٹھے گئے تھے۔ محمد خان جونیجو نے یوسف رضا گیلانی کو وفاقی وزیر بنا لیا تھا۔ انہوں نے مسلم لیگ کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1985ء میں جب انہیں وزارت میں لیا گیا تو انہیں مخدوم حامد رضا گیلانی پر فوقیت دی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ گیلانی خاندان کے چچا بھتیجا میں پہلی بار اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ مخدوم حامد رضا گیلانی نے ہمیشہ سید علمدار حسین گیلانی کے سیاسی فیصلوں کو تسلیم کیا تھا۔

یہاں تک کہ وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہونا چاہتے تھے اور خاندانی اتحاد کی خاطر وہ اس میں شامل نہ ہوئے۔ جب یوسف رضا گیلانی وفاقی وزیر تھے تو ان کے بارے میں اس طرح کی افواہیں گردش کرتی رہی ہیں کہ انہیں صوبائی قیادت سونپی جا رہی ہے۔ میاں نواز شریف سے ان کا اختلاف چوہدری پرویز الٰہی سے ذاتی مراسم کی وجہ سے ابھرا تھا۔ ان دنوں پرویز الٰہی کے بارے میں اس طرح کی قیاس آرائیاں گردش کرتی رہی تھی کہ پرویز الٰہی میاں نواز شریف کی جگہ لینے والے ہیں۔ جب محمد خان جونیجو کی کابینہ کو برخاست کیا گیا تو چند دنوں بعد یوسف رضا گیلانی نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1987ء کے بلدیاتی انتخابات میں قریشی اور گیلانی خاندان ایک دوسرے کے خلاف پھر صف آرا تھے۔ خانیوال

ضلع بن جانے سے فخر امام ضلع کی سیاست میں اہم کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے گیلانی اور قریشی ایک بار پھر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے تھے۔

نیشنل پیپلز پارٹی کی جب بنیاد پڑی تو مخدوم حامد رضا گیلانی اس کے سینئر عہدے دار تھے۔ بعد ازاں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1988 ء میں انہوں نے خاندان کے اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے انتخاب میں حصہ نہ لیا۔ 1990 ء کے مڈ ٹرم انتخاب میں وہ اپنے بھتیجے یوسف رضا گیلانی سے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر ناکام ہو گئے۔

1991 ء کے بلدیاتی انتخابات نے بھی دلچسپ صورت اختیار کر لی۔ پیپلز پارٹی کے یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی نے ضلع کونسل کی قیادت کے لئے مشترکہ جنگ لڑی کیونکہ یوسف رضا گیلانی نے اپنے بھائی مجتبیٰ گیلانی اور حامد رضا گیلانی نے اپنے بیٹے رضا گیلانی کو سیاست میں ابھارنے کی کوشش کی تاکہ ملتان کی قیادت پر دونوں خاندانوں کی برتری قائم رہے۔ البتہ ضلع کی قیادت پر مخدوم شاہ محمود قریشی گروپ کا غلبہ ہو گیا۔

گردیزی سید آف ملتان

- ابوالفضل علی گردیزی سید محمد یوسف شاہ
  - سید حسین
    - سید جعفر شاہ
      - تین نسلیں
        - سید محمود شاہ 1905 ء میں فوت ہوئے
          - محمد حسین شاہ
            - تین نسلیں
    - محمد یوسف
      - عبداللہ شاہ
        - قربان علی شاہ
          - زین العابدین شاہ
            - کلب شاہ
              - چار نسلیں
            - محمد شاہ 1897 ء میں فوت ہوئے
              - مراد شاہ 1876 ء میں فوت ہوئے
                - خان بہادر حسن علی
                  - زمرد حسین شاہ 1913 ء میں فوت ہوئے
                    - محمد عبدالجلیل شاہ 1908 ء میں پیدا ہوئے
                      - محمد اظہر سید قریشی شاہ
                  - محمد نواز شاہ
                    - سات نسلیں
                  - الطاف حسین شاہ
                    - چار نسلیں
      - حامد شاہ
        - تین نسلیں
          - حامد شاہ
            - یوسف شاہ
              - علاؤالدین شاہ
            - غلام مصطفیٰ شاہ
      - مخدوم شیخ محمد راجو
        - مخدوم شیخ محمد یوسف
          - مخدوم شیخ محمد راجو
          - عبدالہادی شاہ
            - تین نسلیں
          - بہاول شاہ
            - پانچ نسلیں
              - شیخ محمد یوسف
                - اکبر علی شاہ
                  - محمد یوسف
                    - مخدوم شیخ محمد راجو 1928 ء میں فوت ہوئے
                      - مظفر علی شاہ 1893 ء میں پیدا ہوئے
                    - امیر حیدر شاہ
                      - دو نسلیں
                - مخدوم محمد راجو
                - نذر علی شاہ
                  - محمد علی شاہ
                  - ولایت شاہ
                    - مظفر علی شاہ
                      - سید تنویر گردیزی 1922 ء میں پیدا ہوئے
              - باقر شاہ
                - پانچ نسلیں
              - نور شاہ
                - چار نسلیں
              - دوست علی شاہ
                - پانچ نسلیں
              - غلام حیدر شاہ
                - پانچ نسلیں
              - یاسین شاہ
                - پانچ نسلیں

تحصیل خانیوال میں مقیم ہیں۔ وہ بھی اسی قبیلے کی ایک شاخ ہے جس کی معروف ترین شخصیت مخدوم مراد شاہ تھے۔ وہ بہاولپور ریاست کے چیف جج بھی رہے ہیں 1848 ء میں جب انگریزوں پر چڑھائی کر کے ان کا محاصرہ کیا تو انہوں نے اس دوران انگریزی فوج کی بڑی مدد کی۔ چودہ سال کی نوکری میں انہوں نے نمایاں ترین عہدوں پر کام کیا۔ بعدازاں انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا انہیں ایک سند اور خلعت جس کی مالیت دو سو روپیہ تھی، 1857 ء کی سروسز کے بعد دی گئیں۔

1865 ء میں وہ بہاولپور میں انگریزوں کے سیاسی نمائندے اور سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

1870 ء میں جب چیف کورٹس کی بنیاد رکھی گئی تو مراد حسین شاہ اس کے چیف جج مقرر ہوئے۔ بعدازاں وہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آف سٹیٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1872 ء میں جب وائسرائے نے ملتان میں دربار منعقد کیا تو اس میں مراد حسین کو 800 روپے کے برابر خلعت دی گئی۔ جج کی حیثیت سے انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں اس کے صلے میں 1874 ء میں ان کی تنخواہ میں ایک ہزار روپے سالانہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ 1876 ء میں ان کی موت کے بعد ان کی بیوہ اور بیٹے کو 6000 روپے کی گرانٹ دی گئی۔ ان کے اکلوتے بیٹے خان بہادر حسن بخش اپنے باپ کی موت کے وقت صرف چندرہ سال کے تھے ان کی کم سنی کے باعث ان کی جاگیر کورٹ آف وارڈ کی نگرانی میں چلی گئی اور اس کے بعد وہ ملتان منتقل ہو گئے اور کئی سال تک میونسپل کمیٹی ملتان کے نائب صدر رہے۔ وہ آنریری مجسٹریٹ اور صوبائی درباری بھی رہے۔ 1899 ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔

حسن بخش ادبی ذوق کے مالک تھے اور انہوں نے ایران اور کئی ملکوں کی سیاحت کی اور انہوں نے اپنے سفرنامے کی دو کتابیں لکھیں۔ 1911 ء میں جشن تاج پوشی کے موقع پر شاہی مہمانوں میں ان کا نام بھی شامل تھا اور انہیں تاج پوشی ایوارڈ دیا گیا۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم میں چار ہزار اور دوسری جنگ عظیم میں آٹھ ہزار قرضہ دیا اور 25 سپاہیوں کو انہوں نے بھرتی کرایا۔

تحریک عدم تعاون کے دوران انگریزوں کے مدد گاروں کی بننے والی ایسوسی ایشن

ملتان کے گردیزی

گردیزی سید ملکی اور سیاسی اعتبار سے ضلع ملتان کی بااثر فیملی ہے۔ تحصیل کبیروالا میں ہر طرف ان کا رقبہ پھیلا ہوا ہے۔ راوی کے کٹاؤ نے گردیزیوں کی زمینوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اس تباہی کے ساتھ ہی گردیزیوں کا زوال شروع ہو گیا گردیزی اپنا تعلق حضرت امام حسینؓ سے جوڑتے ہیں اور شیعہ مسلک سے وابستہ ہیں ان کا خاندان بغداد سے نقل مکانی کر کے ملتان آیا تھا۔ ان کے بزرگ حضرت سید محمد وتیلؒ جو حضرت امام حسینؓ کے پڑپوتے تھے، ان کا سلسلہ نسب یہاں سے شروع ہوتا ہے ان کے بیٹے سید محمد علیؒ نے مدینہ سے بغداد میں نقل مکانی کی تھی اور ان کے پوتے عبدالفضل جمال الدین محمد یوسفؒ نے 1088 ء میں بغداد سے ملتان کی طرف ہجرت کی تھی۔ انہوں نے اپنی بزرگی کے کرشموں سے نمایاں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کی وفات 1137 ء میں ہوئی ملتان میں آج بھی ان کے مزار کو بہت فضیلت حاصل ہے انہوں نے شیر سواری اور سانپوں پر حکمرانی کے حوالے سے شہرت حاصل کی تھی ان کی موت کے چالیس سال پر ان کے مزار سے ان کا پنجہ نمایاں طور پر دیکھا گیا تھا۔

ان کے بڑے بیٹے سید افضل شاہ جوانی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کے دو لڑکے بہت چھوٹے تھے۔

شیخ محمد یوسف نے جنگ عظیم میں انگریزوں کی مشکل وقت میں بڑی مدد کی تھی۔ انہیں جنگ عظیم کا اعزازی میڈل بھی دیا گیا۔ مخدوم شاہ محمد راجو جو کہ امیر حیدر شاہ کے بھائی تھے، وہ امیرپور تحصیل کبیروالا میں مستقل رہائش پذیر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ زمینوں پر مرکوز کر کے علاقے کی زرخیز ترین زمینوں میں شامل کر دیا کارائی بلوچ

کے حصہ بنے تھے۔ جس نے [illegible] تحقیق شیعہ کے مختلف عقائد [illegible] تھے۔ [illegible] ان [illegible] بحث کی نوبت آئی۔ جس نے [illegible] [illegible] ہو گئے۔

ان کے بڑے بیٹے سید [illegible] حسین شاہ [illegible] کے [illegible] ایک [illegible] بیٹے کو چھوڑ کر فوت ہو گئے۔ محمد عبد [illegible] حسین شاہ [illegible] میں اپنے دو [illegible] خان بہادر [illegible] کے بعد [illegible] کامیاب ہو گئے۔

جس نے [illegible] کالج میں [illegible] سات سال اور پانچ سال انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی۔

خان بہادر کے دوسرے بیٹے محمد نواز شاہ ایڈیشنل اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور جس نے جنگ عظیم کے دوران بڑا کام کیا۔

ان کے تیسرے بیٹے سید محمد حسین شاہ پولیس میں تھانیدار تھے اور ان کے بیٹے عباس حسین شاہ پنجاب شیعہ کانفرنس کے صدر تھے۔ محمد یوسف حق آٹھویں نسل سے ہیں ان کی شادی سید عبدالفتح سے ہوئی جن کا سلسلہ نسب حضرت امام حسینؓ کے ایک اور پوتے زید شہید سے ملتا تھا۔ محمد یوسف سوم گردیزی حزاروں کے گدی نشین مقرر ہوئے۔

مغلیہ عہد میں ان کو بڑی عزت افزائی اور پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور خاص طور پر اورنگ زیب نے گردیزی سجادہ نشین کی درخواست پر ملتان کا دورہ کیا تھا۔ 1928ء تک مخدوم شیخ محمد راجو گردیزی حزاروں کے محافظ تھے۔ انہیں انگریز کے زمانہ میں ڈوژنل درباری اور آنریری مجسٹریٹ کی حیثیت حاصل تھی اور وہ تیس سال تک میونسپل کمیٹی ملتان اور ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان کے ممبر رہے۔ وہ 1910ء میں میونسپلٹی کی ممبر شپ سے مستعفی ہو گئے۔ ان کو 100 روپے مالیت کی جاگیر اور سات مربعے اراضی چناب کالونی میں الاٹ کی گئی۔ وہ 1928ء میں فوت ہو گئے۔

ان کے بیٹے محمد یوسف ان کے بعد گردیزی حزاروں کے محافظ بنے۔ اپنے باپ کی موت کے بعد اور ان کی خاندانی تکریم کے باعث انہیں ڈوژنل درباری اور آنریری مجسٹریٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ مخدوم محمد یوسف گردیزیوں کی ایک اور لڑی کا تعلق فتح شاہ (جو کہ

غلام مصطفٰے شاہ کے بیٹے تھے) سے ہے۔ حامد شاہ جو کہ فتح شاہ کے بھائی تھے. ڈوژنل درباری تھے۔ ان کی موت 1900ء میں واقع ہوئی۔

گردیزیوں کا ایک اور سلسلہ کبیر والہ تحصیل میں کوہنہ خاندان سے ہے۔ ان کا رئیس حیدر شاہ تھا۔ وہ ذیلدار اور صوبائی درباری تھے۔ ان کی موت 1905ء میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے پوتوں جعفر شاہ اور مہدی شاہ کے لئے انتہائی قیمتی جائیداد چھوڑی۔ جاگیر کی انتظامیہ کی بدنظمی اور سربراہی کے بحران کی وجہ سے حالات دن بدن خراب ہونے لگے تو ان کی جاگیر کورٹ آف وارڈ میں چلی گئی۔

محمد باقر خان جو کہ جعفر خان کے صاحب زادے تھے. ذیلدار بنے باقر خان اور ان کے کزن محمد نواز شاہ نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی بعدازاں ان کو جاگیر واپس لوٹا دی گئی۔

مراد شاہ کے چچا گلاب خان ڈوژنل درباری تھے بعدازاں یہ سیٹ ان کے بیٹے زین العابدین شاہ کو مل گئی۔ زین العابدین کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ صاحب خان نے دو بیٹے چھوڑے تھے۔

سب سے بڑے صدر الدین شاہ جو کہ زین العابدین کے بھتیجے تھے وہ ریلوے میں اسٹنٹ ٹریفک آفیسر تھے۔ ان کے ایک اور کزن ممتاز حسین شاہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔

گردیزیوں کے علاقے میں رمضان شاہ کے صاحب زادے ذوالفقار شاہ جو کہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے. ڈویژنل درباری تھے۔

مراد پور تحصیل میلسی کے علاقے میں آباد اس خاندان کے سربراہ مصطفٰے شاہ تھے۔ وہ اس علاقے کے ذیلدار تھے اور عراں تحصیل میں امام شاہ کے صاحب زادے احمد شاہ اپنے علاقے میں ذیلدار تھے۔ تراب علی شاہ کے صاحب زادے قاسم علی شاہ نے خان بہادر حسن بخش کی بیٹی سے شادی کی وہ ملتان ڈویژن میں نائب تحصیل دار تھے۔ قاسم علی شاہ نے جنگ عظیم میں اپنے علاقے سے سینکڑوں افراد کو فوج میں بھرتی کرایا وہ ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ علی رضا شاہ کے صاحب زادے نائب تحصیل دار تھے۔

اس کے دو بھتیجے حامد شاہ ذیلدار اور میونسپل کمشنر اور محمد شاہ بار ایٹ لاء میونسپل ملتان کے سیکرٹری تھے۔ گردیزی ملتان کی دھڑے بندیوں میں ہمیشہ قریشیوں کے ساتھی رہے ہیں سید علی گردیزی نے ملتان میں مسلم لیگ کی تنظیم نو میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ صوبائی کونسل کے رکن رہے۔ وہ ترقی پسند نظریات اور رجحانات کے حامل تھے۔ وہ دولتانہ کی سیاست کے حواری رہے ہیں۔ 1951 ء میں انہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر حلقہ نمبر ا سے کامیابی حاصل کی تھی۔ دولتانہ نے جب کابینہ تشکیل دی تو سید علی حسین گردیزی قریشیوں کے نمائندے کے طور پر وزارت میں شامل کیے گئے جس کا گیلانیوں کو شدید افسوس تھا اور وہ دولتانہ وزارت کو گرانے کے لئے مسلسل میاں ممتاز دولتانہ کی مخالف قوتوں کا ساتھ دیتے رہے۔ 1965 ء میں انہوں نے مسلم لیگ کنونشن کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی۔ 1955 ء میں جب ملتان ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات ہوئے تو گیلانیوں کے مقابلہ میں متحدہ محاذ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ اس وقت سید علمدار حسین گیلانی وزیر بلدیات تھے ان کی کوشش تھی کہ قسور گردیزی کامیاب نہ ہو سکیں کیونکہ وہ اس وقت آزاد پاکستان پارٹی کے رہنما تھے اور رحمت حسین گیلانی کو ضلع کی قیادت کے لئے چیلنج کر سکتے ہیں۔ سید علمدار حسین گیلانی نے اپنے اقلیتی گروپ کو جائز ناجائز طریقے سے اکثریت میں تبدیل کر لیا تھا۔ اس پر سید علی گردیزی، ظہور حسین قریشی صادق حسین قریشی اور قسور گردیزی نے وزیر اعلیٰ سردار عبدالحمید کے سامنے احتجاج کیا اور انہوں نے وزیر بلدیات پر لگائے گئے الزامات کی تحقیقات کا وعدہ کیا۔ 1965 ء کے صوبائی انتخابات میں بھی قسور گردیزی کے بنیادی جمہوریتوں کے نمائندوں کو اپنے مدلل ودلائل سے قائل کر لیا لیکن وہ حکومتی مداخلت کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے نمائندوں کو قائل کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ تاجر ہیں تو میں بھی تاجر ہوں۔ اگر آپ میں سے کچھ لوگ صحافی ہیں تو میں بھی امروز اور پاکستان ٹائمز کا ڈائریکٹر رہا ہوں۔

اگر آپ امیر ہیں تو میں نے امارت کے مزے بھی لوٹے ہیں۔ قسور گردیزی دائیں بازو نظریات کے حامی ہیں یہی وجہ ہے کہ ملتان جہاں مذہبی رجحانات بہت زیادہ ہیں، انہوں نے قسور گردیزی کو اہمیت نہ دی۔ وہ بعد ازاں ولی خاں کے سیاسی نظریات سے متاثر ہو کر نیپ میں شامل ہو گئے۔

سید راضی گردیزی نے بھی گردیزی گھرانے کے فرد کی حیثیت سے خاصا نام کمایا ہے ان کی وابستگی سیاسی اعتبار سے صادق حسین قریشی کے ساتھ رہی ہے 1970 ء میں مخدوم سجاد حسین قریشی جو قریشی قبیلے کے سجادہ نشین ہیں، کونسل مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ صادق حسین قریشی نے کونسل مسلم لیگ میں اس لئے شمولیت اختیار نہ کی کہ انہوں نے سید راضی شاہ گردیزی کو ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔

1977 ء میں پیپلز پارٹی نے ملتان سے عباس گردیزی اور سید محمد رضی شاہ کو ٹکٹ دیا تھا۔ 1970 ء میں بھی سید محمد عباس شاہ گردیزی نے پی ڈی پی کے ڈاکٹر خاور شاہ کو شکست دی تھی۔ 1985 ء میں سید محمد رضی گردیزی کے گیلانی خاندان کے سربراہ حامد رضا گیلانی کے مقابلے میں شکست کھائی۔ سید رضی گردیزی 1970 ء اور 1977 ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ بہاولپور کے گردیزی بھی ملتان کے گردیزیوں کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ 1965 ء کے انتخابات میں احمد نواز گردیزی شکست کھا گئے تھے۔ سید تسنیم نواز گردیزی 1983 کے بلدیاتی انتخابات میں ضلع کونسل کی ایک نشست پر شکست کھا گئے تھے۔ انہوں نے ممتاز پارلیمنٹرین اور مسلم لیگی رہنما تابش الوری کو شکست دی تھی۔ 1988 ء کے انتخابات میں بھی سید تسنیم نواز گردیزی کامیاب ہوئے تھے۔ بہاولپور کی گردیزی فیملی کی رشتہ داری پیر پگاڑا سے بھی ہے۔ سید تسنیم گردیزی، محمد خان جونیجو کے دور میں وزیر مملکت رہے اور میاں نواز شریف کی کابینہ میں بھی شامل ہیں۔ 1992 ء کے بلدیاتی انتخابات میں ضلع بہاولپور کی بلدیاتی قیادت کے مسئلہ پر ان کے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں سے اختلافات ابھر کر سامنے آئے تھے جو بعد ازاں مسلم لیگ کے اکابرین نے وقتی طور پر دبا دیئے تھے۔

خانیوال کے ڈاہے

ملتان کے ڈاہے بھی قدیم قوم کی حیثیت سے اس علاقے میں آباد ہیں۔ یہ راجپوت راجہ چندر بنسی اور مہاراجہ سری کھنڈ کی اولاد میں سے ہیں۔ مہاراجہ سری کھنڈ ڈاہا تھا۔ ڈاہے 32 نسلوں سے ہندو چلے آرہے ہیں۔ سب سے پہلے ڈاہا خاندان کے سرکردہ تقی خان نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد نے بہاولپور ریاست کے علاقہ دراوڑ سے نقل مکانی کر کے خانیوال میں رہائش اختیار کر لی تھی اور سکھوں کے عہد میں اس خاندان کے حسن خان نے بہت عروج حاصل کیا تھا۔ سکھوں نے خانیوال کے علاقے کے حقوق علمداری دے کر ڈاہا خاندان کے عروج کی بنیاد رکھی۔

مخدوم پور امیں انہیں سڑکوں کے ٹیکس اور دریا ٹیکس سے مستثنٰی قرار دیا گیا۔ ان کا پوتا زیارت خان جب اپنے قبیلے کا سربراہ بنا تو اس نے اس علاقے پر اپنی کارداری کا مکمل لوہا منوا لیا اور اس کے اختیارات کی حدود کوٹ کمالیہ، تلمبہ، لڈن اور ٹبی کے علاقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیوان ساون مل کے دور میں اس علاقہ کے چور اور ڈاکو خوف سے انہیں لوٹی ہوئی چیزوں کا ایک چوتھائی دیتے تھے۔

زیارت خان کو مالیہ کی رقم کا بہت بڑا حصہ ملتا تھا جو وہ شیخ مالکہ، خانیوال اور خیر پور سے حاصل کرتے تھے۔ خان زیارت خان کے بیٹے خان شاہ محمد خان انگریزوں کے ساتھ کئی محاذوں پر کام کرتے رہے۔ 1857 ء میں انہیں سند عطا کی گئی۔ انہیں ڈویژنل درباری کی حیثیت کے علاوہ ذیلداری بھی حاصل تھی۔ سر رابرٹ منٹگمری نے انہیں سند اور نقد انعام بھی دیا۔ ان کے بیٹے خان کرم خان ذیلداری اور ڈویژنل درباری کی سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 98-1897 ء میں خاں کرم خاں نے مالاکنڈ اور شمال مغربی

سرحدی صوبہ میں گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ انہوں نے 157 اونٹوں کا ایک دستہ بھی اس مہم میں شامل کیا۔ 1903 ء میں ان کی خدمات کے اعتراف میں دہلی دربار میں انہیں سند عنایت کی گئی۔ یہ آنریری مجسٹریٹ اور سول جج کے عہدے پر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ 1911 ء میں جشن تاج پوشی کے موقعہ پر سابقہ خدمات کے عوض انہیں سند عنایت کی گئی۔ خان کرم خان کے چار بیٹے زیارت خان، فرید خان، ہیبت خان اور گل خان بھی ڈاہا خاندان کے نمایاں افراد میں شامل رہے ہیں۔ زیارت خان ذیلدار آنریری مجسٹریٹ اور صوبائی درباری رہے ہیں دوسری جنگ عظیم میں بھرتی کے دوران انہوں نے گراں قدر خدمات سر انجام دی تھیں اور بے شمار اونٹ اور جنگی قرضہ میں بھاری رقم جمع کرائی۔ وہ ضلع مظفر گڑھ میں اسسٹنٹ ریکروٹنگ آفیسر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ وہ 32 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ انگریزوں نے ان کے خاندان کو انتہائی قریبی ساتھی کی سند عطا کی اور ملتان دربار میں ان کے خاندان کی خدمات کا خصوصی ذکر کیا گیا۔

اس کے بیٹے حق نواز میونسپل کمشنر، صوبائی درباری اور ذیلدار رہے ہیں اور یہ بھی جوانی کے عالم میں 29 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ نشاط احمد خاں جوان کے کم سن بیٹے تھے۔ باپ کی جاگیر کے مالک بنے۔ 1946 ء میں ہیبت خان ڈاہا نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا تھا۔ مخدوم سر مرید حسین قریشی نے انہیں کامیاب کرانے کی کوشش کی تھی۔ 1946 ء میں پیر بڈھن شاہ مسلم لیگ کی ٹکٹ پر ہیبت خان ڈاہا کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ 1962 ء اور 1965 ء میں ڈاہا خاندان کے میجر افضل خان نے کھگہ خاندان کا مقابلہ کیا لیکن دونوں بار پیر قمر الزمان شاہ کھگہ سے شکست کھائی۔ 1970 ء میں پیر قمر شاہ الزماں کھگہ کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ناکام ہو گئے تھے۔ 1977 ء کے الیکشن میں انہوں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی۔ 1985 ء میں ان کا ایک بار پھر مقابلہ ڈاہا خاندان کے آفتاب احمد خان ڈاہا سے ہوا۔ 1983 ء کے بلدیاتی انتخابات میں ڈاہا خاندان کے کئی کونسلر منتخب ہو گئے تھے اور وہ آفتاب کی کامیابی کے لئے دن رات کوشاں تھے۔ اس طرح 1985 ء کے انتخابات میں بھی ڈاہا خاندان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

1988 ء میں آفتاب احمد خان ڈاہا قومی نشست پر کامیاب ہو گئے۔ 1937 ء کے تقریباً پچاس سال بعد ڈاہا خاندان کو سیاست میں ابھرنے کا موقع ملا۔ کیونکہ ان کے مقابلہ میں ان کے قریبی رشتہ دار رفعت حیات خان ڈاہا ہی نے شکست کھائی تھی۔ اس بار پیر قمر الزمان کھگہ نے انتخاب میں حصہ ہی نہ لیا کیونکہ انہیں نہ تو اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ ملا اور نہ ہی پیپلز پارٹی نے انہیں ٹکٹ دیا۔

اس طرح پی پی 177 سے حاجی عرفان اللہ ڈاہا نے پیپلز پارٹی کے امیدوار عبدالرزاق نیازی کو شکست دی۔ 1988 ء کی ان کامیابیوں نے ماضی کی شکستوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ 1990 ء میں آفتاب ڈاہا نے پیر قمر الزمان کھگہ کو شکست دے کر اپنے بزرگ خاں بہادر ہیبت خان کی شکست کا بدلہ چکا دیا تھا۔

ڈاہوں کے روایتی حریف بڈھن شاہ کھگہ کے وارثوں کے درمیان 1990 کے انتخابات میں باہمی رنجش ابھر کر سامنے آئی تھی جس کی وجہ سے پیر قمر الزماں کھگہ کامیابی حاصل نہ کر سکے اب ان کی باہمی ناراضگی ختم ہو گئی ہے پیر بڈھن شاہ کے تینوں بیٹے قمر الزماں کھگہ سعید اختر، اور ظفر اقبال کھگہ سیاست میں نمایاں رہے ہیں سعید اختر کھگہ حال ہی میں وفات پا گئے ہیں۔ کھگہ خاندان سیاسی برتری قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے تاکہ آئندہ الیکشن میں اپنے مدمقابل ڈاہا خاندان کو شکست دی جا سکے۔

خاندان ممدوٹ

مشہور صوفی درویش بلھے شاہ کی دھرتی (قصور) جہاں تصوف اور علم و فضل کی بارشیں ہوتی رہیں ہیں، اس کے دامن میں سیاسی اتار چڑھاؤ کی کہانیاں بھی پوشیدہ ہیں۔ اس دھرتی پر پنجاب کا ایک مشہور سیاسی گھرانہ خاندان ممدوٹ کے نام سے قیادت و سیادت کی ذمہ داریاں ادا کرتا رہا ہے۔ قصور شہر کو 1570ء میں شہنشاہ اکبر اعظم نے پٹھانوں کی بستی کے طور پر بسایا تھا۔ اس وقت اس بستی کے نفوس کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس بستی میں آباد ہونے والے حسن زئی قبیلہ کے ممدوٹ خاندان کے افراد بھی شامل تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال تک یہ خاندان قصور میں ہی آباد رہا، پنجاب میں جب سکھوں کی حکومت قائم ہوئی تو سب سے زیادہ مزاحمت کا سامنا انہیں اسی بستی کے جی دار اور بہادر پٹھانوں کا کرنا پڑا۔ آخر کار بھنگی گروپ سردار گلاب سنگھ کی قیادت میں قصور کے تمام علاقوں کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نظام الدین خان اور قطب الدین خان جو دو سگے بھائی تھے، فاتح کے حلقہ بگوش میں داخل ہو گئے۔ دونوں بھائی بہادر، ہوشیار اور بہت ذہین تھے۔ انہوں نے سکھوں سے وابستہ ہونے کے باوجود اپنے ہم وطن افغانوں کی مدد سے 1794ء میں سکھوں کو قصور سے مار بھگایا اور اپنی عملداری قائم کر لی۔ سکھوں نے اس توہین کے بعد انہیں سکون سے نہ رہنے دیا۔ سردار گلاب سنگھ نے متعدد بار یہ علاقہ ہتھیانے کی کوششیں کیں اور اس کے بعد راجپوت سنگھ نے بھی قصور پر قبضہ کرنے کے لئے کئی حملے کئے لیکن ناکام رہا۔ 1800ء میں راجہ رنجیت سنگھ جب لاہور پر قابض ہو گیا تو اس نے قصور پر بھرپور حملہ کر کے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ 1802ء میں نظام الدین کو اس کے تین برادر نسبتی وصیل خان، حاجی خان اور نجیب خان نے قتل کر دیا کیونکہ نظام الدین نے

اپنے سالوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا تھا۔ نظام الدین کی موت کا ذمہ دار اس
کے بھائی قطب الدین کو ٹھہرایا جانے لگا جو قتل کے وقت قصور میں موجود ہی نہیں تھا۔ جب
وہ قصور واپس آیا تو اسے اپنے بھائی کی ناگہانی موت کا شدید صدمہ ہوا اور وہ انتقام کے جذبہ
سے قلعہ اعظم خان پر حملہ آور ہوا اور اپنے بھائی کے دو قاتلوں نجیب خان اور وصیل خان کو
موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کا تیسرا بھائی حاجی خان فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔
رنجیت سنگھ نے دوبارہ قصور پر حملہ کیا لیکن اس بار اسے کامیابی نہ ہو سکی اور قطب الدین
1807ء تک قصور پر قابض رہا۔ جب رنجیت سنگھ تیسری بار حملہ آور ہوا تو قطب الدین نے
ایک ماہ کے محاصرے اور لڑائی کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور قصور سے دستبردار ہو کر ستلج کے
دوسرے کنارے ممدوٹ کے علاقے میں جانے پر آمادہ ہو گیا جہاں اسے جاگیر دی گئی۔
اور ایک سو گھوڑ سوار فراہم کرنے کے لئے کہا گیا۔ قطب الدین نے ممدوٹ کا علاقہ
1800ء میں اپنے بھائی اور مقامی ڈوگروں کی مدد سے راجہ رائے کوٹ کو شکست دے کر
حاصل کیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے فتح الدین خان کو بھی ضلع گوجرہ میں "ملروپ" کے مقام پر
جاگیر عطا کی اور ایک سو گھوڑ سوار فراہم کرنے کی شرط عائد کر دی لیکن فتح الدین اس شرط
سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ راجہ سے ممدوٹ کی حصولی کے لئے کہتا رہتا تھا کیونکہ وہ اس
علاقے پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ آخر کار مہاراجہ کے اشارے پر 1831ء میں فتح الدین دریا عبور
کر کے وہاں پہنچا جہاں اس کے چچا کا دستہ موجود نہیں تھا۔ ڈوگرہ جو پہلے ہی فتح الدین خان
کی آمد کا منتظر تھا، وہ بھی اس کے ساتھ مل گیا اور انہوں نے قطب الدین کو شکست فاش
دی۔ وہ انتہائی زخمی حالت میں وہاں سے فرار ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کا امرتسر
میں انتقال ہو گیا۔ رنجیت سنگھ دریا کی دوسری جانب مداخلت کو جائز سمجھتے تھے اور اس نے فتح
الدین خان کو واپس بلا لیا اور جمال الدین خان کو اس کے باپ کی تعلق داری دے دی۔ فتح
الدین نے ایک بار پھر حملہ کی کوشش کی لیکن برطانوی ایجنٹ نے مداخلت کی اور مہاراجہ نے
اسے واپس آنے کا حکم دیا لاہور میں اپیل کے لئے ایک ہائی کورٹ تھی۔ اس کے ریکارڈ میں
متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ممدوٹ خاندان کے افراد پر جرمانے کئے گئے تھے جن کی وجوہات
سیاسی بھی ہو سکتی تھیں۔ 1824ء میں قطب الدین خان پر لاہور کے علاقے سے مویشیوں

کی چوری میں شرکت کے الزام میں 12556ء روپے جرمانہ عائد کیا گیا۔ 1844ء میں
جمال الدین کو ایک اخبار نویس صوبہ رائے کے قتل کے الزام میں 11100ء روپے جرمانہ
کی سزا ہوئی۔ اخبار نویس اس کے دربار میں اس کے ضلع میں ہونے والی بدعنوانیوں کے
بارے میں معلومات لینے گیا تھا اور فحش کلامی پر اتر آیا جس سے جمال الدین خان برانگیختہ
ہو گیا اور اس نے اسے قتل کرا دیا۔ 1845ء میں مہم ستلج سے قبل جمال الدین کو بتایا گیا کہ
اگر وہ فرنگیوں سے تعاون کرنے کے لئے تیار ہو تو اس کی عملداری کی توثیق کر دی جائے
گی۔ انگریزوں کو اس علاقے میں فیروز شاہ کے قریب سکھوں سے زبردست خطرہ تھا۔
جمال الدین خان نے سرجان کی مدد کی اس کارہائے نمایاں پر فرنگی حکومت نے اس کی
عملداری کی توثیق کر دی اور انہیں مقبوضات پر کلی اختیارات دے دیا جس کے بعد جمال
الدین کو سر کے خطاب سے نوازا گیا اور گھوڑ سواروں کی شرط نرم کر کے امن کے زمانے میں
ساٹھ اور لڑائی کے زمانے میں ستر کر دی۔ جمال الدین غیر ذمہ دار اور خوشامدی لوگوں پر
اعتماد کر لیتا تھا ڈوگر ان کی حقارت اور نفرت کا نشانہ تھے کیونکہ انہی کی مدد سے اس کا باپ
ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس علاقے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کو اس
کی مستحکم گرفت کا احساس تھا۔ اس دور میں ڈاکہ زنی کی وارداتیں بڑھ گئی تھیں فرنگیوں کی
املاک بھی ڈاکوؤں کے گروہ سے محفوظ نہ تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام خوشحال اور امیر
لوگ ممدوٹ کو خیرباد کہہ گئے۔ ایک وقت تھا جب کہ یہ علاقہ بہت زرخیز خوشحال تھا۔ آب
پاشی کے لئے کنوئیں اور نہریں موجود تھیں لیکن اب تمام علاقہ تباہی کی راہ پر گامزن تھا۔ شہر
بے آباد ہو چکا تھا اور لہلہاتے کھیت جنگلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ آخر کار اس کا ازالہ
ہوا۔ فرنگی حکومت ملک میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کی مصلحت کے تحت مداخلت سے انکار
کر چکی تھی لیکن 1855ء میں انگریزوں نے نواب کو اس کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا
اور اس کے علاقے کو ضلع فیروز پور سے ملا دیا گیا۔ نواب کو پنشن دے دی گئی اور وہ
1861ء تک لاہور میں مقیم رہے۔ بعد ازاں نواب نے ضلع ہوشیار پور میں سکونت اختیار
کر لی جہاں مارچ 1863ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد مرحوم کے بیٹوں اور اس کے بھائی جلال الدین خان میں گدی نشینی کا
سوال پیدا ہو گیا جلال الدین کا اپنے بھائی کی بد انتظامی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور بذات خود

ایک ذہین اور بہادر شخص تھا 1845ء میں وہ فرنگیوں کے خلاف تھا لیکن 1845ء میں ملتان کے مقام پر جنرل لیک کی قیادت میں کام کرتا رہا جب گدی نشینی کا سوال پیدا ہوا تو فرنگیوں کی اکثریت جلال الدین کے حق میں تھی۔

چنانچہ 1864ء میں گورنر جنرل کی کونسل نے مرحوم نواب کے بھائی جلال الدین کو ممدوٹ کا سربراہ بنا دیا اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ اگر جلال الدین کی موت کے بعد اس کے بیٹوں میں گدی سنبھالنے کے لئے کوئی نہ رہے۔ تو اس کے بھتیجے اس گدی کے حق دار ہوں گے۔ جس روز جلال الدین نے گدی سنبھالی، اسی دن اسے نواب کے خطاب سے نوازا گیا اور یہ خطاب انگریز نے آئندہ نسلوں کے لئے بھی دے دیا۔ جلال الدین کو انگریزوں نے ممدوٹ میں سکونت کی اجازت دے دی اور 1870ء میں اسے مجسٹریٹ کے اختیارات سونپ دیئے گئے۔ 1875ء میں جلال الدین کا انتقال ہو گیا تو اس کا بڑا لڑکا نظام الدین خان جاگیر کا سربراہ بنا۔ اس کے سن بلوغ کو پہنچنے تک جاگیر کا انتظام فیروز پور کے ڈپٹی کمشنر کی طرف سے تقرر کردہ ایک کورٹ آف وارڈ کے پاس رہا۔ جاگیر کے ذرائع کو کورٹ آف وارڈ نے ترقی دی۔ آب پاشی کے لئے نہریں کھودی گئیں جس کے نتیجہ میں سالانہ آمدن پچیس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ جلال آباد کا موجودہ قصبہ ایک صحت افزا مقام پر ممدوٹ کے پرانے صدر مقام سے بیس میل کے فاصلے پر بسایا گیا کیونکہ وہ نصف کے قریب ستلج کی نظر ہو گیا تھا۔ یہ تمام جاگیریں خوشحال صورت میں نئے نواب کے حوالے کی گئیں نواب نظام الدین اس خوشحالی کو برقرار نہ رکھ سکا اور دیوالیہ ہو گیا۔ 1885ء میں وہ فرنگی حکومت سے کمیشن لے کر فوج میں سیکنڈ لیفٹننٹ ہو گیا۔ اسے کیونکہ گھوڑوں کی نسل کشی سے خاصی دلچسپی تھی، اس بنا پر وائسرائے نے اپنے ہاتھوں سے اسے اعزازی سند عطا کی۔ 1891ء میں نواب نظام الدین کی موت واقع ہوئی تو اس کا بال بال قرضے میں پھنسا ہوا تھا۔ اس کا معصوم لڑکا غلام قطب الدین خان جس کی عمر اس وقت صرف دو سال تھی، اس کا جانشین مقرر ہوا۔ اس نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی۔ نواب امیر الدین کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ نواب کے جوان ہونے تک اس کی جاگیر دوسری بار کورٹ آف وارڈ کی نگرانی میں آ گئی اور یہ اگست 1934ء تک رہی۔ نواب ذہنی طور پر کمزور تھا اور سلطنت کا نظام نہیں چلا سکتا تھا۔ اپنے والد کی طرح اسے بھی

گھوڑوں کی نسل کشی کا بہت شوق تھا اور اس نے ایک بہت بڑا اسٹڈ فارم قائم کیا ہوا تھا۔ اسے چوگان کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ 1928ء میں کوئی وارث چھوڑے بغیر فوت ہوئے لہٰذا تمام جاگیر نواب جمال الدین کے بڑے پوتے شاہنواز کو مل گئی اور اس پر اس کے موروثی حق بحال کر دیئے گئے اور نواب کا خاندانی خطاب عطا ہوا 1939ء میں انہیں سر کا خطاب دیا گیا اور ساتھ ہی صوبائی دربار میں ایک نشست الاٹ ہو گئی سر شاہنواز اپنے زمانے کا بہت بڑا جاگیر تھا ان کی وفات کے بعد اس کا بڑا لڑکا افتخار حسین خان جاگیر کا وارث بنا اور ملک تقسیم ہو جانے کے بعد انہیں اپنی جاگیر کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان کے والد سر شاہنواز نے کڑے وقت میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا صوبائی خود مختاری کے پہلے انتخاب 1937ء میں ہوئے تو قائداعظم" کو لاہور کے "روسا" اپنے ہاں ٹھہراتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ سب میاں سر فضل حسین مرحوم سے خوفزدہ تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ کے والد میاں احمد یار خان سر شاہنواز کے جگری یار تھے اور ایک روز صرف اس لئے پریشان تھے کہ قائداعظم" کو دہلی دروازے کے باغ میں یونینسٹوں کے خلاف بولنا تھا۔ اس وقت نوابین میں صرف شاہ نواز ممدوٹ ہی قائداعظم" کے ہم نوا تھے۔ نواب افتخار ممدوٹ کو قائداعظم" نے مسلم لیگ میں آنے کا مشورہ دیا تھا نواب شاہنواز کی موجودگی میں نواب افتخار ممدوٹ کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے والد صاحب سیاست میں حصہ لیتے اور آپ جاگیر کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے۔ یہاں تک کہ انہیں لاہور آنے کی فرصت بھی نہ ملتی تھی۔ والد کی وفات بعد دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے والد کے سیاسی خلا کو پر کریں۔ آخر کار قائداعظم" کے مجبور کرنے پر وہ 1942ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ چوہدری خلیق الزماں کے ذریعے قائداعظم" نے انہیں پیغام بھیجا کہ وہ پنجاب مسلم لیگ کی صدارت سنبھالیں۔ اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ 1942ء سے 1947ء تک مسلم لیگ پنجاب کے صدر رہے۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد پنجاب کی پہلی وزارت بنی تو نواب افتخار ممدوٹ اس کے پہلے وزیر اعلیٰ بنے لیکن عہدہ یہ طویل عرصہ تک ان کے پاس نہ رہ سکا۔ ان کے سیاسی کیریئر کا پہلا دھچکا وزیر اعلیٰ بننے کے دو سال کے اندر ہی لگا۔ میاں دولتانہ ان کی وزارت میں سینئر وزیر تھے۔ میاں دولتانہ امنگ بھرے سیاستدان تھے۔ ایک ہی کابینہ میں دو تلواروں کا سمانا مشکل ہو گیا۔ معاملہ وزیر اعظم لیاقت علی کے پاس گیا تو وہ

مخمصے میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کس کو رکھیں، کس کو نکالیں۔ ممدوٹ، دولتانہ کشمکش پاکستان کے لئے نیا تجربہ تھی جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پاکستان کی تحریک اور حصول کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے لئے شمشیر بے نیام بنے ہوئے تھے۔ ممدوٹ کی ذاتی شرافت کے سبھی قائل تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی موروثی خدمت کی تھی۔ ان کے والد نے مسلم لیگ کے لئے اس وقت ہزار ہا روپیہ خرچ کیا جبکہ کوئی بھی زمیندار کتوں اور غیر ضروری مشغلوں سے فارغ نہ ہوتا تھا۔ نواب ممدوٹ نے نازک ترین دور میں پنجاب مسلم لیگ کو چندہ دیا

1937 ء کے انتخابات میں جتنے مسلم لیگی امیدوار کھڑے تھے، ان کا مجموعی مالی ایثار ممدوٹ کے مالی ایثار کے ہم وزن نہیں تھا۔ ان تمام خدمات کے صلہ میں پنجاب کے پہلے وزیر اعلیٰ کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا گیا جس کا میاں ممتاز دولتانہ کو بہت رنج تھا۔ پاکستان کی سیاست کا المیہ یہ رہا ہے کہ بڑے بڑے رہنماؤں کا کانٹا وقفہ وقفہ میں بدل جاتا ہے اور جب ذات کا سوال ہوتا ہے تو فیصلے بالا بالا کر لئے جاتے ہیں۔ لیاقت علی خان سمجھتے تھے کہ پنجاب کا صوبہ مستقبل قریب میں بہت بڑی اہمیت حاصل کرنے والا ہے اور آنے والے وزیر اعظم کا تعلق اسی صوبہ سے ہو گا۔ انہوں نے دولتانہ ممدوٹ کشمکش میں ممتاز احمد دولتانہ کو منتخب کر لیا اور ممدوٹ وزارت کی چھٹی ہو گئی۔ اس سے قبل لیاقت علی خان نے نواب ممدوٹ کو کراچی بلایا اور مشورہ دیا کہ ممتاز دولتانہ کو دوبارہ شریک وزارت کر لیں جو ممدوٹ سے اختلافات کے باعث سردار شوکت حیات سمیت استعفیٰ دے چکے تھے۔ ممدوٹ نے لیاقت علی خان کی اس تجویز سے آمادگی بھی ظاہر کر دی تھی لیکن اسی روز خواجہ ناظم الدین نے افتخار ممدوٹ کو مشورہ دیا کہ نون کو بھی وزارت میں لے لو۔ ممتاز دولتانہ نے نون کا نام سنا تو بیگم شاہنواز کو وزیر بنانے پر زور دینے لگے۔ خان ممدوٹ نے اپنی طرف سے چوہدری محمد حسن کو لینا چاہا۔ سر فرانس موڈی کے سامنے یہ بحث بحثی ہوتی رہی۔ ممتاز اور نون تو لازم تھے، محمد حسن کے نام پر ممتاز دولتانہ کو شدید اعتراض تھا اور وہ بیگم شاہنواز کا نام لے رہے تھے۔ فرانس موڈی کا ذہنی جھکاؤ مشترکہ گفتگو میں تو ممتاز دولتانہ کی طرف رہا لیکن جب کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر نون اور ممتاز دولتانہ رخصت ہو گئے تو سر فرانس موڈی نے ممدوٹ سے کہا کہ محمد حسن کو ضرور لو۔ ممتاز دولتانہ وزارت کو پارٹی بازی کا شکار بنانا چاہتے

ہیں۔ ستم پہ ستم یہ کہ جس شوکت حیات کو وزارت عظمیٰ کا کہہ کر ممتاز دولتانہ صاحب کراچی ساتھ لے گئے تھے۔ اس نئی وزارتی نقش آرائی میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ڈسمس ہونے سے پہلے افتخار ممدوٹ اس حد تک بے بس ہو گئے تھے کہ انتظامیہ ان سے تعاون کرنے کے لئے تیار نہ تھی اور یہ سب کچھ ممتاز دولتانہ کے ایماء پر ہو رہا تھا حد کمال یہ کہ کشمکش کے اس نقطہ عروج میں پنجاب اسمبلی کے ارکان کی اکثریت خان ممدوٹ کے ساتھ ہی رہی بالآخر خان ممدوٹ کے خلاف 26 جنوری کو عدم اعتماد کی قرار داد کا نوٹس دے دیا گیا دولتانہ اور ممدوٹ کی جنگ سے ایم ایل اے صاحبان کی چاندی ہو گئی اب وہ ووٹ کی قیمت بڑھانے لگے کبھی ادھر کبھی ادھر صبح افتخار ممدوٹ کے پاس رات ممتاز دولتانہ کے پاس جب ممتاز دولتانہ کو یقین ہو گیا کہ وہ ارکان اسمبلی کی اکثریت توڑنے سے قاصر ہیں اور جو ان کے ہم نوا بنتے ہیں، ان میں ہر کوئی وزارت عظمیٰ کا خواہش مند ہے تو انہوں نے خان لیاقت علی خان کو ایک خط لکھا جس میں اسمبلی کو توڑنے کا مشورہ دیا۔ 26 جنوری 1949 ء میں ارکان اسمبلی کی رائے معلوم کی جانی تھی کہ یکایک 24 جنوری 1949 ء کو گورنر جنرل نے اسمبلی کی فاتح پڑھا دی۔ نواب افتخار ممدوٹ کے ذہن میں یہ راسخ ہو گیا کہ وزیر اعظم نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے تو انہوں نے مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا اور جناح مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ یہ پہلی باقاعدہ حزب اختلاف تھی۔ نواب افتخار ممدوٹ خود تو نرم آدمی تھے لیکن ان کے بعض دوسرے ساتھی ظالم تھے اور ان کا نتیجہ ممدوٹ صاحب بھگتنا پڑا۔

سہروردی اور لیاقت علی خان کے درمیان ان بن ہوئی تو ممدوٹ صاحب جناح عوامی لیگ میں چلے گئے۔ نواب ممدوٹ دولتانہ سے شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ 1956 ء میں راتوں رات جب ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو یہ اس میں شامل ہو گئے۔ کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد پڑی تو یہ اس کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ وزارت عظمیٰ کے دوران اپنے رشتہ داروں اور سیاسی ہم سفروں کو فائدے پہنچانے کے الزام میں آپ کو دولتانہ حکومت نے گرفتار بھی کیا بالآخر خان آف ممدوٹ کا دور ابتلا کٹ گیا وہ باعزت طور پر ان الزامات کی پکڑ سے نکل گئے جو ان کے خلاف مخصوص جذبہ کے تحت وضع کئے گئے تھے۔ مسلم لیگ کے بارے میں جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ کو مسلم لیگ کے پروگرام سے

اختلاف تھا؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ مسلم لیگ کا پروگرام تھا ہی کیا؟ مسلم لیگ کی اب اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اصلاح اس وقت ہوتی ہے جب سب ایک پروگرام پر کاربند ہوں اور جماعت کے وضع کردہ اصولوں پر پابند ہوں لیکن ایسے حالات میں کسی جماعت کی کیا اصلاح ہو سکتی ہے۔ جب جماعت کے سرکردہ حضرات ہی ہر موقع پر جماعت کے آئین کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کریں اور اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کونسلرز کو یا دوسرے لوگوں کو گمراہ کر کے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

بعدازاں نواب آف ممدوٹ جناح عوامی لیگ سے بھی نکل گئے۔ ان کے شہید حسین سہروردی کے ساتھ قیادت کے مسئلے پر شدید اختلافات ہو گئے تھے۔ دونوں میں اتحاد ناممکن ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے سیاسی سفر میں پھر مسلم لیگ کی طرف رجوع کیا ان کی مراجعت کو لوگوں نے ملے جلے جذبات سے محسوس کیا۔ ان کی مسلم لیگ میں واپسی سے بہت سے سیاسی لیڈر پریشانی محسوس کرتے تھے کہ خان ممدوٹ کی واپسی سے ان کا آفتاب گہنا جائے گا اور اب مسلم لیگ کی قیادت و سیادت کو چیلنج بھی کیا جا سکتا ہے۔ دولتانہ گروپ کے لئے ان کی شمولیت سے ان کے مخصوص مقاصد کا سفر کٹھن ہو گیا تھا اور وہ آسانی سے کوئی گل نہیں کھلا سکتے۔ ان کی آمد سے دولتانہ گروپ کا سورج بڑے دنوں کے لئے تاریک بدلیوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔

بعدازاں نواب افتخار ممدوٹ نے مسلم لیگ کو الوداع کہہ دیا اور راتوں رات جنم لینے والی ملک کی سب سے بڑی جماعت ری پبلکن میں شمولیت اختیار کر لی اور اس میں ایک وزارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایوب خان کے دور میں ان پر مارشل ریگولیشن کے تحت بدعنوانی اور اختیارات کے ناجائز استعمال پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ صوبائی ایبڈو ٹریبونل نے سابق وزیر مال و وزیر اعظم پنجاب کے خلاف فرد الزامات جاری کی۔ جس کے ثابت ہونے کی صورت میں انہیں کسی منتخب ادارے کا ممبر بننے یا بطور امیدوار کھڑا ہونے پر پابندی عائد رہے گی جو 31 دسمبر 1966ء تک جاری رہے گی۔ فرد جرم میں 12 الزامات عائد کئے گئے تھے۔ نواب آف ممدوٹ جنہیں ٹریبونل کی طرف سے نوٹس جاری کیا گیا تھا، قیام پاکستان کے بعد پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ انہیں اس وقت کے گورنر

سر فرانس موڈی نے برطرف کیا۔ انہیں جون 1954ء میں سابق سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ مغربی پاکستان کا صوبہ بننے کے بعد 1956ء میں ڈاکٹر خانصاحب کی کابینہ میں وزیر مال کا عہدہ دیا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ سردار عبدالرشید اور نواب مظفر علی قزلباش کی وزارتوں میں اسی عہدے پر فائز رہے۔ ان پر جو الزامات عائد کئے گے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:۔

— رہائشی قطعات سابق صوبائی وزیر کے دو لڑکوں کو جو ان کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے، ساڑھے پچپن روپے مرلے کے حساب سے دلوا دیئے حالانکہ اس وقت زمین کی عام قیمت 350 روپے مرلہ تھی۔ ان کا یہ اقدام حکومت کی پالیسی اور احکام کی صریحاً خلاف ورزی کے مترادف تھا۔ اس طرح انہوں نے سرکاری خزانے کو 10710/50 روپے کا نقصان پہنچایا۔

— اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے خان ممدوٹ نے ری پبلکن پارٹی کے چوہدری غلام رسول تارڑ اور ان کے بھائی غلام قادر کو نجی سمجھوتے کے ذریعہ زرعی زمین کا ایک ٹکڑا خریدوایا اور اس کے بعد چک نمبر 5 تحصیل پھالیہ میں اس سے کہیں زیادہ قیمتی اور زرخیز ٹکڑے سے اس رقبہ کا تبادلہ کرنے کی اجازت دے دی۔ جس کے نتیجہ میں حکومت کو 13081/40 روپے کا نقصان ہوا۔

— خان ممدوٹ نے ناجائز طور پر سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضلع شاہ پور کے ری پبلکن پارٹی کے ایم پی اے ملک صالح محمد کو ٹیوب ویل اسکیم کی آڑ میں جسے ابھی تک حکومت کی منظوری حاصل نہیں ہوئی تھی، 150 ایکڑ اراضی پٹہ پر دے دی اور اس اراضی کے قابضین اللاٹیوں کی حق تلفی ہوئی۔

— خان ممدوٹ نے اپنے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تحصیل جڑانوالہ کے ایم پی اے اور ری پبلکن پارٹی کے رکن راؤ نوشیر خان کو 185 ایکڑ اراضی کا ایک قطعہ جو چک نمبر 10 میں انہیں ٹیوب ویل اسکیم کے تحت دیا گیا تھا، چک نمبر 544 گ ب میں چراہ گاہ کی اراضی کے اس کے مساوی رقبہ اراضی سے انہیں شرائط کے تحت تبادلہ کرنے کی اجازت دی جو چک نمبر 10 کی زمین کے لئے تھی حالانکہ چک نمبر 544 گ ب کی اراضی نسبتاً زیادہ قیمتی اور منافع بخش

تھی اور اس کا ٹھیکہ زیادہ ملتا تھا۔

— خان ممدوٹ نے سیاسی منفعت حاصل کرنے کی خاطر اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے غیر قانونی طور پر نواب شاہ میں ایک قطعہ اراضی کو جو میسرز ایگریکلچرل کواپریٹو لینڈ کو الاٹ کیا گیا یہ اراضی شاہنواز کو ایک روپیہ مربع فٹ کی شرح سے دیا گیا حالانکہ اس وقت زمین کا نرخ دس روپے مربع فٹ تھا لیکن بعد ازاں جب مسٹر شاہ نواز نے مارچ 1958 ء کے اسمبلی کے اجلاس میں ری پبلکن کو ووٹ نہ دیا تو مذکورہ بالا ناجائز رعایت اچانک واپس لے لی گئی اور زمین کی فروخت کے احکامات واپس لے لئے گئے۔

— سیاسی مصلحت کے تحت نواب ممدوٹ نے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کو ہدائت کی کہ اس نے آرٹ سلک یارن کا جو کوٹہ روک رکھا ہے، وہ تھل ریے آن ٹیکسٹائل ملز قائد آباد کو فوری طور پر جاری کر دیا جائے حالانکہ ابھی مل نے تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی مسلسل یاد دہانیوں کے باوجود نہ تو کوئی عمارت تعمیر کرائی تھی اور نہ اس کے پاس بجلی کے کھمبے لگانے کے لئے کوئی جگہ تھی۔

— خان ممدوٹ نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی مصلحت کے تحت ناواجب نفع پہنچانے کے لئے سید ظہور میاں گدی نشین اجمیر شریف اور ان کے مریدین کو 125 مربع زمین سرکاری آباد کاری کی شرائط پر ضلع رحیم یار خان کے چک نمبر 107 میں سرکاری زمینوں کے قواعد آباد کاری اور مقررہ ضوابط کی خلاف ورزی کر کے الاٹ کر دیئے۔

— ری پبلکن پارٹی کے سابق ایم پی اے غلام بخش کھوسہ سے وصول طلب 15000 روپے کے مالیہ کی وصولی کو ملتوی کرنے کے احکام جاری کر کے ملکی خزانہ کو عارضی طور پر نقصان پہنچایا۔ شیخوپورہ کے مسٹر فقیر حسین وغیرہ کے مالیہ کے بقایا جات کی وصولی کو ملتوی کرنے کی بذریعہ تار ہدائت کی گئی۔

— حکومت مغربی پاکستان کے ایک نائب وزیر ملک فتح شیر لنگڑیال کے ایک قریبی عزیز ملک سہاول شیر لنگڑیال پر ناجائز کاشت کرنے کے سلسلہ میں عائد شدہ سرکاری

تاوان مبلغ 2478/15/ کی وصولی ملتوی کرائی۔

— ضلع لاہور کے ایک شخص نواب دین کے نام سرکاری زمین گزشتہ تاریخ سے پٹہ پر لکھوانے کی اجازت دے دی جو اس زمین پر ناجائز قابض تھا اور اس الزام کے ذریعے حکومت کو 32000/00 ہزار روپے نقصان پہنچایا۔

— اس کے علاوہ نواب ممدوٹ کے خلاف درجنوں الزامات کی چھان بین ہو رہی تھی کہ جو نوٹس انہیں جاری ہوا تھا جس کی سماعت 15 فروری 1960 ء کو ہونا تھی۔ نواب افتخار ممدوٹ نے 30 جنوری 1960 ء کو ٹریبونل کی پیش کش قبول کر لی کہ وہ 31 دسمبر 1966 ء تک عوامی زندگی سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں۔

ان ٹریبونل نے سابق صوبائی وزیر مال افتخار ممدوٹ کے خلاف سرکاری عہدہ اور پوزیشن کے ناجائز استعمال سیاسی مصلحتوں کے تحت ناجائز فائدے پہنچانے اور جان بوجھ کر بدعنوانیوں کا ارتکاب کرنے کے الزامات عائد کئے تھے ان کے نام جو نوٹس جاری کیا گیا تھا، اس کے مطابق خان افتخار ممدوٹ نے جن لوگوں کو ناجائز فائدہ پہنچایا، ان کی اکثریت کالعدم ری پبلکن پارٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے زمین کی گرانٹ، تقاوی کی منظوری مالیہ کے بقایا جات اور جرمانوں کی وصولی روکنے کے متعلق ناجائز فائدے پہنچائے۔ ٹریبونل نے افتخار حسین ممدوٹ کو یہ نوٹس پبلک عہدہ پر فائز اشخاص کے طرز عمل کی تحقیقاتی کمیٹی کے مہیا کردہ مواد پر جاری کیا گیا تھا۔

نواب ممدوٹ پر دوسری زد زرعی اصلاحات کی صورت میں پڑی۔ ان کی جاگیر کا بہت بڑا حصہ زرعی اصلاحات کی زد میں آ گیا۔ انہوں نے زرعی اصلاحات کے عمل درآمد کے خلاف عدالت میں رٹ بھی کی کہ ان کی زمین کسی اور کو الاٹ نہ کی جائے۔

ان کے بعد ان کے بھائی تحریک تکمیل پاکستان کے صدر ذوالفقار ممدوٹ نے قومی سیاست میں ابھرنے کی کوششیں کیں اور انہوں نے انتخابات کے ذریعے بھی خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے البتہ ان کی بیوی عفیفہ ممدوٹ جو لغاری خاندان سردار جمال خان لغاری کی بیٹی ہیں، انہوں نے 1977 ء کے انتخابات اور قومی اتحاد کی طرف سے چلائی گئی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ضیاء الحق نے انہیں اپنی کابینہ میں وزیر بھی بنایا تھا۔ 1988 ء کے انتخابات میں انہوں نے اپنے کزن اور پیپلز پارٹی کے مرکزی

رہنما فاروق لغاری کے خلاف اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر حصہ لیا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ 1990ء کے انتخابات میں انہیں ٹکٹ نہ دیا گیا تو انہوں نے مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔ نواب افتخار محروث کے صاحب زادے پرویز افتخار نے بلدیاتی سیاست کے ذریعے 1987ء میں ابھرنے کی کوشش کی لیکن وہ کونسلر بھی نہ بن سکے۔

لاہور کے موکل سردار

لاہور کے علاقے میں جاگیرداروں کے جھرمٹ میں موکل سرداروں کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس خاندان کے پاس انگریزوں کی نوازشات کی بڑی نشانیاں ہیں۔ موکل سردار سندھو جاٹ ہیں جن کو راجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں خالصا اقتدار اور عروج حاصل ہوا تھا۔ موکل سرداروں پر سکھوں نے بڑی مشکل سے اعتماد کیا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا، ان میں زیادہ تر انگریز کی اطاعت اور فرمانبرداری کے طفیل حاصل کیا۔ اس خاندان کا بانی ایک جاٹ سوندھ سنگھ تھا جس کے سات بیٹے تھے۔ ان میں صرف دو کو انگریزوں کے دربار میں نمایاں ہونے کا موقع ملا۔ سوندا سنگھ نے جاگیرداروں سے مضبوط روابط قائم کرنے کی غرض سے اپنی ایک بیٹی پاک پتن کے ایک جاگیردار سردار لال سنگھ سے بیاہ دی تھی جس نے اپنے نسبتی بھائیوں کو سکھ فوج میں بھرتی کرا دیا۔ ان میں جوندھ سنگھ نے دیوان محکم چند کی کمان میں افغان وزیر کے خلاف لڑائی میں بھرپور حصہ لیا۔ رنجیت سنگھ موکل سرداروں کی اس وفاداری سے بہت خوش ہوا اور انہیں جاگیروں سے نوازا اور ایک بھائی کو ضلع گجرات میں افغان کے خلاف بھرپور کردار ادا کرنے کے عوض پانچ گاؤں بخش دیئے۔ موکل سردار سکھوں کے شانہ بشانہ لڑتے رہے اور مسلمانوں کو زک پہنچانے میں ان سرداروں کا بڑا ہاتھ رہا ہے حتیٰ کہ ۱۸۲۹ء میں ان کے ایک فرد چھتر سنگھ نے دین اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام فتح دین رکھ لیا۔ ان کی مسلمان بیوی سے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ البتہ اس خاندان کے دوسرے افراد بدستور سکھ رہے اور انہوں نے راجہ لال سنگھ کے زمانہ میں نہ صرف اپنی چھینی ہوئی جاگیریں واپس لیں بلکہ فوجی خدمات کے عوض نئی زمینیں بھی حاصل کیں۔ ۱۸۶۱ء میں ایک موکل فرمان سنگھ نے پولیس کی ملازمت کے

دوران جو خدمات سرانجام دیں تھیں، اس کے عوض انہیں موکل کے قریب ۳۸ دیہات کا ذیل دار اور آنریری پولیس مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں انہیں ۲۰۷ ایکٹر زمین چونیاں میں دی گئی۔ مانا سنگھ ۱۸۸۳ء میں وفات پا گئے۔ اس کا بیٹا ناریان سنگھ ذیل دار اور نمبردار بنا دیئے گئے۔ اس کی موت ۱۹۰۰ء میں واقع ہوئی۔

اس کے دو بیٹے پرتاب سنگھ اور لابھ سنگھ مسلمان ہو گئے۔ پرتاب سنگھ نے اپنا نام بشیر احمد رکھ لیا۔ انہیں لاہور اور حصار میں ۲۲۰۰ ایکٹر زمین الاٹ کی گئی اور ۵۶۰ ایکٹر چناب کالونی میں الاٹ کی گئی۔ انہوں نے ۳۰ سال تک پنجاب اریگیشن ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی کلکٹر تک کی خدمات سرانجام دیں اور انہیں ۲۰۰ روپیہ کی پنشن بھی ملتی رہی۔ انہوں نے اریگیشن اور موکل خاندان کے بارے میں کتابیں بھی لکھیں۔ ان کا ایک بیٹا حفیظ اللہ اور ایک رشید احمد تھا۔ لابھ سنگھ کا اسلامی نام محمد عمر تھا۔ وہ بھی ذیلدار رہے ہیں۔ ان کے بھائی گوودڑ سنگھ کو انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف تعاون کے صلہ میں رکھ منڈی میں ۵۰ ایکٹر زمین دی گی۔ محمد عمر ۱۹۱۳ء میں فوت ہو گئے۔ ان کے بڑے بیٹے خان بہادر سردار حبیب اللہ خاں بار ایٹ لا تھے۔ وہ پنجاب لیجلیٹو کونسل کے ممبر بھی تھے۔ وہ ایک وقت میں لاہور ڈسٹرکٹ بورڈ کے نائب صدر میونسپل کمشنر لاہور رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں جنیوا میں لیگ آف نیشن کے اجلاس میں شرکت بھی کی۔ وہ انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ وہ پنجاب برانچ آف انڈین چیمبر کے نائب صدر اور زمیندار یونین کے جنرل سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ انہیں لمبرداری کے ڈھائی مربعے فیصل آباد میں الاٹ ہوئے تھے۔ حبیب اللہ کے تین بیٹے تھے ان میں حمید عمر، خالد عمر، اور سلیم عمر ایچی سن کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ خاندانی وراثت میں ذیلداری ارجن سنگھ کو مل گئی۔ جب چین کے ساتھ جنگ چھڑ گئی تو گوذر سنگھ نے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے عوض انہیں ۵۰ ایکٹر زمین تحفہ میں ملی۔ ان کے بعد موکل خاندان کی قیادت پنجا سنگھ کے پاس آ گئی۔ اس نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام عبدالرحمان رکھا۔ وہ اریگیشن کے محکمے میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے تین سال تک اس محکمہ میں خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۰۷ء میں انہیں خاں بہادر کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک وہ درجہ اول کے مجسٹریٹ کے اختیارات کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ رہے۔ موکل خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے انہیں صوبائی

دربدری بنادیا گیا۔ انھیں ۳۶۸ ایکڑ زمین موکل میں الاٹ ہوئی۔ انھیں لوئر باری دو آب کالونی منٹگمری میں ۱۳ مربعے زمین دی گئی۔ ان کا بیٹا بھی ایریگیشن کے محکمے سے ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ہی ریٹائر ہوا۔ یہ ۱۹۳۵ء میں فوت ہو گئے۔ یہ خاندان انگریز کی کاسہ لیسی کے لئے ممتاز رہا ہے اور اس کے عوض اس کے افراد نے بے شمار اراضی حاصل کی جس کی ملکیت آج تک چلی آرہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور کے موکل سردار بر سراقتدار طبقہ سے وابستہ رہے ہیں۔ جن میں سردار رشید، خالد عمر، عادل عمر، سردار عارف، رشید حسن اختر موکل، سیاست میں نمایاں رہے ہیں۔

لاہور کے قزلباش

لاہور کے جن خاندانوں نے سیاست میں شہرت پائی ہے، قزلباش خاندان ان میں نمایاں ہے۔ قزلباش کے معنی سرخ سر کے ہیں اور یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ یہ لفظ ان ٹوپیوں کے بارے میں استعمال ہوتا تھا جو غلاموں کو پہنائی جاتی تھیں اور اس کی ابتدا تیمور اعظم نے شیخ حیدر سے کی تھی۔ ڈاکٹر ہربلوٹ نے اپنی کتاب "تاریخ مشرق" میں لکھا ہے کہ سرخ ٹوپیوں کی ابتدا سلطان اسماعیل نے کی تھی۔ جو ۹۰۷ھ میں ایران کا حکمران تھا۔ اس نے اپنی فوج میں سرخ ٹوپیوں کا رواج دیا تھا اور ان پر بارہ لیسوں کی پگڑیاں باندھی جاتی تھیں، بارہ لیسوں کو بارہ اماموں کے نشان کے طور پر باندھا جاتا تھا کیونکہ سلطان اسماعیل اپنے آپ کو ان اماموں کی اولاد میں شمار کرتے تھے۔ قزلباش قبیلہ بحرہ کیسپین کے ساحل پر آباد تھا اور اپنی شوریدہ سری، بغاوت اور لوٹ مار کے لئے بدنام تھا۔ گریفن کا بیان ہے کہ ایران کا بادشاہ ان لوگوں کو ہمیشہ شاہ کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ جن لوگوں کو گرفتار کر لیا جاتا، ان کو مجرموں کی سرخ ٹوپی پہنا دی جاتی اور اسی بنا پر وہ قزلباش کہلاتے۔ ایک اور مورخ کے بیان کے مطابق یہ شہنشاہ کی فوج میں بھی بھرتی ہوئے۔ ان کے وردی میں سرخ ٹوپی شامل تھی۔ اس لئے وہ قزلباش کہلائے۔ یہ تو مورخین کی مختلف آرا ہیں۔ لیکن روس کے علاقے کو سب سے پہلے خیرباد کہنے والوں میں سردار علی خان کا نام سب سے نمایاں ہے جو اس وقت نادر شاہ خلجی کو بھگا کر خراسان پر قبضہ کر چکا تھا اور ہندوستان پر حملہ کرنے کے منصوبوں میں مصروف تھا۔ ۱۷۳۸ء میں جب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اپنے ساتھ علی خان اور دوسرے سرداروں کو بھی ساتھ لے آیا کیوں کہ اسے خدشہ تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں قزلباش بغاوت یا سازش کے ذریعے ان کی حکومت کا نظم ونسق برباد کر سکتے ہیں۔ علی خان،

نادر شاہ کی ہندوستانی مہموں میں اس کا دست راست بن کر رہا۔ واپسی پر نادر شاہ نے علی خان کو اس کی خدمات کے صلہ میں قندھار کا گورنر بنا دیا۔ دو اور قزلباش سرداروں کو ان کی خدمات کے صلہ میں کابل اور پشاور کی کمان دے دی گئی۔ نادر شاہ قزلباشوں کی بے وفائی اور سازشوں سے خائف تھا اور اسی خوف کے باعث ان کے سرداروں کو ایران سے باہر رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ ایران میں اس کی حکومت کے لئے چیلنج نہ بن سکیں۔ آٹھ سال تک یعنی ان کی تعیناتی سے نادر شاہ کی ہلاکت اور نادر شاہ درانی کے برسراقتدار آنے تک ایران میں امن وسکون رہا۔

احمد شاہ درانی ۱۷۴۷ء میں قندھار میں تخت نشین ہوا، قزلباشوں پر اسے کوئی اعتماد نہ تھا لیکن اس کی حکومت کو اتنا استحکام حاصل نہ تھا کہ وہ قزلباشوں کے خلاف کھل کر کوئی قدم اٹھا سکتا۔ اس نے چیدہ چیدہ سرداروں کو جاگیریں اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا۔ ان عنایات کے صلہ میں وہ احمد شاہ درانی کے پکے وفادار بن گئے۔ قندھار کے جنوب میں ہزارہ کا ضلع علی خان کو دے دیا گیا اور اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہرات پر خود بخود قبضہ کر کے اپنے ضلع کی حدود میں اضافہ کر لیا۔ ۱۷۶۰ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر آخری حملہ کیا تو علی خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ پانی پت کی فتح اور مرہٹوں کی طاقت کا خاتمہ انہی کی چالاکیوں کا مرہون منت تھا۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے احمد شاہ کے دل میں حسد کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ افغانستان واپس پہنچ کر احمد شاہ نے علی خان کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کی کوشش کی تاکہ حکومتی معاملات میں وہ اور نمایاں ہو کر اس کی حکومت کے لئے متبادل قیادت ثابت نہ ہو سکے۔ اس لئے احمد شاہ نے علی خان کو جاگیروں اور کمان سے محروم کرنے کی کوشش کی۔ علی خان کھل کر احمد شاہ کے مقابلہ میں آ گیا اور درپردہ اس کو قتل کرانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ لیکن احمد شاہ نے انتہائی چالاکی سے ۱۷۷۰ء میں اسے قتل کرا دیا۔ علی خان کا بڑا لڑکا گل محمد خان اپنے باپ کی موت کے وقت چھ سال کا تھا۔ اس لئے ضلع میں بے چینی پھیل گئی۔ کچھ عرصہ تک علی خان کی بیوہ نے ضلع کا انتظام والفرام خود سنبھالا۔ آخر کار ضلع کی خود مختاری کئی حصوں میں بٹ گئی اور ایک دوسرے کے مخالف سردار تیمور شاہ کی مخالفت پر بھی متحد ہوئے جو احمد شاہ کے بعد کابل پر تخت نشین ہو چکا تھا۔ جب علی خان کے بیٹے جوان ہوئے تو انہوں نے اپنی جاگیر کا بہت بڑا

حصہ واپس لے لیا اور تیمور شاہ نے موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے مفاہمت میں ہی بہتری سمجھی۔ اس نے گل محمد خان کو قندھار بلایا جہاں اس کا شایان شان خیر مقدم کیا گیا اور اسے سردار کے خطاب سے نوازا گیا۔

سردار علی خان کا لڑکا حیات خان شاہ زمان کے ساتھ ۱۷۹۷ء میں لاہور آیا اور چند ماہ تک مقیم رہا۔ کابل واپس جا کر اس نے امیر دوست محمد خان کے بھائی اسد خان سے اپنی جاگیروں کا تبادلہ کر لیا۔ ۱۸۱۳ء میں ان کا سب سے چھوٹا بھائی علی محمد خان چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ وزیر فتح خان اور اس کے چھوٹے بھائی محمد اعظیم خان کے ہمراہ کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ فتح کے بعد اعلیٰ فوج کی کمان اس کے سپرد کی گئی۔ جس پر وہ آٹھ سال تک اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا۔

کابل واپس پہنچ کر وہ ہدایت خان کے ساتھ مشترکہ طور پر اپنی خاندانی جاگیر کا منتظم رہا۔ وہیں پر ۱۸۳۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی وفات کے وقت علی اکبر خان اور اس کا بڑا لڑکا فوت ہو گیا چنانچہ علی جان خان کابل میں اپنے باپ کے حصے کی جاگیر کا وارث بنا۔

حیات کی ۱۸۳۶ء میں وفات ہوئی اس کی جائیداد کے وارث اس کے چھ لڑکے تھے۔ اس کا بڑا لڑکا وزیر فتح محمد خان کے احکام کے تحت ہرات میں خدمات انجام دیتا رہا جب شہزادہ کامرانی نے اس کے آقا کی آنکھیں بند کر دیں تو وہ کو. لنڈیل اور شیر دل خان کو لے کر قندھار چلا گیا جہاں وہ چند سال تک مقیم رہا اور پھر اپنے چچا کے ساتھ کشمیر چلا گیا۔ واپسی پر وہ کابل میں اپنے بھائی علی رضا کے ساتھ مقیم ہوا۔ برٹش حکومت نے جب افغانستان پر حملہ کیا تو اس نے تاج برطانیہ کا ساتھ دیتے ہوئے فرنگی فوج کی بہت خدمت کی اور ان کے لئے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس کا دوسرا بھائی محمد حسین خان، محمد عظیم خان کا زبردست حامی تھا اور اس کے ماتحت ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ عظیم کی وفات کے بعد وہ کابل واپس آ گیا اور دوست محمد خان کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۴۴ء میں وہ مقامات مقدسہ کی زیارت کو گیا اور چند سال تک وہاں مقیم رہا۔ اس کا تیسرا بھائی حاجی محمد خان، عظیم محمد خان کی وفات اور دوست محمد کی تخت نشینی کے درمیانی عرصہ میں کابل کے حکمران حبیب اللہ خان کا وزیر تھا۔ دوست محمد کی تخت نشینی کے وقت وہ ریٹائر ہو کر مکہ چلا

گیا اور واپسی پر علی رضا خان کے ہاں رہائش اختیار کر لی۔ علی رضا خان ہمیشہ اپنی آبائی جاگیر پر مقیم رہا جسے افغانستان میں زرخرید کہا جاتا تھا۔ اصل میں یہ جاگیر انہیں فوجی خدمات کے صلہ میں ملی تھی۔

۱۸۳۹ء میں جب برطانوی فوج شاہ شجاع کے ساتھ کابل میں داخل ہوئی تو شہر میں علی رضا کا خاصا اثر و رسوخ تھا، چنانچہ اسے وہاں چیف ایجنٹ بنا دیا گیا۔ اس حیثیت میں اس کا کردار مثالی تھا۔ اس نے سامان خورد و نوش اور نقل و حمل کے ذرائع برطانوی فوج کو فراہم کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور جب حریت پسندوں نے برطانوی چھاؤنی کو گھیرے میں لے لیا تو وہ اس دوران برطانوی مفادات کے لئے کام کرتا رہا۔ جب برطانوی افسروں اور خواتین کو حریت پسندوں نے قیدی بنایا تو علی رضا خان نے ان کی رہائی کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں۔ اس مقصد کے لئے وہ محمد شاہ غلزئی کو ۵۰۰ روپیہ ماہوار اور اس کے جونیئر افسروں کو بھی رشوت دیتا رہا تاکہ وہ برطانوی قیدیوں سے اچھا سلوک کریں۔ انگریز قیدیوں سے علی رضا کی ہمدردی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس نے ایک سو ہندوستانی جاسوسوں کو بھی غلامی سے بچایا اور انہیں خفیہ طور پر اس وقت تک اپنے پاس رکھا جب تک کہ مزید برطانوی فوج کابل نہیں پہنچ گئی۔ جب علی رضا خان نے مرتضیٰ خان کو زد کثیر دے کر صالح محمد خان کے پاس بھیجا جو قیدیوں کی نگرانی پر معمور تھا تاکہ اسے بھی ورغلایا جائے۔ یہ اس کے اثر و رسوخ اور دولت کے بے دریغ خرچ کا نتیجہ تھا کہ فرنگی قیدی فرار ہو کر بچی کھچی فوج میں شامل ہو گئے۔

جب اکبر خان اس جرنیل پر حملہ آور ہونے کے لئے آگے بڑھا تو علی رضا خان نے قزلباش سرداروں کو ان سے ورغلا کر فرنگیوں کا طرف دار بنا دیا۔ چنانچہ لڑائی سے قبل وہ اکبر خان کو چھوڑ گئے لیکن شکست پھر بھی فرنگیوں کی ہوئی۔ فرنگی فوجوں کی پسپائی کے بعد علی رضا خان اس کے ساتھ ہی ہندوستان چلا آیا کیونکہ انہیں قوم سے غداری پر سخت سزا دی جا سکتی تھی۔ اکبر خان کے دل میں علی رضا کے لئے شدید نفرت تھی اور کابل میں لوگ اس کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس کی تین لاکھ مالیت کی جاگیر ضبط کر لی گئی۔ اس کا مکان مسمار کرا دیا گیا۔ سردار علی رضا خان نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اپنی دولت، پوزیشن اور خاندانی وراثت سے ہاتھ دھو کر اس فریق کا تنہا ساتھ دیا جس کے ساتھ وہ وفا

دار رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس کے اور اس کے خاندان نے فرنگی حکومت کے استحکام کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ستلج کی مہم میں وہ اپنے بھائیوں اور ساٹھ گھوڑ سواروں کے ساتھ فرنگیوں کے کیمپ میں شامل ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں وہ میجر لارنس کے ساتھ کانگڑہ اور کشمیر گیا۔ ۴۹ ـ ۱۸۴۸ء کی بغاوت میں اپنے بھتیجے شیر محمد کی معیت میں ایک سو گھوڑ سوار مہیا کئے جو فرنگی مفاد کی خاطر لڑے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب ان کی عسکری ضروریات بڑھ گئیں تو علی رضا نے دہلی کے لئے گھوڑ سواروں کا ایک دستہ تیار کیا کیونکہ اس کا لاہور رہنا ضروری تھا۔ یہ گھوڑ سوار دستہ اپنے بھائیوں محمد رضا خان اور محمد تقی خان کی معیت میں روانہ کیا۔ اس دستہ کی تیاری کے لئے اس نے فرنگیوں سے کوئی مالی معاونت حاصل نہیں کی تھی کیونکہ اس وقت فرنگیوں کو پیسے پیسے کی ضرورت تھی۔ یہ علی رضا کا فرنگیوں پر بہت بڑا احسان تھا۔ اس نے اپنے مکان کو گروی رکھ کر یہ دستہ تیار کیا۔ اس دستہ میں اپنے بھائیوں کے علاوہ بھتیجوں اور بھانجوں کو بھیجا جن میں عبداللہ خان، محمد حسن خان، محمد زمان خان، غلام حسن خان، اور شیر محمد خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

علی رضا کے اس دستے نے تمام مہموں میں متعدد مقامات پر معرکے مارے اور جہاں بھی گیا، کامران ہوا۔ اس مہم میں محمد تقی خان لڑتا ہوا حریت پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ علی رضا خان کا چھوٹا بھائی محمد رضا خان ایسی نڈر فوج کا ایک بہادر جوان تھا۔ وہ مالوا اور شمش آباد میں دو مرتبہ زخمی ہوا اور اس کے گھوڑے ہلاک ہوئے۔ جہاں کہیں گھمسان کی لڑائی ہوتی، بہادر محمد رضا خان وہاں موجود پایا جاتا۔ اس مہم کے بعد حریت پسندوں کے خون میں ہاتھ رنگنے کے اعزاز کے طور پر درجہ اول کا آرڈر آف میرٹ یعنی سردار بہادر کا خطاب دیا گیا اور دو سو روپے ماہوار کا وظیفہ دیا گیا۔ محمد رضا خان لکھنؤ میں چند روز قیام کے لئے ٹھہرا تھا اور یہیں اس کا انتقال ہو گیا۔

علی رضا خان لاہور میں اعزازی عہدے پر فائز تھا اور شہر میں اس کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ اس اثر و رسوخ کو اس نے ہمیشہ فرنگیوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا۔ کابل سے ریٹائر ہونے کے بعد اسے آٹھ سو روپے اور اس کے بھائی محمد رضا خان کو دو سو روپے ماہوار پنشن ملتی تھی۔ بغاوت کے خاتمہ کے بعد اسے اپنی خدمات کے صلہ میں اس کے قریبی علاقے

میں ۱۴۷ دیہاتوں کی تعلقہ داری دے دی گئی۔ جن کی سالانہ آمدنی ۱۵ ہزار روپے تھی۔ اسے خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس کے متذکرہ بالا بھانجے کو سردار بہادر کا خطاب ملا تھا کیونکہ اس نے بھی فرنگیوں کے وقار کو بلند کرنے کے لئے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ اپنی وفات کے بعد دو سال قبل ۱۸۴۸ء میں وہ بھی نواب بنا دیا گیا۔

علی رضا کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا نوازش علی خان ۱۸۴۸ء میں پشاور میں میجر لارنس کے ساتھ تھا جہاں سکھوں نے بغاوت برپا کر رکھی تھی۔ وہ آخری وقت تک اس فرنگی کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس وابستگی کی قیمت اسے پشاور میں اپنے مکان اور املاک کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ اس کا تیسرا لڑکا ناصر علی خان اودھ کی جاگیر کا انچارج تھا اور اسے وہاں اعزازی اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا اور فرنگی اس کے کردار سے بہت مطمئن تھے۔ ۱۸۶۶ء میں علی رضا کی وفات کے بعد نواب کا خطاب اس کے بیٹے نوازش علی کو مل گیا۔ وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔ اس نے ساری زندگی عوامی مفاد کے لئے وقف کر دی اور امن و سکون کے زمانہ میں اپنے کردار سے پنجاب کے امراء اور سرداروں کی فہرست میں اپنا نام شامل کروا لیا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں اسے اعزازی اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا گیا اور تین سال کے بعد انہیں سر کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں وہ مجلس قانون ساز کے لئے نامزد ہوئے کیونکہ فرنگیوں کے دل میں اس کے خاندان کے لئے بڑی عزت تھی اور قدم قدم پر اس کے خاندان نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے صلہ میں اسے رکھ جولیانہ (لاہور) (بعد ازاں جس کا نام علی رضا آباد رکھ دیا گیا) کے مالکانہ حقوق عطا کئے گئے۔ ۱۸۸۵ء میں اسے فرنگیوں کی طرف سے ہندوستانی سلطنت کا اعلیٰ ترین اعزاز دیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں سر نوازش علی خان کی وفات کے بعد نواب کا وراثتی خطاب اس کے چھوٹے بھائی ناصر علی خان کو ملا جو اپنے خاندان کا سربراہ اور صوبائی دربار میں اپنے بھائی کا جانشین تھا۔ انہوں نے ۲۵ سال تک سول سروس کے ذریعے انگریز بہادر کی خدمت کی اور ان کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ ناصر علی خان کے بعد اس کے بھتیجے فتح علی خان کو نواب کا خطاب منتقل ہو گیا اور وہ اپنے چچا کی جاگیر کا وارث اور اپنے خاندان کا سربراہ بنا اور ساتھ ہی انہیں صوبائی دربار میں نشست بھی حاصل ہو گئی۔ ۱۸۹۷ء میں نواب فتح علی خان پنجاب کی مجلس قانون کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں وہ پنجاب کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے

انگلستان گئے جہاں انہوں نے شاہ برطانیہ کی رسم تاجپوشی میں شرکت کی اور ۱۹۰۳ء میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے دہلی دربار میں مدعو کئے گئے اور سلطنت کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازے گئے۔ ۱۹۰۴ء میں انہیں گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز کا ایڈیشنل رکن بنایا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں وہ دوبارہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے دہلی دربار گئے۔ جنگ کے دوران فرنگی سلطنت سے اس کی خدمات اور وفاداری مثالی تھی۔ اس کی چند جنگی خدمات کا ذکر یہاں بے جانہ ہو گا۔ جنگ کی ابتداء میں انہوں نے ۱۶ ہزار روپے کی مالی معاونت کی۔ ۱۹۱۶ء میں ہوائی جہاز فنڈ میں ۶ ہزار روپے دیئے۔ دس ہزار روپے جنگی قرضے کے طور پر دیئے۔ مختلف مدوں میں اور بھی متعدد چھوٹی بڑی رقمیں دیں جن کا اندازہ ایک لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ وہ پنجاب اور صوبجات متحدہ میں اپنی جاگیر سے بے شمار رنگروٹ مہیا کرتے رہے۔ مزید برآں اس نے یہ پیش کش بھی کی کہ اس جنگ کے دوران اگر ان کی خدمات کی کہیں ضرورت ہو تو وہ خود اور اس کا بڑا لڑکا ناصر علی خان اس کے لئے تیار ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے فسادات کے دوران نواب نے ایک مرتبہ پھر فرنگی حکام کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ افغانستان کی آخری لڑائی کے وقت اسے کوہاٹ کرم فوج کے ساتھ رابطہ افسر کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ نواب کو علی گڑھ اور انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام لاہور میں مسلمانوں کی تعلیم سے گہری دلچسپی تھی۔

نواب صاحب اپنے شیعہ مسلک پر پوری طرح قائم تھے۔ انہوں نے چندہ اکٹھا کرے اور کثیر رقم اپنی گرہ سے ڈال کر لکھنؤ میں ایک شیعہ سکول اور شیعہ انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیا اور بذات خود کئی سال تک ان دونوں اداروں کے اعزازی جنرل سیکرٹری رہے۔ ۱۹۲۱ء میں انہیں انڈین ایمپائر کا نائٹ کمانڈر بنایا گیا۔ وہ پنجاب چیف ایسوسی ایشن، انجمن حمایت اسلام لاہور اور انجمن اسلامیہ کے صدر رہے۔ مختلف آزمائشوں میں فرنگی حکومت سے نواب کی وفاداری مثالی تھی۔ جس کو متعدد وائسرائوں اور لیفٹنٹ گورنروں نے سراہا وہ بے لوث اور تخیر مخلص تھے۔ فلاحی کاموں میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ وہ عوامی جذبہ سے سرشار ہونے کی وجہ سے پنجاب کے مسلم روساء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے نواب فتح علی کا انتقال ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ہوا اور انہوں نے اپنے پیچھے ایک انتہائی متمول جاگیر چھوڑی۔

خان بہادر محمد علی خان قزلباش "خاندان قزلباش کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ وہ نواب ناصر علی خان کے لڑکے اور نواب علی رضا خان خان کے پوتے تھے۔ وہ انتہائی چالاک اور زیرک تھے۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اعزازی مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر کی حیثیت سے کیا۔ بعد میں وہ لاہور میونسپل کمیٹی کے نائب صدر بن گئے اور اس عہدے پر ۱۹۲۱ء تک فائز رہا۔ ۱۹۱۰ء میں اسے خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ جیل کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے اس نے جیلوں اور دماغی امراض کے ہسپتال اور مریضوں کی فلاح و بہبود کے لئے قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔

جنگ عظیم کے دوران اس نے فرنگیوں کے لئے بے شمار رنگروٹ مہیا کئے۔ ۱۹۲۳ء میں فرنگی حکومت نے اسے صوبائی درباری بنا کر اسلحہ ایکٹ کی بعض دفعات سے مستثنیٰ قرار دیا۔ تحریک سول نافرمانی کے دوران بھی اس نے حکومت کی بڑی خدمت کی۔ ۱۹۳۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے ۵ لڑکے چھوڑے جن میں سردار علی رضا خان قزلباش سب سے بڑا تھا۔ سردار علی رضا خان کو اپنے باپ سردار بہادر محمد خان کی خدمت کے صلہ میں حکومت کی طرف سے دو سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی اور وہ ڈویژنل درباری بھی تھا۔ کچھ عرصہ وہ اسٹنٹ کمشنر بھی رہے۔ سلطان علی خان جو کہ باقر علی خان کا لڑکا تھا، ریلوے میں ایک گزیٹڈ افسر تھا اور اس نے ریلوے ملازمین کی ہڑتالوں کے دوران حکومت کے لئے قابل قدر خدمات سرانجام دیں جن کی بنا پر اعلیٰ فرنگی افسروں کی نظر میں اس کا وقار بڑھ گیا۔

اس کے بعد نواب سر فتح علی خان کا لڑکا نواب نثار قزلباش خاندان کا سربراہ بنا۔ اپنے والد کی وفات سے اپنی وفات تک فرنگی سلطنت کا انتہائی وفادار رہا اور اس نے خاندانی وفاداری میں سرمو فرق نہیں آنے دیا۔ اس نے اپنی تعلیم ہندوستان اور یورپ میں حاصل کی تھی۔ جارج ششم کی تاجپوشی کے موقع پر اسے نواب کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کی موت کے بعد ان کے بھائی نواب مظفر علی قزلباش خاندان کے سربراہ بنے اور انہوں نے سیاسیات پاکستان میں اپنے لئے اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ نواب مظفر علی قزلباش لاہور کے معروف سیاسی گھرانے کے سربراہ بنے تو پنجاب کے پارلیمانی سیاست پر ٹوانوں، نونوں، اور دولتانوں کا قبضہ دیکھا یہ پہلا موقعہ تھا کہ مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ کا تاج لاہور کے ایک شہری کے

سر پر رکھا گیا۔ سلطنت برطانیہ میں حکمت انگلشیہ کے سب سے زیادہ وفادار قزلباش گھرانے کے سربراہ نواب مظفر علی قزلباش بڑے دھڑے کے آدمی تھے۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ پاکستان کے یونیسٹ مخلوط حکومت کے جہاں دو مسلمان وزراء سر خضر حیات خان ٹوانہ اور میاں ابراہیم برق سیاسی لحاظ سے گمنام نہ تھے، وہاں نواب مظفر علی خان قزلباش اپنی شخصیت کے بل بوتے پر آسمان سیاست پر چمکے۔ قیام پاکستان سے قبل عام انتخابات میں یونی نسٹوں کو بڑی عزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ مسلم لیگ کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس سیلاب کے سامنے بڑے بڑے گھاگ خس و خاشاک کی مانند بہہ گئے تھے۔ اس دور میں مسلم لیگ کا مقابلہ کرنا کوئی آسان نہ تھا، چنانچہ یونیسٹ پارٹی کے صرف نصف درجن ارکان کامیاب ہوئے تھے جن میں نواب خضر حیات ٹوانہ اور نواب مظفر علی خان قزلباش نمایاں تھے۔ انہوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر صوبے میں مخلوط وزارت قائم کی تو نواب مظفر علی قزلباش اس وزات میں وزیر مال کی حیثیت سے شامل ہوئے جب خضر حیات ٹوانہ نے قائداعظم سے ٹکر لی تو اس لڑائی میں نواب قزلباش خضر حیات کے قریبی ساتھی تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے خلاف بھرپور کام کیا۔ انہوں نے آکسفورڈ میں مسلم لیگ کے خلاف تقریر بھی کر دی تھی۔ وہ قیام پاکستان تک یونیسٹ پارٹی کا ساتھ دیتے رہے۔ جب پنجاب کے غیور مسلمانوں نے غیر نمائندہ وزارت کے خلاف راست اقدام کا آغاز کیا تو کانگریس اور اکالی لیڈروں کے علاوہ جن لوگوں نے ملک سر خضر حیات کو مضبوطی کا مشورہ دیا تھا ان میں نواب مظفر علی قزلباش پیش پیش تھے اس دوران پورے بتیس دن ہر روز تقریباً لاکھ آدمیوں پر مشتمل جلوس مال روڈ سے گزر کو نواب قزلباش کی کوٹھی پر ختم ہوتا لیکن اس کی پر زور شخصیت نے عوامی مطالبات کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پاداش میں ہزاروں مسلمان جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ صوبے میں اس احتجاج کے دوران درجنوں مسلمان موت کے منہ میں اتر گئے۔ عوامی مطالبات کے سامنے جھکتے ہوئے سر خضر حیات ٹوانہ کے اعصاب جواب دے گئے اور اپنے ساتھیوں کے مشورے کی پروانہ کرتے ہوئے وزارت سے مستعفی ہوگئے۔ ان کا استعفیٰ سیاسیات ملکی سے کنارہ کش ہونے کی تمہید تھی۔ اس کے بعد اپنی وفات ۱۹۷۵ء تک وہ سیاست سے دور رہے لیکن ملک صاحب کے دست راست جناب مظفر علی قزلباش مضبوط اعصاب کے آدمی تھے۔ انہوں نے

سیاسیات سے کنارہ کش ہونے کی بجائے نہایت آسانی سے اپنی پارٹی بدل کر مسلم لیگ کے دو آنے کے ممبر بن گئے اور وہ قیام پاکستان کے بعد پنجاب اسمبلی میں انتہائی خاموشی اور شرافت سے مسلم لیگ کے بنچوں پر آ بیٹھے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ وہ عملی سیاست سے الگ رہے مگر جب صوبے کے انتخابات منعقد ہوئے تو انہوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ نے ٹکٹ دینے سے انکار کیا تو انہوں نے ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے مسلم لیگ امیدوار کو پچھاڑ دیا۔ اس دوران انہوں نے ممتاز دولتانہ سے یاری گانٹھ لی کیونکہ انہیں میاں ممتاز دولتانہ کے ماتھے پر مستقبل کی قیادت کی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ اس لئے کہ انتخابات میں ممتاز دولتانہ کی مساعی جمیلہ کے باوجود قائد ملت لیاقت علی خان نے انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسمبلی میں آزاد رکن کی بجائے نواب مظفر علی قزلباش نے پھر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر نے بھی انہیں گلے لگا لیا۔ نواب صاحب دو سال تک خاموش رکن کی حیثیت سے میاں ممتاز دولتانہ کے پیچھے مسلم لیگی بنچوں پر بیٹھے رہے۔ جب ۱۹۵۳ء میں لاہور میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا اور میاں ممتاز دولتانہ کی بجائے فیروز خان نون کو چور دروازے سے وزارت اعلیٰ کی گدی پر بٹھا دیا گیا تو نواب صاحب یکایک بیک بنچوں سے جست لگا کر نئی کابینہ میں وزارت مال اور وزارت بحالیات کے قلمدان کے محافظ بنا دیئے گئے۔ یہ ایک عجیب ستم ظریفی تھی کہ ایک ایسا شخص جس نے قدم قدم پر مسلم عوام کی سیاسی جدوجہد کو کچلنے کے بعد ہر حربہ استعمال کیا ہو، وہ صوبے میں اہم منصب پر بٹھا دیا گیا۔ نواب صاحب نے سیاسی قلابازی سے یہ سمجھ لیا کہ اب سیاست میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نواب قزلباش نے ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک پنجاب میں ڈنکے کی چوٹ پر راج کیا اور ان کے دور میں مسلم لیگیوں کو چوں چراں کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ملک محمد حسین چیٹھہ نے جرأت کی تو اسے پابند سلاسل کر دیا گیا لیکن جب نواب مظفر علی قزلباش نشہ اقتدار میں اپنی حد سے بڑھ گئے تو میاں مشتاق گورمانی نے ملک فیروز خان نون کی وزارت کو اقتدار سے الگ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی نواب صاحب کا دھوبی پٹڑا بھی ہو گیا۔ اس اثناء میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے۔ گورمانی اور دولتانہ کے علی الرغم ملک فیروز خان نون اور نواب مظفر علی قزلباش آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ اقتدار سے محرومی کے بعد انہیں

مسلم لیگ کی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح وہ ایک بار پھر انڈی پینڈنٹ بن گئے اور چند دنوں تک مرکزی آئین ساز اسمبلی میں بطور آزاد رکن کے حزب اختلاف کے بنچوں پر جا بیٹھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ گزشتہ نصف صدی میں نواب صاحب کو چند روز کے لئے حکومت کے مخالف بنچوں پر بیٹھنا پڑا۔

جب جنرل سکندر مرزا نے اپنی مخصوص مصلحتوں کے تحت ڈاکٹر خان صاحب مرحوم کی زیر قیادت ری پبلیکن پارٹی کا کھڑاک کیا تو نواب صاحب چھلانگ لگا کر راتوں رات جنم لینے والی جماعت میں شامل ہو گئے جس کا عوام میں وجود نہ تھا اور یہ جماعت محلاتی سازشوں کے ذریعے وجود میں آئی تھی۔ نواب صاحب ری پبلیکن پارٹی میں شامل ہونے کے باوجود ون یونٹ پارٹی کے رکن منتخب نہ ہو سکے۔ ان کے پرانے حریف میاں امیر الدین نے لاہور کے ووٹروں سے اس طرح گٹھ جوڑ کر لیا تھا کہ نواب صاحب اور ان کے ساتھی انتخاب میں حصہ ہی نہ لے سکیں۔

مغربی پاکستان کی اسمبلی میں جب چوہدری محمد علی کی کمزوری سے مسلم لیگ شکست کھا گئی اور ری پبلیکن پارٹی برسر اقتدار آئی تو نواب صاحب نے قیصر حکومت پر پھر منڈلانا شروع کیا۔ پہلے تو انہوں نے مرکزی وزارت میں اپنے لئے جگہ بنائی اور پھر چور دروازے سے ساہیوال سے اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ اب وہ ایک بار پھر ناقابل تسخیر پوزیشن کے مالک تھے۔ مرکز میں صدر مملکت اور فیروز خان نون علی الترتیب ان کی دائیں اور بائیں جیب میں تھے۔ انہوں نے صدر مملکت کو یقین دلا رکھا تھا کہ میرے سوا صوبے کو اور کوئی نہیں بچا سکتا۔ جب آئین سازی کا مرحلہ طے ہو چکا تو چوہدری محمد علی کو وزارت عظمٰی سے مستعفی ہونا پڑا۔ جب حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بنے تو انہوں نے ملک فیروز خان نون کو وزیر خارجہ کی حیثیت سے کابینہ میں شامل کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خان صاحب کو سردار عبدالرشید کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی تو مظفر علی قزلباش رشید وزارت میں شامل کر لئے گئے۔ بعد ازاں انہیں مرکزی ردوبدل کے باعث مرکزی وزارت میں لے لیا گیا۔ وہ سیٹو کے اجلاس میں پاکستانی وفد کی قیادت کے بعد واپس آئے تو مغربی پاکستان کی وزارت اعلیٰ کی کرسی ان کی منتظر تھی۔ ری پبلیکن میں انتشار کی افواہیں ایک مدت سے

گردش کر رہی تھیں۔ جب نیشنل عوامی پارٹی نے ری پبلیکن کی حمایت سے دستبردار ہو کر مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور ری پبلیکن پارٹی کی کشتی ڈولنے لگی تو اس کشتی کو بچانے کے لئے نواب مظفر قزلباش کو پیرا شوٹ کے ذریعے اتار دیا گیا۔ راتوں رات انہیں ری پبلیکن پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا اور دوسرے روز وہ صوبے کے چیف منسٹر منتخب ہو گئے۔ اب ان کے نشہ کی کوئی حد نہ تھی۔ ان سے زیادہ کامیاب انسان اور کون ہو سکتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ سارے پنجاب میں ان کے خلاف نعرے گونجتے تھے لیکن انہی نعرے لگانے والوں کے لیڈر بن کر وہ صوبے کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ مرکزی حکومت ان کے مشورے سے چلتی تھی۔ اس چند روزہ دور اقتدار میں نواب صاحب نے دھڑے بندیوں کے نئے ریکارڈ قائم کئے۔ وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کے جی میں نہ جانے کیا بات آئی کہ انہوں نے ایک جلسے میں اعلان داغ دیا کہ ری پبلیکن حکومت ایم ایلوں اور وزیروں کی جائیداد کا محاسبہ کرے گی۔ اور یہ چھان پھٹک بھی کرے گی انہوں نے دولت کیسے جمع کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدعنوان سیاسی رہنماؤں اور نودولتیے حضرات کا محاسبہ بھی کیا جائے گا جنہیں قیام پاکستان سے پہلے سائیکل نصیب نہ تھی مگر وہ آج پندرہ پندرہ فٹ لمبی کاروں کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔ وزیر اعلیٰ کی اس تجویز کو مسلم لیگ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے اس اقدام کو عوامی مطالبہ بنا دیا کہ محاسبہ کمیشن قائم کرو۔ اس پر حکومت میں شامل اور ان کے ہمنواؤں نے احتجاج کیا اور وزیر اعلیٰ کو سمجھایا کہ اگر کمیشن قائم ہو گیا تو بے شمار ری پبلکن پارٹی کے ارکان اس کے شکار ہو جائیں گے۔ آخر حکمران پارٹی میں کونسی کشش ہے کہ ایم ایل اے اس کا ساتھ دیں۔ اگر لائسنس پرمٹ اور اس قسم کی دیگر نعمتیں محاسبہ کی زد میں آتی ہیں تو پھر ری پبلیکن پارٹی کا منشور ہی ضبط کر لینا چاہئے۔ ملک فیروز خان نون نے ایک پریس کانفرنس میں محاسبہ کمیشن کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ محض کمیشن بنا کر صفحے سیاہ کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ لوگ اپنا اثاثہ غیر ملکی بینکوں میں منتقل کروالیں گے اور غیر ملکی بینکوں کی دیانت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کے حساب کتاب کے بارے میں اطلاعات بہم پہنچانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایک آزاد ملک کے وزیر اعظم کی اس بے بسی پر رحم آتا ہے محاسبہ کی بات تو نواب مظفر علی قزلباش کے منہ سے ایسے ہی نکل گئی تھی کیونکہ یہ ملک کی اکثریت کی آواز تھی آخر کار نواب مظفر علی قزلباش اس محاسبے کی زد میں خود آ گئے ایک صحافی نے ان کی

شخصیت کا احاطہ کچھ یوں کیا تھا:

"نواب مظفر علی قزلباش ایک باصلاحیت، بے رحم، اور چاق و چابند انسان ہیں۔ وہ نواب سر فتح علی خان قزلباش کے تین بیٹوں میں سے منجھلے بیٹے ہیں۔ مجھے قزلباش خاندان کی تاریخ بیان کئے بغیر یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اگر ان کے بڑے بھائی نواب نثار علی خان مرحوم (جو خاندانی شرافت کا پاکیزہ نمونہ تھے) کی کوئی اولاد ہوتی تو نواب مظفر علی قزلباش کی وہی پوزیشن ہوتی جو آج کل ان کے چھوٹے بھائی نواب ذوالفقار علی خان کی ہے یعنی Law of primogeniture کے تحت ساری جاگیرات، زمینداری، جائیداد اور ٹرسٹ نواب نثار علی خان کی اولاد کو وراثت میں ملتے اور نواب مظفر علی خان کو بطور نواب زادہ گزارہ الاؤنس ملتا لیکن نواب نثار علی خان مرحوم کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے قزلباش فیملی کی روایات، وراثت کے مطابق تمام املاک نواب مظفر علی خان کو ملیں نواب مظفر علی خان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ ان کی پہلی بیوی کے بطن سے ایک بیٹی ہیں جو ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ نواب صاحب کی طبیعت میں تختی، درشتی اور تلخی کے گہرے عناصر ہیں انہوں نے ۱۹۳۶ء میں جب وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے، صوبائی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ سر سکندر حیات کے زمانے میں وہ بیک بینچر تھے لیکن سر سکندر حیات کے انتقال کے بعد سر خضر حیات ٹوانہ پنجاب کے چیف منسٹر بنے تو قائداعظمؒ سے ان کی کھٹ پٹ شروع ہو گئی تو نواب مظفر علی قزلباش یکایک گمنامی کے اندھیرے سے نکل کر سیاسی شہرت کی روشنی میں آ گئے اور کابینہ میں شامل ہونے سے پنجاب ان کے نام سے روشناس ہو گیا۔ جوں جوں مسلم لیگ سے جنگ کے دوران ملک خضر حیات ٹوانہ عوام سے کٹتے چلے گئے، نواب مظفر علی قزلباش ان کے مشیروں کے اندرونی حلقے میں بااثر ہوتے گئے۔ ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں شکست کھانے کے بعد یونینسٹ پارٹی نے عواقب و نتائج پر غور کئے بغیر پنجاب میں کانگریس اور اکالیوں سے مل کو لیشن وزارت بنائی جس کے سربراہ نواب ملک خضر حیات ٹوانہ بنے۔ نواب مظفر قزلباش اس کے مرد آہن تھے۔ میرے خیال میں برصغیر کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک موڑ پر ملک خضر حیات ٹوانہ کیا ایک ایسی کولیشن کی قیادت قبول کرنا جو مسلم لیگ اور قائداعظم کی مخالفت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا چکی تھی، ایک خوفناک اجتہادی غلطی تھی جس کے خونی نتائج

مسلمانوں کو بھگتنا پڑے۔ بالآخر جب پنجاب کے مسلمانوں نے اس غیر نمائندہ کولیشن وزارت کے خلاف تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا تو اب پیلس پورے ایک ماہ تک لاہور کے مسلمانوں کے احتجاج کا مرکز بنا رہا۔ ایک لاکھ کے قریب مسلمانوں کا عظیم الشان پرامن اور منظم جلوس موچی گیٹ سے شروع ہو کر بھاٹی گیٹ کے راستے مال روڈ پر آتا اور نواب صاحب کی کوٹھی تک "ہائے ہائے" اور "مردہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا پہنچ کر ختم ہو جاتا۔ جب ایسے شخص کو جو سارے پنجاب کے مسلمانوں کی سیاسی مخالفت کا مرکزی نقطہ بنا مسلم لیگ کی وزارت میں شامل کیا جائے تو اس کا عوامی اور قومی نفسیات پر جو ردعمل مرتب ہو گا، اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ کل تک وہ جس شخص کے خلاف نعرے لگا کر مستعفی ہونے پر مجبور کر چکے تھے، آج وہی شخص اپنی کار پر قومی جھنڈا لہراتے ہوئے اس کا پارلیمانی قائد کیسے بن بیٹھا۔ لوگوں کے تصورات کو ایک گہرا دھچکا لگا۔ مسلم لیگ کا جو امیج عوام کے ذہن میں تھا، وہ ٹوٹنے لگا۔"

یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ ہم اپنے سیاسی پس منظر کو بہت جلد بھول جاتے ہیں اس ملک کو ایسے ہی حکمران ٹولے نے لوٹا ہے جو بظاہر عوام کا خیر خواہ بن کر مسند اقتدار پر جا بیٹھتا ہے۔ پھر عوام سے کئے ہوئے وعدے اسے یاد نہیں رہتے۔ محاسبے کا نعرہ جو خود نواب مظفر علی قزلباش نے لگایا تھا، پارٹی کے ایم ایلیوں کے دباؤ کے باعث وہ محاسبہ کمیشن قائم نہ کر سکے البتہ وہ خود جب اس محاسبے کی زد میں آتے تو ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک سیاسی عمل میں حصہ لینے کے نااہل قرار پائے۔ اس ضمن میں ان پر جو الزامات عائد کئے گئے، اس کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس سے پہلے کہ مغربی پاکستان ایبڈو ٹریبونل ان کے خلاف سیاسی بدعنوانیوں کا مقدمہ چلاتا، انہوں نے الزامات سے پہلے ہی ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک رضاکارانہ طور پر سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ نواب مظفر علی قزلباش پر جو الزامات عائد کئے گئے وہ حسب ذیل تھے:

—— ریونیو افسروں کے مشورہ کے منافی سیاسی مقاصد کے تحت ناجائز جانبداری کرتے ہوئے ہدایت کی کہ حاجی محمد حنیف ایم پی اے کو ضلع جھنگ میں ایک پن چکی تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس طرح انہوں نے تعصّب بد انتظامی کا مظاہرہ کیا۔

— نواب مظفر علی قزلباش نے وزیر صنعت کی حیثیت سے اپنی سرکاری حیثیت اور اختیارات کے ناجائز استعمال سے اپنے سیاسی حامیوں کی ناجائز حمایت کرنے کے لئے اس وقت کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس لاہور رینج سے کہا کہ وہ برکی پولیس اسٹیشن کے سب انسپکٹر کو تبدیل کر دیں اور ان کے تجویز کردہ تین سب انسپکٹروں (راشی) میں سے ایک کو وہاں متعین کریں۔

— حکومت مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کی وساطت سے برکی پولیس اسٹیشن کے سب انسپکٹر انچارج کو تبدیل کرا دیا۔ اس وقت کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس لاہور رینج کو جس نے برکی کے سب انسپکٹر پولیس کو تبدیل کرنے اور مظفر قزلباش کے مجوزہ سب انسپکٹروں میں سے کسی ایک کو متعین کرنے سے انکار کر دیا تھا، تبدیل کر دیا۔ اس طرح انہوں نے عمداً حکومت کو ایک ہزار کا نقصان پہنچایا جو متعلقہ افسر نے سفر خرچ کے طور پر وصول کیا۔

— مسٹر مظفر علی قزلباش نے وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں اپنی سرکاری حیثیت اور اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اور سیاسی مقصد بر آوری کے لئے اس وقت کے وزیر خزانہ پیر زادہ عبدالستار کی سفارش سے اتفاق کرتے ہوئے بدعنوانی کا ثبوت دیا۔ ریونیو بورڈ سے مشورہ کئے بغیر اور محکمہ مال کے مشورہ کو نظر انداز کرتے ہوئے مسٹر عبدالحمید جتوئی ایم۔ پی۔ اے ضلع دادو کو پندرہ ہزار آٹھ سو پچاس روپے کا فائدہ پہنچایا۔

— وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے سرکاری اختیارات کے ناجائز استعمال سے صوبائی ایڈیشنل چیف سیکرٹری مسٹر ایس۔ اے مجید کو ہدایت کی کہ ننکانہ مائنر میں پانی کی سپلائی کی اجازت دی جائے اور موضع فیروز وٹواں کے شاہ محمد، انیس علی وغیرہ کو پانی دیا جائے جو وزیر اعلیٰ کی پارٹی کے آدمی تھے اور اس طرح حکومت کو ۴۰۰۰ ۴ ہزار کا نقصان پہنچایا اور اس کے علاوہ آئندہ کے

ان معمولی الزامات کے خلاف لڑنے کی بجائے انہوں نے رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لئے سیاست سے نااہلی قبول کر لی۔

قزلباش خاندان کے ممتاز قزلباش کے خلاف سرکاری عہدہ اور پوزیشن کے ناجائز استعمال، ذاتی فائدے اٹھانے اور حکومت کو سرمایہ سے محروم کرنے کے چھ الزامات عائد کئے تھے۔ مسٹر ممتاز حسین قزلباش ۱۹۴۸ء میں ریاست خیرپور کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے تھے اور ون یونٹ کے قیام تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد انہیں صوبائی کابینہ میں لے لیا گیا اور خوراک و زراعت کا عہدہ دیا گیا۔ وہ ڈاکٹر خاں صاحب، سردار عبدالرشید اور نواب مظفر علی قزلباش کی کابینہ میں وزیر رہے۔ ان کے خلاف جو الزامات عائد کئے گئے تھے، ان میں سے ایک اس وقت کے متعلق تھا جب وہ صوبائی وزیر خوراک و زراعت تھے اور باقی پانچ الزامات ریاست خیرپور کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے لگائے گئے تھے۔ مسٹر ممتاز حسین نے ٹریبونل کو جو اطلاع دی تھی کہ "میں ممتاز حسین قزلباش ساکن ۹۷ بی، گلبرگ لاہور، منتخب اداروں کے نااہل قرار دینے کے حکم مجریہ ۱۹۵۹ء کے آرٹیکل ۷ کی دفعہ ایک کے تحت ٹریبونل کی پیش کش قبول کرتا ہوں اور ۳۱ دسمبر تک عوامی زندگی سے علیحدگی اختیار کرتا ہوں۔"

نااہلیوں کی زد میں آنے کے بعد دوسری ضرب جو مارشل لاء کی طرف سے نواب مظفر علی خان کو لگی، وہ زرعی اصلاحات تھیں۔ اس طرح جاگیرداروں کے تسلط سے ایسی اراضی حکومتی ملکیت میں آگئی جو انہیں خوشامدوں اور حریت پسندوں سے غداری کے صلے میں ملی تھیں۔ یوں زرعی اصلاحات محلاتی سازشوں کے چیمپئن سیاستدانوں کے زوال کی باعث بنیں جو پاکستانی سیاست کو جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ نواب مظفر علی قزلباش کی ملکیت میں لاہور، لائل پور، اور بہاولپور کے اضلاع میں تقریباً چھ ہزار اکانوے ایکڑ زمین تھی جس میں ایک ہزار ایکڑ ذوالجناح کے نام کی جاگیر ہے۔ صرف لاہور میں ان کا رقبہ علی رضا آباد، ٹھوکر نیاز بیگ، بھوپتیاں اور کاہنہ کے قریب دو تین دیہات میں تھا۔ زرعی اصلاحات کے تحت امید تھی کہ وہ ۵۰۰ ایکڑ رقبہ ۳۶ ہزار یونٹس کے برابر اپنے پاس رکھ سکیں گے۔ انہوں نے ۳۶۵ ایکڑ زمین ضلع فیصل آباد کے چک نمبر ۲۲۲ میں اپنے پاس رکھنے کی

ور خواست دی تھی۔ باقی زمین وہ لاہور میں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس کے ساتھ ساتھ نواب مظفر علی قزلباش نے زرعی اصلاحات کی زد سے بچنے کے لئے ہبہ کی چھ درخواستیں بھی دی تھیں جنکے تحت وہ ڈیڑھ سو ایکڑ زمین اپنے رشتہ داروں کے نام منتقل کرنا چاہتے تھے۔ ہبہ کے لئے ان کے رشتہ داروں میں ان کی ایک ایسی شادی شدہ ہمشیرہ بھی تھی جو اس وقت تک ہندوستان میں مقیم تھی۔ نواب مظفر علی قزلباش کو متذکرہ رقبہ دینے کے بعد پانچ ہزار دو سو اکانوے ایکڑ رقبہ بچتا تھا جو بحق سرکار ضبط ہونا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے لمبا بہت بڑا رقبہ ٹرسٹ کے نام کروالیا۔ کچھ اراضی بانٹ اور گھوڑپال سکیم کے تحت حاصل کرلی اور عملاً انہیں زرعی اصلاحات کا اتنا نقصان نہ ہوا جس کا اتنا واویلا مچایا جا رہا تھا۔

جب ایوبی دور ختم ہوا تو نواب مظفر علی قزلباش جنرل یحییٰ خان کی منحنی سی کابینہ کے وزیر تھے۔ نواب مظفر علی قزلباش جب ایبڈو کے الزامات کے تحت سیاسی منظر سے ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تک ہٹ گئے تو قزلباش کے اقتدار کا سورج عارضی طور پر گہنا گیا۔ جب ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کے ذریعے انتخابات کروائے تو نواب مظفر علی قزلباش کے بھائی ریٹائرڈ میجر ذوالفقار علی کونشن مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور قومی اسمبلی کی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے لیکن انہیں وزارت یا اسی طرح کے کسی اور حکومتی عہدے سے نہ نوازا گیا۔ جب کونشن مسلم لیگ کا اقتدار ختم ہوگیا تو نواب ذوالفقار علی خان نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے لاہور کی نواحی نشست سے حصہ لیا لیکن بری طرح ناکام ہوگئے۔ نواب مظفر علی خان جب ایبڈو کی پابندیوں سے آزاد ہوئے تو انہوں نے سیاسی منظر پر نئی قیادت کو دیکھا اور دھڑے بندیوں اور منافقانہ سیاست کا دور بھی کس حد تک گزر گیا تھا تو انہوں نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۵ء تک اس خاندان کا کوئی فرد بھی قومی سیاست کے افق پر دکھائی نہ دیا۔ نواب مظفر علی خان کی اکلوتی بیٹی افسر رضا قزلباش جو یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے حال ہی میں لوٹی تھی، نے ۱۹۸۳ء میں پہلی بار ضلع کونسل کے انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئیں۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں لیاقت بلوچ سے شکست کھا گئی تھیں۔ بعد ازاں وہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئیں۔ محمد خان جونیجو کی کابینہ میں وزیر بنائی گئی اور خواتین کی مخصوص نشست پر قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ ۱۹۸۷ء میں ان کے کزن ضلع کونسل

کے انتخاب میں اپنے آبائی حلقہ رضا آباد سے شکست کھا گئے۔ محمد خان جونیجو کی کابینہ کو ضیاء الحق نے ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو رخصت کیا تو بے نظیر سیاسی افق پر نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ تب افسر رضا قزلباش نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔ ان کے کزن رضا علی پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر بری طرح شکست کھا گئے تھے۔ اس طرح سیاست کے افق پر چمکنے والا لاہور کا مشہور جاگیردار گھرانہ ایک بار پھر گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔

خان بہادر شیخ ناصرالدین

لاہور کے کلاں شیخ

پنجاب کا ایک ایسا جاگیردار گھرانہ بھی ہے جس کا سربراہ شیخ اجلالہ ہوشیارپور کے سربراہ سکھ سردار بھوپ سنگھ کے ہاں صرف منشی تھا لیکن اس کی اولاد نے انگریزوں اور سکھوں سے ساز باز کر کے دوآبہ جالندھر اور ریاست جموں و کشمیر کے مسلمانوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس خاندان کے افراد کے پاس فیصل آباد، لاہور، پاکپتن اور منٹگمری کے پاس ہزاروں ایکڑ اراضی ہے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کا صلہ ہے۔ نہ صرف انہیں زمینیں ملیں بلکہ یہ اعلیٰ حکومتی عہدوں پر بھی فائز رہے۔ شیخ اجلالہ کا لڑکا انتہائی ذہین اور سمجھ دار تھا۔ ہوشیارپور کے سردار کی نظر غلام محی الدین پر پڑی تو اس نے اسے اپنے بیٹے شیودیال کے پاس ملازم کرا دیا۔ غلام محی الدین نے سکھ سرداروں کی خامیوں پر نگاہ رکھی اور ہندوؤں نے بھی اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔

1823ء میں افغانستان کے محمد اعظم خان نے راجہ رنجیت سنگھ کی طاقت کو کچلنے کے لئے پشاور پر چڑھائی کی۔ اعظم خان نے سکھوں کو اس حد تک تنگ کیا کہ انہوں نے اعظم خان سے صلح کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لئے رنجیت سنگھ کی نظر غلام محی الدین پر پڑی تاکہ وہ مذاکرات کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کریں۔ غلام محی الدین نے اعظم خان کے پیر کو ساتھ ملایا اور اس معاملے کو خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اعظم خان کے بھائی یار محمد خان کو سکھوں کا ہم نوا بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغان فوج غلام محی الدین کی سازشوں کا شکار ہو کر تتر بتر ہو گئی۔ اس کے بعد سکھوں کے دربار میں ان کی اہمیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

1827ء میں شیو دیال کے بھائی کرپارام کو ریاست جموں و کشمیر کا گورنر بنایا گیا تو وہ کرپارام کا خصوصی نمائندہ بن کر کشمیر چلا گیا۔ کرپارام کی طاقت کو کسی حد تک غلام محی الدین ہی استعمال کرتا رہا اور یہی دور تھا کہ جس میں اس خاندان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ وہ مالیہ وصول کرتا تھا۔ اس نے غریب مسلمانوں سے پیسہ بٹورنے کے لئے ایسے ایسے ظلم کئے کہ حکومت لاہور کو اس کا نوٹس لینا پڑا۔ اسے دو مرتبہ واپس بلا کر قید اور جرمانے کی سزا دی گئی لیکن وہ باز نہ آیا۔ آخر کار راجہ رنجیت سنگھ نے حکم دیا کہ اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی جائے۔ اس کے قبضہ سے ساڑھے نو لاکھ روپے نقد نکلے۔ وہ قسمیں کھاتا رہا کہ یہ روپیہ اس کے باپ نے اپنی ملازمت کے دوران جمع کیا تھا لیکن رنجیت سنگھ جانتا تھا کہ اس کے باپ نے ایک لاکھ روپیہ نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ غلام محی الدین کو ملازمت سے نکال دیا گیا۔ اس نے نونہال سنگھ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بھائی یار سنگھ سے یاری گانٹھی۔ اس نے نونہال سنگھ کے دشمنوں سے چن چن کر بدلے لئے اور وہ ان کے انتہائی وفاداروں کی صف میں شامل ہو گیا۔

1839ء میں انہیں دو آبہ جالندھر کا حاکم بنا دیا اور اگلے سال ہی اسے جنرل ونتورا کے ساتھ منڈی کے راجپوتوں کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ ابھی وہ لڑائی میں مصروف تھا کہ اس نے نونہال سنگھ کی موت کی خبر سنی تو وہ بھاگم بھاگ ان کی ماں رانی چند کورم کے پاس گیا اور اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا تاہم جب شیر سنگھ تخت نشین ہوا تو غلام محی الدین نے ان کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اس نے اس کی تمام خطائیں معاف کر دیں اور اسے گورنر کشمیر کے عہدے پر متمکن کر دیا۔ ان کے بیٹے نواب امام الدین کو جالندھر دو آبہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ باپ اور بیٹے نے اپنی ان حیثیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے وہاں دولت بھی سمیٹی۔ راجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں جب مسلمانوں نے سکھوں کے مظالم کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا تو وہاں امن قائم کرنے کے لئے غلام محی الدین کی خدمات حاصل کیں جو اپنے جابرانہ رویئے کی وجہ سے وادی کشمیر میں مشہور تھے۔ اس طرح سکھوں کے عہد میں مسلمانوں کے خون سے یہ خاندان اپنی ترقی کی تاریخ رقم کرتا رہا۔

غلام محی الدین نے چپکے چپکے انگریزوں سے دوستی برقرار رکھی۔ 1845ء میں ہی

جب انگریزوں نے پنجاب میں قدم جمانے شروع کر دیئے تو وہ سکھوں کے خلاف ضروری اطلاعات اور امداد مہیا کرتا رہا۔ انہیں انگریزوں کی وفاداری کا موقع نہ مل سکا کیونکہ 1845ء میں یہ پراسرار طور پر ہلاک ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد امام الدین باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔ 16 مارچ 1846ء کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کا سودا کیا تو وہ وہیں گورنر تھا۔ لاہور دربار میں گلاب سنگھ کی اس حرکت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے دشمن راجہ لال سنگھ نے امام الدین سے ساز باز کی اور پیغام بھیجا کہ وہ راجہ کی مخالفت پر کمربستہ رہے۔ امام الدین نے یہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور کشمیر کے مسلمانوں کا خون نچوڑ نچوڑ کر روپیہ جمع کرتا رہا۔ حتیٰ کہ مشہور ہو گیا کہ اس کے پاس دو کروڑ ہے۔ اگر غلام محی الدین اور امام الدین کشمیر کے مسلمانوں پر مظالم نہ ڈھاتے تو آج کشمیر کی تاریخ مختلف ہوتی۔ امام الدین کا خیال تھا کہ وہ انگریز افسروں کو رشوت دے کر ساتھ ملائے گا اور خود کشمیر کا وائسرائے بن جائے گا۔ اس لئے وہ راجہ لال سنگھ کی ہدایت پر بھی عمل کرتا رہا۔ اس نے سازش کے ذریعے راجہ گلاب سنگھ کی فوجوں کو رشوت دے کر ساتھ ملا لیا تھا۔ امام الدین نے راجوری کے راجہ رحیم اللہ خان کی امداد سے نہ صرف کشمیر میں اپنے پاؤں مضبوط کر لئے بلکہ اس نے انگریزوں سے مقابلہ کی بھی ٹھان لی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ انگریزی سپاہ کا مقابلہ کرنا خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف ہے تو اس نے کرنل لارنس سے وفاداری کا عہد کیا اور اس کی جانثاری کے لئے بے تاب رہا۔ اس نے اپنی صفائی کے لئے راجہ لال سنگھ کے خطوط بھی دکھائے کہ کشمیر میں ہونے والی بغاوت میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا بلکہ وہ تو حکم کے تحت اور مجبوری کے عالم میں ایسا کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ انگریز فوج کے ساتھ مل گیا اور ملتان کی مہم میں شریک ہوا۔ انگریز نے ان کی وفاداری سے خوش ہو کر نواب کا خطاب دیا اور انہیں 11,600 نقد انعام دیا۔ اس کے علاوہ 8400 روپے کی جاگیر دی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں امام الدین نے دو دستے خصوصی طور پر دہلی روانہ کئے تھے جنہوں نے آزادی پسندوں کا خون ناحق بہایا اور انہیں اذیت ناک موت سے دوچار کیا۔ ان کی موت 1859ء میں ہوئی۔ ان کا اکلوتا بیٹا غلام محبوب سبحانی بھی انگریزوں کا وفادار تھا۔

1862 ء میں پنجاب حکومت کی سفارش پر ان کے خاندان کی خدمات اور عملی
ون کی پذیرائی کے لئے مرکزی حکومت نے 5600 کی جاگیر غلام محبوب سبحانی کو عنائت
ی۔ انہوں نے بھی والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی حیثیت سے زیادہ وفاداری
کھائی۔ 1903 ء میں تاج برطانیہ کی تخت نشینی کی تقریب میں انہیں خصوصی مہمان کی
حیثیت حاصل تھی۔ ان کی موت کے بعد ان کے کزن شیخ ناصرالدین خاندانی جاگیر کے
وارث بنے۔ وہ ایکسٹرا جج اور تین سال تک بہاولپور ریاست میں وزیر رہے۔ یکم جنوری
1909 ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ ان کے والد شیخ فیروز الدین 1866 ء
میں تحصیل دار تھے۔ پانچ سال کے بعد ان کی خدمات ریاست بہاولپور کے سپرد کر دی گئیں
تھیں اور وہ وہاں سیشن جج کے عہدے پر متمکن ہوگئے۔ 1878 ء میں انہیں سینئر وزیر کا
درجہ حاصل تھا۔ انہوں نے ریاست بہاولپور میں جو خدمات سرانجام دی تھیں، حکومت
پنجاب نے ان کے اعتراف کے طور پر انہیں 1878 ء میں آنریری ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر
بنا دیا تھا۔ 1879 میں ان کی موت واقع ہوئی۔

شیخ سائدے خان بھی اس خاندان کے نمایاں افراد میں شامل تھا جو شیخ امام الدین کا
سیکنڈ کزن تھا۔ وہ فوج میں لیفٹنٹ تھے۔ اس نے ملتان میں سکھوں کے خلاف جس
بہادری کا مظاہرہ کیا اس کو انگریز کبھی فراموش نہ کر سکے۔ انہیں آنریری مجسٹریٹ بنا دیا
گیا۔ 1885 ء میں انہیں دو ہزار ایکڑ زمین منٹگمری میں آلاٹ کی گئی۔ ان کی موت
کے بعد ان کا بیٹا جاگیر کا وارث بنا۔ 1899 ء میں محمد حسین کو 6 مربعے زمین لائل پور
میں دی گئی۔ اس طرح یہ خاندان انگریزوں کی خوشنودی سے پروان چڑھتا رہا۔

لاہور کے بخاری فقیر

لاہور کے بخاری فقیر بھی حکومتوں کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں اس خاندان کو غلام محی الدین سے عروج حاصل ہوا تھا جن کے لاہور دربار کے ساتھ قریبی روابط تھے بعدازاں ان کے تین بیٹے امام الدین، عزیز الدین اور نور الدین بھی باپ کے طفیل لاہور دربار کے قریب ہو گئے تھے اور یہ خاندان ضلع لاہور کے قریب چونیاں اور بہاولپور ریاست کے علاقے میں اثر و رسوخ سے نمایاں ترین خاندانوں میں شمار ہوتے تھے اور ان کی زمین دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ اس خاندان کا بانی ایک عرب باشندہ جلال الدین تھے جو ساتویں صدی عیسوی میں بخارا میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ فقیر اور درویش ہونے کے باعث لوگوں نے عزت و احترام کے حوالے سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن بخارا کے حاکم ہلاکو خان کو جو ایک ظالم اور دہریا تھا، کو ان سے سخت نفرت تھی۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جلال الدین کو زندہ جلا دیا جائے لیکن وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا ان کی کرامات سے حاکم بخارا بہت متاثر ہوئے۔ وہ نہ صرف مسلمان ہو گئے بلکہ اپنی بیٹی جلال الدین سے بیاہ دی۔ اسی نسبت سے یہ خاندان بخاری فقیر کہلاتا ہے۔ تاہم ایک روایت یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ خود کو انصاری لکھتے تھے لیکن فقیر عزیز الدین نے اپنے آپ کو بخاری سید کہنا شروع کر دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فقیر عزیز الدین انگریزوں اور سکھوں کے درمیان رابطہ کا کام سرانجام دیتا رہا۔ انگریز اور سکھ انھیں دونوں مملکتوں کے درمیان دوستی کا محافظ قرار دیتے تھے۔ وہ سکھوں کے ساتھ کئی اہم فوجی مہمات میں شامل رہا۔ جہاں داد خان نے حملہ کر کے جب سکھوں کو تقریباً شکست دے ہی دی تھی تو اس موقع پر اگر فقیر عزیز الدین ان کی مدد نہ کرتے تو پنجاب کی تاریخ شاید کچھ اور ہوتی۔ 1835 ء میں جب امیر دوست محمد نے

سکھوں سے پشاور کا علاقہ خالی کرانے کے لئے حملہ کیا تو عزیز الدین نے امیر دوست محمد کے پاس قاصد بھیجے اور ان کے کیمپوں میں افراتفری پھیلا کر ان کی قوت کو پاش پاش کر دیا اور اس طرح افغان جنگ میں مجاہدوں نے سکھوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس شکست کی ساری ذمہ داری عزیز الدین پر عائد ہوتی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ، فقیر عزیز الدین کے اس کردار سے بہت خوش تھے۔ کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ فقیر عزیز الدین کے کردار سے اچھی طرح واقف تھے اور انہوں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی البتہ شیر سنگھ نے انھیں ایک بار پھر عروج بخشا اور ان کا مشورہ ضروری سمجھتے تھے۔

فقیر عزیز الدین انگریز کے قریب ہوتے چلے گئے۔ ان کے چھ بیٹے تھے جنھیں انگریزی دربار میں خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ان کے ایک بیٹے شاہ الدین کی موت 1842 ء میں ہوئی۔ وہ 1836 ء میں لدھیانہ میں پولیٹیکل آفیسر کے ایجنٹ تھے اور اس کے دو سال بعد انھیں فیروز پور میں وکیل تعینات کر دیا گیا۔ فقیر چراغ الدین کو بھی اعلیٰ حکومتی عہدے پر فائز کیا گیا۔ خلیفہ عزیز الدین کے ایک بیٹے جمال الدین نے تحصیل دار کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ حافظ آباد اور گوجرانوالہ میں بھی سرکاری ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں بعدازاں انھیں پنجاب اسمبلی میں میر منشی بنا دیا گیا۔ انھیں 1870 ء میں ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ انھیں خرابی صحت کی بنا پر 1883 ء میں ریٹائر کر دیا گیا انھیں پینشن کے علاوہ پولیٹیکل الاؤنس کے ایک ہزار ملتے تھے۔ وہ 1883 میں سب رجسٹرار مقرر ہوئے اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ میں انھیں ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ انھیں صوبائی درباری کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ عزیز الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام رکن الدین تھا۔ ناصر الدین تمام بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ وہ 1814 ء میں عین عالم شباب میں قتل ہو گئے تھے۔ جب انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کا فارمولا چل رہا تھا تو اس وقت فقیر عزیز الدین کے بھائی فقیر نور الدین نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ فقیر خاندان نے سکھوں سے جس بے مروتی سے آنکھیں پھیر کر انگریزوں سے وفاداری کی تھی، وہ فقیر خاندان کے اس کردار سے بہت خوش تھے۔ 1850 ء میں انگریزوں نے ان کی لائف جاگیر اور سالانہ الاؤنس 20885 مقرر کر دیئے۔ نور الدین کے دو بیٹوں ظہور الدین اور شمس الدین کو نقد پنشن 1000 اور

720 چھوٹے لڑکوں کو 540 روپے سالانہ ملتے تھے۔ نور الدین کی موت کے بعد الاؤنسز میں 400,1200 اور 1080 روپے سالانہ کا اضافہ کر دیا گیا۔

فقیر ظہور الدین اعلیٰ حکومتی عہدوں کے ذریعے وفاداری نبھانے میں نمایاں رہے ہیں۔ انہیں انگریزوں کی خدمت کے صلہ میں 500 ایکڑ زمین گوجرانوالہ میں دی گئی۔ علاوہ ازیں وہ صوبائی درباری رہے اور ان پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہی۔

نور الدین کے چھوٹے لڑکے شمس الدین نے تھانے داری سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ انہوں نے دوسری افغان جنگ میں حریت پسندوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ انہیں ترقی دے کر شاہ پور میں تحصیل دار لگا دیا گیا۔ خرابی صحت کی بنا پر انہیں بھی استعفیٰ دینا پڑا اور اگلے ہی سال انہیں آنریری مجسٹریٹ لگا دیا گیا۔ وہ میونسپل کمیٹی لاہور کے ممبر بھی رہے۔ وہ انسانی آزادیوں کے بڑے حامی تھے اور اس غرض سے انہوں نے ایک سوسائٹی بھی قائم کر رکھی تھی۔ شمس الدین 1872 ء میں فوت ہوئے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ برہان الدین بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے بھوپال ریاست میں اپنی تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی کیا۔ وہ یہاں نائب وزیر مال تھے انہیں جنوری 1888 ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ باپ کی موت کے بعد انہیں خاندانی جاگیروں کو سنبھالنا پڑا۔ ان کو ورثہ میں سینکڑوں ایکڑ اراضی ملی تھی۔ شمس الدین کے چھوٹے بیٹے زین العابدین نے وکالت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کی موت بھی 1904 ء میں ہو گئی۔ ظہور الدین کے دو بیٹے افتخار الدین اور اقتدار الدین اپنے دادا کے جانشین ثابت ہوئے۔ افتخار الدین نے 1886 ء میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ وہ پنجاب گورنمنٹ میں میر منشی، ریونیو اسسٹنٹ، ایکسٹرا اسٹینٹ آفیسر اور راجپوتانہ ریاست میں اہم ذمہ داریاں سر انجام دیتے رہے ہیں۔ انہیں لائل پور میں ہزاروں ایکڑ اور لاہور میں ۲ سو ایکڑ اراضی الاٹ کی گئی۔

فقیر سید قمر الدین نور الدین کے تیسرے بیٹے تھے۔ وہ خاندان کے سرپرست بھی رہے ہیں۔ وہ سکھ عہد حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ 1882 ء میں سر رابرٹ ایجرٹن نے 500 روپے کی خلعت انعام دی اور اسی سال انہیں سات سو گھماؤں زمین الاٹ کی۔ انہوں نے یہاں اپنے چھوٹے بیٹے جلال الدین کے نام سے ایک گاؤں بھی

آباد کیا۔ انہیں 1905 ء میں چناب کالونی میں دس مربعے زمین الاٹ کی گئی اور انہیں سیاسی پنشن بھی ملتی تھی۔ وہ لاہور میونسپل کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے کئی سال ممبر رہے۔ وہ لاہور میں آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ وہ صوبائی درباری بھی تھے۔ انہیں تمام وفاداریوں اور خدمات کے اعتراف میں 1887 ء میں تاجپوشی کی رسم کے موقع پر خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور انہیں

"Companionship of the order of the Indian Empire"

کا خطاب یکم جنوری 1909 ء کو ملا۔ اس حیثیت نے فقیر خاندان کو لاہور کا بااثر خاندان بنا دیا۔

انہیں تاریخ سے بہت شغف تھا اور انہوں نے اپنا ایک میوزیم بھی بنا رکھا تھا۔ ان کے بیٹے فقیر سید ظفر الدین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ریلوے پولیس تھے۔ انہوں نے یہاں انتہائی ایمان داری سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا اور انہیں خانصاحب کا خطاب دیا گیا۔ ان کا ہونہار بیٹا جلال الدین بھی ایچی سن کالج کے پڑھے لکھے تھے۔ وہ منصف اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر تعینات رہے۔ قیام پاکستان کے بعد فقیر مغیث الدین اس خاندان میں نمایاں رہے ہیں۔ وہ 1952 ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے ایک پرائیویٹ میوزیم قائم کیا جس میں بہت سی پرانی چیزیں موجود ہیں۔ ان کی دو بیویوں سے تین بیٹے ہیں۔ فقیر سید منیر الدین، فقیر سید رضی الدین اور فقیر سید سیف الدین ہیں سید منیر الدین کے بیٹے کمال الدین امریکہ میں بہت بڑا بزنس کر رہے ہیں اور تنویر الدین ڈاکٹر ہیں۔ فقیر سید شبیر الدین کئی فیکٹریوں کے مالک ہیں۔ انہوں نے انگلینڈ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس خاندان کے پاس جو کچھ ہے اس کا بہت بڑا حصہ ماضی کی نشانی ہے۔

ربوہ کے مرزائی

انگریز بہادر نے برصغیر پر اپنی حکمرانی کی طنابیں مضبوطی سے قائم رکھنے کے لئے ہندوستان کی قوموں میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی اختیار کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلمانوں میں نئے نئے فتنے کھڑے کئے۔ ان فتنوں میں مرزائیت کا خود ساختہ مذہب بھی انگریزوں کی گھٹیا ترین پروڈکشن تھی جس کا مقصد مسلمانوں کی قوت کو منتشر اور پارہ پارہ کرنا تھا۔ احمدی خاندان کی بنیاد کچھ اس طرح پڑی تھی کہ ۱۵۳۰ء میں بابر کے عہد میں ہادی بیگ سمرقند سے نقل مکانی کر کے گورداسپور میں رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ ہادی بیگ باعلم آدمی تھے۔ وہ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر قاضی اور مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہو گئے اور قادیان کے علاقے میں اس کا سکہ چلنے لگا۔ اس کے بعد ہادی بیگ کا خاندان نسل در نسل علاقہ میں عزت و تکریم کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ خاندان باہمی جھگڑوں میں بھی ملوث رہا جس کا واحد سبب جائیداد کی تقسیم تھا۔ اس کے بعد سکھوں نے ان سے جائیداد چھین لی تو یہ ان کے کاسہ لیس بن گئے۔ اس طرح نونہال سنگھ کے اور شیر سنگھ کے عہد میں غلام مرتضیٰ نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور انہوں نے مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور خاص طور پر صوبہ سرحد کے غیور پٹھانوں نے سکھوں کو ٹکنے نہ دیا تو حریت پسند پٹھانوں کے خون میں ہاتھ رنگتے غلام محی الدین نے بھی بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سکھوں کے شانہ بشانہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ جب بھائی مہاراج سنگھ نے دیوان ساون مل کی مدد کے لئے مارچ کیا تو غلام محی الدین دوسرے جاگیرداروں کے ساتھ حریت پسندوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے لئے ملتان پہنچ گیا۔

ان خدمات کے عوض سکھوں نے غلام محی الدین اور اس کے خاندان کو جاگیروں سے مالا مال کر دیا۔ غلام محی الدین کو ۷۰۰ سو گرانٹ اور اس کے بھائی غلام محی الدین کو قادیان میں وسیع جاگیر کے حقوق ملکیت دے دیئے گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس خاندان کا ریکارڈ سکھوں کے تعاون سے زیادہ روشن اور بھاری تھا۔ غلام مرتضٰی نے سینکڑوں آدمی اور اپنا بیٹا غلام قادر حریت پسندوں کی سرکوبی کے لئے نکلسن کے حوالے کر رکھا تھا جنہوں نے مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے اور انہیں گرفتار کر کے اذیت ناک سزائیں دیں۔ ان غداریوں کے صلہ میں جنرل نکلسن نے غلام قادر کو تعریفی سرٹیفکیٹ عنایت کئے۔ قادیان فیملی نے اپنے ضلع میں وفاداری کے حوالے سے کسی اور خاندان کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ ان کی دی ہوئی اطلاعات گرداسپور کے ضلع میں حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے بے حد معاون ثابت ہوئیں۔ غلام مرتضٰی کی موت ۱۸۷۶ء میں واقع ہوئی۔ ان کی موت کے بعد غلام قادر خاندانی معاملات کے سربراہ بنے۔ انہوں نے مقامی انتظامیہ سے تعاون کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ وہ کچھ عرصہ گرداسپور ڈسٹرکٹ آفس میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر بھی کام کرتے رہے۔ ان کا بیٹا لڑکپن میں ہی فوت ہو گیا تو اس نے اپنے بھتیجے سلطان احمد کو متبنیٰ بنا لیا۔ سلطان احمد نے نائب تحصیل دار کے عہدے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور ترقی پاتے پاتے وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر تعینات ہو گئے۔ انہیں قادیان کا نمبردار بھی بنا دیا گیا لیکن مرزا سلطان احمد کو انگریز بہادر نے خان بہادر کے خطاب کے علاوہ منٹگمری میں ۵ مربعے زمین دی۔ ان کی موت ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ ان کی موت کے بعد خاندان کے معاملات ان کے بڑے بیٹے مرزا عزیز کے پاس چلے گئے۔ انہیں خاندانی خدمات کے صلہ میں اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ خان بہادر سلطان احمد کے چھوٹے بیٹے مرزا رشید احمد کو سندھ میں انگریز کی طرف سے الاٹ کی ہوئی زمین کی ذمہ داریاں ادا کرنا پڑیں۔ انعام الدین جو کہ نظام الدین کے بھائی تھے، وہ رسالدار کی حیثیت سے فوج میں خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور خاص طور پر محاصرہ دہلی کے دوران وفاداری کے ثبوت میں درجنوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

مرزا غلام احمد قادیانی جو انگریز فتنہ "احمدی تحریک" کے بانی تھے، ۱۸۳۵ء میں

پیدا ہوئے۔ انگریز نے مرزائی مذہب کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۹۱ء میں نہ صرف امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کا مسیحا ہونے کا اعلان کیا جس کا مطلب (نعوذ باللہ) نبوت کا دعویٰ تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ماننے والوں کی ایک فوج تیار کی اور اس خود ساختہ مذہب کی تحریک انگریزوں کی بیساکھیوں اور مفادات کے سہارے چلتی رہی۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے فارسی، عربی اور اردو میں کئی کتابیں لکھیں جن کا مقصد مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو ٹھنڈا کرنا تھا جو انگریزوں کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں میں ابل رہا تھا۔ جب مسلمانوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے فریب کو سمجھ لیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس کی جانی دشمن ہو گئی تو انگریزوں نے غلام احمد کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی اس نے زندگی کی آخری سانس تک انگریزوں کی طرف داری کی۔ غلام احمد کے بعد احمدیہ تحریک کے سربراہ مولوی نور الدین کو نامزد کیا گیا۔ وہ بہت بڑے فزیشن تھے وہ کئی سالوں تک مہاراجہ کشمیر کی خدمات بھی سرانجام دیتے رہے اور مرزا غلام احمد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے ہر فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے۔ مولوی نور الدین کے بعد مرزا بشیرالدین احمدی تحریک کے خلیفہ نامزد ہوئے جو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بیٹے تھے۔ مرزا بشیرالدین کی قیادت میں احمدی تحریک نے بہت زور پکڑا اور وہ تنظیمی حوالے سے ہندوستان کی ایک قوت بن گئی۔ انگریزوں کے خلاف سیاسی بدامنی کا مظاہرہ ہوا اور عوام نے عدم تعاون کی تحریک شروع کر رکھی تھی تو مرزا بشیراحمد نے انہیں بھرپور امداد دی اور ان کے منیجر انگریزوں کو ضروری معلومات فراہم کرتے رہے۔ ۱۹۱۹ء تک پنجاب میں آنے والے تین گورنروں اور تین وائسرائوں نے مرزائیوں کی وفاداری اور ان کے عملی تعاون کی تحریری تعریف کی جو کہ ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ ان کے دوسرے بھائی مرزا بشیراحمد، مرزا شریف احمد، اور ان کے کزن مرزا گل محمد نے بھی ان کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ انہیں خدمات کے صلہ میں ۱۵۰۰ سو ایکڑ اونے پونے اور ۲۵۰۰ ایکڑ تعلق داری میں دے دیئے۔ علاوہ ازیں انہیں ضلع منٹگمری میں ۱۵ مربعے اور ۵ ہزار ایکڑ سندھ میں دیئے گئے۔ اس طرح یہ خاندان انگریزوں کی مسکراہٹوں کے سائے میں پلتا رہا اور مالی فائدے ان کی جھولی میں انگریز کی وساطت سے گرتے رہے۔ یہ سب انعامات مسلمان قوم کو گمراہ کرنے کے صلہ میں تحفہ تھے۔ مرزائی

تحریک میں بھی بالآخر بغاوت اور پھوٹ پڑ گئی۔ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی نے بشیر الدین محمود احمد خلیفہ ثانی کے خلاف بغاوت کر کے "لاہوری پارٹی کی بنیاد رکھی"

جو مرزا غلام احمد کے احکام کی اطاعت تو کرتی تھی لیکن وہ انہیں نبی کی بجائے مجدد مانتی تھی۔ تاہم مسلمانوں کے عناد میں دونوں جماعتیں یکسر ہیں۔ اکابرین دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب نے بھی عالمی سطح پر مرزائیت کا مقابلہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں قادیانی جماعت نے مسلمانوں کی سیاسی قیادت حاصل کرنے کے لئے ایک نیا منصوبہ بنایا۔ ڈوگرہ مہاراجہ نے کشمیر کے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے تھے، ان کا کوئی موثر جواب مسلمانوں کی طرف سے نہیں دیا جا رہا تھا۔ چنانچہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو مرزا بشیر الدین محمود نے بعض مسلمان اکابرین کو جمع کر کے آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی جس کے سربراہ وہ خود تھے۔ اس میں علامہ اقبال" بھی شامل تھے۔ علامہ اقبال" اور ان کے احباب نے محسوس کر لیا کہ انگریزوں کے پٹھو مسلمانوں کی قیادت اور ترجمانی نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مقصد قادیانیت کی تبلیغ سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس کمیٹی کا سربراہ کسی قادیانی کو نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح علامہ اقبال" نئے سربراہ بنے۔ قادیانیوں نے انگریزوں کے ایماء پر علامہ اقبال" کے خلاف بھی سازشوں کا جال پھیلا دیا اور انہیں دو سال کے اندر اندر مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ پنڈت نہرو قادیانیت سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے قادیانیوں کی حمایت میں ماڈرن ریویو کلکتہ میں لکھنا شروع کیا تو علامہ اقبال" نے اس کا بھرپور جواب دیا۔ قیادت کے مسئلہ پر مرزا بشیر الدین احمد نے ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو مجلس احرار کے ساتھ تصادم کیا۔ ۱۹۳۴ء کے بعد قادیانیوں کو احرار کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری" نے قادیان میں احرار کانفرنس منعقد کر کے اس جدوجہد کا آغاز کیا۔

قادیانیوں نے تقسیم بھارت کے خلاف بز(عم) انگریزوں اور کانگریس کے موقف کی ترجمانی کی۔ ۱۶ مئی ۱۹۴۷ء کے الفضل میں انہوں نے تقسیم ہندوستان کے سوال پر لکھا تھا کہ "ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوتے ہیں تو وہ خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں" قیام پاکستان کے بعد مرزائیوں نے کلیدی عہدوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس غرض سے انہوں نے فوج

اور بیوروکریسی میں پلاننگ کے تحت قبضہ کرنے کے لئے بے شمار افراد بھرتی کرائے۔ مسٹر ظفر اللہ خان پاکستان کے وزیر خارجہ تھے۔ انہوں نے اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستانی سفارتخانوں میں مرزائی افسر بھرتی کرائے اور ان کی مدد سے اور اپنے اثر و رسوخ سے بیرونی ممالک میں قادیانی مشن قائم کرائے۔ حساس اور باشعور لوگ ان چیزوں کو محسوس کر رہے تھے اور عوام میں چھن چھن کر اس طرح کی خبریں پہنچتی رہیں۔ قائد اعظم "اور لیاقت علی خان کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سر ظفر اللہ خان نے اپنا پورا وزن قادیانیت کے پلڑے میں ڈالنا شروع کر دیا۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں قادیانیوں کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں انہوں نے وزیر اعظم کا مشورہ قبول نہ کرتے ہوئے شرکت کی۔ اس طرح قادیانیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے سرکاری اثر و رسوخ کے استعمال کا الزام عوام کو ایک حقیقت نظر آنے لگا۔ احمدی خلیفہ کے بیٹے مرزا منظور احمد نے ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے قادیانی مشنریوں کی سرگرمیوں کی پشت پناہی کی۔ عوام میں دن بدن قادیانیت کی پر اسرار سرگرمیوں کے بارے میں بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں اور اس نئے مذہب کے ماننے والوں کو کافر قرار دینے کی تحریک جو ۱۹۵۳ء میں شروع ہوئی تھی، پنجاب میں خوفناک صورت حال اختیار کر گئی تھی اور پنجاب میں امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا جس کو کنٹرول کرنے کے لئے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کرنا پڑا۔ مولانا مودودی اور عبدالستار خان نیازی کو مرزائیوں کے خلاف تحریک چلانے کے جرم میں پھانسی کی سزا سنا دی گئی جس نے عوام کے جذبات کو اور مشتعل کر دیا۔ مسلم لیگ کی حکومت اس تحریک کے دوران عوام کا اعتماد کھو چکی تھی۔ میاں ممتاز دولتانہ اور خواجہ ناظم الدین دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھا کر مرزائیوں کے خلاف چلنے والی تحریک کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے۔ غلام محمد دونوں سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ پنجاب کی بدامنی کی ذمہ داری دولتانہ پر ڈال کر استعفیٰ دھروا لیا گیا۔ پھر ۱۹۳۵ء کے اختیارات کے تحت خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا گیا۔ ایک بار پھر قادیانیت کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک ٹھنڈی پڑ گئی۔ محمد علی بوگرہ، چوہدری محمد علی، سہروردی آئی آئی چندریگر اور فیروز خان نون وزارت عظمیٰ کی گدی پر آتے جاتے رہے لیکن احمدی تحریک کا اثر و نفوذ برقرار رہا۔
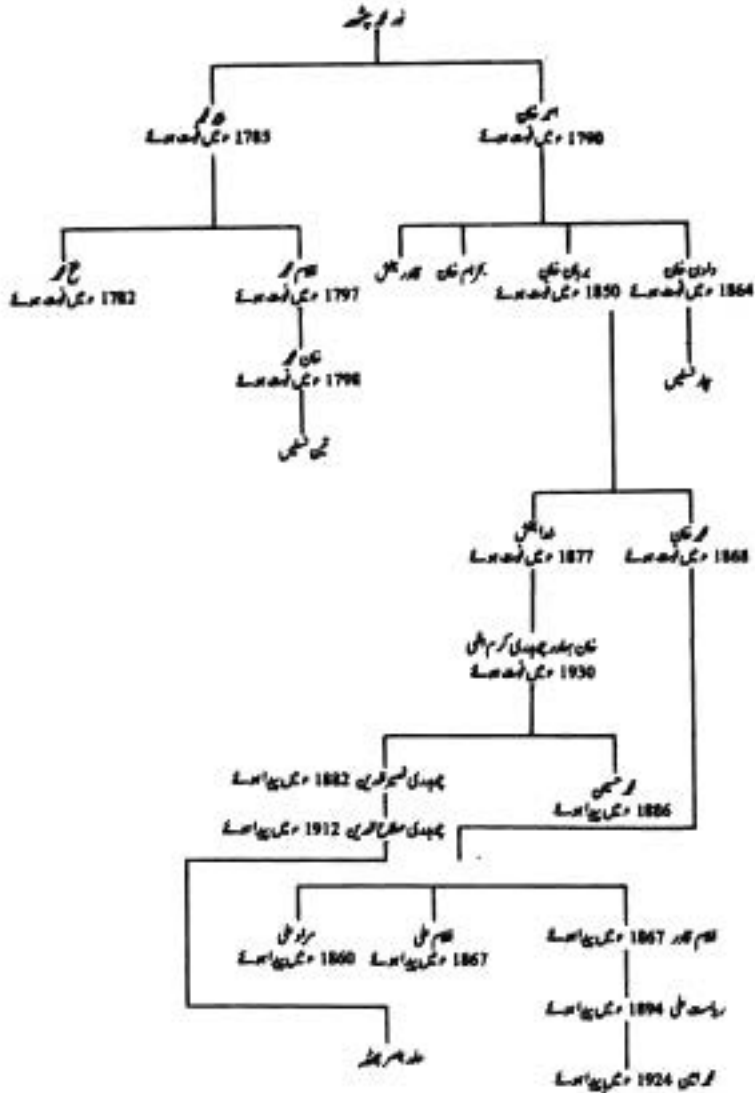
ایوب خان نے کونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو احمدی تحریک کے اثر و نفوذ کی جھلک ایوبی دور میں بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو برسراقتدار آئے تو ان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سہرا جہاں ملک کے کروڑوں غریبوں کے سر تھا اس کے ساتھ ساتھ مرزائیوں نے بھی دامے درمے سخنے بھٹو کی مدد کی۔ ۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ تفریحی ٹور پر تھے جب وہ ربوہ ریلوے اسٹیشن سے گزرے تو قادیانیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ بھٹو دور میں قادیانیوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اور سول بیوروکریسی میں ان کے نمائندے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے تھے۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ احمد رضا قصوری کے علاوہ یہ فیصلہ قومی اسمبلی نے اتفاق رائے سے منظور کیا تھا۔ قادیانی مسئلہ کے حل کے سلسلے میں پیپلز پارٹی میں آخری وقت تک اختلاف رائے تھا۔ لیکن حزب اختلاف کی جماعتوں کی طرف سے دباؤ، ملک گیر تحریک اور نازک مذہبی جذبات کے پیش نظر ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک کو سختی سے دبانے کی بجائے اس مسئلہ کو دستوری طور پر حل کر کے کریڈٹ لیا۔

پیپلز پارٹی کے دور حکومت کے اس تاریخ ساز فیصلہ کے بعد مرزائیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ ربوہ کو کھلا شہر قرار دے دیا گیا۔ جو قیام پاکستان کے بعد قادیان کی طرز پر خفیہ سرگرمیوں کا اڈا تھا۔ مرزا ناصر احمد جو کہ اس وقت خلیفہ تھے۔ ان کے لئے یہ فیصلہ صدمے کا باعث بنا۔ مرزا ناصر کے بعد مرزا طاہر خلیفہ نامزد ہوئے۔ ضیاء الحق نے ان کی خفیہ سرگرمیوں کو ناممکن بنا دیا تو انہوں نے اپنا مرکز لندن کو بنا لیا اور مرزا طاہر ملک سے باہر چلا گیا۔ وہ دنیا بھر کے غیر مسلموں کو گمراہ کرنے میں مصروف رہے قادیانی فرقہ کا ہر دور میں عروج رہا ہے انہوں نے اس خود ساختہ مذہب کو زیادہ تر بیورو کریسی میں گھسے ہوئے قادیانیوں کے ذریعے چلانے کی کوشش کی۔ سرکاری ملازموں کے ذریعے قادیانی مذہب کی ترویج و ترقی زیادہ تر مرزا ناصر کے دور میں پروان چڑھی جس سرکاری افسر نے مرزا ناصر کے اشاروں پر چلنے سے انکار کیا اسے اس کی سزا ضرور بھگتنا پڑی اس دور میں محکمہ تعلیم پنجاب کے ڈی پی آئی ڈاکٹر عبدالروف نے جب ان کے اشاروں پر چلنے سے انکار کیا تو انہیں کھڈے لائن لگا دیا گیا

گوجرانوالہ کے چٹھے

گوجرانوالہ، وزیر آباد اور شیخوپورہ کے علاقہ میں بسنے والے چٹھوں نے پنجاب کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ گذشتہ دو سو سالوں سے وہ مختلف حوالوں سے ہر آنے والے حکمران کی نظروں میں نمایاں رہے ہیں۔ ان کا مورث اعلیٰ ایک ہندو راجپوت گنگو تھا جس نے 1600ء کے لگ بھگ اسلام قبول کر لیا تھا۔ گوجرانوالہ، وزیر آباد اور شیخوپورہ کے اسی کے قریب دیہات میں زیادہ تر اسی قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے چٹھوں نے دہلی کے علاقے سے نقل مکانی کی تھی لیکن اس بارے میں تاریخ کا صحیح تعین نہیں ہو سکا۔ سب سے پہلے انہوں نے چناب کے کنارے درجنوں گاؤں خود بسائے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ علاقہ چٹھوں سے آباد ہو گیا۔ احمد نگر، رسول نگر اور ارد گرد کے کئی قلعے دشمنوں اور ہوسِ علاقہ کے مارے حملہ آوروں سے بچاؤ کے لئے آباد کئے گئے تھے گنگو کی اولاد میں سے نور محمد نے خاصی طاقت جمع کر لی تھی۔ ان کی عسکری اہمیت اور خوف کے باعث ملتان کے سکھ مہاراجوں اور جموں کے راجہ رنجیت دیو نے بھی ان سے یارانہ گانٹھ لیا۔ اس کے علاوہ نور محمد نے اپنے حسن سلوک سے چٹھوں کی سرداری کا حق ادا کر دیا۔ وہ اپنے سردار کی عزت و تکریم اپنے لئے فرض سمجھتے تھے۔

جب نور محمد سرداری کے قابل نہ رہا تو اس کے بیٹے احمد خان نے چٹھوں کو اپنے ارد گرد جمع کر لیا اور قرب و جوار کے علاقوں میں مار دھاڑ شروع کر دی ان کا سب سے زیادہ جانی دشمن شکر چاکیہ خاندان تھا جن کا چٹھوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ شکر چاکیہ خاندان سے دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے علاقے کی زمینوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا

اور ان کی بڑھتی ہوئی قوت اور طاقت چٹھوں کے لئے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔

سکھی عہد میں اور خاص طور پر سردار چڑت سنگھ کے زمانے میں چٹھوں کو عروج پانے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے گوجرانوالہ میں بھنگیوں کی توپ گاڑ کر اپنی قوت کا اعلان کر رکھا تھا تاکہ کسی کو سردار چڑت سنگھ کے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہ ہو سکے۔ احمد خان نے ان کی قوت توڑنے کے لئے توپ پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کی وجہ سے احمد خان کی اپنے بھائی پیر محمد سے ٹھن گئی کیونکہ پیر محمد سکھوں سے دشمنی کے حق میں نہ تھا۔ دونوں بھائی توپ پر قبضہ کرنے کے مسئلہ پر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ اسی دشمنی کی آگ میں احمد خان کے دو بیٹے اور بھتیجا مارا گیا۔ پیر محمد نے گوجر سنگھ اور صاحب سنگھ کو اپنے ساتھ ملا کر احمد خان کو پکڑ لیا اور اس وقت تک انہیں رہا نہ کیا جب تک احمد خان نے توپ واپس نہ کر دی۔ گرفتاری کے دوران احمد خان کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اس دشمنی میں چٹھے دن بدن زوال پذیر ہوتے گئے۔

احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا تو انہوں نے چٹھوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور جس گاؤں پر ان کا فرستادہ میر منو بھی قبضہ نہ کر سکا، اسے لے کر چٹھوں کو واپس کر دیا۔ چٹھوں کا دشمن سردار چڑت سنگھ 1774ء میں فوت ہو گیا اور ان کے ہم نوا اور ساتھی نور محمد اور پیر محمد بھی ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

چٹھوں کے سربراہ نور محمد نے احمد نگر، گاڑھی گل محمد اور رسول نگر کے علاقے بسائے۔ سکھوں نے رسول نگر کا نام رام نگر رکھ دیا۔ پیر محمد چٹھہ نے کئی قلعے تعمیر کرائے جن میں کوٹ میاں خان، علی پور جن کے سکھوں نے رام کلی گڑھ نوالہ، کوٹ تسلیم کوٹ علی محمد اور فتح پور رکھ دیئے۔

چٹھوں کا نیا سردار غلام محمد، شکر چاکیہ قبیلے سے شدید نفرت کرتا تھا۔ سردار چڑت سنگھ کا بیٹا مہان سنگھ بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔ اس کی بہادری اور سپہ سالاری کے قصے بھی مشہور تھے۔ ان کو علم تھا کہ ان کے باپ چڑت سنگھ کو چٹھوں نے سکھ کا سانس نہ لینے دیا تھا۔ غلام محمد کی صورت میں ایک دلیر سردار میسر تھا۔ اس علاقے میں امن اب اسی صورت میں قائم رہ سکتا تھا۔ یا تو سردار مہان سنگھ یا غلام محمد چٹھہ کی موت واقع ہو جائے البتہ چٹھوں نے خوش قسمتی سے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور قدم قدم پر سکھوں کو

شکستیں دیں۔ دو بہادر قومیں باہمی دشمنی اور رقابت کی آگ میں سالہا سال جلتی رہیں۔ کبھی چٹھے جیت جاتے اور کبھی چڑت سنگھ کے وارث اور کئی بار دونوں کے درمیان صلح بھی ہوئی تاکہ علاقے میں امن قائم ہو سکے لیکن مہان سنگھ کو زیادہ تر شکست ہوئی تھی اور اس کے دل میں بار بار انتقام کا جذبہ ابھرتا رہا اور یوں یہ صلح بار بار ٹوٹتی رہی۔

1790 ء میں سردار مہان سنگھ بہت زیادہ طاقت میں آگیا۔ اسی کے گھمنڈ میں وہ چٹھوں کے ایک گاؤں مینچر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مینچر کا محاصرہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ اس کشمکش اور لڑائی میں زیادہ تر جانی نقصان سکھوں کو ہی اٹھانا پڑا تھا۔ جب چھ ماہ کے طویل محاصرے سے چٹھے تنگ آگئے تو انہوں نے اس محاصرے کو توڑنے کا فیصلہ کیا۔ چٹھوں کے سردار غلام محمد اور اس کے چچا حشمت خان نے محاصرہ توڑنے میں پہل کی اور ہاتھی پر سوار ہو کر سردار مہان سنگھ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ غلام محمد ہاتھی پر سوار ہو کر سکھوں پر حملہ آور ہوا اور قریب تھا کہ سردار مہان سنگھ مارا جاتا کہ غلام محمد کے ساتھیوں نے انہیں زبردستی ہاتھی سے اتار کر اس کارروائی کو عملی جامہ نہ پہنانے دیا۔ جب غلام محمد نے محسوس کیا کہ اب قلعہ کو بچانا ممکن نہیں رہا تو اس نے اس شرط پر سردار مہان سنگھ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے کہ اسے حج پر جانے کی اجازت دی جائے۔ سردار نے یہ شرط مان لی لیکن بدعہدی کرتے ہوئے غلام محمد کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اور گاؤں لوٹ لیا۔ اس کے علاوہ قریبی علاقے پر بھی قبضہ کر لیا چٹھوں کی طاقت کو انہوں نے اس حد تک کمزور کر دیا تھا کہ ان میں دوبارہ ابھرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ غلام محمد کا بیٹا جان بچا کر افغانستان بھاگ گیا اور امیر افغانستان سے درخواست کی کہ وہ ان کی مدد کریں۔ چناب کے علاقے کا دوبارہ قبضہ لینے کے لئے 1797 ء میں شاہ زمان کے ساتھ واپس آیا۔ شاہ زمان نے سکھوں کو مار بھگایا اور یہ علاقہ دوبارہ چٹھوں کو واپس دلایا۔ شاہ زمان کی واپسی کے بعد چٹھوں سے یہ علاقہ دوبارہ سکھوں نے چھین لیا۔ رنجیت سنگھ نے چٹھوں کی قوت توڑنے کا عزم کئے رکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ چٹھوں کو اس علاقے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ کہتے ہیں کہ پیروں اور ولیوں نے بھی اس موقع پر چٹھوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ "پنجاب چیفس" کے مطابق چٹھوں نے اپنے گاؤں کے ایک پیر کو دعا کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا "تمہاری امداد میرے اختیار سے باہر ہے۔ پیران پیر (شیخ

عبدالقادر جیلانی") خود سبز چولہ پہن کر سکھوں کے شانہ بشانہ تمہارے خلاف لڑ رہے ہیں" نتیجہ یہ ہوا کہ جان محمد کو توپ کا ایک گولہ لگا اور اس کے مرتے ہی قلعہ کے دروازے سکھوں کے لئے کھل گئے۔

رسول نگر کے فتح ہوتے ہی چٹھوں کی تاریخ دن بدن محدود ہوتی گئی اور چٹھہ قوم تیزی سے سکڑنے لگی۔ جان محمد کے بیٹے کو رنجیت سنگھ نے جاگیر عنایت کی اور اسے اپنی فوج میں شامل کر لیا۔

بعدازاں جان محمد کے خاندان نے سکھ دشمنی میں 1849 ء اور 1857 ء میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ 49-1848 ء میں خدا بخش اور اس کی قوم سکھوں کے خلاف جانفشانی سے لڑتی رہی۔ خدا بخش کے دو پوتے غلام حیدر اور شمس الدین تھانے دار اور ڈپٹی تھانے دار بنا دیئے گئے۔

کاجر گولہ کا علاقہ جب انگریزوں کی عملداری میں چلا گیا تو 15000 روپے کی جاگیر خدا بخش کو زندگی بھر کے لئے دی گئی۔ ان کی موت 1857 ء میں ہوئی۔ کاجر گولہ کی 2700 سو ایکڑ زمین کی ملکیت کرم الٰہی قادر بخش کے بھتیجوں اور بہرام خاں کو مل گئی۔ سردار کرم الٰہی کو 90 روپے سالانہ بارہ سو گھماؤں اراضی اور لائل پور کے کئی مکانوں اور دکانوں کی ملکیت ملی۔ جس سے 5 ہزار دو سو روپے سالانہ آمدن ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے چٹھہ خاندان کے کئی افراد کو 1857 کے بعد عہدے اور منصب دیئے۔

وہ احمد نگر کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے ذیلدار تھے اور انہیں ڈویژنل درباری کی حیثیت حاصل تھی۔ انہیں 1914 ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور چار سال کے بعد انہیں K-B-E کا اعزاز ملا اور انہیں جنگ عظیم کے بعد چغہ ملا۔ یہ آنریری مجسٹریٹ درجہ اول اور سول جج کی خدمات بھی دیتے رہے ہیں۔ 26-1924 ء تک یہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ خان بہادر چوہدری کرم الٰہی 1930 ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے چوہدری نصیر الدین چٹھہ برادری کے سربراہ نامزد ہوئے۔ یہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے۔ انہیں صوبائی درباری کی حیثیت حاصل تھی۔ بعدازاں یہ

گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین نامزد ہوئے۔ خان صاحب چوہدری ریاست علی بی اے، ایل ایل بی ایڈووکیٹ گوجرانوالہ کے نامور وکیل تھے اور چٹھہ برادری کو اپنے اس سپوت پر ناز تھا۔ وہ کئی سال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہے۔ 1930 ء کے بعد یہ کئی سال گوجرانوالہ میونسپل کمیٹی کے نامزد ممبر رہے۔ 1934 ء میں ریاست علی چٹھہ کو صدر گوجرانوالہ میونسپل منتخب کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ صدر میونسپلٹی کی حیثیت سے اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کے منیجر سیکرٹری ڈسٹرکٹ جوبلی کمیٹی کے سنیئر وائس پریذیڈنٹ دیہات سدھار سکیم اور گوجرانوالہ جیل کے نان آفشل وزیٹر رہے۔ انھیں 1937 ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کے ہونہار بیٹے چوہدری صلاح الدین چٹھہ 1912 ء میں موضع احمد نگر وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ 1932 ء میں گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا اور گوجرانوالہ میں پریکٹس شروع کر دی اور یہیں سے انھوں نے سیاست کا آغاز کیا۔ 1940 ء میں مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ 1946 ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن چنے گئے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے کے بعد خضر وزارت کے خلاف بے باکی سے سیاست کی۔ 1951 ء میں پاکستان نے جنرل اسمبلی آف دی یونائیٹڈ نیشن میں وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا تو صلاح الدین چٹھہ اس میں شامل تھے۔ 1952 ء میں آپ اکنامکس اینڈ سوشل کمیٹی کے رکن رہے۔ 1952 ء میں آل پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ 1951 ء میں انھوں نے مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے دن رات کام کیا۔ ان کے ضلع میں میاں منظور حسین مسلم لیگ، سجاد علی خان، چوہدری غلام نبی، ظفر حسین مہاجر، راجہ عبداللہ خان، سیف اللہ آزاد، کامیاب ہوئے انھوں نے ضلع گوجرانوالہ میں مسلم لیگ کا پیغام گھر گھر پہنچانے کا عزم کر رکھا تھا۔ آپ صوبائی وزیر بھی رہے۔ 1955 ء میں اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اور اس سال مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ 1962 ء میں قومی اسمبلی کے رکن کامیاب ہوئے۔ کونسل مسلم لیگ کے سرگرم رہنما تھے۔ نواب آف کالا باغ ان سے خار کھاتے تھے۔ اور انھیں دبانے کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ انھیں قومی سیاست سے باہر رکھنے کے لئے حلقہ بندیوں میں ایسی دھاندلی مچائی کہ ان کی نشست ختم کر دی گئی اور اس طرح 1965 ء میں آپ قومی اسمبلی کے رکن نہ ہو سکے، البتہ آپ نے وزیر آباد سے اپنے دوست راجہ

عبداللہ خان کی حمایت کی اور انھیں کنونشن لیگ کے ٹکٹ پر منتخب کرایا۔

چوہدری صلاح الدین چٹھہ اور راجہ محمد عبداللہ خان کی اولاد میں حامد ناصر چٹھہ اور راجہ عبداللہ خان کے صاحب زادے کرنل ریٹائرڈ راجہ جمیل اللہ خان بالترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کے امیدوار بنے۔ وزیر آباد میں چیمہ برادری کی اکثریت ہے۔ چیموں اور چٹھوں کی اس سیاسی جنگ میں کبھی چٹھے جیتے اور کبھی چیمے۔

1970 ء میں حامد ناصر چٹھہ پیپلز پارٹی کے غلام حیدر چیمہ کے مقابلے قومی اسمبلی کا الیکشن ہار گئے اور غلام حیدر چیمہ 92962 ووٹ لے کر کامیاب ہوئے، البتہ ان کے سیاسی رفیق راجہ جمیل اللہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ 1972 ء میں راجہ جمیل احمد پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے مگر حامد ناصر چٹھہ نے مسلم لیگ کا دامن نہ چھوڑا۔ 1977 ء میں 1970 ء کے پرانے حریفوں کے درمیان ایک بار پھر مقابلہ ہوا۔ اس بار بھی حامد ناصر چٹھہ کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ مارشل لاء حکومت میں حامد ناصر چٹھہ نے صوبائی وزیر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ اس دوران انھوں نے علاقے کی ترقی پر توجہ دی اور فلاحی کاموں کے ذریعے عوام میں موثر رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

1985 ء کے غیر جماعتی انتخابات میں پارٹی نظم و ضبط کے باعث چیمہ برادری نے انتخابات میں حصہ نہ لیا، البتہ انھوں نے اپنے سیاسی حریف کے لئے میدان کھلا نہ چھوڑا اور ان کے مقابلے میں چوہدری سیف علی چٹھہ کو مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ چوہدری سیف علی کے والد کنز مسلم لیگی تھے لیکن 1970 ء کے انتخابات میں کونسل مسلم لیگ نے انھیں ٹکٹ نہ دیا تو انھوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ بعد ازاں پیپلز پارٹی نے چوہدری بشیر احمد کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا۔ چوہدری بشیر احمد چٹھہ نے کونسل مسلم لیگ کے امیدوار کو شکست دی۔ حامد ناصر چٹھہ نے سیف اللہ چٹھہ کو ووٹوں کی بھاری اکثریت سے شکست دی۔ علاوہ ازیں وہ صوبائی نشست سے بھی کامیاب ہو گئے۔ نفر امام کے خلاف مسلم لیگ نے جب عدم اعتماد کا اظہار کیا تو حامد ناصر چٹھہ سپیکر بنائے گئے۔

1988 ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے کرنل (ریٹائرڈ) غلام سرور چیمہ کامیاب ہوئے تھے۔ اس سے قبل دو مرتبہ ان کے والد اس نشست پر کامیاب ہوئے تھے۔ غلام سرور چیمہ کو ان کے والد کی خدمات کے اعتراف میں نمائندگی کا حق دیا گیا۔ 1990 ء کے

انتخابات میں حامد ناصر چٹھہ نے ایک بار پھر اپنے سیاسی حریف کرنل غلام سرور کو شکست دے کر 1988ء کا بدلہ لے لیا۔ ضلع گوجرانوالہ میں 1979ء اور 1983ء کے بلدیاتی انتخابات میں چٹھہ برادری کو برتری حاصل رہی ہے۔ حامد ناصر چٹھہ اب میاں نواز شریف کی کابینہ میں وزیر ہیں۔

شیخوپورہ ضلع میں چٹھہ برادری کی ایک اور قد آور شخصیت محمد حسین چٹھہ کی صورت میں موجود ہے۔ انہوں نے گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے تعلیم حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے، بعد ازاں یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔ 1936ء میں لکھنؤ میں طالب علم کی حیثیت سے مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ قائداعظمؒ نے انہیں کونسلر بنا دیا۔ وہ 1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ضلع شیخوپورہ سے سید منظور حسین، چوہدری عبدالغنی، چوہدری محمد صدیق، حاجی محمد علی بھی ان کی کوششوں سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر 1951ء میں کامیاب ہو گئے۔ چوہدری محمد حسین چٹھہ مسلم لیگ میں میاں ممتاز دولتانہ کے دھڑے سے وابستہ رہے ہیں۔ دولتانہ ممدوٹ کشمکش میں انہوں نے دولتانہ کا ساتھ دیا۔ 1951ء میں میاں ممتاز دولتانہ کی وزارت میں وزیر بنائے گئے۔ جب فیروز خان نون پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو دولتانہ فیروز خان نون کے بھی خلاف ہو گئے۔ 27 / اپریل 1953ء کو فیروز خان کی وزارت اعلیٰ کے دور میں محمد حسین چٹھہ کو بنگال ریگولیشن 1818ء کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری ایسی سرگرمیوں کے باعث عمل میں آئی تھی جو پنجاب میں تحفظ امن عامہ کے خلاف تھی۔ آپ ممدوٹ وزارت میں وزیر خزانہ کے پارلیمانی سیکرٹری تھے۔ ایوب خان نے جب سیاستدانوں کا زوال شروع کیا تو محمد حسین چٹھہ ایبڈو کر دیئے گئے۔ 1962ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو محمد حسین چٹھہ بھی ایبڈو ہونے کے باوجود کاغذات نامزدگی کے لئے پہنچ گئے کیونکہ انہیں 31 / دسمبر 1966ء تک ایسی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے عدالت میں اپنی نااہلی کو چیلنج کیا تو عدالت نے فیصلہ محمد حسین چٹھہ کے حق میں دیا۔ انہوں نے رانا افتخار آف مانوالہ کو شکست دی اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ 1965ء میں انہوں نے مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی مگر یہ بات گورنر امیر محمد کو گوارا نہ تھی۔ انہوں نے محمد حسین چٹھہ کو کامیاب نہ ہونے

دیا۔ 1970ء کے انتخابات میں بھی وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پیپلز پارٹی کے دور میں مسلم لیگ کو جس انتشار کا سامنا تھا، اس کو ختم کرنے کے لئے آپ نے بڑی محنت کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ 1977ء میں دھاندلی کے باعث وہ کامیاب نہ ہو سکے اور عملاً سیاست سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے۔ مارشل لاء حکومت کو ملک کے لئے زہر قاتل سمجھتے ہیں۔ ضیاالحق نے جب ان کے بیٹے نعیم حسین چٹھہ کو وزارت سے نوازا اور وہ حلف اٹھانے اسلام آباد بھی پہنچ گئے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو ایسا کرنے سے روکا اور انہوں نے دھمکی دی کہ اگر وہ مارشل لاء وزارت میں شامل ہوئے تو وہ خود کشی کر لیں گے۔ والد کے دباؤ میں آ کر حاجی نعیم حسین چٹھہ نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1983ء میں ضلع کی بلدیاتی قیادت حاجی نعیم حسین چٹھہ کے حصہ میں آئی۔ 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں انہوں نے پی پی 126 سے چوہدری توکل اللہ ورک کو شکست دی تھی جو ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حاجی نعیم حسین چٹھہ نے وفاقی مجلس شوریٰ کا رکن بننا بھی پسند نہ کیا اور انہوں نے ضیاالحق کو اس غیر جمہوری ادارے کا رکن نہ بننے کے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ 1988ء میں حاجی نعیم حسین چٹھہ کو چوہدری توکل اللہ ورک کے مقابلے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ 1990ء کے انتخابات میں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ نواز شریف کی کابینہ میں حاجی نعیم حسین چٹھہ کو وزیر مملکت کی حیثیت حاصل ہے ان کے والد محمد حسین چٹھہ نے زندگی کا بیشتر حصہ مسلم لیگ کو متحد کرنے میں گزار دیا۔ پیر پگاڑا کی کھیلا عید ملن پارٹی میں بھی انہوں نے پیر آف پگاڑا پر زور دیا ہے کہ وہ مسلم لیگ کو حقیقی معنوں میں متحد کرنے کی کوششیں کریں۔

حال ہی میں حامد ناصر چٹھہ کے بیٹے کی شادی آصف نواز جنجوعہ کے قریبی رشتہ داروں میں ہوئی ہے

خان بہادر نواب فضل علی او بی ای O-B-E

گجرات کے نوابزادے

گجرات کی نوابزادہ فیملی سیاست کے حوالے سے نمایاں رہی ہے ان کے زوال کا آغاز 1962 ء سے شروع ہوا تھا جب گجرات میں چوہدری ظہور الٰہی کی صورت میں ایک قد آور شخصیت ان کے سیاسی حریف کی صورت میں ابھری تھی جنھوں نے پے در پے شکستوں سے نوابزادہ فضل علی خان خاندان کی سیاسی برتری کو ضلع گجرات میں تقریباً ختم کر دیا تھا۔

نوابزادہ گجر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں گجرات کے بڑے زمینداروں کی حیثیت حاصل ہے۔ جب سلطان مسعود نے ملک کے شمالی علاقے پر چڑھائی کی تو اس وقت یہ خاندان کلاس کہلاتے تھے ھودم کا صرف ایک ہی لڑکا تھا جو اس دوران چلیا نوالہ کے جنگلوں میں اپنے قبیلے کے ساتھ پناہ گزین ہو گیا اور اسی دھرتی کو انہوں نے اپنا مستقل مسکن بنا لیا اور اس علاقہ پر قبضہ کر کے اس کے خود ہی مالک بن بیٹھے۔

چوہدری سلطان علی جو زیلدار اور انجیالہ ریاست کے نمایاں زمیندار تھے، پنجاب کے الحاق کے وقت وہ اس قبیلے کے سربراہ تھے۔ 1854 ء میں جب ریذنٹ فری کی تحریک چلی تو چوہدری سلطان علی نے 325 روپے کا کلیم جو انہیں راجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں ملتا تھا داخل کر دیا۔ جب گھیبوں نے ان کے علاقے پر چڑھائی کی تو چوہدری سلطان علی نے ایک ہزار سواروں کی مدد سے انہیں ان کے علاقے میں واپس دھکیل دیا۔ ان کے دستے دہلی بھی گئے اور سکھوں کے خلاف محاصرے میں بھی انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان سروسز کے بعد ان کے انعام کے دعوے کی رقم بحال کرنے کا اعلان کیا گیا، یہ اپنے علاقے میں پرجوش اور جذبے والے ذیلدار تھے 1872 ء میں جب ملیریا کی وبا پھوٹ پڑی تو اس
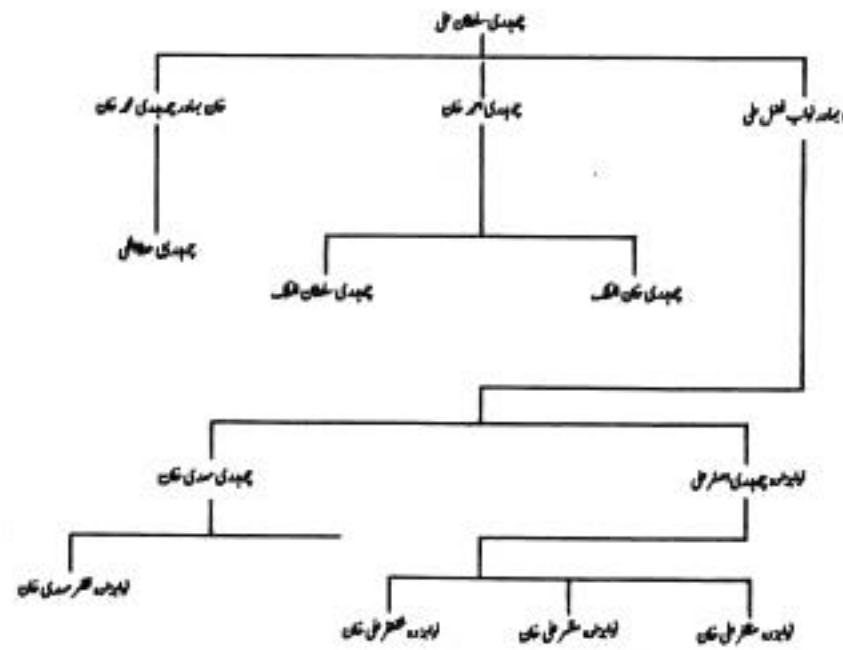
سے بچاؤ کے لئے لوگوں کو حفاظتی تدابیر کے سلسلہ میں رہنمائی اور ملیریا کے انسداد کے ٹیکے مفت تقسیم کرتے رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی میرباز کو 1877 ء میں گورنمنٹ میں بہترین خدمات کے عوض سند دی گئی۔

چوہدری سلطان علی کے تین بیٹے محمد خان، احمد خان اور فضل علی خان تھے۔ محمد خان ذیلدار تھے۔ انہوں نے ایک ہزار جنگی قرضہ کے طور پر دیا اور آٹھ ہزار وصول کئے۔ انہوں نے جنگ عظیم کے دوران ایک ہزار افراد اپنے علاقے سے بھرتی کرائے انہیں اس موقع پر تلوار انعام میں دی گئی۔ علاوہ ازیں انہیں جنگ کا خصوصی بیج اور خلعت بھی دی گئی۔

1919 ء میں ہونے والے سیاسی فسادات کے بعد انہیں 250 روپے کی جاگیر اور خان صاحب کا خطاب دیا گیا۔ محمد خان آنریری مجسٹریٹ، نائب صدر ریڈ کراس سوسائٹی اور ایس ٹی جان ایمبولینس ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔ 1927 ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ 1927 ء میں ان کا انتقال ہوا تو اس وقت اس کا سب سے چھوٹا بیٹا دس سال کا تھا۔ دو سال پہلے عطاالٰہی کو ذیلداری ملی تھی۔ دوسرا بیٹا احمد علی سرپراہ ذیلدار اور علاقہ دار بار برداری تھا اور سب سے چھوٹا فضل علی تھے.

خان بہادر نواب زادہ فضل علی نے ذیلدار کی حیثیت سے خود کو نمایاں کیا تھا۔ انہوں نے سکاچ مشن ہائی سکول گجرات سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی جہاں وہ سکول کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی تھے۔ انہیں 1896 ء میں صوبائی درباری بنایا گیا۔ 1901 ء میں انہوں نے آنریری مجسٹریٹ کی حیثیت سے استعفیٰ دیا تھا۔ چترال کی مہم کے دوران آپ نے انگریزوں کو بار برداری کے لئے ذرائع نقل و حمل فراہم کئے تھے۔ 1902 ء میں انہیں ساڑھے دس مربعے اراضی گھوڑے پالنے کی شرط پر دی گئی تھی۔

پنجاب کے شرفاء کو دی جانے والی زمین میں سے بہت بڑی جاگیر انہیں بھی اس مد سے ملی تھی۔

نواب زادہ فضل علی نے جنگ عظیم میں 1500 سپاہی بھرتی کرائے تھے اور دو ہزار جنگی قرضہ کے طور پر دیئے تھے جس کے عوض انہیں دس ہزار لوٹائے گئے۔ انہیں اس کے بعد M-B-E کا خطاب دیا گیا اور جنگی تلوار خلعت اور بیج تحفے میں دیئے گئے۔ نواب

زادہ فضل علی گجرات میونسپلٹی کے پہلے منتخب نائب صدر اور پہلے غیر سرکاری صدر تھے۔ 1921 میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ 1927 ء میں انہوں نے گجرات میونسپلٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے گجرات میں کوآپریٹو تحریک شروع کی اور انجیالہ سنٹرل کوآپریٹو بنک کے 1919 ء میں صدر بنے۔ وہ پنجاب کوآپریٹو یونین کے نائب صدر بھی تھے۔ 1926 ء میں گجرات ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر رہے۔ انہیں 1928 ء میں 500 روپے کی جاگیر تحفہ میں ملی۔ 1937 ء میں 250 روپے مالیت کی جاگیر پھر تحفہ میں ملی۔ 1932 ء میں انہیں نواب کا خطاب دیا گیا۔

نوابزادہ فضل علی نے ضلع گجرات میں حکومت کی طرف سے فلاحی خدمات کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنی جیب سے فلاحی سکیمیں شروع کیں۔ انہوں نے زمیندارہ ہائی سکول کی بنیاد رکھی۔ نواب سر فضل علی کی تاریخ پیدائش کسی کو یاد نہیں۔ سب کو اتنا یاد ہے کہ وہ 72 سال کی عمر میں تھے۔ آپ کی تعلیم کی ابتدا مشن ہائی سکول گجرات سے ہوئی اور یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو علی گڑھ کے ایم اے او کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ اس وقت سرسید کے تعلیمی کارناموں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ انہوں نے سرسید کو اپنا آئیڈیل اور ان کی سیاسی اور تعلیمی پالیسیوں کو اپنے ذہن کا جزو بنایا۔ 1914 ء میں انہوں نے ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ سرکاری سکولوں میں دور سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی رہائش کے لئے ہوسٹل نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے ہوسٹل کی بھی بنیاد سکول کے ساتھ ہی رکھی۔ انہیں گجرات کے سرسید کا اعزاز حاصل ہے۔

نواب سر فضل علی خان کی وفات کے بعد نوابزادہ اصغر علی کالج کی انتظامیہ کے صدر بنے اور انہوں نے اپنے مرحوم والد جیسی لگن اور جذبے سے سرشار اس میں کئی اضافے کئے۔ گجرات کی سیاست پر 1962 ء تک نوابزادہ گروپ کا مکمل قبضہ رہا۔ یہاں کے دو دھڑے نظریات یا سیاسی مسائل کے پروگراموں کے دھڑے نہیں بلکہ دونوں برادریوں پر قائم ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ نسلی تفریق نے ضلع گجرات کی آبادی کو دو سیاسی دھڑوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک گوجر برادری اور دوسرا جاٹ برادری کا دھڑا ہے۔ گجرات کی گجر برادری کے قائد نواب سر فضل علی خان تھے۔ انہوں نے اپنی طویل زندگی میں کبھی جاٹ اور گوجر کے مسئلے کو پیدا نہ ہونے دیا اور وہ 1942 ء تک گجرات

ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین رہے اور جاٹ برادری کا تعاون انہیں ہمیشہ حاصل رہا ہے۔
1937 ء میں ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر چوہدری سلطان علی نے پہلی بار جٹ اور گجری تفریق کا نعرہ
لگایا اور جٹ حقوق کی حفاظت کا نام لے کر ڈسٹرکٹ بورڈ کا الیکشن لڑا لیکن ناکام رہے اور یہ
نعرہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ 1951 ء میں چوہدری سلطان علی انتخابات میں پھر یہ نعرہ لے کر اٹھے۔
اس وقت ان کا مقابلہ نوابزادہ سر فضل علی خان کے صاحب زادے صمدی علی خان سے
تھا

جو نوابزادہ اصغر علی کے بڑے بھائی تھے۔ اس بار اس نعرے کو بڑی پذیرائی حاصل
ہوئی۔ چوہدری صمدی خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر 19419 ء اور چوہدری سلطان علی نے
18613 ووٹ حاصل کئے۔ اس طرح اس الیکشن سے جٹ اور گوجر کی تفریق کا آغاز
ہوا۔

نوابزادہ اصغر علی اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ جب دولتانہ اور ممدوٹ
کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری تھی تو نوابزادہ کھلم کھلا ممدوٹ کے ہم نوا تھے۔ انہوں نے
لیاقت علی خان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی طور پر بھی میاں ممتاز دولتانہ کو اپنا قائد تسلیم نہیں
کریں گے۔ انہوں نے لیاقت علی خان سے ملاقات میں کہہ دیا تھا کہ اگر گجرات میں لیگ
کے ٹکٹ ان کی مرضی سے جاری کئے گئے تو کامیابی کے امکانات سو فی صد ہیں ورنہ صفر۔
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا گجرات کی سیاست میں کس قدر اثر و رسوخ تھا۔
1951 ء میں نوابزادہ اصغر علی نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ خان ممدوٹ کے لیگ
چھوڑ جانے کے بعد ضلع گجرات میں خان ممدوٹ کے خاص معتمد شمار ہوتے تھے، مسلم لیگ
چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔ بقول خان ممدوٹ خان لیاقت علی خان کے ایک ڈر نے انہیں
رام کر لیا ہے۔ خان ممدوٹ نوابزادہ کے اس رویئے پر سخت برہم ہو گئے اور انہوں نے
دلیل یہ دی کہ نوابزادہ کا خاندان وفاداریاں نبھانے کا ماہر ہے بشرطیکہ جس سے وفاداری
استوار رکھی جائے اور وہ اقتدار میں ہو، 1951 ء کے انتخابات میں نوابزادہ خاندان کو
عروج حاصل ہوا۔ گجرات کے حلقہ نمبر ایک سے نوابزادہ صمدی علی خان حلقہ نمبر 2 سے
نوابزادہ اصغر علی خان، حلقہ نمبر 3 سے چوہدری محمد احسان، حلقہ نمبر 4 سے آزاد پاکستان

پارٹی کے سید امیر حسین شاہ، حلقہ نمبر 5 سے چوہدری محمد زمان خان، حلقہ نمبر 6 میاں فتح
محمد، حلقہ نمبر 7 سے چوہدری فضل الٰہی، حلقہ نمبر 8 سے چوہدری گل نواز خان، حلقہ نمبر
9 سے غلام رسول تارڑ، حلقہ نمبر 10 سے چوہدری ولی محمد، حلقہ نمبر 11 سے چوہدری
ارشاد اللہ، حلقہ نمبر 12 سے چوہدری سخی محمد، کامیاب ہو گئے اس طرح مسلم لیگ کو ضلع
گجرات میں تین نشستوں پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جن قد آور شخصیات کو شکست کا سامنا
کرنا پڑا، ان میں اسلام لیگ کے مظفر خان، محمد افضل خان آزاد پاکستان پارٹی، نذیر حسین
جناح مسلم لیگ، چوہدری غلام فرید آزاد پاکستان پارٹی، چوہدری محمد اسلم جوڑا آزاد، چوہدری
احمد خان جناح عوامی مسلم لیگ، چوہدری محمد سرفراز، چوہدری عطا محمد جناح عوامی مسلم لیگ،
چوہدری نیک عالم جناح عوامی مسلم لیگ، روشن علی آزاد، چوہدری محمد اشرف جناح عوامی
مسلم لیگ، ملک خان بوسال مسلم لیگ، چوہدری لال الدین آزاد، چوہدری شیر محمد تارڑ جناح
عوامی مسلم لیگ چوہدری میاں خان بوسال مسلم لیگ، محمد صدیق آزاد پاکستان پارٹی شامل
تھے۔

دستوریہ کے انتخابات کے موقع پر جب فیروز خان نون گجرات کے دورے پر گئے تو
نوابزادہ اصغر علی نے چوہدری غلام رسول تارڑ، چوہدری ولی محمد بسال، میاں فتح محمد، چوہدری
سخی محمد اور چوہدری محمد احسن سمیت مسلم لیگ کے فیصلے کے خلاف فیروز خان نون کا ساتھ
دیا۔

نوابزادہ اصغر علی خان کی قیادت کو 1955 ء تک کوئی چیلنج نہ کر سکا ان کی قیادت
کو پہلا چیلنج چوہدری ظہور الٰہی نے گجرات سنٹرل بنک چیئرمین شپ کے الیکشن میں کیا۔ اس
دنوں فیروز خان نون کی حکومت تھی۔ ضلع گجرات کے تیرہ ارکان اسمبلی میں سے گیارہ
نوابزادہ کے ساتھ تھے فضل الٰہی چوہدری اور چوہدری گل نواز نے چوہدری ظہور الٰہی کو حمایت
کا یقین دلایا لیکن اتنی واضح اکثریت کے باوجود چوہدری ظہور الٰہی کو فتح ہوئی۔ اس شکست
سے نوابزادہ خاندان کا یہ سحر ٹوٹ گیا کہ انہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ چوہدری ظہور
الٰہی نے نوابزادہ کو دوسرا چیلنج ڈسٹرکٹ بورڈ میں کیا۔
ضلع گجرات کا سب سے بڑا سیاسی معرکہ 1962 ء میں ہوا۔ نوابزادہ اصغر علی
خان ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر اور سنٹرل بنک کے چیئرمین بھی رہے ہیں۔ چوہدری ظہور الٰہی

نے جسے قدرت نے قیام پاکستان کے بعد دولت سے مالا مال کر دیا تھا. نوابزادہ کے مخالفین کو اکٹھا کر کے قوت بنائی۔ 1962 ء کے غیر جماعتی انتخابات میں نوابزادہ کو عبرت ناک شکست ہوئی اس کے بعد چوہدری ظہور الٰہی کا وجود نوابزادہ خاندان کے سیاسی اقتدار اور عروج کے لئے مسلسل خطرہ بنتا گیا۔ چوہدری صاحب نے مسلم لیگی امیدوار راجہ محسن اختر کے مقابلے پر چوہدری محمد افضل چیمہ کو سینئر ڈپٹی سپیکر کا انتخاب لڑایا اور ایک ووٹ سے کامیاب کرایا۔ چوہدری ظہور الٰہی ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کی کابینہ میں شامل تھے۔ ان سے ظہور الٰہی کی ذاتی دوستی اور رلہ ورسم بھی ہو گئے۔ بالآخر وہ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی سے جنرل سیکرٹری چنے گئے۔ ایوب خان ان کی سیاسی بصیرت کے قائل تھے۔ جب نواب آف کالاباغ اور چوہدری ظہور الٰہی کی ان بن ہوئی تو نواب آف کالاباغ نے نوابزادہ اصغر علی کو سینے سے لگا لیا اور انہیں کنونشن لیگ میں شامل کر لیا اور نوابزادہ اصغر علی ڈسٹرکٹ کونسل کے وائس چیئرمین چنے گئے۔ اور یہ صوبائی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہو گئے جب چوہدری ظہور الٰہی نے اپنے علاقائی حریف نوابزادہ اصغر علی کا عروج دیکھا تو انہوں نے ایوب خان کو راضی کر لیا۔ نواب زادہ نے ایوب خان سے آخری وقت تک یاری نبھائی جب دوسری بار مارشل لاء نافذ ہوا تو ظہور الٰہی کونسل مسلم لیگ اور نواب زادہ اصغر علی قیوم مسلم لیگ میں چلے گئے۔ 1970 ء میں پیپلز پارٹی کی حالت دونوں برادریوں کے سرکردہ سرخیوں کے سامنے بہت پتلی تھی نواب زادہ اصغر علی خان تب مسلم لیگ میں شامل تھے جب 5 ، اکتوبر 1958 ء کو خان اعظم کا جہلم سے گجرات تک کا مشہور 32 میل لمبا جلوس نکالا 1970 ء میں ٹکٹوں کی تقسیم کچھ اس طرح تھی۔ گجرات حلقہ نمبر 1 نواب زادہ اصغر علی مسلم لیگ (قیوم گروپ) چوہدری ظہور الٰہی (کونسل مسلم لیگ) چوہدری ارشاد احمد (جماعت اسلامی) ایم سلیم ایڈووکیٹ (پی ڈی پی) چوہدری محمد اسلم جوڑا (آزاد) تھانہ کڑیاں والا کی چودہ کونسلوں میں سے دو کونسلیں جاٹوں اور باقی بارہ کونسلیں گوجروں پر مشتمل ہیں جلال پور جٹاں میں 55 فی صد آبادی جاٹوں کی اور 45 فی صد گوجروں کی ہے

گجرات شہر میں جاٹ اور گجر کم ہیں یہاں دوسری برادریاں نمایاں ہیں۔ 1970 ء میں چوہدری ظہور الٰہی کامیاب ہو گئے تھے جس بنا پر نواب زادہ کے دیرینہ ساتھی میاں فتح محمد آف کوٹلیاں، صوبیدار غلام رسول آف کھاریاں، چوہدری شیر محمد تارڑ، چوہدری فضل الٰہی اور چوہدری غلام رسول تارڑ پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔

نواب زادہ خاندان زیادہ دیر تک اپوزیشن میں نہ ٹھہر سکا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا۔ چوہدری ظہور الٰہی جو کونسل مسلم لیگ کے تنہا رکن رہ گئے تھے کیونکہ کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن جیتنے والے بڑے بڑے جاگیردار مسلم لیگ کو چھوڑ کر پیپلز پارٹی میں چلے گئے تھے. یا ان کے مکمل ہم خیال بن گئے تھے۔ تنہا ظہور الٰہی اپوزیشن کا رول ادا کرتے رہے۔ آزمائش کے اس دور سے گزرنے کے بعد ملکی سیاست میں ان کا اہم کردار بن گیا تھا۔

1977 ء کے انتخابات میں ایک بار پھر علاقائی حریف ایک دوسرے کے مدمقابل سیاسی اکھاڑے میں اترے۔ برادری ازم کا تعصب گجرات سے زیادہ پنجاب بھر میں کہیں نہیں۔ پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد نے اپنے کارکنوں کو خالصتاً برادری ازم کے تحت ٹکٹ دیئے تھے۔ چوہدری ظفر مہدی جو نواب زادہ مہدی خان کے صاحب زادے ہیں، 1970 ء میں قیوم لیگ کے ٹکٹ پر چوہدری ظہور کے ساتھی محمد نواز سے شکست کھائی تھی۔ چوہدری نواز ظہور الٰہی کو چھوڑ کر پیپلز پارٹی میں چلے گئے تھے۔ یہ ظفر مہدی کے کزن ہیں۔ چوہدری نواز 1977 ء میں پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کے باوجود چوہدری ظہور الٰہی گروپ کی حمایت کرتے رہے۔ ظفر مہدی نے پیپلز پارٹی کے صوبائی ٹکٹ ہولڈر اصغر گھرال کے لئے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی نے کوشش کی تھی کہ وہ گجرات کی تمام برادریوں کو ساتھ لے کر چلے۔ گجرات حلقہ نمبر 2 سے مشتاق پگانوالہ کو ٹکٹ دیا تھا جو کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ چوہدری فضل الٰہی کے صاحب زادے کو بھی پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دے کر خود کو گوجر برادری، جاٹ اور کشمیریوں کی نمائندہ جماعت بنا دیا تھا۔

1971 ء میں ضمنی انتخاب میں پیپلز پارٹی کے سرور جوڑا جیت گئے تھے۔ انہیں چوہدری ظفر مہدی کے مقابلے میں چوہدری ظہور الٰہی کی حمایت حاصل تھی۔ 1977 ء

میں ظفر مہدی کے کزن نواب زادہ مظفر علی قومی اتحاد کے بائیکاٹ کے باعث آزاد امیدوار کی حیثیت سے جیت گئے تھے۔

ملک میں جب تیسرے مارشل لاء کے تحت انتخابات اکتوبر 1977 ء میں کرانے کا اعلان کیا گیا تو حلقہ نمبر 1 سے پیپلز پارٹی نے اپنا امیدوار تبدیل کرتے ہوئے نواب زادہ اصغر علی کو اپنا امیدوار بنایا اور ان کے داماد اور بھتیجے ظفر مہدی کو صوبائی امیدوار بنا دیا گیا۔ البتہ الیکشن منعقد نہ ہو سکے۔ ملک میں جب مارشل لاء حکومت نے وفاقی کابینہ تشکیل دی اور چوہدری ظہور الٰہی کا نام بھی اس میں گونجنے لگا تو سیاسی مبصرین قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ اب چوہدری فضل الٰہی جو پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے باوجود ضیاالحق کے ساتھ صدر پاکستان کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، استعفیٰ دے دیں گے۔ ایسا ہی ہوا اور انہوں نے چوہدری ظہور الٰہی کی شمولیت کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔

چوہدری ظہور الٰہی کی کابینہ میں شمولیت کے باعث جاٹوں کو گجرات کی سیاست پر ایک بار پھر برتری حاصل ہو گئی۔ گوجر برادری کے لیفٹننٹ جنرل سوار خاں نے نواب زادہ خاندان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور انہیں پیپلز پارٹی سے جدا کر کے ضیاء الحق کا حلیف بنا دیا۔ نواب زادہ مظفر علی خان کو وفاقی مجلس شوریٰ کا رکن بنا دیا۔ 1979 ء کے بلدیاتی انتخابات میں نواب زادہ گروپ کو ایک اور برتری حاصل ہو گئی کہ نواب زادہ مظفر علی ضلع کونسل گجرات کے چیئرمین منتخب ہو گئے البتہ یہ چیئرمینی زیادہ دیر تک ان کے پاس نہ رہ سکی۔ 1983 ء میں چوہدری منظور الٰہی کے صاحب زادے پرویز الٰہی ضلع کونسل گجرات کے چیئرمین منتخب ہو گئے۔

1985 ء کے غیر جماعتی انتخابات میں مارشل لاء حکام نے دونوں خاندانوں کی برادری ازم کی بنیاد پر بڑھتی ہوئی سیاسی محاذ آرائی کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا اور دونوں خاندانوں میں صلح کرا دی اور اس طرح نواب زادہ مظفر علی بلا مقابلہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ گجرات کے حلقہ 2 سے چوہدری شجاعت بھی کامیاب ہو گئے۔ ان کے مقابلہ میں نواب زادہ خاندان نے معاہدے کے تحت کسی کو کھڑا نہ کیا البتہ ایک خاتون ارشاد بیگم نے چوہدری شجاعت الٰہی کو بلا مقابلہ منتخب نہ ہونے دیا۔ اس طرح نواب زادہ مظفر علی خان [illegible] منتخب ہو گئے۔

1988 ء کے جماعتی انتخابات میں دونوں سیاسی گروہ پھر الگ ہو گئے۔ نواب زادہ گروپ نے ایک بار پھر پیپلز پارٹی کی پناہ حاصل کی۔ نواب زادہ اصغر علی کے صاحب زادے مظفر علی خان، چوہدری تجمل حسین کے مقابلے میں شکست کھا گئے۔

1990 ء کے قومی انتخابات میں نواب زادہ خاندان کے نواب زادہ غضنفر علی اور نواب زادہ مظفر علی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 1991 ء کے بلدیاتی انتخابات میں بھی ان کا گروپ بری طرح شکست کھا گیا۔

خان صاحب خان محمد سعادت علی خان کھرل آف کمالیہ

پیر کمالیہ کے کھرل

پنجاب کے پرانے خاندانوں میں کھرل ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس خاندان نے صوبے میں انگریزوں کے عروج سے پہلے ہر تاریخی ہنگامے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور پر سکھوں کے ابتدائی ایام میں کھرل کافی عرصے تک اپنی طاقت اور شہ زوری کے بل بوتے پر ناقابل حل معمہ بنے رہے۔

پنجاب کے اس صحت مند اور توانا خاندان کو جاگیرداروں کے زمرے میں شامل کرتے وقت یہ وضاحت ضروری ہے کہ کھرلوں کو بحیثیت ایک خاندان جاگیر دار نہیں کہا جاسکتا کیونکہ خاندان کی مختلف شاخوں میں کئی کنبے اور افراد ایسے بھی ہیں جو زمینوں کی تقسیم در تقسیم کی وجہ سے اب کسانوں کی معمولی سی زندگی گزار رہے ہیں لیکن اس خاندان میں اب بھی بڑے بڑے جاگیردار موجود ہیں۔

کھرل خاندان کی باقاعدہ زندگی کے آثار راجہ کرم والی ستیار پور کے زمانے سے ملتے ہیں۔ اس وقت یہ قبیلہ گوگیرہ ضلع اوکاڑہ کے نواحی جنگلات میں اقامت پذیر تھا۔ انگریزوں کے نزدیک کھرل ایک جرائم پیشہ قبیلہ تھا جس کا کام قتل و غارت اور مار دھاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ صوبہ میں سیاسی ہنگاموں اور تبدیلیوں کی وجہ سے کھرلوں نے گوگیرہ کو خیرباد کہہ دیا اور شاندار وطن کی تعمیر میں چل نکلے۔

1627ء میں اس خاندان کے سردار کمال خان نے جھنگ سے چالیس میل کے فاصلے پر کوٹ کمالیہ آباد کیا۔ اس علاقے میں اس وقت سیالوں کا طوطی بول رہا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو سیال اور کھرل ایک دوسرے سے گتھم گتھا رہے۔ جھنگ کے سیالوں سے انہوں نے رشتہ داریاں بھی کیں۔ آخر کار دونوں خاندانوں میں اقتدار کے لئے شدید
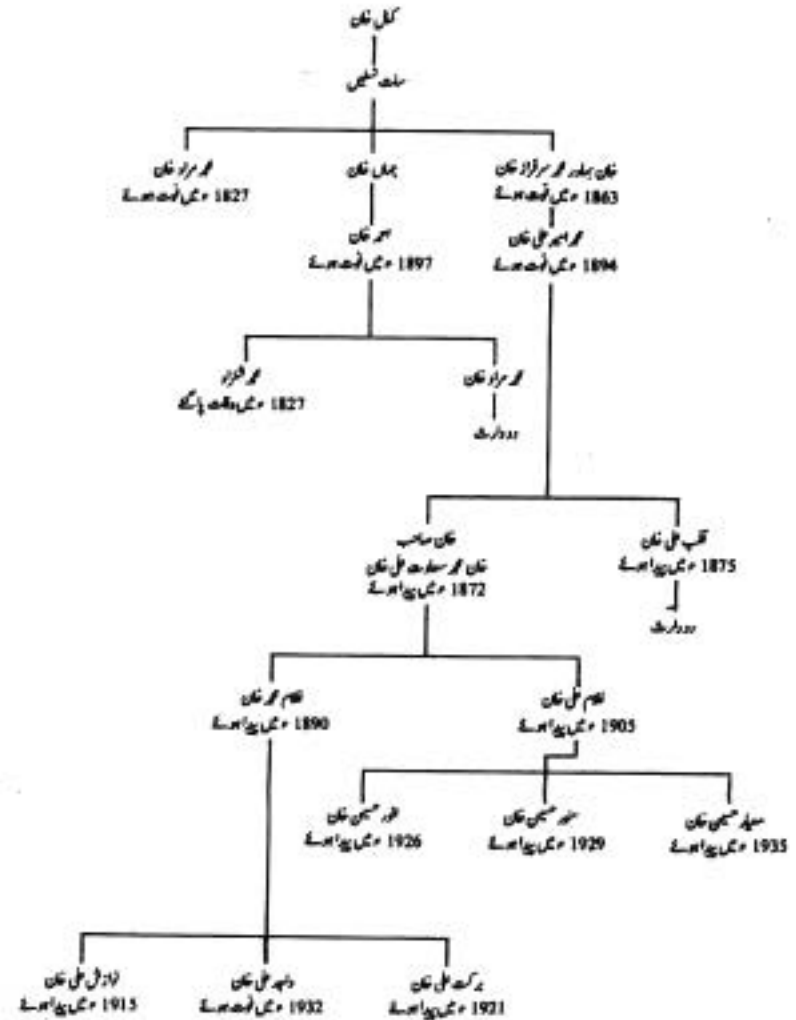
کشمکش شروع ہو گئی۔ اس کشمکش نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی تو پایہ تخت دہلی سے ایک شہزادے کو دونوں خاندانوں میں صلح کرانے کی غرض سے بھیجا گیا۔ وہ کوٹ کمالیہ میں کھرل سردار سعادت یار خان سے ملا۔ سردار غازی خان اس زمانے میں سیالوں کا سردار تھا۔ مغل شہزادے نے دونوں خاندانوں میں مفاہمت کے لئے تجویز کیا کہ سیال سردار اپنی بیٹی کی شادی کھرل سردار سے کر دے، چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک ایلچی جھنگ بھیجا گیا لیکن سیال سردار نے اس پیغام پر مشتعل ہو کر ایلچی کو قتل کر دیا۔

اس قتل سے حالات میں اس قدر تلخی پیدا ہو گئی کہ نتیجہ میں غازی خان سیال کو بھی پراسرار حالت میں قتل کر دیا گیا اور مغل شہزادہ مایوس ہو کر واپس لوٹ گیا۔ اس اثنا میں کھرل خاندان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس خاندان پر گہرا اثر ڈالا۔ پنجاب کے مشہور ترین رومانوں میں سے "مرزا صاحباں" کے رومان میں صاحباں اس خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور مرزا شاہی خاندان کا فرد تھا۔ اس رومان میں مرزا کے قتل کے پس منظر میں بھی خاندانوں کی سیاسی چپقلش کا زیادہ ہاتھ تھا۔ اس واقعہ نے کھرلوں میں دختر کشی کو سختی سے رائج کر دیا۔ کافی عرصہ کے بعد کرنل ہملٹن کمشنر ملتان نے اس قبیح رسم کا خاتمہ کیا۔

غازی خان سیال کے قتل کے بعد لال خان سیالوں کا چیف بنا تو سعادت خان کھرل نے اس کے متعلق مشہور کر دیا کہ وہ رقاصہ کا بیٹا ہے اس الزام سے مشتعل ہو کر لال خان سیال نے کوٹ کمالیہ پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا اور تباہ کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد کھرلوں کے سیاسی انحطاط کا دور شروع ہو گیا۔

سیاسی انحطاط کے ہاتھوں یہ قوم کاہل اور سست ہو گئی۔ ایک سکھ سردار قمر سنگھ نکئی نے حملہ کر کے کوٹ کمالیہ پر قبضہ کر لیا لیکن 1797ء میں شاہ زماں کے حملہ پنجاب کے وقت کھرل سردار نے مظفر خان گورنر ملتان کی امداد سے دوبارہ اپنی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ خاندان میں انتشار اور سیالوں سے الجھاؤ نے کھرلوں کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ جنگ کی دشوار شوری اور ہماہمی کی بجائے ذہن پر مصلحتوں اور سیاسی جوڑ توڑ نے قبضہ جما لیا۔ کھرل سردار سعادت خان ثانی نے رنجیت سنگھ کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور اسے مکمل یقین دلایا کہ وہ سکھوں کے وفادار کی حیثیت سے ہر شاندار خدمت سرانجام دینے کے لئے تیار ہیں۔ سکھ

دوستی کے انعام میں سکھ سردار کو چالیس گاؤں جاگیر میں دے دیئے گئے لیکن راجہ ہیرا سنگھ کے زمانے میں محمد سرفراز خان کھرل حلف وفاداری کے باوجود ان سے یہ گاؤں چھین لئے گئے اور سردار کو تین سو روپیہ سالانہ پنشن دی گئی۔

پنجاب کے سیاسی مطلع پر خالصہ جھنڈے کی بجائے یونین جیک لہرایا گیا تو صوبے کے دوسرے موقع پرست جاگیردار خاندانوں کی طرح کھرلوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ سردار محمد سردار خان کھرل نے اپنی جاگیر واگزار کرانے کے لئے حکومت انگلشیہ سے عہد وفاداری استوار کر لیا۔

1848ء میں جب سکھوں کے ساتھ پیہم تصادم سے انگریزی استعمار کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور سکھوں کے ساتھ دوسری فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں تو محمد سرفراز کھرل نے اپنی فوج بنا کر لڑائی میں حصہ لیا۔ انگریز کھرلوں کے اس عملی تعاون سے بہت خوش ہوئے۔ ان کی بہادری کے عوض انہیں 500 روپے پنشن کے علاوہ ریاست کمالیہ کے مالیہ سے 275 روپے سالانہ بطور انعام دیئے۔

1857ء میں اہل ہندوستان کے سینے میں انگریز کے خلاف نفرت کے لاوے پک رہے تھے اور انگریزوں کے خلاف نفرت نے خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس وقت کھرل خاندان کا حکمران احمد خان تھا۔ کھرل سردار سرفراز خان نے ایک بار پھر وفادار ساتھی کا ثبوت دیتے ہوئے انگریز کے لئے جاسوسی کے فرائض سرانجام دیئے۔ انہوں نے کیپٹن انفنسٹن کے قتل کی سکیم میں ایک مسلمان سردار کی حیثیت سے شرکت کرنے کے بعد اسے دو گھنٹے پہلے طشت ازبام کر کے گورے آقا کی جان بچالی۔ اس واقعہ کے بعد 1857ء کی آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لئے کھرل سردار کی معلومات بڑی مفید ثابت ہوتی رہیں اور جب آزادی کی تحریک کو انگریزوں نے پوری طاقت سے کچل دیا تو انہیں خان بہادر کے خطاب اور خلعت کے علاوہ 525 روپے سالانہ پنشن مقرر کی۔ سرفراز خان 1863ء میں فوت ہوئے۔ ان کے مرنے کے بعد 1775 روپے جاگیر اور پنشن حکومت کے خزانے میں واپس چلے گئے اور ان کی جائیداد پر لوگوں نے قبضہ کر لیا۔

سرفراز خان کھرل کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا محمد امیر خان تھا۔ انگریز نے انہیں موضع سید موسیٰ کے مقام پر جاگیر عنایت فرمائی۔ 1866ء میں حکومت نے ان کے لئے

300 روپے سالانہ پنشن مقرر کردی۔ پیر کمالیہ کے گیارہ کنوئیں اور بے شمار گاؤں ان کے نام کر دیئے۔

امیر محمد خان نے مقامی انتظامیہ کے ساتھ ہر مشکل میں ہمیشہ تعاون کیا۔ انہوں نے مقامی انتظامیہ کی مدد کسی ایک موقع پر نہیں کی بلکہ کئی بار انہیں مشکلات سے نکالا۔ 1878ء میں جب افغانیوں کے ساتھ انگریزوں نے پنجہ آزمائی کی تو امیر علی کھرل نے انہیں سینکڑوں اونٹ اور آدمی جنگ کے لئے دیئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی ذاتی خدمات بھی پیش کر دیں جس کی انگریزوں کو ضرورت نہیں تھی۔ 1884ء میں بھی امیر علی خان نے بے چینی کی تحریکوں کو دبانے میں ضلعی انتظامیہ کا ساتھ دیا۔ انگریزوں کو آپ پر اس قدر اعتماد تھا کہ پورے ضلع میں آپ اکیلے درباری تھے۔ 1894ء میں امیر علی خان کی موت کے بعد سعادت علی خان اپنے والد کی جاگیر کے وارث بنے۔

کمال خان جو کہ کمالیہ کے بانی تھے، ان کے دو پوتے ابراہیم خان جو بعد ازاں سندھ نقل مکانی کر گئے، ان کے وارث خان بہادر حاجی امیر علی خان بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔ اللہ دین کی نسل کمالیہ میں ہی آباد رہی۔ امیر علی اور اس کے بیٹے نے اپنی تمام جائیداد 1907ء میں رہن رکھ دی اور ان کی جاگیر کورٹ آف وارڈ کی نگرانی میں چلی گئی جو بعد ازاں چھڑالی گئی اور خان صاحب محمد سعادت علی خان، قطب علی خان، محمد شہزاد خان اور محمد مراد خان میں تقسیم ہوگئی۔ انگریزوں نے انہیں ملتان اور لائل پور کے دو گاؤں اور منٹگمری کے 38 گاؤں کی تعلق داری کے علاوہ لائل پور کے 64 اور منٹگمری کے دس دیہاتوں کے مالکانہ حقوق بھی دے دیئے۔

صرف سعادت علی خان کو 16 دیہاتوں کے مالکانہ حقوق اور چناب کالونی میں وسیع رقبے کے علاوہ تین دیہاتوں کی نمبرداری بھی دی۔ انہیں 1924ء میں جاگیر کے علاوہ 500 روپے انعام بھی دیا گیا۔ یہ نہ صرف صوبائی درباری تھے بلکہ انہیں آنریری مجسٹریٹ کا درجہ بھی حاصل تھا۔ محمد شہزاد خان کو 16 دیہاتوں کی تعلق داری، گیارہ دیہاتوں کے مالکانہ حقوق، ایک گاؤں کی نمبرداری اور ملتان کمالیہ میں بڑی بڑی عمارتیں ان کے نام کر دیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ اور لائل پور میں انہیں 18 مربعے اور 15 گاؤں دیئے۔ یہ بھی صوبائی درباری تھے۔ ان کے بڑے بیٹے سرفراز خان نمبردار اور سب رجسٹرار کمالیہ

تھے۔ ان کے تیسرے صاحب زادے شہزاد خان پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر تعینات تھے۔ محمد مراد خان کو چھ گاؤں کا تعلقہ اور آٹھ دیہاتوں کے مالکانہ حقوق مل گئے تھے اور اسے ضلع کے درباری کی حیثیت حاصل تھی۔

1872ء میں امیر علی خان اور جہان خان میں ذیل داری کے سوال پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ تو اسے جلدی چکا دیا گیا۔ اس کے بعد بھی خاندان کے دونوں افراد کی آپس میں بول چال بند رہی۔ جہان خان کا لڑکا 1897ء تک اپنے گاؤں کمالیہ میں رہتا رہا۔

اس خاندان میں انگریزوں سے وفاداری کے جذبے پروان چڑھتے رہے، وہاں احمد خان کھرل انگریزوں کے لئے شدید نفرت کی آگ دل میں لئے پھرتا تھا اور اس نے انگریزوں کا جینا دوبھر کر دیا۔

قیام پاکستان کے بعد کھرل ساہیوال، اوکاڑہ، کمالیہ اور لائل پور کے علاقے میں پھیل گئے۔ 1946ء کے انتخابات میں کھرل سرداروں نے یونینسٹوں کا ساتھ دیا تھا۔ بعد ازاں مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد سیاست میں ابھرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ 1951ء میں علاقہ کمالیہ سے مختلف جماعتوں نے پیر ناصر دین شاہ، مخدوم نذر حسین، چوہدری محمد حسن ایڈووکیٹ سردار عبدالحق اور نواب زادہ غلام علی خان کو اپنا نمائندہ بنا کر ان کی کامیابی کے لئے کوششیں شروع کر دیں البتہ رائے نصر اللہ خان اس انتخاب میں بھاری اکثریت سے ایم ایل اے منتخب ہوگئے۔

انقلاب 1947ء میں رائے کوٹ اور مشرقی پنجاب کے دوسرے علاقوں سے مہاجرین متعدد مسلمان قبیلے یہاں آکر بسے تو نوابوں کا گرتا ہوا وقار بسرعت پیوند زمین ہونے لگا۔ رائے فیملی نے میدان جیتنے شروع کر دیئے اور ہر محاذ پر کھرل پس پس کر رہنے لگے۔ کھرل خاندان کے نواب زادہ جاوید احمد خان اپنے والد سردار خان کی وفات کے بعد 1970ء میں میدان سیاست میں اترے تھے انہیں کھرل خاندان کی پوری حمایت حاصل تھی۔

ڈاکٹر سلیمان نے 1953ء میں کھرل فیملی کے سرفراز خان کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ رائے گروپ جو کھرلوں کا قیام پاکستان کے بعد سے سیاسی حریف چلا آرہا تھا، انہیں شکست دی۔

نواب زادہ سرفراز خان کھرل نے سیاسی محاذ پر کامیابی کے لئے کئی بار کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ کھرل خاندان کو ایک بار خالد خان کی وجہ سے عروج حاصل ہوا۔ خالد خان کھرل کے چھوٹے بھائی 1970ء کے انتخاب میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ سے کامیاب ہوئے تھے۔ یہ کمالیہ کی نواب فیملی کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کا شمار بھٹو کے وفادار ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ بھٹو دور میں خالد خان کھرل کمشنر لاڑکانہ بھی رہے، ان دنوں ضلع جھنگ میں ان کے ہر حکم کی تعمیل ہوتی تھی۔ جب پیپلز پارٹی اقتدار سے الگ ہوئی تو خالد خان کھرل ملک سے باہر چلے گئے۔ 1988ء میں پیپلز پارٹی نے انہیں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ دیا۔ لیکن اسلامی جمہوری اتحاد کے اسد الرحمان کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ 1990ء کے انتخابات میں انہوں نے حصہ نہ لیا بلکہ اسد الرحمان کے مقابلے میں اپنے قریبی عزیز جاوید کھرل کو کھڑا کیا لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوسکے۔ دونوں کو شکست کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کمالیہ کے نواب زادہ کھرل خاندان کے سرکردہ افراد نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

خان غلام اکبر خان سیال

غازی خان
سلطان محمود — لال خان — محرم خان
بہرام خان — شیر خان
عنایت اللہ خان
1787 میں فوت ہوئے
شارت خان
رشید خان
شیر خان
چار نسلیں
کبیر خان
سلطان خان — صاحب خان
فتح خان — احمد خان — جلال خان
جلال خان
عنایت اللہ خان
1838ء میں فوت ہوئے
خان بہادر محمد اسماعیل خان
1890ء میں فوت ہوئے
کبیر خان
1898ء
میں فوت ہوئے
ولی داد خان
میں فوت ہوئے
سردار خان
1929
میں فوت ہوئے
مہادار خان
1880ء
میں پیدا ہوئے
احمد خان
1885ء
میں فوت ہوئے
زہاد خان
دو نسلیں
زکات خان
خان بہادر مہادار خان
1935ء میں فوت ہوئے
خان صاحب حاکم خان
1931ء میں فوت ہوئے
شمشیر علی خان
1896ء
میں فوت ہوئے
عنایت خان
1913ء
میں پیدا ہوئے
جہان خان
1930ء
میں پیدا ہوئے
عزیز اللہ خان
1930ء
میں پیدا ہوئے
محمد خان
1900ء
میں فوت ہوئے
احمد خان
1934ء
میں فوت ہوئے
فتح خان
1906ء
میں فوت ہوئے
خان غلام اکبر خان
1896ء
میں پیدا ہوئے
محمد خان
1916ء
میں فوت ہوئے
تین اور بیٹے
سرفراز خا
1914
میں پیدا ہو
کبیر خان
1917ء
میں پیدا ہوئے
قطب علی خان
1921ء
میں پیدا ہوئے
سلطان محمد خان
1925ء
میں پیدا ہوئے
امیر علی خان
1934ء
میں پیدا ہوئے
غلام محمد
1936
میں پیدا ہو

جھنگ کے سیال، رجوعہ، اور سید

جغرافیائی طور پر جھنگ ضلع سرگودھا اور ضلع ملتان کا درمیانی ضلع ہے چناب اور جہلم کے پانیوں سے سیراب ہونے والے یہ تینوں اضلاع اپنی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں بڑی حد تک مشابہ ہیں۔ ۱۹۰۴ء تک فیصل آباد، جھنگ کی ایک تحصیل تھی جھنگ والے پورے فخر سے فیصل آباد کو اپنا ترقی یافتہ بچہ کہتے ہیں جھنگ کا شہر آباد کرنے کا سہرا سیالوں کے سر ہے جنہوں نے اسے آج سیاسی حوالے سے ملکی اہمیت کا حامل بنا دیا ہے تقریباً ایک صدی سے اس شہر کی سیاست سیالوں، شاہ جیونہ فیملی اور رجوعوں کے گرد گھومتی رہی ہے پنجاب کے جاگیردار خاندانوں میں جھنگ کے سیال خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ جاگیرداروں کے اس خاندان نے بھی گذشتہ دو سو سالوں میں پنجاب کے تاریخی انقلابات اور سیاسی مدوجزر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس خاندان کے کئی افراد نے سکھوں کے عہد حکومت اور انگریزوں کے ابتدائی دور میں پنجاب کے ایک طاقتور خاندان کی حیثیت سے صوبے کے تمام ہنگاموں میں پوری طرح حصہ لیا۔

اس خاندان کا اصل وطن جونپور کا علاقہ تھا۔ جہاں یہ لوگ انتہائی غیر منظم حالت میں چھوٹے چھوٹے قبیلوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قبیلے کا نہ کوئی سربراہ تھا اور نہ کوئی اجتماعی لائحہ عمل۔ اس بے ترتیب زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس خاندان کے ایک فرد سیال (جس کے نام پر بعد میں یہ لوگ پنجاب میں مشہور ہوئے) نے سلطان علاؤالدین کے زمانہ میں 1243 ء کے اوائل میں پنجاب کا رخ کیا۔ اس مختصر سے قافلے نے تقریباً تمام پنجاب میں آوارہ گردی کرنے کے بعد ضلع شاہ پور کینال کے علاقہ کو آباد ہونے کے لئے منتخب کیا اور یہ وہاں پر آباد ہو گئے لیکن اس علاقے میں ان

کے پاؤں نہ جم سکے اور ارد گرد کے باشندوں سے ان کے جھگڑے شروع ہو گئے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ انہی لڑائیوں اور جھگڑوں میں صرف ہونے لگا۔ اگرچہ حالات کافی ناموافق تھے لیکن اس کے باوجود ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ماحول کی ناسازگاری سے تنگ آ کر خاندان کے سردار مل خان نے 1492 ء میں ساہیوال سے ہجرت کر کے جھنگ کے علاقے میں ڈیرے جمائے اور جھنگ سیال کی بنیاد ڈالی۔ یہاں اس خاندان کو اپنی طاقت مجتمع کرنے کا موقع ملا کیونکہ بیشتر علاقہ بنجر تھا اور ارد گرد آبادی کم ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی فوری خانہ جنگی کا اندیشہ نہیں تھا۔ جھنگ سیال کی باقاعدہ تعمیر کے چار سال بعد ہی حاکم لاہور نے مل خان کو اس ریاست کا مالک بنا دیا اور معاہدہ یہ طے پایا کہ مل خان حکومت کو باقاعدہ مالیہ ادا کرتا رہے۔ ظاہر ہے ارد گرد کے تمام علاقے پر بلا شرکت غیرے تصرف جمانے سے خاندان کے وقار میں اضافہ ہو گا۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی یہ خاندان صوبے کے سیاسی محاذ پر بھی آگے بڑھا۔ مل خان کے پوتے کھیوہ خان نے جھنگ سیال سے دس میل کے فاصلے پر قلعہ کھیوہ تعمیر کیا اور اس میں باقاعدہ رہائش اختیار کر لی۔ خاندان کی معاشرت میں ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا اور عظمت و وقار میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن دوسرے رئیسوں کی جاگیریں ہتھیانے یا سیاسی چپقلش میں عملی جوڑ توڑ کرنے کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ سیالوں کی آٹھ نو پشتوں نے یہیں منجمد سی زندگی گزار دی۔

خاندان کے تیرہویں سردار ولی داد خان نے اس جمود کو توڑ ڈالا۔ اس نے اپنی بے انداز طاقت کے بل پر میرک اور شور کوٹ پر قبضہ کر لیا اور یوں بے اندازہ دولت کے مالک بن گئے۔ ولی داد نے ہوشیاری سے اپنی جاگیروں کو مغلوں کی دستبرد سے بچائے رکھا اور ان کی وفاداری کا دم بھرتا رہا۔ سیاسی ماحول میں اس سردار نے اس خاندان کو عملی طور پر متعارف کرایا اور 1747 ء میں ان کی وفات کے بعد عنایت اللہ خان سیالوں کا سردار منتخب ہوا۔ انہوں نے خاندان کی طاقت کو پہلے سے زیادہ منظم کر دیا۔

سکھوں کے ابتدائی دور میں جھنگ سیال کی ریاست پر احمد خان سیال حکمران تھا۔ ایک مسلمان سردار کی حیثیت سے اس کی طاقت سکھوں کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ تھی۔ اس لئے رنجیت سنگھ نے حصول اقتدار کے لئے راستے کے اس کانٹے کو نکالنے کا فیصلہ کیا اور سکھوں کی فوج نے 1803 ء میں جھنگ سیال پر حملہ کیا۔ یہ اس خاندان کی تاریخ میں پہلی

مظفر لڑائی تھی۔ احمد خان سیال نے لڑائی کے خوفناک نتائج سے بچنے کے لئے رنجیت سنگھ سے صلح کر لی اور سکھ سرداروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ساٹھ ہزار روپے سالانہ مالیہ دینے کا وعدہ کیا لیکن احمد خان زیادہ دیر تک اس معاہدے پر قائم نہ رہ سکا۔ اس طرح رنجیت سنگھ نے جھنگ سیال پر حملہ کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا اور احمد خان شکست کھا کر بھاگ گیا۔

احمد خان نے ایک سیاسی شاطر کی طرح کمال ہوشیاری سے نواب مظفر خان والئی ملتان سے گٹھ جوڑ کیا اور اس کی امداد سے سکھوں کو شکست دے کر جھنگ سیال پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس شکست پر سکھ دربار میں زلزلہ آ گیا۔ 1810ء میں رنجیت سنگھ نے خود جھنگ سیال پر حملہ کیا اور احمد خان سیال کو گرفتار کر کے لاہور لے آیا جہاں اس نے احمد خان سے اپنے وقار اور ریاست کو بچانے کے لئے سکھ بادشاہ کے دربار میں وفاداری کا حلف لیا اور اسے قصبہ میروال ضلع امرتسر میں 12000 مالیت کی جاگیر عطا کی۔ احمد خان کا لڑکا عنائت خان اپنے باپ کی گرفتاری کے بعد روپوش ہو گیا تھا۔ سکھ اس کی روپوشی کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے احمد خان کو کہا کہ وہ وفاداری کے ثبوت میں اپنے لڑکے کو لاہور دربار میں پیش کرے۔

تقریباً چھ ماہ بعد احمد خان نے اپنے بیٹے کو لاہور دربار میں پیش کر دیا اور سکھوں نے اس نئے دوست کو ملتان میں تین ہزار روپے مالیت کی جاگیر عطا کی۔ احمد خان کی موت کے بعد اس کے لڑکے کی درخواست پر اس کے باپ کی جاگیر کو موضع سرائے سدھو میں منتقل کر دیا اور پھر 1823ء میں عنائت خان کے کہنے پر یہ جاگیر لیہ کے علاقہ میں مستان والی گاؤں کی صورت میں دے دی گئی۔

سکھ دوستی کے غیر متزلزل جذبے کے باوجود رنجیت سنگھ کی موت کے ساتھ ہی اس خاندان پر زوال آ گیا مہاراجہ گلاب سنگھ نے اسماعیل خان سیال سے (جو اس وقت خاندان کا سربراہ تھا) تمام جاگیر چھین کر سو روپے ماہانہ پنشن مقرر کر دی۔ اسماعیل خان تمام جاگیر سے محروم ہونے کے بعد جھنگ واپس چلا آیا۔

اس اثنا میں سکھوں کی سلطنت لڑکھڑانے لگی اور انگریز نے صوبے کی سیاست پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ انگریزوں کی نظر اسماعیل سیال پر پڑی۔ 1848ء میں میجر ایڈورڈ

نے ایک خاص قاصد کے ذریعے اسے بلایا اور اسے اپنا پر اعتماد ساتھی بنا لیا کیونکہ سیال سربراہ پہلے ہی اس طرح کے موقع کی تلاش میں تھے اور میجر ایڈورڈ کے کہنے پر جھنگ سیال سے نوجوانوں کو جمع کر کے فوج بنانا شروع کر دی۔ اس فوج کی سنگین سب سے پہلے ایک مسلمان جاگیردار عطا محمد کے سینے پر چمکی۔ اس مہم کی کامیابی کے بعد سیال انگریزوں کی ہر مہم میں بہادری کے جوہر دکھاتے رہے۔ جب پنجاب پوری طرح برطانوی سامراج کی گرفت میں آ گیا تو دوسرے جاگیرداروں کی طرح اسے 1856ء میں 600 روپے مالیت کی جاگیر کے علاوہ پانچ سو ایکڑ زمین عطا کی۔

1857ء کے خونی ہنگاموں میں سیال سردار انگریز کے حقوق کے تحفظ کے لئے چٹان کی طرح ڈٹے رہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک خصوصی فوج تیار کی جو باغیوں کی سرکوبی کرتی تھی۔ اس ہمہ گیر ہنگامے کے خاتمے پر اسے پانچ سو روپے کی مالیت کی خاص خلعت اور دو ہزار روپے کی زرعی جاگیر عطا کی۔

1879ء میں سیال سردار نے سر رابرٹ ایجرٹن کو ایک درخواست پیش کی جس میں اپنی سنہری خدمات گنوانے کے بعد یہ گلہ کیا گیا تھا کہ ان خدمات کا معاوضہ بہت ہی کم دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس درخواست پر سر رابرٹ ایجرٹن نے خاص سفارش کی جس کی بنا پر 2000 روپے کی مزید جاگیر دی گئی۔ اس کے بعد تمام نقد جاگیر کی بجائے اسے زمین دی گئی۔ اس سے پہلے مغل شہزادے بھی سیال قبیلے کو نوازتے رہے ہیں۔ ولی داد کو چنیوٹ کا قلعہ تحفہ میں دے دیا گیا تھا۔ اسماعیل خان کو 1857ء کی خدمات کے صلے میں 500 روپے کی خلعت اور خاں بہادر کا خطاب دیا گیا اور انہیں حکومت کی طرف سے چھ سو روپے کی جو امداد ملتی تھی، اس میں اضافہ کر کے نو سو روپیہ کر دیا گیا اور 950 روپے کی جاگیر بھی دی گئی۔ 1860ء میں انہیں جو پنشن دی گئی تھی، وہ اسماعیل خان کی خواہش پر لائف جاگیر میں تبدیل کر دی گئی۔ محمد اسماعیل خان جھنگ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹی جھنگ کے کونسلر بھی رہے۔

وہ ذیلدار اور ظلبردار بھی رہے اس کے علاوہ وہ صوبائی درباری بھی تھے۔ وہ ضلع جھنگ میں چار ہزار ایکڑ زمین اور جھنگ کے سترہ دیہاتوں کے مالک بن گئے۔ ان کے بعد ان کا بیٹا کبیر خان صوبائی درباری اور ذیلدار بنا دیا گیا۔ کبیر خان کی موت کے بعد مولاداد خان

سیال قبیلے کا سردار منتخب ہوا۔ وہ آنریری مجسٹریٹ کے بنائے جانے والے بینچ میں شامل تھے۔ وہ آنریری صوبیدار میجر بھی تھے۔ جنگ عظیم میں انہوں نے انگریزوں کے لئے جو خدمات سرانجام دیں، اس کے صلہ میں ساہیوال کے ضلع میں انہیں بہت بڑا رقبہ دیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں خدمات کے صلہ میں ایک پستول، گولڈ اور سلور میڈل اور بے شمار تعریفی سرٹیفکیٹ دیئے گئے اور انہیں خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا اور یہ انگریز سرکار کے کرسی نشین تو پہلے ہی تھے۔ ان کی موت 1931 ء میں ہوئی۔

حاکم خان کے بعد اس کا بیٹا عنایت اللہ سیال قبیلے کا سربراہ بنا اور علمبردار کی حیثیت سے انہیں جو پانچ گاؤں ملتے تھے، وہ ان کے علمبردار بننے سے انہیں مل گئے۔ عنایت اللہ کے بعد ان کا بیٹا امیر علی خان قبیلے کا سربراہ بنا۔ انہیں انگریز سرکار نے آنریری مجسٹریٹ اور صوبائی درباری کی نشست بھی الاٹ کر دی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں امیر علی کی موت کے بعد احمد خان قبیلے کا سربراہ چنا گیا۔ اس طرح سیال قبیلے نے وفاداری کے سلسلے میں انگریزوں سے شورکوٹ ساہیوال اور دوسرے علاقوں میں وسیع اراضی حاصل کر لی تھی۔

سیالوں کے علاوہ جھنگ کے دو سید خاندان رجوعہ اور شاہ جیونہ بھی اپنا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ شاہ جیونہ کی گدی خاصی قدیم ہے۔ حضرت شاہ جیونہ اکبر کے عہد میں پیدا ہوئے۔ ان کی نیکی کے چرچے تھوڑی سی مدت میں دور دور تک پھیل گئے۔ شاہ جہان نے اپنے روزنامچہ میں بھی ان کی تبلیغی خدمات اور تقویٰ کا ذکر کیا ہے۔ جھنگ کے گرد و نواح میں آپ کی کرامات کے کئی قصے مشہور ہیں۔ درگاہ کے نزدیک ایک چھوٹی سی دیوار اب تک قائم ہے۔ اس کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ دیوار حرکت میں آ گئی تھی اور گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی تھی۔

واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ شاہ جیونہ کی نواحی بستی میں کچھ لوگوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور خون خرابے تک نوبت جا پہنچی۔ حضرت شاہ جیونہ تک جب اس کی خبر پہنچی تو وہ یہ جھگڑا ختم کرنے کے لئے بہ نفس نفیس اس مقام پر تشریف لے گئے۔ جب آپ جا چکے تو آپ کے پوتے کو اس کا علم ہوا۔ چنانچہ وہ کم سنی کی عادت کے مطابق اس دیوار پر چڑھ گئے اور کہنے لگے۔

"چل میرے گھوڑے دادا کے پاس"

چنانچہ دیوار فوراً حرکت میں آ گئی اور گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتی ہوئی اس بستی میں جا پہنچی جہاں حضرت شاہ جیونہ تشریف لے گئے تھے اس کو اتفاق سمجھئے یا اس مقصد کے درگاہ سجادہ نشینوں کی کرامات تصور کیجئے کہ اس واقعہ کے پانچ سو سال بعد سید عابد حسین وزارتوں کی دیوار پر بیٹھ گئے۔ اس کے باوجود کہ وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بھی نہ تھے، اقتدار کی یہ دیوار حرکت میں آ گئی اور 1958 ء تک گھوڑے کی طرح دوڑتی پھرتی رہی اور سید عابد حسین صاحب اس گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر شاہ سواری کے کمالات دکھاتے رہے اور وزارتیں ان پر قربان ہوتی رہیں۔

یہاں کے زمیندار گھرانوں کی جاگیریں زیادہ تر سکھی عہد یا انگریز دور کی یادگاریں ہیں۔ سکھ دور میں جن دو سید خاندانوں کو سکھی دور میں خاصی بڑی زمینداریاں میسر آئیں، وہ رجوعہ اور شاہ جیونہ خاندان تھے۔ برطانیہ کے عہد میں 1856 ء میں زمینوں کا پہلا بندوبست ہوا۔ اس وقت تک نہریں نہیں نکالی گئی تھیں اور علاقہ بڑی حد تک بے آباد تھا۔ اس بندوبست کے تحت رجوعہ اور شاہ جیونہ خاندان کے نام بڑے بڑے ٹکڑے لگا دیئے گئے۔ انگریز نے یہ تقسیم قبیلہ وار کی تھی۔ جو قبیلہ عددی لحاظ سے زیادہ مضبوط اور انگریزوں کا زیادہ وفادار ہوتا تھا، اس کے نام سے بے آباد زمینوں کے وسیع رقبے کر دیئے جاتے۔ رجوعہ اور شاہ جیونہ خاندان اسی پالیسی کے تحت بڑے بڑے رقبوں کے مالک بن گئے۔

تحریک پاکستان اس ہمہ گیر سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی استحصال کے خلاف آنے والے ناگزیر انقلاب کی آواز تھی۔ زمیندار سرکار کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ شاہ جیونہ خاندان کے سربراہ سید مبارک حسین شاہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1946 ء میں عام انتخابات سے پہلے جھنگ کے ڈپٹی کمشنر نے زمیندارہ لیگ بنائی تو انہوں نے سید صاحب کو یقین دلایا کہ اس میں انہیں اہمیت دی جا رہی ہے۔ جب ان کے مخالف گروپ کے سربراہ سید محمد حسین کو زمیندارہ لیگ کا صدر بنا دیا گیا تو سید مبارک حسین اپنے حریف کی اس حوصلہ افزائی اور عزت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ وہ فوراً زمیندارہ لیگ کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ شاہ جیونہ جونیئر شاخ کے سربراہ

کرنل عابد حسین جنہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 1937ء میں ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ کے رکن کی حیثیت سے کیا تھا، مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ شورکوٹ سے مسلم لیگ کو کوئی امیدوار نہ مل سکا تو نواب مظفر کو کیمبل پور سے بلوا کر الیکشن لڑایا گیا۔ چنیوٹ میں مسلم لیگ کی عوامی طاقت دیکھ کر سردار غلام عباس شاہ رجوعہ نے مقابلے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس طرح جھنگ کی مسلم لیگ شور کورٹ کے محمد عارف خان جھنگ کے سید مبارک شاہ آف شاہ جیونہ اور چنیوٹ کے غلام محمد شاہ آف رجوعہ کے اتحاد ثلاثہ کا نام پائی۔ اس کے علاوہ نوازش علی خان، مہر غلام حیدر بھروانہ، شیخ محمد سعید اور مولا محمد ذاکر حسین جیسے درویشوں کی بھی جماعت تھی۔ قیام پاکستان کے بعد شاہ جیونہ خاندان کی قیادت کرنل عابد حسین کے گرد ہی گھومتی رہی ہے۔ وہ 1954ء میں مرکزی کابینہ کے رکن نامزد کئے گئے۔ اکتوبر 1955ء میں مغربی پاکستان کی کابینہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ تک خوراک کا محکمہ بھی پاس رہا۔ وزیر مواصلات اور تعلیم کے وزیر بھی رہے۔ آپ سید مراتب علی کے داماد اور پاکستان کے سابق وزیر خزانہ کے بہنوئی تھے۔ جب آنکھ کھلی تو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر خان صاحب اور نواب مشتاق گورمانی کی تخریب پیش کش ری پبلکن جب منظر عام پر آئی تو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر یہ ملک کی سب سے بڑی جماعت بن گئی۔ کرنل عابد ان کے پروڈیوسروں میں شامل تھے۔ وہ اس سیاسی عجوبے کے جنرل سیکرٹری رہے ہیں۔ میاں ممتاز دولتانہ نے میجر (ریٹائرڈ) مبارک اور ان کے کزن کرنل عابد حسین کو کسی حد تک کھڈے لائن لگائے رکھا تھا۔ ان زیادتیوں نے کرنل عابد حسین اور میجر مبارک علی کو ڈاکٹر خان صاحب کے قریب کر دیا تھا۔ محلاتی سازشوں کا دور جب بیت چکا تو ملک مارشل لاء کی گرفت میں آ گیا۔ سازشوں کے اس دور کی وجہ سے ملک معاشرتی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے زوال کی طرف جا رہا تھا اور مارشل لاء کی وجوہات کی تمام تر ذمہ داری سیاستدانوں پر ڈال کر انہیں 31 دسمبر 1966ء تک کوچہ سیاست سے بے دخل کیا گیا تو کرنل عابد حسین بھی نااہلیت کے ٹریبونل کی گرفت میں آ گئے۔ انہوں نے اپنا مقدمہ پوری تیاری سے لڑا بد عنوانیوں اور بد انتظامیوں کے الزامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر الزامات کی چھان پھٹک کے بعد انہیں سیاسی اور عوامی زندگی سے 31 دسمبر 1966ء تک دور رہنے کا حکم دیا گیا۔

ایوب خان نے بنیادی جمہورتیوں کے ذریعے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا تو رجوعہ سیال اور سید خاندان ایک بار پھر میدان میں آ گئے۔ کرنل عابد حسین ایبڈو کی وجہ سے الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ انہوں نے سید ذوالفقار علی بخاری کو شورکوٹ کی نشست سے انتخاب لڑانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے مقابلے میں سید حسن شاہ تھے۔ جھنگ کی دوسری نشست سے سیالوں کے نمایاں قبیلے کے سربراہ غلام حیدر بھروانہ میدان میں اترے۔ ان کے مقابلہ میں سردار زادہ ظفر عباس تھے۔ ان کا تعلق رجوعہ خاندان سے تھا۔ جھنگ کے یہ جاگیردار قیادت کے حصول میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے زور دار مقابلہ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ شورکوٹ سے خان محمد اسلم خان آزاد، صوفی احمد خاں بلوچ رائے احمد نواز منگیر ایڈوکیٹ، خان لال خاں بلوچ، قاضی محمد صفدر بھی قسمت آزمائی کر رہے تھے لیکن اصل مقابلہ دونشستوں کے لئے سیالوں، رجوعوں اور شاہ جیونہ خاندانوں کے درمیان ہی تھا۔

صوبائی نشستوں کے لئے شیخ محمد سعید سابق ایم پی اے نواب زادہ افتخار احمد انصاری مہر ولی محمد خاں بھروانہ، مہر شیر محمد گھمیانہ، سید علی حسین شاہ، نواب زادہ حبیب اللہ خان سیال، مہر محمد جہانگیر خان بھروانہ اور محمد ظفر اللہ خان بھروانہ جھنگ شہر کی صوبائی نشست کے لئے امیدوار بنے تحصیل چنیوٹ سے سید الطاف حسین شاہ سابق ایم پی اے سید ناصر شاہ، سردار غلام محمد شاہ رجوعہ، سید احمد شاہ، ملک ممتاز خان نسوانہ، غلام رسول، قاضی غلام شبیر امیدوار تھے۔

تحصیل شورکوٹ سے محمد افضل شاکر، مہر شیر محمد بھروانہ سابق ایم پی اے حکیم غلام نبی میاں غلام سرور، خان ذوالفقار خان سیال، میاں محمد اسلم چھینہ اور میاں سجاد احمد چھینہ امیدوار تھے۔ ان امیدواروں میں بھی جھنگ کے جاگیرداروں کی بھرپور نمائندگی تھی۔ شورکوٹ کی نشست سے ذوالفقار بخاری اپنے حریف کو بری طرح شکست دینے میں کامیاب ہوئے اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ چنیوٹ سے مہر غلام حیدر بھروانہ 221 ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے۔ ان کے مقابلہ میں سردار زادہ سید ظفر عباس نے 189 ووٹ لے کر شکست کھائی۔

شاہ جیونہ خاندان نے محترم فاطمہ جناح کو صدارتی انتخاب میں کامیاب کرانے کے

ے بڑے جتن کئے تھے۔ جھنگ شہر میں ایوب خان اور مادر ملت کے ووٹوں کا کوئی نمایاں
ق نہیں تھا۔ اس کا نواب امیر محمد آف کالاباغ کو شدید رنج تھا اور وہ اس موقع کی تلاش میں
ے کہ شاہ جیونہ خاندان کو فاطمہ جناح کی حمایت کا سبق سکھایا جائے۔ 1965 ء کے
ی اور صوبائی انتخابات 1962 ء کے غیر جماعتی انتخابات سے مختلف تھے۔ 1962 ء
ں حکومت نے پالیسی اختیار کی تھی کہ جو جیتے گا، وہی ہمارا امیدوار ہو گا البتہ 1965 ء کے
نتخابات میں صورت حال اس سے مختلف تھی۔ کنونشن مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آ چکا
۔ 1965 ء کی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان ہوا تو شاہ جیونہ خاندان پر ابتلا کا دور
روع ہو گیا۔ پہلا شگاف سرکاری مسلم لیگ میں اس وقت پڑا جب مہر فلک شیر بھروانہ نے
سلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔ ٹکٹوں کے حصول کے لئے دوڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ
ں سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایوب خان سے وفاداری کے اظہار کے لئے "ایوب گروپ"
کے نام سے رجوعہ سیداں ضلع جھنگ کے سردار فیض احمد شاہ، سردار فضل عباس شاہ،
ردار ناصر عباس، رتہ متہ کے میاں غضنفر عباس، مہر احمد شیر لالی، مہر ممتاز لالی، ملک محمد ممتاز،
ں محمد خان، ملک محمد حیات میاں محمد شفیع ٹیکو کارا، میاں محمد شاہ اور جانی شاہ اپنے گروپ کو
ونشن مسلم لیگ کے ذریعے ابھارنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس گروپ نے فاطمہ جناح
ی شکست میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

علاوہ ازیں قوم سیال بھروانہ جو ضلع جھنگ کے زمینداروں کا اہم قبیلہ ہے، ایوب
ان کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ سردار سید ظفر عباس اور مخدوم محمد غوث سجادہ نشین
ربار حضرت شاہ جیونہ کی سرکردگی میں سید علی شاہ رئیس کوٹ عیسیٰ، سید غضنفر عباس
ئیس رتہ متہ، مہر ظفر اللہ خان بھروانہ، رئیس گھمیانہ اور دیوان علی شاہ آف رجوعہ نے
صدارتی انتخاب میں ایوب خان کے حق میں زور دار صدارتی مہم چلائی تھی اس کے صلہ میں
کنونشن مسلم لیگ نے مسٹر نوازش علی خان کو مغربی پاکستان حلقہ نمبر 35 سے، حلقہ نمبر
36 سے سردار زادہ ظفر عباس ایڈووکیٹ کو کنونشن مسلم لیگ کا امیدوار نامزد کیا متحدہ
حزب اختلاف سے سید خاندان کے سید ذوالفقار علی بخاری، مسٹر نوازش علی خان کے مقابلہ
میں اترے سب سے پہلے حزب اختلاف کے رہنما اور جھنگ شہر سے نواب زادہ افتخار احمد
انصاری کو گرفتار کر لیا گیا علاوہ ازیں ضلع جھنگ سے 16 بی ڈی ممبروں کو گرفتار کر لیا جن

میں سے تیرہ ذوالفقار بخاری کے پکے حامی تھے۔ جس جرات اور بہادری سے کرنل عابد حسین کے گروپ نے 1965 ء میں انتظامیہ کی دھاندلیوں کے خلاف جنگ لڑی تھی یہ حلقہ پورے ملک کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ مسلم لیگ نے صوبائی اسمبلی کی تین نشستوں پر جھنگ شہر اور تحصیل جھنگ میں چوہدری ادریس ایڈووکیٹ صدر سٹی مسلم لیگ تحصیل چنیوٹ کے لئے قاضی غلام شبیر اور شورکوٹ کی تحصیل کی نشست پر شیخ اختر علی شاہ قریشی کو نامزد کیا۔ ادریس ایڈووکیٹ کا مقابلہ حبیب اللہ خاں سیال، ذوالفقار علی خان سیال ممبر صوبائی اسمبلی اور متحدہ محاذ کے نواب زادہ انصاری سے تھا چنیوٹ کی نشست پر قاضی غلام شبیر کا مقابلہ الطاف حسین سید اور مہر محمد نسوانہ وکیل سے تھا۔

اس ضلع کی سیاست سے سرکاری مداخلت کا پول اس وقت کھلا جب ضلع کچہری سے کرنل عابد حسین کو گرفتار کر لیا گیا قریب ہی تھانہ تھا۔ گاڑی میں لے جانے کی بجائے انھیں ہتھکڑی لگا کر بازار سے لے جایا گیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اس شخص کے ساتھ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اخبارات نے حکومت کی اس حرکت کا نوٹس لیا اور رائے عامہ حکومت کے خلاف بننے لگی تو حکومت نے کرنل عابد حسین کو رہا کر دیا۔ اس موقع پر میجر مبارک علی شاہ اور جھنگ کے ایک ایڈووکیٹ فلک شیر بھروانہ نے پر ہجوم پریس کانفرنس میں حکومت کے اس رویے کی مذمت کی۔

میجر مبارک جو خود بھی مورث حکومت میں وزیر مال رہے انھوں نے الزام لگایا کہ ان کے صاحب زادے ذوالفقار بخاری قومی اسمبلی کا انتخاب لڑ رہے ہیں۔ ان کے 80 ووٹروں کو پولیس گھروں سے اٹھا کر لے گئی ہے۔ ان میں سے بیس کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا۔ باقی ارکان ضلع انتظامیہ نے نہ جانے کہاں چھپا رکھے ہیں۔ گڑھ مہاراجہ کے بی ڈی ممبروں کی عورتوں کو پولیس گھروں سے لے گئی ہے۔ ان کارروائیوں کا مقصد وفاداریاں تبدیل کرانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ذوالفقار بخاری نے حکومتی مداخلت کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں ضلعی انتظامیہ کی جانبداری کے خلاف رٹ کی اس وقت کے جسٹس انوار الحق نے ڈپٹی کمشنر مسٹر سعید احمد اور ایس پی شیر احمد کو ہدایت کی کہ وہ مسلم لیگی امیدوار مہر نوازش علی خان کی انتخابی مہم چلانے سے باز رہیں۔ درخواست دہندہ میجر مبارک علی نے عدالت

کے روبرو درخواست پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب سے ہم نے مسلم لیگی امیدوار کے خلاف کاغذات جمع کرائے ہیں ڈی سی اور ایس پی ووٹروں کو مسلم لیگ کے حق میں اور ہمارے خلاف ووٹ دینے کی تلقین کر رہے ہیں۔

ایک موقع پر جب شاہ جیونہ خاندان کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو کرنل عابد حسین نے الزام لگایا کہ ذوالفقار بخاری کی حمایت کرنے والے ایک سو اسی رائے دہندگان کو پولیس اغوا کر کے لے گئی ہے۔ جن کو گرفتار کیا ہے، ان پر خود ساختہ چوری، ڈاکہ اور اندیشہ نقص امن عام کے مقدمات درج کیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت پولیس فورس ہے جو قومی اسمبلی کا انتخاب لڑ رہی ہے۔ ہائی کورٹ کی واضح ہدایت کے باوجود ضلع حکام پوری سرگرمی سے سرکاری پارٹی کے امیدوار کی انتخابی مہم کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ کرنل عابد حسین نے ڈی سی اور ایس پی کے خلاف توہین عدالت کا استغاثہ دائر کر دیا جس کی کئی ماہ تک سماعت زور و شور سے جاری رہی اور اس کی کارروائی اخبارات کے صفحہ اول پر نمایاں شائع ہوتی رہی۔

18 مارچ 1965ء کو میجر مبارک، مہر فلک شیر بھروانہ ایڈوکیٹ اور سید علی حسین شاہ کی زیر قیادت انتخابی ادارہ کے 50 ارکان الیکشن کمشنر کے احاطہ میں جمع ہوئے۔ انہوں نے سیاہ رنگ کے کتبے اٹھا رکھے تھے جن پر نعرے درج تھے ہمارے امن پسند رہنماؤں اور محب وطن پاکستانیوں پر حکمران جماعت نے قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینا ناممکن بنا دیا ہے۔ صدارتی انتخابات میں مادر ملت کے حق میں 202 ارکان نے اور ایوب کے حق میں 272 ارکان نے ووٹ دیئے تھے لیکن مقامی دھڑے بندیوں کی وجہ سے شاہ جیونہ خاندان نے ان سے بہت سے ارکان کو توڑ لیا تھا۔ اس انتخاب میں حصہ لینا لاحاصل ہو گیا تھا۔ 143 رائے دہندگان نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔ ذوالفقار بخاری نے حکومتی مداخلت کے خلاف بائیکاٹ کر دیا۔ حکومتی امیدوار مہر نوازش علی خان 414 ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے تھے بائیکاٹ کے باوجود ذوالفقار بخاری کو 11 ووٹ ملے۔ مسلم لیگ کا امیدوا سردار زادہ ظفر عباس ناکام ہو گیا۔ ان کے سسر سردار غلام محمد شاہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہو گئے۔ سید اختر علی شاہ، قاضی غلام شبیر اور چوہدری محمد ادریس ایڈوکیٹ کو بھی حکومت نے کامیاب کرا لیا تھا۔

جھنگ کی سیاست 50 سالوں سے سیالوں، رجوعہ اور شاہ جیونہ خاندانوں کے گرد گھومتی رہی ہے۔ 1970ء کے انتخابات میں رجوعہ گروپ چنیوٹ میں باہم گر متصادم ہو گیا جس کی وجہ سے انہیں اپنے گروپ کو منظم کرنے کا صحیح موقع نہ ملا۔ جھنگ نمبر 2 سے سید ظفر عباس آزاد امیدوار کی حیثیت سے میدان میں اترے تھے۔ ان کے مقابلے میں سردار غلام محمد شاہ کے صاحب زادے سردار محمد علی شاہ رجوعہ جو سید ظفر عباس کے برادر نسبتی بھی ہیں، پیپلز پارٹی کا ٹکٹ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ گزشتہ انتخابات میں سردار غلام محمد شاہ حکمران جماعت کونشن مسلم لیگ کے امیدوار تھے اور سردار غلام محمد آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوئے تھے۔ یہ گروپ اس انتخاب میں اس نشست پر اس قدر انتشار کا شکار تھا کہ انہیں دوسرے علاقوں میں دھڑے بندی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس خلا کو کرنل عابد حسین نے پر کرنے کی کوشش کی۔ جھنگ کی دوسری نشست سے غلام حیدر بھروانہ کا مقابلہ شاہ جیونہ خاندان کے سرخیل کرنل عابد حسین سے تھا۔ غلام حیدر بھروانہ پہلے شاہ جیونہ گروپ سے منسلک تھے۔ مہر غلام حیدر بھروانہ نے بھی اس ضلع کے دوسرے جاگیرداروں کی طرف کونشن مسلم لیگ کو خیر باد کہہ دیا کیونکہ اب وہ اقتدار میں نہیں رہی تھی۔ انہوں نے سنی بورڈ کی طرف سے جمعیت علما پاکستان کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا پسند کیا۔ انہیں جمعیت علما اسلام کی حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ شیعہ سنی جھگڑے میں وہ سنی موقف کے حامی تھے۔ جھنگ کی تیسری نشست سے محمد عارف خان رجبانہ نے انتخاب میں حصہ لیا۔ وہ شاہ جیونہ گروپ کے رکن اور کرنل عابد حسین کے انتہائی وفادار ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں صاحب زادہ نذیر سلطان جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ سے ان کے مقابلہ میں حصہ لے رہے تھے۔ صوبائی نشستوں کی تقسیم کچھ اس طرح تھی۔ نواب زادہ افتخار احمد انصاری آزاد شاہ جیونہ گروپ، شیخ محمد اقبال جمعیت علما اسلام ہزاروی گروپ شیخ محمد سعید پروگریسو پیپلز پارٹی (ان کا شمار کونشن لیگ کے بے تاج بادشاہوں میں ہوتا تھا۔ ظفر عباس قریشی پیپلز پارٹی، شریف الدین آزاد ولی احمد بھروانہ آزاد

حلقہ نمبر 2 سے محمد حیات چیلہ آزاد، واجد علی شاہ آزاد شاہ جیونہ گروپ، سید حسن شاہ آزاد سید تقی شاہ شاہ جیونہ گروپ،

حلقہ نمبر 3 سے احمد خان سپرا جمعیت علما اسلام ہزاروی گروپ ظفر اللہ خان بھروانہ آزاد شاہ جیونہ گروپ ناصر حیات آزاد، عمر حیات گھسیانہ پیپلز پارٹی، سردار احمد شاہ جمل خان بلوچ نیپ بھاشانی گروپ، جہانگیر خان بھروانہ آزاد، دیوان محمد سعید آزاد جھنگ 4 جو چنیوٹ رجوعہ خاندان کا مرکز ہے۔ اس میں شاہ جیونہ خاندان کی پیش قدمی دیکھئے۔

رائے خدا بخش کلیار جماعت اسلامی، سید واجد علی شاہ (آزاد شاہ جیونہ گروپ) چوہدری دلاور خان چدھڑ (آزاد) چوہدری فلک شیر آزاد (شاہ جیونہ) مہر شماست خان سپرا (آزاد شاہ جیونہ گروپ) سردار سید احمد شاہ آزاد شاہ جیونہ گروپ

جھنگ نمبر 5 سے مہر غلام عباس لالی (آزاد شاہ جیونہ گروپ) مہر دوست محمد لالی (آزاد شاہ جیونہ گروپ)

جھنگ نمبر 6 سید الطاف حسین شاہ اسے رجوعہ اور شاہ جیونہ دونوں گروپوں کی حمایت حاصل تھی قاضی غلام دستگیر آزاد باقی اور بھی امیدوار تھے۔

جھنگ نمبر 7 اختر عباس بھروانہ آزاد شاہ جیونہ گروپ، شمس الحق بھروانہ شاہ جیونہ گروپ، چوہدری محمد ادریس آزاد (کنونشن مسلم لیگ) اختر علی شاہ قریشی آزاد

جھنگ نمبر 8 سے ذوالفقار علی خان سیال شاہ جیونہ گروپ مہر نوازش علی خان سیال پیپلز پارٹی (1965 ء میں کنونشن مسلم لیگی تھے اور اس جماعت کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے کے لئے تیار تھے جیسے ہی اقتدار سے گئی، مہر نوازش علی خان سیال صاحب پیپلز پارٹی میں چلے گئے) کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہے تھے اور رشتہ کے اعتبار سے آزاد امیدوار ذوالفقار علی خان سیال کے چچا تھے۔

ضلع جھنگ کی سیاست کا یہ المیہ ہے کہ یہاں سیاسی جماعتیں غیر موثر ہیں یہاں کے جاگیر دار جس سیاسی جماعت میں جاتے ہیں، اس کا ستارہ عروج پر چلا جاتا ہے۔ یہاں کا شاہ جیونہ گروپ کا سیاست میں کبھی بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ 1970 ء کے سیاسی حالات نے شاہ جیونہ خاندان کی سیاست کی کایا پلٹ دی۔ اس انتخاب نے برادریوں اور مقامی دھڑے بندیوں کو کسی حد تک ملیامیٹ کر دیا البتہ مذہبی عصبیت کا رنگ ذرا غالب رہا۔ ان اٹھنے والے برجوں میں کرنل عابد حسین بھی شامل تھے۔ شاہ جیونہ گروپ قومی اور

صوبائی اسمبلیوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ کرنل عابد حسین پر انتخابات کے چند ہفتوں بعد دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی موت کے بعد انکی ہونہار بیٹی سیدہ عابدہ حسین نے جانشین بننے کا اعلان کیا تو سید خاندان کو سیدہ عابدہ حسین کا سیاست میں یوں کود جانا اچھا نہ لگا۔ کیونکہ سید زادیوں کے سیاست میں آنے کی پہلے اس خاندان میں کوئی نظیر نہیں ملتی تھی۔ ان کے تایا میجر مبارک نے شاہ جیونہ گروپ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس طرح اس خاندان کی سیاسی راہیں جدا ہو گئیں۔

باپ کی موت کے بعد سیدہ عابدہ حسین سیاست کے میدان میں تو کود پڑی تھی لیکن انہوں نے اپنے لئے کوئی سیاسی فلسفہ سامنے نہ رکھا حزب اختلاف کے دشوار اور مشکل سفر پہ گامزن رہنا ذرا مشکل تھا۔ پنجاب کے ایک سابق گورنر اور محمود علی قصوری کی وساطت سے پیپلز پارٹی سے اپنے سیاسی سفر کا آغاز کیا اور وہ خواتین کی نشست پر صوبائی اسمبلی کی رکن بھی منتخب ہو گئیں۔ پیپلز ورکس پروگرام ضلع جھنگ کی چیئرمین بھی منتخب ہو گئیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے سیاسی اثر و رسوخ سے شاہ جیونہ گروپ کو پھر متحد کیا بعد ازاں انہوں نے سیاسی وفاداری تبدیل کر لی اور پیپلز پارٹی سے بغاوت کر کے قومی اتحاد میں شامل ہو گئیں اور قومی رہنماؤں کے ساتھ بھٹو کے خلاف زور دار جلسوں میں حصہ لیا۔

1977 ء کے انتخابات کا رنگ جھنگ میں ہونے والے سابقہ انتخابات سے مختلف تھا۔ کہ الیکشن سیاسی وابستگیوں کی بنیاد پر تو لڑے گئے البتہ مقامی دھڑے بندیوں اور گروپنگ کو توڑا نہ جا سکا۔ غلام حیدر بھروانہ اور صاحب زادہ نذیر سلطان جو جمعیت علما پاکستان کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے پارٹی سے بغاوت کرتے ہوئے انہوں نے اپنی تمام تر وفاداریوں کا عہد پیپلز پارٹی سے باندھ لیا ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں غلام حیدر بھروانہ نے مولانا رحمت اللہ کو شکست دی۔ مہر غلام حیدر نے پیر آف سیال کے ذریعے مولانا رحمت اللہ کو دستبردار کرانے کا منصوبہ بنایا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ سید ذوالفقار علی بخاری نے بھی پیپلز پارٹی میں انتخابات سے قبل ہی شمولیت اختیار کی تھی۔ ان کے والد میجر مبارک علی بہترین پارلیمینٹیرین تھے۔

پیپلز پارٹی کی حکومت جب دھاندلیوں کے الزامات کے تحت برطرف کی گئی تو ضیاء الحق نے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر کے بلدیاتی سیاست کے ذریعے نئی قیادت کو

ابھارنے کا منصوبہ بنایا اس وقت ضلع جھنگ کی قیادت سید عابدہ حسین کی مٹھی میں تھی۔ وہ 1979ء سے 1987ء تک ضلع کونسل جھنگ کی چیئرمین رہیں۔ ان آٹھ سالوں کے دوران ضلع میں جس قدر ترقیاتی کام ہوئے اس نے اسے ضلع کی مقبول ترین شخصیت بنا دیا۔ بلدیاتی سیاست کے ساتھ ساتھ وہ شاہ جیونہ گروپ کو بھی مضبوط کرتی رہیں۔ ضلع میں ایسی شخصیتوں کو ابھارتی رہیں جو صوبائی اور قومی اسمبلی کی قیادت میں ان کے گروپ کے نمائندے ہوں۔ 1985ء میں رجوعہ خاندان کے اہم فرد سردار زادہ محمد علی غیر جماعتی انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن چنے گئے۔ مجلس شوریٰ کے رکن دوست محمد لالی نے ان سے شکست کھائی۔ ان انتخابات میں عابدہ حسین نے غلام محمد گادھی کو شکست دی تھی۔ ان کے خاندان کے پرانے ساتھی مہر عارف خان سیال اور ظفر اللہ خان بھروانہ کامیاب ہو گئے تھے۔ انتخابات میں نئی قیادت ابھر کر سامنے آئی غیر جماعتی اسمبلی نے جب سیاسی رنگ اختیار کیا تو آزاد پارلیمانی گروپ کے نام سے مسلم لیگ کے خلاف ایک مضبوط اپوزیشن وجود میں آئی سب سے پہلی شکست خواجہ صفدر کو سیدہ عابدہ حسین کے شوہر فخر امام نے سپیکر کے انتخابات میں دی اس کے بعد آزاد پارلیمانی گروپ ایسے لوگوں اور سیاسی مسافروں کو تنقید کا نشانہ بناتا رہا ہے جو سیاسی وابستگیوں کا صلہ وصول کرنے کے لئے اقتدار کی غلام گردشوں میں گھومتا تھا اس گروپ نے ضیاء الحق اور محمد خان جونیجو کی پالیسیوں کی کھل کر مخالفت کی جس کی قیادت سیدہ عابدہ حسین اور اس کے شوہر سید فخر امام کے پاس تھی جو بلدیاتی سیاست کے ذریعے ابھر کر سامنے آئے تھے اور جنہوں نے گیلانیوں اور قریشیوں کی سو سالہ اجارہ داری کو توڑتے ہوئے ڈسٹرکٹ کونسل کی چیئرمینی بھی حاصل کر لی تھی۔ گیلانیوں اور قریشیوں کی برسوں پرانی سیاسی دشمنی کو دوستی میں بدلنے کا سہرا بھی فخر امام کے سر ہے جن کو اقتدار سے باہر رکھنے کے لئے قریشوں اور گیلانیوں میں مفاہمت ہوئی تھی۔

جب ملک میں سیاسی آزادیاں بحال ہوئیں اور محترم بے نظیر بھٹو خود ساختہ جلاوطنی کے بعد وطن واپس لوٹیں تو آزاد پارلیمانی گروپ کی حیثیت اپوزیشن کے حوالے سے کم ہو گئی۔ البتہ اس کا کردار ختم نہ ہوا۔ محمد خان جونیجو کی حکومت کو بد عنوانیوں کے الزامات کے تحت جب برطرف کیا گیا تو سیدہ عابدہ حسین نے انہی لوگوں کے ساتھ صلح کر لی جن کے

خلاف ایوانوں میں شدید سیاسی جنگ لڑتی رہی تھیں۔ وہ نہ صرف ان کی حلیف بن گئیں بلکہ انہیں اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ بھی دیا گیا جو انہوں نے شکریے کے ساتھ واپس کر دیا اور آزاد امیدوار کی حیثیت سے دو نشستوں سے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت وہ اطلاعات و نشریات کی وزیر تھیں۔ وزارت کے دوران جھنگ کے ترقیاتی کاموں کے علاوہ لوگوں کے ذاتی کاموں میں دلچسپی لیتی رہیں۔ انہوں نے دو نشستوں سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیابی حاصل کی جھنگ کی سیاست سے فرقہ واریت کو کسی حد تک کم کرنے کی کوششیں بھی کیں یہی وجہ تھی کہ ان کے مقابلے میں انجمن سپاہ صحابہ کے مولانا حق نواز جھنگوی شکست کھا گئے تھے اور دوسری نشست سے مولانا ذاکر کے صاحب زادے جو 1985ء میں منتخب ہو گئے تھے، 1988ء میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ ان حلقوں میں ایک نشست پر ان کے قریبی عزیز سید ذوالفقار بخاری بھی بری طرح شکست کھا گئے تھے جو 1962ء میں ایم این اے منتخب ہوئے تھے۔ 1965ء میں وہ حکومتی مداخلت کی وجہ سے نہ جیت سکے تھے۔ 1970ء میں بھی وہ امیدوار بنے اور کرنل عابد حسین کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔ 1977ء میں وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایم این اے منتخب ہوئے۔ 1985ء میں انہوں نے الیکشن میں پیپلز پارٹی کی پالیسی کی حمایت کرتے ہوئے حصہ نہ لیا۔ سیدہ عابدہ حسین اپنے کزن ذوالفقار بخاری سے صلح کرنے کے لئے تیار تھی لیکن ذوالفقار بخاری نے اپنی سیاسی راہیں ان سے جدا کر لیں۔ 1977ء کے انتخابات میں شاہ جیونہ کے گدی نشین محمد غوث کے صاحب زادے فیصل صالح حیات کے خلاف رٹ دائر کی تھی کہ انہیں الیکشن میں حصہ لینے سے روکا جائے۔ کیونکہ اس وقت ان کی عمر کم تھی سیدہ عابدہ حسین رشتہ کے اعتبار سے ان کی پھوپی ہیں۔ اس طرح شاہ جیونہ خاندان گروپ میں انتشار پیدا ہو گیا۔ 1988ء کے انتخابات میں سیدہ عابدہ حسین نے اس نشست سے حصہ نہ لیا جہاں سے وہ 1985ء میں کامیاب ہوئی تھیں کیونکہ اس کی ایک ٹکر تو سید ذوالفقار بخاری سے ہو چکی تھی اور فیصل صالح حیات کے مقابلہ نہ کرنے کی پالیسی کے تحت تیسری نشست سے الیکشن میں حصہ نہ لیا۔ سیدہ عابدہ حسین سیاسی میدان میں ڈٹ جائیں تو ان کے موقف کو تبدیل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جونیجو حکومت ان کو ان کے شوہر فخر امام کو ہر طرح کی سزا دینے پر تلی ہوئی تھی اور ان کے سٹڈ فارم پر حکومت نے قبضہ کرنے کی

وشش کی۔ حلقہ 68 سے ان کے کزن سید ذوالفقار بخاری چوتھے نمبر پر رہے۔
1988 ء کے انتخابات میں شاہ جیونہ خاندان کے ابھرتے ہوئے چشم وچراغ سید فیصل صالح حیات قومی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے سینئر افتخار علی بخاری کو شکست دی۔ 1977 ء میں انہوں نے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سابق ناظم اعلیٰ ظفر جمال بلوچ کو شکست دی تھی۔ 1988 ء میں وہ وفاقی وزیر بھی بنا دیئے گئے۔ ان کا شمار بے نظیر بھٹو کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے اور پارٹی پالیسیوں کی ہمیشہ حمایت کرتے رہے ہیں۔ 1988 ء کے انتخاب میں ضلع جھنگ سے دوست محمد لالی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے ملک غلام عباس نسوانہ کو شکست دی جو 1985 ء میں مسلم لیگی تھے۔ جب پیپلز پارٹی کے عروج کا زمانہ آیا تو یہ پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ سردار زادہ ظفر عباس رجوعہ بھی اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گئے۔ 1977 ء میں وہ آزاد ایم پی اے منتخب ہوئے تھے۔ بعدازاں وہ پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ 1985 ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔

1988 ء میں محمد نواز بھروانہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوئے تھے۔ انہیں شاہ جیونہ خاندان کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ناکام امیدوار مہر ظفر اللہ بھروانہ کو سید عابدہ حسین نے بے اثر کر دیا تھا۔ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ حاصل کرنے کے باوجود آزاد امیدوار سے شکست کھا گئے تھے۔ مہر ظفر اللہ بھروانہ کا شمار سدا بہار ایم پی اے میں ہوتا تھا۔ انہوں نے 1970 ء میں مہر عمر حیات سیال کو شکست دی تھی۔ 1977 ء میں بھی وہ بحیثیت آزاد امیدوار کامیاب ہوئے۔ 1985 ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف کے مشیر بھی رہے۔ سید غضنفر حسین شاہ آف رتہ بھی 1988 ء کے انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے سید چراغ اکبر کو شکست دی تھی جو 1985 ء میں اس علاقے سے کامیاب ہوئے تھے۔ ان کے والد سید تقی شاہ 1970 ء میں شاہ جیونہ گروپ سے کامیاب ہوئے تھے۔ ان کا شمار کرنل عابد حسین کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔ 1965 ء کے انتخابات میں کرنل عابد حسین کے ساتھ ساتھ سید تقی نے بھی حکومتی جبر حوصلے سے برداشت کیا تھا۔ 1988 ء میں ان کے صاحب زادے سید چراغ اکبر اپنے قریبی رشتہ دار غضنفر عباس رتہ سے شکست

کھا گئے۔

ضلع جھنگ میں بھروانوں کو ہمیشہ ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ 1988 ء میں اختر عباس بھروانہ کامیاب ہو گئے۔ 1985 ء میں وہ ناکام ہو گئے تھے۔ 1977 ء میں ان کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔ 1970 ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیا تھا۔ ان کے ایک قریبی رشتہ دار اسلم بھروانہ وزیر اعلیٰ کے مشیر ہیں۔ ضلع جھنگ میں اختر عباس بھروانہ کی شخصیت کو ابھارنے میں میاں نواز شریف نے اہم کردار ادا کیا۔

1987 ء میں ان کے گروپ کو ضلع کونسل کی سیاست میں نمایاں کامیابی نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود انہوں نے انہیں ضلع کونسل کا چیرمین منتخب کروا دیا۔ 1987 ء کے بلدیاتی انتخابات میں سیدہ عابدہ حسین کو ضلع کی سیاست میں بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خود تو انہوں نے ضلع کونسل کی سیاست میں حصہ نہ لیا البتہ انہوں نے اپنا مضبوط گروپ سامنے لانے کی سرتوڑ کوششیں کی۔ سید ذوالفقار بخاری کے بیٹے کو ضلع کونسل کا چیرمین بنانے کے لئے رانا نعیم نے اہم کردار ادا کرنا چاہا لیکن میاں نواز شریف نے شرط یہ رکھی تھی۔ کہ اگر سید ذوالفقار بخاری پیپلز پارٹی کو خیرباد کہہ کر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں تو ان کے بیٹے کو اس صلہ میں چیرمین ڈسٹرکٹ کونسل جھنگ منتخب کروایا جا سکتا ہے۔

1990 ء کے انتخابات میں شاہ جیونہ خاندان کو بہت بڑا صدمہ اس وقت برداشت کرنا پڑا جب 1988 ء قومی اسمبلی کی دونشستوں پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہونے والی سیدہ عابدہ حسین قومی اسمبلی کی نشست سے شکست کھا گئی۔ 1988 ء اور 1990 ء کے دو سالوں میں جھنگ کی سیاست میں کتنے نشیب وفراز آئے۔ سیاست میں فرقہ واریت کا رنگ اس حد تک غالب آ گیا تھا کہ حق نواز جھنگوی کو قتل کر دیا گیا جو 1988 ء میں سیدہ عابدہ حسین کے خلاف ناکام ہوئے تھے۔ شہری نشست سے عابدہ حسین دستبردار ہو گئی۔ اسلامی جمہوری اتحاد نے یہاں سے سنی امیدوار اور انجمن سپاہ صحابہ کے قائد ایثار الحق قاسمی کو ٹکٹ دیا۔ سیدہ عابدہ حسین نے 1988 ء کے انتخاب میں وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ انتخاب میں سنی امیدوار کی حمایت کریں گی اور انہوں نے ایثار الحق قاسمی کے مقابلے میں شاہ جیونہ گروپ کے کسی امیدوار کو کھڑا نہ کیا۔ اب اسلامی جمہوری اتحاد اور پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی ترتیب کچھ یوں تھی۔ (سیدہ عابدہ حسین، سید فیصل صالح حیات)، (ایثار

الحق قاسمی، نواب امان اللہ)، (اختر عباس بھروانہ، نذیر سلطان) (حاجی مولانا محمد رحمت اللہ فیصل صالح حیات)

عابدہ حسین سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شاہ جیونہ خاندان کے گدی نشین اور اپنے قریبی رشتہ دار کے مقابلے میں آ جائیں گی۔ بہر حال سیاست میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سیدہ عابدہ حسین اور اختر عباس بھروانہ میں اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ اختر عباس بھروانہ صوبائی سطح پر تیزی سے شہرت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ عارف خان سیال جو کرنل عابد اور شاہ جیونہ خاندان کے انتہائی قابل اعتماد ساتھی تھے، 1990 ء میں اس نے بھی سیاسی راہیں اس خاندان سے جدا کر لیں۔ اختر عباس بھروانہ اپنی کامیابی کے لئے ایک ہی نعرہ لگاتے رہے "ووٹ دو سڑکیں لو" ان کے خلاف ہونے والے اس پروپیگنڈے نے بھی ان کی سیاسی مہم کو متاثر کیا تھا کہ وہ شیعہ نہیں، سنی ہیں۔ سید افتخار علی شاہ جو مسلم لیگ میں شامل تھے، پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیرمین بھی رہے۔ 1988 ء میں اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار تھے۔ شکست کھانے کے بعد وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔

اب شاہ جیونہ خاندان دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کی ہیں، دوسری اقوام میں رجوعے سپرا دیوکہ، سیال، سادات بھروانے، نسوانے، ماچھیانے، خانو آنے، کادھی، کھوکھر، بلوچ، ہنجرا اپنی پرانی دھڑے بندیوں کی وجہ سے شاہ جیونہ گروپ میں دونوں کے ہم نوا بن گئے ہیں۔ 1990 ء کے انتخابات میں ایثار الحق قاسمی قومی اور صوبائی اسمبلی کی نشست پر انجمن سپاہ صحابہ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گئے تھے۔ ضمنی انتخاب میں ان کے امیدوار کا مقابلہ اسلامی جمہوری اتحاد کے شیخ اقبال احمد چیرمین بلدیہ جھنگ سے تھا۔ پولنگ والے دن خونی معرکے میں ایثار الحق قاسمی ممبر قومی اسمبلی اور شیخ اقبال کے داماد قتل ہو گئے۔ دسمبر 1991 ء میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں انجمن سپاہ صحابہ نے نمایاں کامیابی حاصل کر کے جھنگ کی سیاست کو سیالوں، رجوعوں اور شاہ جیونہ کے خاندانوں سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔

شیعہ سنی تنازعہ جھنگ کی سیاست کا عمومی ڈھانچہ ہے۔ جس پر جاگیرداروں کی چھاپ رہی ہے۔ جس کا نقشہ برطانوی عہد میں تیار کیا گیا تھا۔ یہ مذہبی اختلافات پہلی مرتبہ 1951 ء کے انتخابات کے موقع پر ابھر کر آئے تھے جب مولانا محمد ذاکر آزاد امیدوار کی

حیثیت سے رجوعہ گروپ کے سید غلام محمد شاہ کے مقابلے میں کامیاب ہوئے تھے۔ 1970 ء میں بھی شیعہ سنی تنازعے کو ابھارا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ صاحب زادہ نذیر سلطان، مہر غلام حیدر بھروانہ اور مولانا ذاکر حسین سنیوں کی حمایت سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے۔ غلام حیدر بھروانہ نے کرنل عابد حسین کے خلاف مذہبی اختلافات کو ابھار کر کامیابی حاصل کی تھی۔ انہوں نے اپنی کامیابی سے پہلے کہا تھا کہ میرے حلقے میں ووٹروں کی کل تعداد دو لاکھ اڑتالیس ہزار ہے جب کہ شیعہ صرف 15 ہزار ہیں، اس لئے اس حلقہ سے سنیوں کو اپنا نمائندہ بھیجنے کا پورا حق ہے۔ کرنل عابد حسین نے یہ الیکشن شیعہ سنی اتحاد کی بنیاد پر جیتنے کی پوری کوششیں کیں لیکن عوام مذہبی اختلافات کے ریلے میں بہہ گئے تھے۔

ایک بات ضلع جھنگ کی سیاست میں بڑی اہم ہے کہ یہاں سیاسی جماعتیں غیر موثر ہیں۔ قومی اور سیاسی جماعتیں سیالوں، رجوعوں اور شاہ جیونہ خاندان کے سامنے اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں بلدیاتی قیادت کے مسئلہ پر محمد اسلم بھروانہ اور اختر عباس بھروانہ جو آپس میں ٹکرا گئے تھے محمد اسلم بھروانہ نے فیصل صالح حیات کی مدد سے ایک مضبوط گروپ بنا کر اپنے ممبروں کی تعداد میں نمایاں اضافہ کر لیا تھا کیونکہ دونوں گروپ اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل تھے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کو پیپلز پارٹی سے اتحاد ایک آنکھ نہ بھایا اور یوں اختر عباس بھروانہ حکومت کے تعاون سے ضلع کی قیادت پر اپنے قریبی رشتہ دار کو چیئرمین بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ جھنگ میں اب جاگیرداروں کی روائتی سیاست کا زور ختم ہوتا جا رہا ہے اب یہاں کی سیاست میں فرقہ واریت کا رنگ غالب آتا جا رہا ہے جھنگ شہری بلدیاتی قیادت انجمن سپاہ صحابہ کے ہاتھ میں آ گئی ہے مولانا ایثار الحق قاسمی کے قتل سے خالی ہونے والی نشست قومی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں انجمن سپاہ صحابہ نے اسلامی جمہوری اتحاد کو عبرتناک شکست دے کر سیالوں، رجوعوں اور سیدوں کی سیاست پر کاری ضرب لگائی ہے اس کے علاوہ ایثار الحق قاسمی کے قتل سے خالی ہونے والی صوبائی نشست بھی انجمن سپاہ صحابہ نے بلا مقابلہ جیت لی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے انتخاب میں سیدہ عابدہ حسین شکست کھانے کے بعد وزیر اعظم کی مشیر نامزد ہوئیں بعد ازاں انہیں امریکہ میں پاکستان کا سفیر نامزد کر دیا گیا۔

سرگودھا کے ۔ ٹوانے

شاہ پور میں جاگیرداروں کے جھرمٹ میں ہر طرف ٹوانے ہی ٹوانے نظر آتے ہیں۔ مٹھا ٹوانہ میں سیال، گھیبے، نون اور ٹوانے آباد ہیں۔ 1680ء میں میر احمد خان نے مٹھا ٹوانہ کی بنیاد رکھی تھی جو ہندو راجپوت رائے شنکر کی اولاد میں سے تھے۔ یہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد دریائے سندھ کے کنارے جہانگیر کے مقام پر آکر آباد ہوئے۔ ڈیڑا کے مقام پر ایک جگہ میٹھا پانی دریافت ہوا تو میر احمد خان نے وہیں آکر ڈیرے ڈال دیئے۔ رفتہ رفتہ یہ علاقہ بہت بڑے گاؤں کی صورت اختیار کر گیا اور اس میں کئی قبیلوں نے (جو دراصل ایک دوسرے کی شاخ ہیں) رہائش اختیار کرلی۔ مٹھاٹوانہ کے شمال میں پانچ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہڈیالی ہے۔ وہاں اعوان قبیلہ رہتا تھا۔ میر احمد خان نے ان کے بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر ارد گرد کے علاقہ میں اپنی سرداری قائم کرلی۔ حتیٰ کہ ان کی اولاد میں ایک شخص شیر خان بھی ملک کہلانے لگا۔ اس نے اپنے بھائی عالم شیر سے مل کر نہ صرف اپنے چچا بلکہ ایک جھڑپ میں باپ کو بھی مار ڈالا۔ اس کے بعد ارد گرد کے اعوانوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر پورے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ کہتے ہیں کہ عالم شیر خان اکثر صبح سویرے اپنی بندوق لے کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ جاتے اور جہاں کوئی اعوان نظر آتا، اس کا شکار کھیلتے۔ پھر گھر آکر ناشتہ کرتے تھے۔ جب شیر خان نے بہت زیادہ طاقت پکڑلی تو اس نے ڈیرہ اسماعیل خان کے گورنر کو خراج دینا بند کردیا۔ 1745ء میں شیر خان نے نور پور ٹوانہ کی بنیاد رکھی اور تھوڑے ہی عرصے بعد جھنگ کے سیالوں کو مار بھگایا۔ اس کی موت کے بعد اس کے دونوں بیٹے آپس میں اقتدار کی کشمکش میں مصروف رہے اور انہوں نے ہمسایوں کو بھی سکھ کا سانس نہ لینے دیا۔ 1817ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نور پور
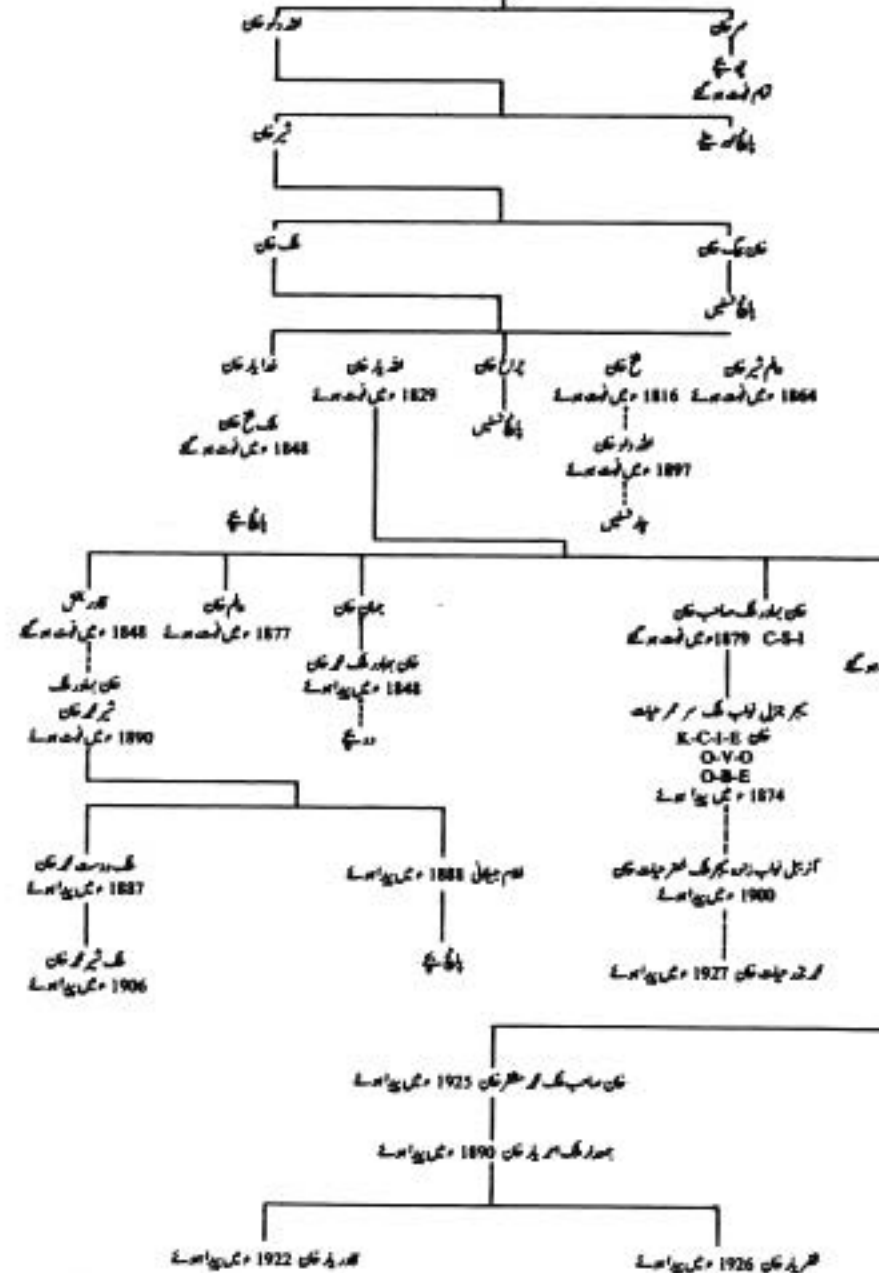
ٹوانوں پر چڑھائی کی اور اس علاقہ کو فتح کر کے جسونت سنگھ موکل کی فوجی نگرانی میں دے دیا،
تاہم اس وقت کے ملک احمد یار نے اپنا علاقہ پھر واپس لے لیا لیکن اسے منکیرا کے نواب نے
ٹکنے نہ دیا۔ اس پر ملک احمد یار نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پناہ طلب کی۔ اس نے اسے
بھاوڑیاں کی جاگیر عطا کی۔ 1821ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے منکیرا کے نواب پر فوج
کشی کی جس میں ملک ٹوانہ نے ان کی پوری مدد کی کیونکہ ٹوانوں نے نواب آف منکیرا حافظ احمد
کے خلاف دشمنی کے پرانے بدلے چکانے تھے۔ نواب آف منکیرہ نے دشمنوں سے نمٹنے کے
لئے بارہ قلعے تعمیر کئے تھے جن میں حیدر آباد، موج گڑھ، فتح پور، دریا خان، خان پور،
جھنڈوالہ، کلور، دلے والا اور چوبارہ کے قلعے نمایاں تھے۔ ان کے درمیانی فاصلوں میں
کوئی کنواں نہ کھودا گیا تھا تاکہ ان پر حملہ آور ہونے والے راستے میں کہیں تازہ دم نہ
ہو سکیں۔ راجہ رنجیت سنگھ نے تمام تر مشکلات کے باوجود 25 دن کے اندر اندر نواب کے
علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس مہم کے دوران ٹوانوں کی مزاحمت قابل دید تھی۔ ان کی
جنگجویانہ قیادت کا اعتراف راجہ رنجیت سنگھ نے اس صورت میں کیا کہ قادر بخش کی قیادت
میں 15 گھوڑ سواروں کا دستہ اپنے ساتھ لاہور لے گئے جس نے ملتان کی اہم مہمات
کامیابی سے سر کیں۔ 1837ء میں قادر بخش کے کزن فتح خان کے ساتھ مل کر گھوڑ
سواروں کی قیادت کی۔ جب ٹوانوں کا ایک قافلہ خدا یار خان کی قیادت میں مہاراجہ رنجیت
سنگھ کے دستوں میں شامل ہو گیا تو یہاں آ کر اس نے اپنی تضحیک محسوس کی کیونکہ سکھ اس
کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ ایک ہزار روپیہ سالانہ پر مہاراجہ کا ملازم رکھا
گیا اور اپنی موت تک مہاراجہ کے شکاری دستے میں کام کرتا رہا۔

خدا یار کا بیٹا فتح خان جو اس دوران سردار ہری سنگھ نلوا کے ساتھ ملازم تھا، اسے
1819ء میں مٹھا ٹوانہ کا علاقہ دیا گیا تھا۔

1838ء میں راجہ دھیان سنگھ نے نہ صرف فتح خان ٹوانہ کو مٹھا ٹوانہ کا منیجر مقرر کیا
بلکہ وڑچہ اور چوا ہائی نمک کی کانیں بھی اس کے حوالے کر دیں تاہم فتح ٹوانہ کا حقیقی عروج
راجہ نونہال سنگھ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے فتح خان کے رشتہ داروں کو میاں
والا، شیخو وال اور نور پور ٹوانہ کا کاردار مقرر کر دیا اور خود فتح خان کو مختلف زمینداروں سے
مالیہ وصول کرنے پر لگا دیا۔ اس دوران فتح ٹوانہ ہوشیاری سے سکھ سرداروں میں پھوٹ

ڈالنے میں بھی مصروف رہا۔ پرنس نونہال سنگھ جو کہ فتح خان کے خلاف تھا اور موقع کی تلاش
میں تھا کہ ان کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ کیسے ختم کیا جائے. اس نے اسے گرفتار کر کے مشلا ٹار
سنگھ کے گھر بند کر دیا اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک انہوں نے حکومت کی رقم واپس
نہ کر دی۔

نونہال سنگھ کی موت کے بعد راجہ نے قیادت دوبارہ سنبھال لی تو فتح خان کی قسمت
دوبارہ جاگ اٹھی۔ اس نے اسے کچھی کے علاقہ کا منیجر بنا دیا اور اس کے رشتہ داروں
صاحب خان، عالم خان اور کئی دوسرے رشتہ داروں کو اہم ذمہ داریاں سونپیں۔ شیر سنگھ
کی موت کے بعد فتح خان کو دریا پار کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ انہوں نے ٹنک کے علاقے
سے کالی خیل قبیلے کی شورش کو فرو کیا لیکن یہ علاقہ سکھوں کے لئے زیادہ فائدہ مند ثابت نہ
ہو سکا۔ اللہ داد خان جو کہ ٹنک کے علاقے کا بااثر شخص تھا، وہ اقتدار سے الگ ہونے کے بعد
حکومت کے مخالفین کو اکٹھا کرتا رہا جو سکھوں پر حملہ آور ہوتے رہے اور انہیں لوٹتے
رہے۔ فتح خان ہی نونہال کی نظر میں واحد آدمی تھا جو حالات سدھار سکتا تھا اور جس نے
کامیابی سے اختیارات کو استعمال کیا۔ اس نے تجویز کیا کہ اللہ داد خان کو اس علاقے کا گورنر
بنا دیا جائے۔ لیکن اس فیصلے سے پہلے ہی چیف کا انتقال ہو گیا تو فتح خان ٹوانہ اس علاقے سے
مروت چلا گیا تاکہ حکومت کے لئے مالیہ فنڈ جمع کیا جائے۔

اس نے سب سے پہلے دریائے کھیبلہ کے قریب لاکھی قلعہ بنایا۔ انہوں نے
قلعہ کی تعمیر کے لئے اس علاقے سے حاصل ہونے والے ٹیکسوں کا 1/6 مختص کرنے کی
درخواست کی جس پر سکھ حکمرانوں نے اعتراض نہ کیا۔

دیوان دولت رائے کے دور میں فتح خان کو لاہور بلا لیا گیا اور وہ اپنے ساتھ اس
علاقے کے گورنر اللہ داد کے بیٹے کو بھی ساتھ لے آیا۔ جہاں ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔
یہ دور سکھوں کی باہمی رقابتوں کا دور تھا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور سکھوں میں
نفرت کے بیج بونے اور سازشوں میں مصروف ہو گیا تاکہ ان کو کمزور کر کے اپنی اہمیت کو
اجاگر کیا جا سکے۔ اس دوران فتح خان ٹوانہ کو جان بچا کر دریائے سندھ کی طرف بھی بھاگنا
پڑا۔ جواہر سنگھ نے جب زور پکڑا تو فتح خان کو اس نے واپس بلا لیا اور اسے انعام سے مالا مال
کر دیا۔ انہوں نے جہلم راولپنڈی، بنوں اور ڈیرہ غازی خان کا بہت سا علاقہ ٹوانوں کو دے

دیا جس کی قیمت اس نے یہ وصول کی کہ اس نے اپنے جانی دشمن پشورا سنگھ کے پیچھے لگا دیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ قتل ہوا تو اس کے قتل میں بھی فتح محمد ٹوانہ پر شبہ کیا گیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے بیٹے نے اپنے باپ کے قتل کا کھلم کھلا الزام فتح خان ٹوانہ پر لگایا۔ اس کے بعد دن بدن فتح خان پر بداعتمادی کا اظہار کیا جانے لگا۔ جواہر سنگھ نے فتح خان کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بیٹے پشورا سنگھ کے قتل کی ذمہ داری بھی سونپی فتح خان ٹوانہ نے اپنے قبیلے اور حلیف دوستوں کی مدد سے پشورا سنگھ پر حملہ کر دیا اور انہیں قتل کر دیا۔ پنجاب کی تمام تر ہولناک تاریخ میں پشورا سنگھ جیسا عبرت ناک قتل نہ کیا گیا۔ اس کی لاش دریا میں بہادی گئی۔ جواہر سنگھ خود بھی سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو فتح خان ٹوانہ کا ستارہ ایک بار پھر تاریک بادلوں کے پیچھے چلا گیا۔ وہ جان بچا کر ڈیرہ اسماعیل خان بھاگ گیا۔ فتح خان اپنے دشمنوں کو معاف نہیں کرتا تھا۔ اس نے جب پھر طاقت حاصل کی تو اپنے دشمن چنڈا خان کے گھر پر حملہ کر دیا۔ اس کے بیٹے اور حواریوں کے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کے بعد اس نے حیات اللہ خان، عاشق محمد اور ثناء اللہ خان کے گھر پر دھاوا بول دیا۔

فتح خان ٹوانہ نے نئے سکھ حکمرانوں کو بھی نہ ٹکنے دیا۔ آخر کار فتح خان ٹوانہ اور سکھوں کے درمیان صلح ہو گئی تو وہ لاہور آ گئے اور انہیں سابقہ کوتاہیوں کے الزام میں سات لاکھ ہرجانہ ادا کرنے کو کہا۔ انہوں نے چار لاکھ ادا کر دیئے۔ اب وہ ہری سنگھ کی جانشینی کے تحت دوبارہ کام کرنے لگا اور اسے بنوں بھیج دیا گیا۔ بنوں کی سکھ فورس نے فتح خان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ وہ خود جان بچا کر دلیپ گڑھ کے قلعہ میں محبوس ہو گیا۔ اس دوران انہوں نے اپنے قبیلے کو مدد کے لئے پکارا۔ محمد خان عیسیٰ خیل ان کی مدد کو پہنچے اور انہوں نے سرداری کی بحالی کی کوششیں بھی شروع کر دیں۔

ولاسہ خان جس سے سکھ مہاراجہ خوف کھاتے تھے، اس نے اپنی متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ فتح خان نے ان کی طاقت کو کچلنے کے لئے ولاسہ خان کو جگہ جگہ تلاش کیا۔ فتح خان اور شیر خان کے درمیان خاندانی دشمنی تھی۔ دونوں کی موت کے بعد یہ دشمنی ان کی اولاد فتح شیر خان اور ملک شیر محمد خان کے درمیان منتقل ہو گئی۔

فتح خان ٹوانہ کی جائیداد ان کے چار بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ ملک شیر محمد کو بڑا ہونے کے ناطے زیادہ جائیداد اور رقم ملی۔ شیر محمد خان کو 3242 روپے کی جاگیر اور لائف پنشن کے علاوہ جاگیر کا وارث بنا دیا گیا فتح شیر خان اور ملک شیر محمد خان دونوں خاندانی برتری ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔

1848-49 میں ملک فتح شیر ٹوانہ نے ایڈورڈ کی قیادت میں ملتان میں چار سو سواروں کی قیادت کی۔ 1857ء میں جان لارنس کے زمانے میں انگریزوں کی طرف داری کے جوہر دکھائے۔ جب سکھوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس وقت فتح شیر خان کے پاس 50,150 روپے کی جاگیر تھی۔ فتح شیر خان اسی میں مسلسل اضافہ کرتا گیا۔

جب دہلی کو فتح کیا گیا تو اس میں ٹوانوں کے گھڑ سواروں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے بہادری کے جوہر دکھا کر خود کو بہت نمایاں کر لیا تھا۔ انہیں خان بہادر کا خطاب، 1200 کی جاگیر، 2000 روپے کی لائف جاگیر اور 5 ہزار کی لائف پنشن دی گئی۔

خان بہادر فتح شیر کی موت 1894ء میں واقع ہوئی۔ اس وقت اس کا بیٹا کمسن تھا۔ ان کی ساری جاگیر کورٹ آف وارڈ کی نگرانی میں چلی گئی۔ جب محمد شیر خان ٹوانہ اس قابل ہو گیا کہ وہ جائیداد سنبھال سکے تو انہیں 30 ہزار ایکڑ خوشاب اور 1500 سو ایکڑ جہلم میں ملی۔ یہ تمام جاگیر 1857ء کے بعد ان کے خاندان کو ملی تھی۔ شیر خان کو مٹھا ٹوانہ کا ذیل دار بنایا گیا۔ جنگ عظیم کے دوران انہوں نے تین سو گھوڑ سوار اور چھ ہزار پیادہ کا انتظام کیا تھا۔ 1918ء میں انہیں آنریری لیفٹننٹ اور 1921ء میں انہیں صوبائی درباری کی نشست دی گئی۔

ملک شیر محمد خان نے بھی 1849 میں ملتان کے غدر میں سکھوں کا صفایا کیا تھا۔ ملک شیر محمد بھی درباری لسٹ میں شامل تھے۔ 1849ء میں انہوں نے ملتان کے علاقے سے انگریزوں کے دشمنوں کا اس طرح صفایا کیا کہ انہیں دوبارہ سر اٹھانے کا موقعہ نہ مل سکا۔

مٹھا ٹوانہ پر گھکھڑوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اسی قبضہ کو ختم کرانے کے لئے ملک شیر خان کو 12000 روپے کی رقم اور ٹیلر نے سات ہزار کی رقم انہیں خوشاب اور مٹھا ٹوانہ کی

شورش کچلنے کے لئے دی تھی۔

ملک شیر خان ٹوانہ نے یہ علاقہ خالی کرانے کے بعد ساہیوال کا رخ کیا جہاں اس نے احمد یار کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے اس دوران جو عسکری خدمات سرانجام دی تھیں، وہ انگریز کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کی سفارش پر تین سو گھوڑ سوار ملازم رکھے گئے۔ 1858میں انہوں نے اودھ میں بھی انگریزوں کا ساتھ دیا تھا جہاں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ انگریز اس علاقے میں تقریباً ناکام ہو چکے تھے۔ انہیں بھی خان بہادر کا خطاب، 600 روپے کی لائف جاگیر، 6000 ہزار کی الگ جاگیر، 3240 روپے کی لائف پنشن، خوشاب تھل کے علاقے میں تیس ہزار اور چودہ ہزار ایکڑ زمین جہلم کے نزدیک لیز پر دی گئی۔ ملک شیر خان ٹوانہ کے دو بیٹے دوست محمد خان اور غلام جیلانی ان کی موت کے وقت بہت چھوٹے تھے۔

خان بہادر ملک صاحب خان ٹوانہ سی ایس آئی ملک شیر محمد کے چچا تھے۔ 1848ء میں وہ بھی سکھوں کے خلاف انگریزوں کے طرف دار تھے۔ انہوں نے ملتان اور جہلم میں بھی گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ انہیں 1200 کی لائف جاگیر، 480 روپے لائف پنشن اور پرائیویٹ شہر کی اجازت دی گئی تھی۔ انہیں گھوڑوں کی نسل کشی کا بہت شوق تھا۔ ٹوانہ خاندان میں ابھرنے والی خطرناک لڑائیوں کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہیں ''Companion of the star of India'' کا خطاب بھی دیا گیا۔

1879میں خان بہادر فوت ہوئے تو انکی تمام تر جاگیر کے وارث ان کے اکلوتے بیٹے عمر حیات خان بنے۔ انگریز مورخین نے ان کا نام انگریزوں کے انتہائی قابل اعتماد دوستوں میں لکھا ہے۔ عمر حیات خان ٹوانہ نے ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج سے حاصل کی۔ ان کی جائیداد کورٹ آف وارڈ کی نگرانی میں رہی جس سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ علاقے کے ڈپٹی کمشنر نے عمر حیات کو پہلا سبق یہ دیا کہ اگر وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلیں گے تو انہیں بھی عزت و تکریم کے وہ تمام اعزازات مل جائیں گے جو ان کے والد کو حاصل رہے ہیں۔ سر عمر حیات نے اپنے علاقے کو سدھارنے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ جرائم کے خاتمے کے لئے ان کی کوششیں مٹھاٹوانہ کے لوگوں کو ہمیشہ یاد رہیں گی۔ انہوں نے کئی فلاحی ادارے قائم کیے۔ مسلمانوں کی شادیوں کا ریکارڈ رکھنے کا انتظام کیا۔ انہیں بھی گھوڑوں کی

نسل کشی سے بڑی دلچسپی تھی اور انہوں نے اس مقصد کے لئے سٹڈ فارم قائم کر رکھا تھا۔ رائل ہارس کمیشن کی جانب سے انہیں چناب کالونی میں کئی مربعے زمین گھوڑے پالنے کے لئے ملی تھی۔ 1901ء میں انہیں کمیشن ملا۔ نیشنل ہارس بریڈنگ سوسائٹی آف انڈیا کے صدر رہے۔ پنجاب کونسل کے ممبر کی حیثیت سے نو آبادیاتی نظام کے بارے میں انہوں نے جو اختلافی نوٹ لکھا تھا، انگریزوں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے پنجاب کے الحاق ایکٹ کی حمایت کی تھی۔ پنجاب میں نمائشوں کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا۔ پنجاب چیف ایسوسی ایشن اور انجمن حمایت اسلام کے صدر رہے ہیں۔ آپ برصغیر کے ان چھ مسلمان نمائندوں میں شامل تھے جو ملکہ وکٹوریہ کی جشن تاج پوشی میں شریک ہوئے تھے۔ امیر افغانستان نے انہیں پستول اور گھڑی انعام دی تھی۔ علاوہ ازیں اریگیشن کمیشن، ریفارمر کمیٹی، پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے ہیں۔

انہوں نے جنگ عظیم میں کئی ممالک میں عسکری خدمات سرانجام دیں۔ 1906ء میں انہیں سی، آئی کا خطاب دیا گیا۔ جارج ہفتم کے اعزاز میں دہلی دربار میں انہیں (رائل ہیرلڈ آف دی کنگ) شاہی نقیب کی حیثیت حاصل تھی اور یہ اعزاز کسی پہلے ہندوستانی کو حاصل ہوا تھا۔ جھروکہ کی تقریب میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا اور اس میں انہوں نے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔

شاہی نقیب کے ساتھ ساتھ انہیں M-V-O کا خطاب بھی دیا گیا۔ 1909ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ 1920ء تک اس کے رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بعد ازاں انہیں کونسل آف سٹیٹ کا رکن نامزد کیا گیا۔ 1922ء تک وہ اس کے ممبر رہے۔

آپ کو سیکرٹری آف دی سٹیٹ کونسل کے ممبر کی حیثیت سے انگلستان بھیجا گیا۔ 1934ء تک وہ اس پر فرائض سرانجام دیتے رہے۔ تیس سالوں میں انہوں نے انگریز کے سامنے نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ انہیں نواب کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ ملک عمر حیات خان "جنگ عظیم کونسل" کے پہلے ممبر تھے جو رضاکارانہ طور پر فرانس گئے۔ 1919ء میں انہیں ''Knight Hood'' کا خطاب دیا گیا۔ قیام انگلستان کے دوران فری میسن کے خیراتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ یہ اپنے وقت کے

دوران فری میسن کے خیراتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ یہ اپنے وقت کے بہترین گھوڑ سواروں میں شامل ہوتے تھے اور نیزہ بازی میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ میجر جنرل نواب خان بہادر سر محمد حیات خان ٹوانہ کے اکلوتے بیٹے سر خضر حیات خان ٹوانہ نے سیاست میں نمایاں مقام حاصل کیا دہلی دربار میں وہ ایچی سن کالج کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ 1916ء میں انھوں نے کمیشن حاصل کیا۔ انھوں نے ستیہ گرہ تحریک میں انگریزوں کی بھرپور حمایت کی۔ 1921ء میں عارضی بھرتی افسر مقرر ہوئے۔ شاہ پور ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر رہے۔ انھیں اول درجے کے مجسٹریٹ اسسٹنٹ کمشنر کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ انھوں نے 1931ء میں کانگرس کی طرف سے شروع کی جانے والی عدم تعاون اور ریڈ شرٹ تحریک کے خلاف انگریزوں کی ہر ممکن مدد کی۔ فوج میں انھوں نے جو عسکری خدمات سرانجام دی تھیں، اس کے صلے میں انھیں فوجی اعزاز O.B E. دیا گیا۔ جاپان اور انڈیا کے درمیان ہونے والے تجارتی معاہدے میں کپاس پیدا کرنے والے زمینداروں کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ انھوں نے انگریزی طرف سے سونپی گئی کئی اہم ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ انھیں گھوڑوں کی نسل کشی کا بہت شوق تھا۔ اس ضمن میں وہ شاہ پور میں کیٹل شو کا انعقاد پورے اہتمام سے کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کی کئی اہم کمیٹیوں کے رکن تھے۔ جارج پنجم کی رسم تاج پوشی کی تقریب میں انھیں سلور جوبلی میڈل دیا گیا۔ 1937ء میں پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے وزیر بنائے گئے۔
1942ء میں جب سردار سکندر حیات اچانک وفات پاگئے تو آپ پنجاب کے وزیر اعلیٰ مقرر کئے گئے۔ ان دنوں آپ مسلم لیگ کے ایک سرگرم کارکن تھے اور پنجاب کی یونینسٹ پارٹی سے بھی وابستہ تھے۔ 1942ء میں جب آپ وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے تو تحریک پاکستان عروج پر تھی اور قائداعظمؒ چاہتے تھے کہ خضر حیات مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو سمجھیں اور یونینسٹ پارٹی سے الگ ہوجائیں لیکن ملک صاحب مسلم لیگ کے خلاف کام کرتے رہے۔ ادھر مسلم لیگ نے پارلیمانی گروپ بنالیا۔ اس کے بعد ان سے مسلم لیگ کا ٹکراؤ شروع ہوگیا۔

خضر وزارت کو انگریز سہارا دیتے رہے۔ انھوں نے وزارت قائم رکھنے کے لئے

پنجاب کے مفادات کا نعرہ لگایا۔ پنجاب کے بڑے بڑے جاگیردار اور سیاسی گھرانے خضر حیات کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ اس زمانے میں کانگرس نے اکثریت کے صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا جبکہ ایک قرارداد مسلم لیگ نے پاس کر دی کہ صرف ایسے علاقے تقسیم کیے جائیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں۔ خضر حیات وزارت کو مسلم لیگ نے سکھ کا سانس نہ لینے دیا، یہاں تک کہ 1946ء کے انتخابات کا وقت آگیا۔ ان عام انتخابات میں مسلم لیگ اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ خضر حیات ٹوانہ کی یونینسٹ پارٹی کو چند نشستیں ملیں اور ملک خضر حیات انفرادی طور پر دو نشستوں سے جیتے۔ انتخابات کے بعد گورنر نے انھیں وزارت بنانے کی دعوت دے دی۔ خضر حیات نے کانگرس یونینسٹ اور اقلیت کے نمائندوں کو ساتھ ملا کر وزارت قائم کر لی لیکن پارلیمانی گروپ اور حزب اختلاف کے درمیان صوبائی نشستوں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ ملک صاحب کے خاص سیاسی معتمد سردار بلدیو سنگھ اور چھوٹو رام وغیرہ تھے۔ خضر حیات حکومت تو چل رہی تھی لیکن اس کی عوام میں شدید مخالفت تھی۔ مسلم لیگ کا استدلال تھا کہ صوبائی اسمبلی میں منتخب ارکان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مسلم لیگ سنگل لارجسٹ پارٹی ہے، اس لئے مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دی جائے۔ پنجاب مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ تھا۔ سب مسلمان مسلم لیگ کی سیاست اور قائداعظمؒ کی قیادت کے ہم نوا تھے۔ ایسے زمانے میں ملک صاحب کا وزارت اعلیٰ چلانا آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا کہ صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کے اراکین اکثریت رکھتے ہیں ان کے پارلیمانی لیڈر نواب افتخار حسین ممدوٹ تھے، مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دی جائے۔ ادھر انگریز گورنر خضر حیات کی وزارت کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کی سیاست کو خضر حیات وزارت نے تشدد کے ذریعے بھی دبایا۔ میاں ممتاز دولتانہ، افتخار حسین ممدوٹ اور سردار شوکت حیات کے عروج کا زمانہ بھی یہی تھا۔ عورتوں میں بیگم فیروز خان نون کے سیاسی افق پر نمودار ہونے کا زمانہ بھی یہی ہے۔ جب پنجاب کے حالات بہت زیادہ خراب ہوگئے تو انھوں نے اپنی ماں کے اصرار پر استعفیٰ دے دیا بلکہ سر ظفر اللہ کے بقول اس کی ماں نے استعفیٰ لکھوا کر قائداعظم کو پیش کیا تھا۔ اس استعفیٰ کے بعد عوام میں جو غم و غصہ پایا جاتا تھا، وہ کسی حد تک ٹھنڈا پڑ گیا۔ سر خضر حیات ٹوانہ کا نام سیاسیات پاکستان میں متنازعہ فیہ بن کر رہ گیا۔ 1946ء کے بعد خضر حیات نے سیاست سے کنارہ

کشی کر لی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ملک خضر حیات ٹوانہ گولڑہ شریف کا دامن پکڑ کر سیاست سے عملاً ریٹائر ہو گئے اور ان کا زیادہ تر رجحان تصوف کی طرف مائل رہا اور وہ قیام پاکستان کے فوراً بعد دوستوں کے اصرار کے باوجود سیاست کے کوچے میں کسی دروازے سے بھی قدم رکھنے کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ وہ ایک فیوڈل لارڈ کی حیثیت میں سیاست میں کردار ادا کر سکتے تھے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے والد مرحوم رسالدار میرداد خان صاحب ملک خضر حیات خان کے والد میجر جنرل عمر حیات ٹوانہ کے ذاتی نیاز مندوں میں شامل تھے اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اپنے والد کے محسن کے بیٹے سر خضر حیات کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اگر ملک صاحب چاہتے تو پاکستان میں کرسیوں کی جنگ میں وہ ایک آدھ خاصی اونچی کرسی پر قبضہ جما سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک مرتبہ عوام سے عام انتخاب میں شکست کھانے کے بعد عملی سیاسیات سے مکمل طور پر کنارہ کشی کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ سرگودھا شہر میں داخل نہ ہوئے۔ اگر انہوں نے شاہ پور سے باہر جانا ہوتا تو وہ سرگودھا کے باہر بائی پاس سے ہی سفر کرتے تھے۔

ان کے اکیلے بیٹے نذر حیات ٹوانہ نے بھی سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھا بلکہ وہ اپنے باپ کی جاگیر کو سنبھالتے رہے۔

1951 ء کے انتخاب میں ملک خضر حیات ٹوانہ اور مسلم لیگ میں کچھ سیاسی ہم آہنگی واقع ہو گئی تھی۔ وہ خود تو کوچہ سیاست سے دلچسپی نہ رکھتے تھے کیونکہ اس کے علاقے میں خضر حیات ٹوانہ کی مدد کے بغیر مسلم لیگ الیکشن نہ جیت سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے آزمودہ سپاہی محمد یار کے بھتیجے سر احمد یار کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا کرنا منظور کر لیا۔ اس ضلع سے پانچ ٹکٹ ہولڈر تھے ملک خضر حیات نے ملک فتح محمد ٹوانہ جو خضر حیات کے قریبی رشتہ دار تھے، ان کے سابقہ دست راست ملک اللہ بخش مرحوم کے وارث نور پور ٹوانہ سے احمد شیر جمالی کو ٹکٹ دلایا تھا۔ آج تک انہوں نے خضر حیات کے معاملہ میں وفاداری بشرط استواری کا مقولہ سامنے رکھا ہوا تھا۔ صالح ولد سردار حلقہ بھلوال اور امیر عبداللہ حلقہ سلانوالی کو ٹکٹ دلائے۔

ان کے نامزد تمام امیدوار جیت گئے۔ اخبارات میں 1958 ء تک ان کے سیاسی عمل میں حصہ لینے کے بارے میں خبریں شائع ہوتی رہیں لیکن انہوں نے کوچہ سیاست میں

قدم نہ رکھا۔

ایوب خان کے والد کے ٹوانہ خاندان سے گہرے مراسم تھے۔ اسی وجہ سے انہیں ایوب دور میں اہمیت ملی تھی 1962 ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ٹوانہ خاندان کے نمایاں افراد میں نور حیات، حبیب اللہ ٹوانہ، محمد انور ٹوانہ اور فتح اللہ ٹوانہ نے حصہ لیا ضلع سرگودھا کی سیاست انہیں خاندانوں کے گرد ہی گھومتی رہی ہے جب ایوب خان نے کونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو ضلع سرگودھا کونشن لیگ کی قیادت اسی خاندان کے پاس تھی۔

1951 ء میں حبیب اللہ ٹوانہ جناح عوامی لیگ اور فتح خان ٹوانہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ فتح خان ٹوانہ 1962 ء میں غیر جماعتی انتخابات میں کامیاب ہو گئے۔ ٹوانوں کی سیاست مخصوص مزاج کی سیاست ہے۔ بڑی بڑی برادریاں ان کے گرد گھومتی رہی ہیں۔ قیادت کے مسئلہ پر ٹوانہ خاندان آپس میں ٹکراؤ بھی کرتا رہا ہے۔ فتح محمد ٹوانہ نے اپنے بیٹے انور ٹوانہ کو ضلع کونشن مسلم لیگ کا صدر بنانے کے لئے قریشی اور مقامی برادریوں سے صلح کر لی تھی البتہ 1965 ء کے انتخابات میں محمد انور ٹوانہ کے مقابلہ میں حبیب اللہ ٹوانہ کھڑے ہو گئے جنہیں نور حیات نون کی حمایت حاصل تھی اور وہ انور ٹوانہ کی شکست ہر صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی طرح نور حیات نون اور انور ٹوانہ ایک ہی سیاسی جماعت میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھے۔ ٹوانہ خاندان کے ملک رب نواز ٹوانہ ملک نادر ٹوانہ بھی سیاسی معرکے کرتے رہے ہیں۔

پنجاب کی اس دوسری بڑی سب ڈویژن کی سیاست پر قیام پاکستان سے 1970 ء تک ٹوانہ خاندان اور قریشی ہی چھائے رہے ہیں۔ ملک فتح ٹوانہ سیاسی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ 1968 ء میں عوامی تحریک کے وقت ملک فتح ٹوانہ کونشن لیگ کے صدر تھے۔ 1970 ء کے انتخابات میں جب کونشن لیگ زوال پذیر ہوئی تو ملک فتح خان ٹوانہ اپنے بیٹے انور ٹوانہ سمیت جمعیت علماء پاکستان میں شامل ہو گئے۔ محمد انور ٹوانہ کرم بخش اعوان سے شکست کھا گئے۔ 1970 ء کے انتخابی نتائج نے کسی حد تک ٹوانہ خاندان کی سیاست کو ختم کر دیا۔

جب پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی تو ملک فتح ٹوانہ اپنے گروپ سمیت پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ملک انور ٹوانہ 1977 ء کے انتخاب میں قومی اسمبلی کے امیدوار تھے لیکن

ں صوبائی ٹکٹ دیا گیا۔

جب پیپلز پارٹی اقتدار سے الگ ہو گئی تو ٹوانہ خاندان پس منظر میں چلا گیا۔

ٹوانہ جو خضر حیات ٹوانہ کے قریبی عزیز ہیں
198 ء کی بلدیاتی سیاست سے ملک خدا بخش ٹوانہ جو خضر حیات ٹوانہ کے قریبی عزیز ہیں
ر کر سامنے آئے۔ ملک خدا بخش ٹوانہ ملک فتح ٹوانہ کے بھتیجے ہیں۔ جب خوشاب کو ضلع کا
رجہ دیا گیا تو خدا بخش ٹوانہ ضلع کونسل خوشاب کے چیرمین منتخب ہوئے تھے۔ 1985 ء
ں ملک احمد اقبال ٹوانہ بھی کامیاب ہوئے۔ اقبال ٹوانہ کے دادا ملک ممتاز ٹوانہ نے
1946 ء کے انتخاب میں متحدہ پنجاب کے یونینسٹ وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات ٹوانہ کا مقابلہ
سلم لیگ کے ٹکٹ پر کیا تھا اور ناکام ہوئے تھے۔ ملک اقبال ٹوانہ کے والد حبیب اللہ ٹوانہ
1951 ء میں جناح عوامی لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ 1988 ء کے انتخاب
میں ملک نور حیات نون نے حصہ نہ لیا جو 1962, 1965, 1977 ء اور 1985 ء میں
قومی اسمبلی کے رکن اور وزیر رہے ہیں۔ 1988 ء اور 1990 ء میں ملک خدا بخش ٹوانہ
کامیاب ہوئے تھے۔ انہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار ملک نسیم آہیر جو
1970 ء میں ناکام اور 1977 ء میں کامیاب ہوئے تھے اور بعد ازاں انہوں نے مسلم
لیگ میں شمولیت اختیار کر لی کو شکست دی۔ 1988 ء میں اقبال ٹوانہ پیپلز پارٹی کے
سردار سکندر حیات کے مقابلے میں کامیاب ہوئے تھے۔ 1990 ء میں ملک خدا بخش ٹوانہ
کامیاب ہوئے تھے۔ 1991 ء کے بلدیاتی انتخابات میں ٹوانہ خاندان کو ضلع خوشاب میں
برتری حاصل رہی۔ غلام محمد ٹوانہ بھی جو خدا بخش ٹوانہ کے بھائی ہیں، ضلع خوشاب کے سیاسی
معرکوں میں نمایاں رہے ہیں۔

خان بہادر ملک محمد حاکم خان نون

نور محمد خان

گل خان

فتح خان
1818 ء میں فوت ہوئے

جہان خان

محمد حیات خان
1875 ء میں پیدا ہوئے

خان بہادر ملک محمد حاکم خان
1828 ء میں پیدا ہوئے

محمد علی خان
1887 ء میں پیدا ہوئے

فیروز خان نون
1894 ء میں پیدا ہوئے

نور حیات نون

سلطان علی خان
1894 ء میں پیدا ہوئے

سردار خان
1888 ء میں پیدا ہوئے

صاحب خان
1887 ء میں پیدا ہوئے

عطا محمد خان
1882 ء میں پیدا ہوئے

فتح خان
1881 ء میں پیدا ہوئے

شیر محمد خان
1876 ء میں پیدا ہوئے

فتح محمد خان
1902 ء میں فوت ہوئے

سیف اللہ خان
1904 ء میں پیدا ہوئے

جہاں دار خان
1902 ء میں پیدا ہوئے

گل شیر خان
1897 ء میں پیدا ہوئے

محمد شیر خان
1894 ء میں پیدا ہوئے

غلام احمد خان
1904 ء میں پیدا ہوئے

غلام محمد خان
1902 ء میں پیدا ہوئے

سرگودھا کے نون

سرگودھا ڈویژن کو سیاسیات پاکستان اور برصغیر میں ہمیشہ اہم مقام حاصل رہا ہے اس سرزمین نے پاکستان کو ایک وزیر اعظم اور متحدہ پنجاب کا ایک وزیر اعلیٰ دیا ہے۔ پنجاب کے سیاسی گھرانوں کا سب سے بڑا جھرمٹ بھی ضلع سرگودھا ہی میں ہے، یہاں ٹوانے، نون، اور اعوان قبائل کے بڑے بڑے زمیندار بھی آباد ہیں۔

نون خاندان کا شجرہ نسب ہندو راجوں سے ملتا ہے جو چندرھویں صدی میں دریائے سندھ کے کنارے آکر آباد ہوئے تھے، ان لوگوں نے قرب و جوار کے علاقے میں مار دھاڑ کی اور بے شمار اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اسی ملکیت کے باعث ایک ٹوانے ملک شیر خان نے اپنے آپ کو "ملک" کہلانا شروع کر دیا۔ انگریز کی آمد پر ان لوگوں کے مقدر کا ستارہ چمکا۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں آزادی پسندوں کا خون بہایا جس کی سرخی نے ان کے چہرے گلنار کر دیئے۔ بعد ازاں ان کے سینوں پر سونے اور چاندی کے تمغے جگمگانے لگے اور ان کی جاگیریں تاحد نظر وسیع ہو گئیں۔

نون دراصل ٹوانوں کی ہی ایک شاخ ہے جن کی نامور اور سرکردہ سیاسی شخصیات میں سر فیروز خان نون، اور سر خضر حیات ٹوانہ نمایاں ہیں۔

شاہ پور کو آباد کرنے میں بلوچستان کے ایک خاندان کا بھی بڑا حصہ ہے جس نے ۱۵۲۷ء میں اس علاقے پر قبضہ کیا۔ اس کا سربراہ ملک "بجر خان" مکران کا ایک معمولی سردار تھا۔ اس کی بیٹی کے حسن کے چرچے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ سیستان کے سردار نے ان سے رشتہ مانگا لیکن بجر خان نے انکار کر دیا، سردار نے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے کہ بجر خان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور وہ دہلی چلا گیا۔ شہنشاہ بابر ہندوستان کے

نئے نئے حکمران بنے تھے۔ انہوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے فرخ آباد کی جاگیریں بخش دیں۔ اس کے علاوہ بجر خان کو شاہ پور کے نواح میں علاقہ تھل کا رئیس بنا دیا۔ یہاں ان کے دل میں سیستان کے سردار کے خلاف انتقام کا جذبہ پروان چڑھا۔ انہوں نے اپنا صدر مقام خوشاب کو بنا لیا۔ اس کے بعد گل بالک خاں گدی پر بیٹھا جس نے شاہ پور میں کئی نئے دیہات آباد کئے۔ اس کی ککلیاں قبیلے کے سردار سے ان بن رہتی تھی۔ انہوں نے انتقام کے جذبے کے تحت اس قبیلے کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کا نام و نشان خوشاب کے علاقے سے مٹا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مقتولین کی ہڈیاں، عرصہ دراز تک میدان میں بکھری رہیں۔ اس لئے اس مقام کا نام ہڈیاں والا پڑ گیا۔

جب احمد شاہ درانی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس قبیلے کا سردار لال خان تھا۔ اس نے احمد شاہ درانی کی مدد میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور احمد شاہ ابدالی کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں شامل ہو گیا۔ اس قربت کا لال خان کے بھ" بارک علی خان کو بڑا رنج تھا اور اس نے حسد کی آگ میں جل کر اپنے ہی بھائی کے خون میں ہاتھ رنگنے سے بھی گریز نہ کیا مبارک خاں یہ علاقہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سردار لال خان کے قتل کے بعد ان کے بیٹے فتح خان نے اپنے باپ کے قاتل کو بہاولپور کے قریب قتل کر دیا۔

سکھوں کے زمانے میں اس قبیلے کو شروع میں بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن اس کے ایک فرد فتح خان نے رنجیت سنگھ کا "خراجی" ہونا قبول کر لیا تھا، رنجیت سنگھ کو خوشاب میں ظفر خاں کی مخالفت کا شدید سامنا تھا اور اسے ضرورت تھی کہ اس علاقے سے کوئی اس کا دست و بازو بنے۔ رنجیت سنگھ نے فتح خان کو رئیس ظفر خان کے خلاف استعمال کیا اور اسے جھنگ کی جاگیر بخش دی۔ اس کے بعد سکھوں نے اس کے بیٹے لنگر جان کو مختلف اضلاع میں جاگیروں سے نوازا۔ لنگر خان نے انگریز کی بڑی خدمت کی اور افغان جنگ میں حصہ لیتے رہے۔ راجہ ہیرا سنگھ نے اسے فتح خان ٹوانہ کا مقابلہ کرنے پر مامور کر دیا۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی تاہم محاصرہ ملتان میں لنگر خان نے بعض ایسے کارنامے دکھائے کہ انگریز نے خوش ہو کر اسے جاگیروں اور انعام سے نوازا جو ورثہ میں اس کی اولاد کو ملے۔ نون خاندان سے مبارک خان کے چھوٹے بھائی کا لڑکا محمد چراغ بھی انگریز کا ڈویژنل درباری تھا۔

ٹوانوں کی ایک شاخ کا سربراہ بہادر ملک جہاں خان تھا جس نے ملک صاحب خان

کے رسالے میں شامل ہو کر جہلم اور انبالہ کی لڑائیوں میں حصہ لیا اور مجاہدین کو تہ تیغ کیا۔ وہ جنرل نیپیر کے ہم رکاب سی۔ پی کی مہمات میں شریک رہے۔ اسے اور اس کی اولاد کو گورا فوج کی خدمت کے صلہ میں کئی اعزاز اور تمغے دیئے گئے۔ ٹوانوں کی ایک اور شاخ کے سربراہ نواب ملک خدا بخش تھے۔ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازم تھے ملک خدا بخش ٹوانہ کی اولاد میں سے ملک سلطان محمود نے ایڈورڈس کے ساتھ ملتان کی لڑائیوں میں حصہ لیا اور رسالدار کے علاوہ انسپکٹر پولیس بھی مقرر ہوئے۔ اس کے بیٹے ملک خدا بخش کے پاس خواجہ آباد کی اسٹیٹ کے علاوہ بے شمار زرخیز زمین تھی جس کو سیراب کرنے کے لئے ایک پرائیویٹ نہر کھودی گئی۔ وہ کابل میں انگریز کے سفیر بھی رہے۔

مٹھا ٹوانہ میں نون بھی آباد ہیں۔ ان کا مورث اعلیٰ راجہ گنج نامی ایک ہندو راجپوت تھا۔ اس خاندان میں سے ملک خان اور ملک جہاں خان نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجی خدمت کی اور کئی دیہات جاگیر کے طور پر تحفہ میں وصول کئے۔ بغاوت ملتان کے زمانہ میں ملک فتح خان نے ایڈورڈس کا ساتھ دیا اور انہوں نے جہلم اور بنوں کے اضلاع میں کئی قلعے برباد کئے۔ اسے بارہ سو روپیہ پنشن ملتی تھی۔ ان کے بیٹے ملک محمد حیات خان کے پاس بھیرہ میں ساڑھے تین ہزار ایکڑ زمین تھی۔

نون خاندان کا سربراہ خان بہادر ملک محمد حاکم خان 1857ء کی جنگ آزادی میں ملک فتح شیر خان ٹوانہ کے رسالے میں شامل تھا جہاں اس نے Hissar, Bangali Harnaul کے علاوہ کئی شورش زدہ علاقوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اسی دوران وہ شدید زخمی بھی ہوئے اور اس کے بارے میں انگریز جرنیلوں کی رائے تھی کہ ان جیسا بہادر انسان صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز سرکار نے ان کے عملی تعاون کی وجہ سے ملاقات کے دروازے ان کے لئے ہر وقت کھلے رکھے تھے۔ اسے گھوڑوں کی نسل کشی کا بہت شوق تھا۔ 1857ء میں انہوں نے جو خدمات سرانجام دی تھیں، جس کے صلہ میں ان کے لئے بہت بڑی جاگیر اور 275 روپے سالانہ انعام مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد ملک حاکم خان پولیس میں بھرتی ہوگئے۔ انسپکٹر کے عہدے کو انہوں نے تحصیل داری کی سیٹ کے ساتھ تبدیل کر لیا۔ اس پوسٹ پر انہوں نے کئی سال تک کام کیا اور عوام کی بے لوث اور

رشوت کے بغیر خدمت کر کے دیانت دار افسر کا اعزاز حاصل کیا۔

انہوں نے حکومت سے پانچ ہزار ایکڑ زمین سستے داموں خریدی اور اسے اپنی ریاست کے طور پر آباد کر لیا اور بہت جلد نون خاندان بھی پنجاب کے بڑے جاگیرداروں میں شامل ہو گیا اور انہیں 1888ء میں ڈویژنل درباری کی حیثیت بھی مل گئی اور اسی سال انہیں خان بہادر کا خطاب بھی مل گیا ان کے کزن محمد حیات خان پہلے ہی ڈویژنل درباری تھے ان کا بڑا بیٹا ملک شیر محمد خان آنریری مجسٹریٹ بنایا گیا۔

محمد حیات خان کے لڑکے فیروز خان نون 1875ء میں پیدا ہوئے۔ ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی، بعد ازاں انہوں نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ قیام لندن کے دوران بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1917ء میں ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ 1927ء میں لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزیر مقرر ہوئے۔ تین سال تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ بعد ازاں وہ وزیر تعلیم بھی رہے۔ 1936ء میں انہیں انگلستان کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔ واپس آنے پر انہیں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ 1945ء تک کونسل میں ڈیفنس ممبر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے امپیریل وار کیبنٹ اور پیسفک وار میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہونے کے بعد ملک فیروز خان نون مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ پنجاب میں خضر وزارت اور سیفٹی ایکٹ کے خلاف مسلم لیگ نے تحریک شروع کی تو ملک صاحب بھی پنجاب کے دوسرے ممتاز لیگی رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ ان دنوں عام خیال یہی تھا کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی قیادت ملک فیروز خان نون کے حصہ ہی میں آئے گی مگر افتخار حسین ممدوٹ جن کا مالی تعاون مسلم لیگ کے لئے سب سے زیادہ تھا، میدان میں موجود تھے۔

1947ء میں انہیں مجلس دستور ساز کا رکن چنا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اتحادی فوجوں کے اقتصادی کمیشن برائے مشرق بعید کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اپریل 1945ء میں انہوں نے اتحادی قوموں کی اسمبلی میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ سرکار برطانیہ نے انہیں سر کا خطاب دیا تھا جو انہوں نے 1946ء میں واپس کر دیا۔

پنجاب کی پہلی کابینہ میں جب ممدوٹ اور دولتانہ میں سیاسی رسہ کشی شروع ہوئی تو آپ کا جھکاؤ دولتانہ کی طرف تھا۔ 1951ء کے انتخابات کے بعد پنجاب کی قیادت کے لئے ان کا نام بھی گونجتا رہا۔ بعد ازاں انہیں گورنر مشرقی پاکستان بنا دیا گیا اور پنجاب کا وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کو بنایا گیا۔ احمدی تحریک میں جب میاں ممتاز دولتانہ کو ہٹایا گیا تو ان کی جگہ فیروز خان نون کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔

ان کی میاں ممتاز دولتانہ سے ان بن ہو گئی اور انہوں نے انہیں وزارت اعلیٰ سے نکلوا دیا۔ ملک فیروز خان نون کی حکومت 22 مئی 1955ء کو ختم کر دی گئی۔ جب انہیں وزارت اعلیٰ کا منصب سونپا گیا تھا تو اس وقت وہ اسمبلی کے ممبر نہ تھے۔ انہیں وزیر اعلیٰ پہلے اور ممبر بعد میں بنوایا گیا۔

جس دن مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے سردار عبدالحمید دستی کو اپنا قائد چنا، اس کے چند دنوں بعد انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت کے خلاف بیانات داغنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے اس موقعہ پر کہا کہ "پنجاب میں میں 26 مہینے پہلے آیا تھا اور اس وقت آپ نے متفقہ طور پر مجھے اپنا قائد منتخب کیا تھا۔ جب میں نے عنان قیادت سنبھالی تو حالات خاصے خراب تھے لیکن آپ کے تعاون اور آپ کی حکومت نے ان حالات پر قابو پالیا اور حالات بہتر ہو گئے لیکن بدقسمتی سے جب گورمانی پنجاب کے گورنر بن کر آئے تو انہوں نے میری وزارت کے خاتمہ کے لئے سازشوں کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن جب وہ میرے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کامیاب کرانے میں ناکام رہے تو انہوں نے چار وزیر رفقاء کو اپنے ساتھ ملا لیا اور انہوں نے گورنر کو استعفیٰ پیش کر دیا۔ ان حالات میں میرے لئے کام کرنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے میں وزارت سے ہی مستعفی ہو گیا۔"

پہلی دستوریہ کے انتخابات میں میاں ممتاز دولتانہ سے ان کا ٹکراؤ پھر ہو گیا۔ وزارت اعلیٰ کی برخاستگی کے بعد انہوں نے اپنا الگ گروپ تشکیل دینا شروع کر دیا۔ 14 جون 1955ء کو انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت کو یقین دلایا کہ وہ پارٹی ڈسپلن کا پورا پورا خیال رکھیں گے جب کہ دوسری طرف وزیر داخلہ سکندر مرزا نے بھی مسلم لیگ کے ان باغیوں کو سخت الفاظ میں انتباہ کیا تھا۔ جب فیروز خان نون نے دستوریہ کے لئے الگ گروپ تشکیل دینا شروع کیا تو ان پر سب سے بڑھ چڑھ کر تنقید کرنے والے وہی چار وزراء

تھے جن میں مسعود صادق، سید عابد حسین گیلانی اور محمد خان لغاری شامل تھے۔ جنہوں نے چند ہفتے پہلے انہوں نے اپنا قائد تسلیم کیا تھا۔ انہوں نے ایک بیان جاری کیا کہ اب ملک صاحب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ پارلیمانی اتحاد رکھنے کی ضرورت پر زور دیں۔ پارٹی میں دھڑوں کی مذمت کریں اور شکوہ کریں کہ دستور سازی کے معاملہ میں پنجاب کی آواز نہ ہونے کے برابر ہو گئی۔ اگر ملک صاحب کے خدشات حقیقت پر مبنی ہوں تو انہیں اپنا دل ٹٹولنا چاہیے اور یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا یہ صورت حال انہی کی کارروائیوں کا نتیجہ نہیں۔ ملک صاحب کو یاد ہونا چاہیے کہ یکم جون 1954ء کو کراچی سے واپس آکر انہوں نے بارہا کہا کہ مرکز سے وہ پوری طرح متفق ہیں اور انہیں مرکز کا پورا اعتماد حاصل ہے۔

ملک فیروز خان نون اور مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ کے درمیان لفظوں کی جنگ جاری تھی کہ اس دوران مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے اجلاس 13 جون 1955ء میں جہاں عبدالحمید دستی کی قیادت پر مکمل اعتماد کیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ مرکزی پارلیمانی بورڈ سے درخواست کی گئی کہ وہ ملک فیروز خان نون اور ملک مظفر قزلباش کو ٹکٹ نہ دیں۔ اسمبلی کے 179 ارکان میں سے اس مطالبے پر 129 ارکان سے دستخط کئے تھے۔ اس موقع پر ملک فیروز خان نون نے ارکان کی تعداد کو چیلنج کیا اور انہوں نے اس موقع پر ستر ارکان کی حمایت کے ثبوت بھی فراہم کئے۔ اس وقت مسٹر شمیم احمد خان ایم ایل اے جو مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے بھی فیروز خان نون کی حمایت کی۔

مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ نے بیس نشستوں پر امیدواروں کا اعلان کیا۔ ان میں میاں مشتاق گورمانی، میاں افتخار ممدوٹ، چوہدری محمد علی، سکندر مرزا، وزیر خوراک کرنل عابد حسین، وزیر اطلاعات سردار ممتاز، وزیر مملکت بحالیات سردار امیر اعظم، وزیر اعلیٰ عبدالحمید دستی، وزیر صحت علمدار حسین گیلانی، وزیر جنگلات صوفی عبدالحمید، میاں ممتاز دولتانہ، شیخ دین محمد سابق گورنر سندھ، عبدالغنی گھمن چیف وہپ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی، نواب امیر محمد آف کالا باغ، محی الدین لال بادشاہ پیر آف ٹھٹھ، چوہدری عزیز دین، بیگم شاہنواز، محمد حسین چٹھہ، سید جمیل حسین رضوی، نواب زادہ رشید علی خان شامل تھے۔

پنجاب کے بارہ مسلم لیگی ارکان نے پارلیمانی بورڈ کے فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی۔ مسٹر اے کے بروہی نے جو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے سیکرٹری تھے، فیروز خان نون کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے فیصلے کو تسلیم نہ کیا تو ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ مسلم لیگ کے خلاف جس گروپ کو منظم کرنے کا سرا فیروز خان نون کے سر ہے، ان میں پہلی دستوریہ کے انتخاب میں حصہ لینے والوں میں میاں افتخار الدین، نواب مظفر قزلباش، مولانا عبدالستار خان نیازی، ملک غلام نبی، نصراللہ خان، مسٹر بی گمن، ملک فتح محمد خان ٹوانہ سرگودھا، چوہدری صلاح الدین چٹھہ گوجرانوالہ، راجہ عبداللہ خان گوجرانوالہ، مولانا داؤد غزنوی لاہور، مسٹر شمیم احمد خان جہلم، مسٹر بلخ شیر مزاری رکن مرکزی لیگ پارلیمانی بورڈ، میاں عبدالباری قائد حزب اختلاف، سردار عبدالحمید نکئی قصور شامل تھے۔

اس موقع پر وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے اعلان کیا کہ جن امیدواروں کو دستوریہ کا ٹکٹ نہیں ملا، اگر وہ پکے مسلم لیگی ہیں تو وہ نام واپس لے لیں۔ اگر انہوں نے فیصلوں کی پابندی کی تو ان کی سیاسی بحالی کے امکانات ہیں اور ان کی سابقہ کوتاہیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ نون گروپ کو لیگ کا ٹکٹ اس لئے نہیں دیا گیا کہ انہوں نے پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے۔

اس طرح فیروز خان نون کو مسلم لیگ سے 5 سال کے لئے نکال دیا گیا۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے بیس ساتھیوں سمیت مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا اور اب جس مسلم لیگ کے لئے انہوں نے دن رات کام کیا تھا، وہ اس کے دو آنے کے ممبر بھی نہ رہے تھے۔ مسلم لیگ سے حذف ہونے کے بعد انہوں نے نئی سیاسی جماعت بنانے کے سلسلہ میں ابتدائی کام شروع کر دیا تھا کہ اس دوران چاروں صوبوں کو ملا کر مغربی پاکستان کے نام سے ون یونٹ قائم کر دیا گیا۔ 24 اپریل 1954ء کو ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت اس پارٹی میں 6 مئی 1956 کو شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی شمولیت کے موقع پر اعلان کیا کہ ڈاکٹر خان صاحب (جو ون یونٹ پارٹی کے صدر تھے) کی ناکامی ہماری بہت بڑی بدبختی ہوگی۔

مسلم لیگ کا یہ حال تھا کہ جب ون یونٹ پارٹی کی بنیاد پڑی تو 157 ایم ایل اے اس میں شمولیت کے لئے پر تولنے لگے اور راتوں رات جنم لینے والی جماعت کو سپیکر کے انتخاب میں 149 اور مسلم لیگ کو 148 ووٹ ملے۔

مسلم لیگ کے بارے میں فیروز خان نون کا انداز جارحانہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے ری پبلکن میں شمولیت کے بعد کہا کہ ملک کی تباہی کی ذمہ دار مسلم لیگ اور اسکی قیادت ہے۔ مسلم لیگ سیاسی جماعت نہیں، "اقتدار پرستوں کا ٹولہ بن گئی ہے" جس کے سامنے کوئی اصول نہیں بلکہ وہ دھاندلی، دھونس اور سازش سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ اگر بدنام مسلم لیگیوں کو دوبارہ اقتدار مل گیا اور مغربی پاکستان میں برسراقتدار آنے کی اجازت دے دی گی تو پھر وہی لاقانونیت کا دور دورہ ہو گا اور نظم و نسق میں بدعنوانی اور رشوت پھیل جائے گی۔ مسلم لیگ نے مہاجرین کا جو حشر کیا ہے، وہ کس کو معلوم نہیں۔ مجھے امید ہے کہ مہاجرین مسلم لیگ کو اقتدار سے محروم رکھنا اپنا فرض سمجھیں گے۔ چند مسلم لیگی کسی حکومت کو پرامن طریقے سے کام نہ کرنے دینے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔

فیروز خان نون کے مسلم لیگ پر کھلم کھلا سیاسی حملوں کے خلاف مسلم لیگ نے پنجاب کے چھ سابق وزراء صوفی عبدالحمید، محمد حسین چٹھہ، شیخ فضل الٰہی پراچہ، سردار محمد خان لغاری، سید علی حسین گردیزی اور مسٹر صلاح الدین سے ایک مشترکہ بیان جاری کروایا کہ "غیر ملکی استعمار پرستوں یا قومی حکمرانوں کی سرپرستی میں بانخواہ عہدے قبول کرتے وقت دلائل، استقلال، حب الوطنی اور اصول کبھی فیروز خان نون کے آڑے نہیں آئے۔ اس مرتبہ ملک صاحب نے ریکارڈ توڑ دیا۔ وہ کسی مسلمہ معیار کے مطابق اپنے رویئے کی صفائی نہیں کر سکتے۔

یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ رسوائے زمانہ یونینسٹ وزارت کے بعد ملک صاحب کے دور اقتدار میں ایوان کے ووٹ خریدنے کے لئے پرائیویٹ پارلیمنٹری سیکرٹری مقرر کئے۔ پھر کیا وہ ارشاد فرمائیں گے کہ ٹیوب ویل سکیم کے تحت تین کروڑ روپے مالیت کی سرکاری زمینوں کا سکینڈل کس کے دور وزارت میں ہوا تھا اور ایسے حالات پیدا کئے گئے تھے جس کے سبب ملک خضر حیات کی پرائیویٹ نہروں کے معاوضے کے طور پر 8 کروڑ روپے

کی ادائیگی روکنے کے لئے قومی پارلیمینٹ کو مداخلت کرنا پڑی تھی۔ ملک صاحب نے اب مشرقی بنگال اور ون یونٹ کے قیام سے پہلے سندھ، بہاولپور اور صوبہ سرحد کی وزارتوں کی برطرفی کا رونا رویا ہے۔ حسین شہید سہروردی کی وزارت میں انہیں وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔

مسلم لیگ سے ان کی نفسیاتی جنگ جاری تھی کہ مرکز میں تبدیلی آجانے سے انہیں ری پبلکن جماعت کی نمائندگی کا حق دیتے ہوئے دوبارہ وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔ آئی آئی چندریگر بھی جب حالات کو نہ سنبھال سکے تو انہیں 13 دسمبر 1957ء کو وزیر اعظم کی حیثیت سے وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ انہیں ری پبلکن، عوامی لیگ، کانگرس، نیشنل عوامی پارٹی، کریشک سرک پارٹی، شیڈول کاسٹ فیڈریشن کے علاوہ امیر اعظم اور اے کے دانش کی حمایت بھی حاصل تھی۔ سازشوں کے اس دور میں ملک دن بدن سیاسی حوالے سے زوال پذیر ہو رہا تھا۔ ملک کے حالات سنبھالنے کے لئے اکتوبر 1958ء کو ملک میں مارشل لاء لگ گیا اور ملک فیروز خان نون ری پبلکن پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے سیاست سے جبری ریٹائر کر دیئے گئے۔ سیاستدانوں کے احتساب کے لئے سابق صدر پاکستان ایوب خان نے جب ایبڈو کا قانون بنایا اور ان پر بدعنوانی اور اقربا پروری کے الزامات لگا کر 31 دسمبر 1966ء تک سیاسی زندگی سے جبری ریٹائر کرنے کا منصوبہ بنایا تو فیروز خان نون نوٹس ملنے سے پہلے ہی سیاست سے 31 دسمبر 1966ء تک رضا کارانہ طور پر کنارہ کش ہو گئے۔

ایوب خان نے جب کونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو فیروز خان نون کا گروپ ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرتا رہا۔ فیروز خان نون کا بیٹا نور حیات نون 1962ء کے غیر جماعتی انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے تھے۔ وہ کونشن مسلم لیگ تحصیل بھلوال کے صدر بھی بن گئے۔ 1965ء کے انتخابات میں ان کا مقابلہ قاسم میلہ سے تھا جن کے حق میں پانچ امیدوار دستبردار ہو گئے تھے۔ دوسری نشست پر ملک انور ٹوانہ کا مقابلہ حبیب اللہ ٹوانہ سے تھا۔ ایک ہی جماعت اور ایک ہی خاندان سے وابستہ ہونے کے باوجود نور حیات نون نے ذاتی رنجش کی بنا پر انور ٹوانہ کی مخالفت کی تھی۔ فتح ٹوانہ کے فرزند کو سرکاری ٹکٹ ملا تھا۔ وہ کونشن مسلم لیگ کے قیام کے موقع پر جماعت کی ضلعی قیادت کے

مسئلہ پر نور حیات نون سے متصادم ہوئے تھے جب محمد انور ٹوانہ ضلع کونشن مسلم لیگ کے کنونیر بن گئے تو یہ مخالفت بتدریج زیادہ ہونے کی وجہ سے نور حیات نون، انور ٹوانہ کو شکست دینے کے لئے بے چین تھے لیکن ان کا خاندانی اور سیاسی حریف گورنر امیر محمد آف کالاباغ کی مداخلت کے باعث بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔ جب ایوب خان اقتدار سے الگ ہوئے تو دونوں خاندانی حریفوں نے کونشن مسلم لیگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ملک محمد انور ٹوانہ جمعیت علماء پاکستان میں شامل ہو گئے اور نور حیات نون مسلم لیگ قیوم گروپ کے ٹکٹ پر اپنے کزن انور علی ملک سے شکست کھا گئے تھے۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے انہوں نے بھی انور علی ملک کی طرح پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ دوسری طرف ان کے خاندانی حریف ملک فتح محمد ٹوانہ اور اس کے بیٹے انور ٹوانہ نے بھی اپنے گروپ سمیت پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی کیونکہ انور ٹوانہ اور نور حیات نون دونوں 1970ء کے انتخابات میں شکست کھا گئے تھے جبکہ ملک انور علی نون پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گئے تھے۔

سرگودھا کی سیاست جو ایک مخصوص مزاج کی سیاست ہے، بڑی بڑی برادریوں کے گرد ہی گھومتی رہی ہے۔ 1977ء میں پیپلز پارٹی اور قومی اتحاد نے اکثر ٹکٹ سرگودھا میں برادریوں کے نام پر ہی دیئے تھے۔ ضلع سرگودھا کی تحصیل بھلوال کی دو مرکزی نشستوں پر ایک ہی خاندان کے ملک انور نون اور ملک نور حیات نون کو ٹکٹ جاری کئے تھے جب کہ قومی اتحاد نے نور حیات نون کے مقابلہ میں میاں اکرم رانجھا اور جاٹ برادری کے چوہدری فضل الٰہی کو ملک انور علی کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا تھا۔

نور حیات نون 1977ء کے انتخابات میں کامیاب ہو گئے اور ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں وفاقی کابینہ میں بھی شامل کر لیا تھا۔ دھاندلیوں کے الزامات کے بعد جب پیپلز پارٹی اقتدار سے الگ ہوئی تو ملک نور حیات نون کو پیپلز پارٹی سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔

ان کی والدہ وقار النساء نون، ضیاالحق دور میں ٹورازم کے محکمہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہی ہیں۔

1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ملک نور حیات نون نے اپنی بالادستی قائم رکھی اور این اے 59 سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے بھیرہ کے پراچوں سے مل کر اپنے ہی خاندان کے بااثر افراد کو مجبور کر دیا کہ وہ انتخابی سیاست سے دستبردار رہیں۔

ور رانجھا کے رانجھا زمینداروں کو پہلی بار فقید المثال انتخابی کامیابیاں نصیب ہوئیں اور تین
فراد قومی و صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔ 1988ء اور 1990ء کے انتخابات میں
ور حیات نون اور نون فیملی کے کسی فرد نے حصہ نہ لیا۔ اس طرح یہ پہلا موقعہ ہے کہ نون
فیملی ایک سو سالہ قیادت سے محروم ہوگئی۔ اس وقت نون خاندان جاگیرداری کے ساتھ
ساتھ صنعتی اعتبار سے بھی ملک کا اہم خاندان شمار ہوتا ہے۔

میجر نواب ملک ممتاز محمد خان میئڈل ٹوانہ آف جہان آباد

جہاں آباد کے ٹوانے

شاہ پور کے ٹوانوں میں نون اور مٹھا ٹوانوں کے بعد جہاں آباد کے ٹوانے سیاست میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ اس خاندان کے جس فرد نے شہرت حاصل کی تھی، وہ سردار بہادر جہان خان تھے جو 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لے کر اور آزادی کی تحریک کے خلاف ملک صاحب خان کے رسالہ میں شامل ہو کر جہلم اور اجنالہ کی مہمات میں اہم کردار ادا کر کے نمایاں ہوئے تھے۔ انہوں نے کلبی اور جنرل نیپیئر کے اسکاوٹ میں شامل ہو کر سنٹرل انڈیا میں اہم خدمات سرانجام دی تھیں خاص طور پر انہوں نے راندھے کی لڑائی میں دشمنوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ اس بہادری کو دیکھتے ہوئے انہیں اٹھارہ بنگال لانسر میں رسالدار بنا دیا گیا۔ ملک جہاں خان 1893ء میں فوت ہوئے تو ان کا بڑا بیٹا ملک بہادر خان خاندانی معاملات کا سربراہ بنا انہوں نے نویں بنگال لانسر میں 1885ء میں کمیشن حاصل کیا۔ اور یہاں چھ سال تک اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اسی رجمنٹ میں آنریری لیفٹنٹ بنا دیا گیا جب وہ فوت ہوئے تو یہ عمدہ ترقی پاتے پاتے کیپٹن تک پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے فوج میں کئی کھیلیں بھی متعارف کرائیں اور خود بھی بہت بڑے سپورٹس مین تھے انہیں صوبائی درباری کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ 1910ء میں انہیں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ جنگ عظیم میں انہوں نے اپنی تمام خدمات حکومت کے حوالے کر دی تھیں۔ انہوں نے جنگ میں جس جذبہ کے تحت کام کیا تھا، صوبائی حکومت نے ان کی خدمات کا خصوصی طور پر اعتراف کیا تھا۔ انہوں نے 39,600 روپے جنگ کے فنڈ مین جمع کرائے تھے۔ انہیں ڈسٹرکٹ بورڈ شاہ پور اور وار لیگ کا صدر بھی نامزد کیا گیا۔ انہوں نے اس دوران رنگروٹوں کی بھرتی اور جنگی قرضہ اکٹھا کرنے میں اہم کردار ادا کیا

تھا۔ ملک مبارز خان ایک اعلیٰ دل اور بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور انجمن حمایت اسلام کے زبردست حامی تھے۔

انہوں نے اپنی جیب سے اس فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ جمع کرایا اور 75000 ہزار چندہ جمع کیا انہوں نے 1914ء میں اسلامیہ ہائی سکول شاہ پور کی بنیاد رکھی انہیں 1915ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور اس کے ایک سال بعد O.B.E کا خطاب دیا گیا۔ 1917ء میں انہیں ایک تلوار اور 15 مربعے زمین الاٹ کی گئی۔ ملک صاحب 1923ء میں فوت ہوئے ان کی موت کے بعد ان کے چھوٹے بھائی میجر نواب ملک محمد ممتاز خان خاندان کے سربراہ بنے۔ انہیں صوبائی درباری کی نشست وراثت میں الاٹ ہوئی تھی۔ انہوں نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی اور امپیریل کیڈٹ کور میں شمولیت اختیار کی۔ وہ اس کیڈٹ کور میں تین سال تک تربیت حاصل کرتے رہے اور نمایاں ترین کیڈٹس میں ان کا شمار ہونے لگا۔ 1907ء میں انہوں نے کنگ کمیشن حاصل کیا اور ان کی خدمات شملہ ہیڈ کوارٹر میں محکمہ جاسوسی کے سپرد کر دی گئیں۔ جنگ کے دوران انہوں نے پشاور میں ایک انتہائی خفیہ مشن پر کام بھی کیا تھا اور وہ اس ڈیوٹی کے سلسلہ میں 27 مہینے اہم فرائض سرانجام دیتے رہے۔ واپسی پر وہ ضلع راولپنڈی، شاہ پور اور کیمبل پور میں ریکروٹنگ آفیسر رہے۔ ان کے بھائی کی صحت خراب ہو گئی اور انہیں ملازمت چھوڑ کر فیملی جاگیر کے معاملات سنبھالنے پڑے۔ تحریک عدم تعاون کے دوران انہیں آنریری مجسٹریٹ نامزد کیا گیا۔ ملک صاحب 1924ء سے 1925ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ وہ ڈسٹرکٹ سولجر بورڈ اور ڈویژنل سولجر بورڈ کے صدر بھی تھے۔ ملک صاحب ایک سخی اور صاحب دل انسان تھے۔ وہ کالج کے لئے سالانہ 400 اور اسلامیہ ہائی سکول کے لئے 1200 روپے باقاعدگی سے دیتے رہے۔ وہ کورٹ آف علی گڑھ یونیورسٹی کے بھی ممبر تھے۔ سلور جوبلی فنڈ میں انہوں نے 500 روپے جمع کرائے اور اپنے اثر و رسوخ سے 15,000 روپے اسی فنڈ میں جمع کئے۔ انہیں سابقہ خدمات کے صلہ میں کنگ ایڈورڈ دہلی دربار، کنگ جارج دربار میڈل، مون سٹار، جنرل سروسز میڈل آف گریٹ وار، وکٹری میڈل اور جوبلی میڈل دیئے گئے۔ میجر نواب ملک ممتاز علی خان اپنے علاقے کے انتہائی با اثر شخصیت تھے اور انہوں نے اپنے علاقے میں لا اینڈ آرڈر کے مسئلہ کو سدھارنے میں انتہائی

اہم کردار ادا کیا۔

نواب صاحب کے دو بیٹے ملک حبیب اللہ خان اور ملک عزیز اللہ خان باپ کی طرح انتہائی باثر تھے۔ حبیب اللہ خان نے ایچی سن کالج اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیاست میں حصہ لیا اور وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے سینئر نائب صدر چنے گئے۔ علاوہ ازیں وہ کئی فلاحی اداروں کے عہدے دار بھی رہے۔

اس خاندان کی دوسری برانچ بھی سیاسیات میں نمایاں رہی ہے۔ جہاں خان کے بھائی عظمت خان فوج میں رسالدار تھے۔ انہوں نے ٹوانہ لارنس اور گوالیار میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ ان کے بڑے بیٹے بھی رسالدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے مظفر خان نے بھی چترال کی مہمات میں اہم کردار ادا کیا۔ اور ان کے تیسرے بیٹے شیر بہادر خان بھی فوج میں رسالدار میجر کے عہدے پر تعینات رہے ہیں۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف چلنے والی سیاسی تحریکوں کو دبانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہیں رسم تاج پوشی میڈل، O.B.E اور درجہ اول کے سردار بہادر کا خطاب دیا گیا۔ انہوں نے 1906ء میں Aide de Camp کی حیثیت سے پرنس آف ویلز کے ساتھ ڈیوٹی سرانجام دی اور انہیں انگریز حکومت نے انتہائی اہم ذمہ داریوں سے سرفراز کیا۔ شیر بہادر خان آنریری کیپٹن کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ مظفر خان کے صاحب زادے محمد خان نے بھی فوج سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اس دوران چترال کی مہم میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ملازمت کے دوران امن بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1895ء میں چترال میں امن کی بحالی کے لئے جو کوششیں کیں انہیں ریلیف چترال میڈل دیا گیا۔ 1897-98ء میں پنجاب فرنٹیر میڈل 1914-15ء میں سٹار میڈل، برٹش وار میڈل اور وکٹری میڈل دیا گیا۔ انہیں آنریری لیفٹنٹ بنایا گیا اور انہیں ڈیڑھ مربع زمین الاٹ کی گئی۔ خان محمد خان نے 1935ء میں سلور جوبلی میڈل بھی حاصل کیا۔ ملک غلام حسین خان، ملک سعادت خان کے تیسرے بیٹے تھے۔ انہوں نے 1857ء میں اہم کردار ادا کیا اور انہوں نے میوٹنی میڈل حاصل کیا۔ ان کے بڑے بھائی عظمت خان کی موت کے بعد ملک سعادت خان نمبردار بن گئے۔ ان کے بیٹے عبدالرحمان خان نے بھی فوج سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ وہ ترقی پاتے پاتے رسالدار بن گئے۔ انہوں نے جنگ عظیم میں بھی اہم کردار

ادا کیا۔ جنگ عظیم کی خدمات کے بعد انہیں سٹار، وکٹری اور جنرل سروسز میڈل ملے۔ وہ کیپٹن موڈی کو ایک بغاوت کے دوران بچاتے ہوئے ہلاک ہو گئے۔ ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے اور بیوہ کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔ عبدالرحیم خان کے صاحب زادے عبدالحمید خان اور عبدالمجید خان نے بھی فوج سے ملازمت کا آغاز کیا۔ عبدالمجید خان باپ کی موت کے بعد نمبردار بنائے گئے۔ پیارا خان بھی ڈویژنل درباری تھے۔ ان کے بڑے بیٹے عبدالغفور خان دفعدار تھے۔ جنگ عظیم کے دوران انہوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے سرحد اور Mesopotamia تحریک کے دوران خدمات سرانجام دیں اور انہیں سٹار، دی وکٹری، جنرل سروسز اور بلوچستان میڈل دیئے گئے اور ان کے دوسرے بیٹے عبدالقادر خان نے بھی 1917ء میں فوج سے اپنی نوکری کا آغاز کیا۔ ان کے چوتھے بیٹے محمد صادق خان بھی فوج میں ملازم رہے ہیں۔

ملک جہاں خان کے چھوٹے بھائی فتح شیر خان نے بھی 1857ء میں حریت پسندوں کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہیں "میوٹنی میڈل" دیا گیا۔ ان کے بیٹے عالم شیر خان نے بھی فوج میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ آٹھ سال کی خدمات کے بعد پانچ مربعے زمین حاصل کیں۔ ان کے بڑے بیٹے عطا محمد خان نے بھی 1917ء میں فوج میں ملازمت اختیار کی اور 1921ء تک ملکی و غیر ملکی مہمات میں اہم ذمہ داریاں سرانجام دیتے رہے۔

فتح شیر خان کے بیٹے محمد شیر خان جمعدار کے عہدے پر تعینات رہے۔ انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں، ان کے صلے میں انہیں بھی کئی ایوارڈ دیئے گئے۔ ان کے دو بیٹے یعقوب خان اور محمد ایوب خان بھی اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔

میر اعظم کے ہونہار بیٹے میرباز خان نمبردار تھے اور ان کے بیٹے محمد خان کو ذیلدار بنا دیا گیا۔ ان کے بعد ان عہدوں کو سکندر خان جو کہ اعظم خان کے بیٹے تھے، استعمال کرتے رہے۔ انہوں نے جنگ عظیم میں اہم خدمات سرانجام دیں اور 1919ء میں خلعت حاصل کی۔

مٹھا ٹوانہ برانچ کے نواب ملک عمر حیات خان ٹوانہ بھی تقریباً گزشتہ تیس سال سے مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے۔ ان کا نام 1904ء میں پنجاب کی دستور ساز کونسل کی

اصلاحات سے قبل ہی نمایاں نظر آتا تھا اور 1909ء سے 1920ء تک وہ امپیریل دستور ساز کونسل کے رکن تھے لیکن 1935ء میں ان کی نشست نواب سر مہر شاہ کو دے دی گئی اور 1926ء میں عمر حیات خان کو کونسل آف اسٹیٹ کا رکن نامزد کیا گیا۔ ان کے صاحب زادے نواب ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ 1937ء میں اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے تھے اور بعد میں انھیں سر سکندر حیات خان کی کابینہ میں پبلک امور سے متعلق وزیر مقرر کیا گیا۔
ٹوانہ ذات کی مٹھاٹوانہ برانچ ہی سیاست میں نمایاں نہیں تھی بلکہ ہمو کا شاخ کے چار دوسرے فرد بھی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے نواب ملک سر خدا بخش خان 26-1925ء میں کونسل کے رکن تھے یہ نشست فضل حسین کے ایگزیکٹو کونسل میں شمولیت کے بعد خالی ہوئی تھی اور خدا بخش نے ضمنی انتخاب میں اس نشست پر کامیابی حاصل کی تھی دوسرے عام انتخاب میں اس نشست پر سکندر حیات خان بلامقابلہ منتخب ہوگئے تھے۔ خدا بخش کے بیٹے اللہ بخش خان ایک سول سرونٹ تھے۔ 1931ء میں مرکزی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا۔ اللہ بخش اپنے بھتیجے خضر حیات کے قریبی مشیر سمجھے جاتے تھے۔ ہمو کا برانچ کے ملک فتح محمد خان بھی 58-1950ء تک اسمبلی کے رکن رہے۔ ان کے بیٹے ملک محمد انور خان ایوب خان کے دور میں قومی اسمبلی کے رکن تھے۔ یہ برانچ آج بھی خوشاب میں ملک خدا بخش ٹوانہ کی صورت میں نہ صرف ضلع کی قیادت پر چھائی ہوئی ہے بلکہ غلام حیدر وائیں کی وزارت میں انھیں اہم وزیر کی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں آباد کے منڈیل ٹوانہ کے نواب ملک ممتاز محمد خان اس خاندان کی نمایاں شخصیت تھے۔ 37-1936ء میں ملک صاحب کونسل کے رکن منتخب ہوگئے تھے۔ ان کے صاحب زادے ملک حبیب اللہ 55-1951ء تک اسمبلی کے رکن رہے۔ 1946ء میں ممتاز محمد خان نے خضر حیات کی زبردست مخالفت شروع کر دی تھی۔ لائل پور برانچ کے ملک نادر علی ٹوانہ بھی قومی اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ ٹوانہ اور نون خاندان میں آپس کی شادیوں کی وجہ سے دونوں کی سیاسی اہمیت مساوی ہے۔ ہمو کا برانچ کے ایک رشتہ دار ملک خدا بخش بچہ سرکاری افسر تھے۔ 1940ء میں خضر حیات کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ 1966ء میں نواب آف کالاباغ کے دور میں وزیر زراعت تھے۔ اور پیپلز پارٹی کی حکومت میں وہ وزیر اعظم کے زراعت سے متعلق خصوصی مشیر رہے۔

ٹوانہ خاندان کے عروج کا زمانہ سکھوں اور انگریزوں سے شروع ہوتا ہے اور پھر ہر آنے والی حکومت میں ان کا اقبال ہمیشہ بلند رہا ہے۔ ملک حبیب اللہ ٹوانے کے بیٹے ایم۔ پی۔ اے سے آگے نہ بڑھ سکے اور وہ سیاسیات پاکستان میں ابھرنے کی کوشش میں معروف ہیں

محمد افضل خان کھوکھر آف پنڈدادن خان

راجہ دادن خان

فیروز خان
احمد خان
خدا بخش خان
بہادر خان
خدا بخش خان

فتح محمد خان
چار نسلیں
سرفراز خان
فتح خان

میر خان
دادن خان
1870 ء میں فوت ہوئے

شیر علی خان
صفدر علی خان
راجہ سیف علی خان
راجہ مظفر علی خان
1885 ء میں پیدا ہوئے

شیر دل خان
صاحب خان

شفیع خان
چار نسلیں
اکبر خان
دو نسلیں
سلطان احمد خان
سلطان فتح محمد خان
راجہ جہلال خان
1935 ء میں فوت ہوئے
محمد حیات خان
1894 ء میں پیدا ہوئے

سکندر حیات خان
1922 ء میں پیدا ہوئے
لیاقت حیات خان
1921 ء میں پیدا ہوئے
خضر حیات خان
1919 ء میں پیدا ہوئے

بلند خان
چار نسلیں
سردار خان

فتح خان
احمد خان
راجہ خدا بخش خان

شیر خان
تین نسلیں
راجہ سردار خان
محمد حیات خان

محمد اعظم خان
1914 ء میں پیدا ہوئے
سردار خان
1934 ء میں پیدا ہوئے
سرفراز خان
1933 ء میں پیدا ہوئے
محمد اسلم خان
مظفر حیات خان
1930 ء میں پیدا ہوئے
محمد اکرم خان
محمد منور خان
محمد ایوب خان
1930
ء میں پیدا ہوئے
محمد افضل خان
1901 ء میں پیدا ہوئے

ذوالفقار خان
1915 ء میں پیدا ہوئے
[illegible]
1921 ء میں پیدا ہوئے
[illegible]
1923 ء میں پیدا ہوئے

محمد افضل خان کھوکھر آف پنڈدادن خان

کھوکھر راجپوت پنڈدادن خان اور احمد آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس علاقے میں کھوکھر راجپوتوں کے آثار دادن خان راجپوت سے شروع ہوتے ہیں جو شہنشاہ جہانگیر کی ملازمت چھوڑ کر آئے اور "نمک سار" میں آباد ہوگئے۔ یہاں اس نے "مخش آباد نمک سار" کے آثار پر اپنے نام کی ایک بستی پنڈدادن خان بسائی۔ اس علاقہ میں جنجوعے بھی رہتے تھے جن کو اس علاقے کا ایک اور طاقت ور قبیلہ تنگ کرتا تھا۔ چنانچہ وہ اس علاقے کو چھوڑ کر چلے گئے جس کی وجہ سے کھوکھروں کو اس علاقے میں پوری طرح قبضہ جمانے کا موقعہ ملا۔ نمک کی منڈی کی وجہ سے پنڈدادن خان بہت جلد ایک شہر بن گیا۔ دادن خان کے تین لڑکے تھے جن کی اولاد اب بھی احمد آباد اور پنڈدادن خان میں رہتی ہے۔ شفیع خان نے چک شفیع میں دشمنوں سے حفاظت کے لئے ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا تاکہ گجروں اور جنجوعوں کے حملوں کی روک تھام ہو سکے جو کھوکھروں کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ اور یہ لڑائی سیاسی تسلط قائم کرنے سے شروع ہوئی تھی۔ کھوکھروں میں جانشینی کے مسئلہ پر جھگڑا ہو گیا۔

فیروز خان کا بیٹا احمد خان اپنے کزن سے قیادت کے مسئلہ پر جھگڑتا رہا۔ بالآخر اس نے پنڈدادن خان سے پندرہ میل کے فاصلہ پر احمد آباد نامی ایک نیا قصبہ بسالیا اور اس کی نسل اب تک اس علاقے میں آباد ہے۔ احمد خان ایک سمجھ دار حکمران تھا اور اس نے اپنے علاقے کا انتظام انتہائی سمجھ داری سے چلایا۔ انہوں نے نور پور کے اعوانوں کو اپنے علاقے سے مار بھگایا تاکہ وہ اس علاقے پر قبضہ کر کے اس کے حکمران نہ بن بیٹھیں۔ انہوں نے اپنے علاقے کی علمداری دہلی دربار سے منظور کرالی تھی۔

احمد خان کے دو بیٹے فیض اللہ اور خدا بخش تھے۔ خدا بخش خان نے کھوکھر قبیلے کی قیادت سنبھالے رکھی۔ ۱۸۶۵ء میں ان کی موت واقع ہوئی۔ انہوں نے کھوکھر قبیلے کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ خاص طور پر ۳۹۔۱۸۳۸ء میں سکھوں کے خلاف لڑائی بڑی یادگار ہے۔ انہوں نے ملک شیر خان ٹوانے کی فوج میں شامل ہو کر جاگیر اور ملکیت اراضی بھی حاصل کر لئے تھے۔ ان کی موت کے بعد ان کے بیٹے سردار خان اثر و رسوخ کے حوالے سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں سردار خان کی موت کے بعد حیات خان نے قبیلے کی سرداری سنبھالی۔ وہ واندٖ، کوٹ کہچ اور احمد آباد کی ریاست کے نگران بھی تھے۔ اسے انگریزوں نے جاگیر سے بھی نوازا۔

وہ صوبائی درباری بھی تھے۔ ۱۹۰۹ء میں احمد آباد میں کھوکھروں کے دو نمایاں راہنماؤں محمد حیات خان اور شیر خان نے قبیلے کی فلاح و بہبود کے لئے بڑا کام کیا۔ محمد حیات کی موت کے بعد ان کا بیٹا محمد افضل خان باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔ لیکن وہ باپ جیسی انتظامی اور رابطہ عوام سرگرمیوں میں خود کو نمایاں نہ کر سکا۔

پنڈدادن خان کے راجوں میں سرفراز خان نے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے دن رات کوششیں کیں۔ جنجوعہ قبیلے سے لڑائیاں ختم کرنے کے لئے انہوں نے ان سے رشتہ داریاں بھی کیں لیکن بدقسمتی سے قبائلی عصبیت کا رنگ کھوکھروں اور جنجوعوں پر غالب رہا اور یہ خاندان ایک دوسرے سے لڑتے مرتے رہے۔ سردار چرت سنگھ جو کہ راجہ رنجیت سنگھ کے دادا تھے، نے جب پنڈدادن خان کا علاقہ فتح کیا تو انہوں نے احمد آباد کے راجہ کو اجازت دی کہ وہ علاقے پر اپنی حکمرانی اور سرداری برقرار رکھے۔ ۳۹۔۱۸۳۸ء میں جب کھوکھر راجے نے انگریزوں کے ساتھ شمولیت اختیار کی تو اس کی تمام جاگیر اور الاؤنس بحال کر دیئے گئے۔ کچھ عرصہ بعد شیر دل خان کو ۲۰۰ روپے پنشن کے ملتے تھے۔ علاوہ ازیں شمشیر علی خان، مہر خان اور ان کی بیوہ ماں کو سو روپیہ پنشن ملتی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں شیر دل خان نے انگریزوں کو ۳۵۰ روپے چندہ جمع کر کے حریت پسندوں کی تحریک کو کچلنے کے لئے دیئے۔ تحریک آزادی کے المناک خاتمہ کے بعد انگریزوں سے تعاون کے صلہ میں سلطان احمد، شمشیر علی خان کو ایک ہزار کی مستقل گرانٹ دی اور شیر دل خان، مہر خان اور بانو بی بی جو کہ ان کی والدہ تھی، کو لائف پنشن بھی دی۔ احمد آباد اور پنڈدادن خان میں

کھوکھر خاندان کو اراضی کے مالکانہ حقوق بھی دیئے۔ شیر دل کی موت کے بعد صاحب خان قبیلے کے سربراہ بنے۔ ان کے بعد سلطان احمد بھی ۱۸۷۲ء میں فوت ہو گئے۔ تو قبیلے کے سربراہ راجہ سیف علی خان بنے۔

راجہ سیف علی خان بھی انگریز سرکار کے بہت قریب تھے۔ انہیں ایک ہزار کی گرانٹ کے علاوہ دیگر سہولتیں بھی میسر تھیں۔ وہ اپنی تحصیل میں سب رجسٹرار اور صوبائی درباری تھے۔ ان کے بیٹے غضنفر علی خان پنڈدادن خان میں مجسٹریٹ تھے۔ وہ کونسل آف سٹیٹ کے ممبر بھی تھے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۳ء تک الور ریاست میں منسٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن بھی چنے گئے۔

قیام پاکستان کے پنڈدادن خان کے کھوکھر راجے انگریزوں سے ملی ہوئی مراعات سے لطف اندوز ہوتے رہے اور سیاست میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ان کے سیاسی سفر کی داستان مسلم لیگ، کنونشن لیگ، پیپلز پارٹی اور ری پبلکن سے وابستہ رہی ہے۔

جہلم کے راجے (دارا پور)

جہلم کے علاقے میں سب سے پہلے آباد ہونے والے راجے تھے۔ جنجوعے راجے ڈھائی ہزار قبل آ کر اس علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ راجپوت آباد کاروں کی تین نسلیں پنجاب میں وقفے وقفے سے نقل مکانی کر کے آباد ہوئی ہیں۔ حضرت یسوع مسیح سے قبل کٹوچ اور چمبہ کے راجے جہلم کے علاقے اور جالندھر کی پہاڑیوں کے قریب آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ کسی زمانے میں دو آب باری اور رچنا پر حکومت کرتے تھے۔ یہاں ان کی دوسری نسل تقریباً ایک ہزار سال بعد آئی۔ اس قبیلہ کا سردار ہستنا پور کے راجہ کا بیٹا تھا۔ اس نے جہلم کے شمال میں ایک خانوادے کی بنیاد رکھی جو راولپنڈی سے ملتان تک حکومت کرتا رہا ہے۔ آخر میں دکن سے آنے والے راجپوت تھے جن کی اولاد جاٹ، گھیبے، کھوکھر اور سیال تھے۔ جنجوعے ہستناپور سے آنے والے راجپوتوں کی اولاد سے بتائے جاتے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب یادو راجپوت سے شروع ہوتا ہے اور یہ نمک سار کے علاقے کے ساتھ ساتھ آباد ہوتے چلے گئے۔ آباد ہونے والی بستی کا نام "جودھ پہاڑی" رکھا گیا۔ اس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جنجوعے یدھیا جودھ راجپوتوں کی نسل میں سے ہیں۔ بعض لوگ ان راجپوتوں کا سلسلہ اور رشتہ جویا اور جودھی راجپوتوں سے ملاتے ہیں لیکن بیکانیر کے جویا راجپوتوں کی عادات و رسم و رواجات جہلم کے جنجوعے راجپوتوں میں پائے جاتے ہیں۔ جنجوعوں کے متعلق تاریخی شہادت یہ ہے کہ وہ راجپوتوں کی قدیم نسل میں سے ہیں جبکہ جنجوعے خود ایک پانڈو راجہ مل کو اپنا جد امجد تسلیم کرتے ہیں۔ جو پنجاب میں 980 ء کے لگ بھگ آئے تھے۔ ان کا ابتدائی وطن جودھ پور یا قنوج ہے جس پر اس زمانہ میں راٹھور راجپوتوں کی حکومت تھی۔ جب راٹھور کے راجہ کو علم ہوا کہ

پانڈو اس علاقے سے بھاگ کر جہلم کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہو گیا ہے تو وہ بھی اس کی تلاش میں اس علاقے میں آ کر آباد ہو گیا جہاں اس نے راج گڑھ نامی گاؤں آباد کیا جو کہ اب ملوٹ گاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں راجہ مل کی حکومت تھی۔ اس نے راجہ مل کو بلا بھیجا کہ وہ ان کی اطاعت قبول کرے۔ جب راجہ نے ایسا نہ کیا تو اس کی سرکوبی کے لئے ایک دستہ روانہ کیا گیا جس نے راجہ کو شکست دے کر قیدی بنا لیا۔ راجہ کے سامنے یہ شرط رکھی گئی کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو اسے نہ صرف رہا کر دیا جائے گا بلکہ اسے جاگیریں بھی دی جائیں گی۔ راجہ مل نے ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہ کٹاس اور ملوٹ میں ٹینک بھی تعمیر کرایا جہاں ہر سال ہزاروں ہندو آج بھی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ راجہ مل کے پانچ بیٹے تھے۔ ویر، جودھ، کھیالہ، ترالونی اور کالا۔ کھیالہ کی اولاد کھیوڑا، کلر کہار اور راولپنڈی کے علاقہ میں آباد ہوئی۔ ترالونی کی اولاد اسب اور اٹک کے ارد گرد آباد ہو گئی لیکن جودھ اور ویر دونوں نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قبیلے کی سربراہی سنبھالی اور اپنے باپ کے نام کی لاج رکھتے ہوئے جہلم کے علاقے میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ دونوں میں جب اختلافات ابھرے تو انہوں نے باپ کے مرنے کے بعد جائیداد آپس میں تقسیم کر لی۔ جودھ نے نکراچ کی پہاڑیوں اور مکشالہ گاؤں پر قبضہ کر لیا جہاں برہمنوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ اس نے مکشالہ کا نام تبدیل کر دیا اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس علاقے میں بارش بہت کم ہوتی تھی پانی جمع کرنے کے لئے انہوں نے دو ٹینکوں کو تعمیر بھی کرائی۔

ویر خان نے پنڈ دادن خان کے قریب کھیوڑا کا علاقہ لے لیا۔ ویر خان کا صرف ایک بیٹا راجہ احمد خان تھا جو کہ ملوٹ، بادشاہ پور اور دلوال کا وارث بنا۔ جودھ چار بیٹوں کا باپ تھا۔ ان کی اولاد بھاگن پورہ، کوٹ عمر، پنڈی کھوکھر، واگ، چکری، پیرچک، فرید پور، نھیال اور سید پور پر حکمرانی کرتی رہی۔

جودھ کا دوسرا بیٹا سنس پال چوا سیدن شاہ، ڈی چوہار، کوٹلی سیدان، کٹورا، کلاس، بھدرای، واٹلی، لاہو، وہاڑی، دریالہ اور کھیوالہ کے علاقے میں پھیلا۔ اس طرح جودھ کے دوسرے بیٹوں کی اولاد بھی پھیلتی رہی اور اوس پڑوس کے علاقوں پر قابض ہوتی رہی۔

1398ء میں جب تیمور نے حملہ کیا تو جنجوعوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا وہ ان کی قیادت

میں ہر طرف لڑتے مرتے رہے۔ 1526ء میں یہ بابر کے ساتھ مل گئے۔ اس قبیلے کا تذکرہ بابر نے اپنی کتاب "تزک بابری" میں بھی کیا ہے۔ اس علاقے میں ان کے سب سے بڑے دشمن گکھڑ تھے۔ انہوں نے جنجوعوں کے کئی دیہات چھین لئے تھے اور ان کی اراضی پر قابض ہو گئے تھے۔ اس علاقے کے اعوان بھی ان کے دشمن تھے۔ جب سکھوں نے اس علاقے پر حملہ کیا تو انہوں نے بھی جنجوعوں کو پیچھے دھکیل دیا، البتہ دھاناسنگھ ملوائی نے انہیں چند دیہاتوں کے مالکانہ حقوق دیئے۔ راجہ محمد خان اور سمند خان لمبردار تھے۔

داراپور گاؤں ملک درویش نے دریافت کیا تھا جس کے خاندان کو گکھڑوں نے کئی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ انہوں نے اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے سکھوں کی قیادت بھی قبول کر لی تھی۔ ملک درویش کا پوتا جب خاندان کا سربراہ بنا تو اس نے سردار مہان سنگھ شکر چاکیہ کی قیادت میں بہادری کے جوہر دکھائے اور ساتھ ساتھ وہ اپنے دشمن گکھڑوں سے بھی نبرد آزما رہے۔ ان کا بیٹا غلام محی الدین بدقسمتی سے سردار اتار سنگھ کے ہاتھوں مارا گیا اور سردار اتار سنگھ نے ان کے تمام دیہاتوں پر قبضہ کر لیا ان کے بیٹے ہیبت خان اور علی حیدر ملک پور کی طرف بھاگ گئے جہاں انہوں نے قلعہ میں پناہ لی اور کئی سال یہاں مقیم رہے۔ 1810ء میں سردار اتار سنگھ کو ملتان کی مہم میں شمولیت کے لئے پہاڑیوں سے واپس آنا پڑا۔ انہوں نے اپنے حقوق واپس لینے کے لئے پھر لڑائی شروع کر دی۔ سردار اتار سنگھ کے چچا نے جنجوعوں کو پھر داراپور سے مار بھگایا۔ اس طرح جنجوعہ خاندان دن بدن مالی بحران کا شکار ہوتا گیا اور جو کار دار اور بڑے جاگیردار تھے، دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے۔ اس خاندان کو ایک بار خیر مہدی خان کی رہنمائی میں پھر عروج حاصل ہوا۔ اس کے چار بیٹوں میں سب سے بڑے ملک زمان مہدی ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ انہوں نے قبیلے کا انتظام انتہائی محنت اور ایمان داری سے چلایا۔ انہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور خاص طور پر ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو مفید معلومات فراہم کیں۔ ملک زمان مہدی نے حریت پسندوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو پکڑ کر جنگی انتظامیہ کے حوالے کیا جو کشتیوں کے ذریعے دریا عبور کر کے انگریزوں کے خلاف مضبوط منصوبہ بندی کرنے والے تھے۔ نیز انہوں نے دوسری افغان جنگ میں بھی ان کی مالی اور افرادی

قوت کے ساتھ مدد کی۔ 1887 ء میں انہیں وائسرائے کے ہاتھوں توصیفی سند دی گئی جس میں ان کی وفاداری اور عملی تعاون کا ذکر کیا گیا تھا اور انہیں صوبائی درباری کی نشست الاٹ کی گئی۔ 1891 میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ 1894 ء میں ان کی موت کے بعد ان کے بڑے بیٹے ملک طالب مہدی خان نے سول سروس سے اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ انہیں مستقل ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ ایک وقت میں وہ ممدوٹ سٹیٹ کے منیجر بھی مقرر ہوئے اور بہاولپور ریاست کے ریونیو ممبر بھی رہے۔ علاوہ ازیں صوبائی درباری بھی تھے۔ ان کے کئی چچا بھی انگریزوں کے وفادار رہے ہیں۔ ان میں عبداللہ خان نے اپنا عملی تعاون جاری رکھا۔ پنڈا خان جو کہ صوبائی درباری تھے، بنگال لانسر میں ملازم رہے۔ انہوں نے اپنے والد کی موت کے بعد ریٹائرمنٹ لے لی۔ ان کے خاندان کے دوسرے کئی افراد بھی فوج میں بھرتی ہوئے۔ ان میں ملک فضل مہدی خان اٹھارواں ٹوانہ لانسر، کریم اللہ خان جمعدار، حبیب اللہ خان صوبیدار، نجیب اللہ خان جمعدار اور رحیم اللہ خان صوبیدار کے عہدے پر کام کرتے رہے ہیں۔ ملک زمان مہدی کے بعد اس کی اولاد نے بھی انگریز کی اطاعت و وفاداری کو جزو ایمان بنائے رکھا جس کے صلہ میں ان کو فوجی عہدے، جاگیریں اور خطابات ملے کوہستان نمک میں اب بھی جنجوعے آباد ہیں جن کے پاس انگریز کی دی ہوئی زمینیں اور جاگیریں موجود ہیں۔ نواب زادہ مہدی خان نے بھی سیاسی حوالے سے عروج حاصل کیا۔ ان کے بیٹے افضال مہدی 1965 ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ افضال مہدی کے والد مہدی خان دارا پور جنجوعہ خاندان کے سردار تھے۔ نواب مہدی خان سرکاری ملازم تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ریاست بہاول پور میں 1934 ء سے 1940 ء تک وزیر اعلیٰ کے عہدے پر معمور رہے نوابزادہ افضال مہدی نے چیف کالج سے میٹرک پاس کیا نوابزادہ افضال مہدی کے والد ڈسٹرکٹ کونسل جہلم کے بانی صدر بھی تھے۔ 1949 ء میں جب افضال مہدی نے کالج سے تعلیم مکمل کی تو زمینوں کی دیکھ بھال میں لگ گئے وہ مسلم لیگ میں ترقی پسند گروپ کے حامی تھے نوابزادہ افضال مہدی کی موت سے ان کی چھوڑی ہوئی نشست سے ان کے کزن راجہ لہراسب خان قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ان کے خاندان کے راجہ خداداد خان 1951 ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے

بعد ازاں انہوں نے 1965 کے الیکشن میں کنونشن لیگی امیدوار میاں عبدالعزیز سے شکست کھائی 1970 ء میں راجہ خداداد نے پہلے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی جب پیپلز پارٹی نے ٹکٹ نہ دیا تو انہوں نے جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ کے لئے رجوع کیا جمعیت علماء پاکستان نے شیخ نذیر احمد کو ٹکٹ دیا تو راجہ صاحب نے 1970 ء میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے ناکامی حاصل کی۔

1970 ء میں نوابزدگان کے سرخیل راجہ لہراسب خان کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن ہار گئے۔ وہ 1959 ء سے لے کر ایوبی اقتدار کے خاتمے تک کنونشن مسلم لیگی رہے۔ 1965 ء کے صدارتی انتخابات میں راجہ لہراسب نے ایوب خان کو کامیاب کرانے کے لئے ضلع جہلم میں اہم کردار ادا کیا۔ جنوری 1970 ء میں جب سیاسی سرگرمیوں سے پابندیاں اٹھائی گئیں۔ تو راجہ لہراسب نے کونسل مسلم لیگ کا بہت بڑا جلسہ کیا اور کونسل مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ پوری انتخابی مہم میں ضلع جہلم میں کونسل لیگ کا پوری مہم کے دوران یہ اکلوتا جلسہ تھا جس میں میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات نے بھی شرکت کی تھی۔ کونسل مسلم لیگ سے راجہ صاحب کو جو توقعات تھیں، وہ پوری نہ ہو سکیں اور انہوں نے اس دوران پیپلز پارٹی سے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ راجہ صاحب کو ٹکٹ تو نہ مل سکا البتہ پیپلز پارٹی نے اس بات کو خوب اچھالا کہ جہلم کا ایک بہت بڑا جاگیردار ان سے ٹکٹ مانگنے آیا تھا۔ انہوں نے اس انتخابی مہم میں مختلف برادریوں کے موثر گروہوں کو زیر دام لا کر انتخابی مہم کو کامیاب کرنے کی کوشش کی۔ راجہ صاحب نے الیکشن جیتنے کے لئے صوبائی اسمبلی کی جہلم کی نشست نمبر ا سے گوجر برادری کے چوہدری غلام احمد کو ساتھ ملانے کی کوشش بھی کی، چوہدری غلام قادر نے راجہ لہراسب سے اتحاد سے پہلے ہی اسی خاندان کے راجہ خداداد سے اتحاد کر کے ان کی جیت کے امکانات کو ختم کر دیا۔ 1970 ء میں راجہ لہراسب نے ڈاکٹر غلام حسین سے شکست کھائی تھی۔ 1977 ء کے انتخابات میں اس خاندان کو شاندار کامیابیاں نہ ہو سکیں بلکہ یہ الیکشن خالصتاً نظریاتی بنیادوں پر لڑے گئے۔ 1985 ء میں راجہ افضال مہدی کے بیٹے راجہ اقبال مہدی نے کامیابی حاصل کی۔ اور حکومتی پارٹی یعنی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ نواز شریف نے انہیں صوبائی وزیر بنا لیا تھا۔ 1988 ء کے انتخابات میں نوابزادہ اقبال

مهدی کو جمہوری اتحاد کا ٹکٹ نہ مل سکا اور وہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن کے امیدوار بن گئے۔ ان کا مقابلہ آزاد امیدوار ڈاکٹر غلام حسین، پیپلز پارٹی کے راجہ ممتاز احمد خان اور اسلامی جمہوری اتحاد کے راجہ افسر سے تھا۔ اس حلقے سے راجہ افسر کو اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ مل گیا تھا لیکن انہیں سائیکل کا انتخابی نشان نہ مل سکا اور یہ نشست اسلامی جمہوری اتحاد اور اقبال مہدی کے درمیان متنازعہ رہی۔ نگران وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف نے جب جہلم کا دورہ کیا تو راجہ افضل نے اعلان کیا کہ اقبال مہدی اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار ہیں۔ راجہ افسر یہ شکایت لے کر صدر پاکستان مسلم لیگ محمد خان جونیجو کے پاس پہنچے۔ ان کی دعوت پر محمد خان جونیجو نے پنڈ دادن خان کا خصوصی دورہ کر کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ راجہ افسر کو ووٹ دیں۔ محمد خان جونیجو کی اس اپیل پر کسی نے توجہ نہ دی اور اقبال مہدی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ 1990ء میں راجہ اقبال مہدی نے اپنے سیاسی حریف ڈاکٹر غلام حسین کو شکست دی 1991ء کے بلدیاتی انتخابات میں ان کے حلقہ پنڈ دادن خان پر ان کے گروپ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ملک محمد اشرف گولا چیرمین اور اعجاز حسین وائس چیرمین اقبال مہدی گروپ سے کامیاب ہوئے۔ ضلع کی دھڑے بندی میں ان کے سیاسی حلیف راجہ خالد گروپ کو کامیابی ہوئی تھی۔ راجہ افضل بھی وارا پور فیملی کے رکن بھی ہیں۔ انہوں نے پرانے سیاستدان چوہدری الطاف کو بری طرح شکست دے کر کامیابی حاصل کی۔

راجہ محمد اکبر خان چب راجے

جہلم کی پہاڑیوں میں جو قدیم خاندان سیاسی اور مالی حوالے سے نمایاں رہے ہیں۔ ان میں چب راجے بھی شامل ہیں اور ہندو راجوں کی نسل سے ان کا سلسلہ نسب ملتا ہے۔ گجرات کے ضلع میں اکاون دیہاتوں کے مالک بھی راجے تھے۔ ان کی ایک شاخ کانگڑہ اور جموں میں آباد ہے۔ انہوں نے اسلام قبول نہ کیا اور یہ ابھی تک ہندو ہیں۔ اس خاندان کی حقیقت کچھ یوں ہے کہ اس کا بانی سردار چب چند تھا جس کے اپنے بھائی اودھے سے لڑائی ہو گئی تھی اور وہ ۱۳۰۰ء میں کانگڑہ چھوڑ کر گجرات میں بھمبر کے قریب آ کر آباد ہو گیا۔ اس نے اپنی لڑکی کی شادی ایک مقامی راجہ سری پت سے کر دی۔ وہ دولت کا حریص تھا اور اپنے خسر سے بہت جلتا تھا ایک دن اس نے اپنے خسر کو اپنے گھر بڑے کھانے پر بلایا اور اس کے پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ وہ راجہ کہلاتا تھا اور اس کی عملداری بھمبر کے پورے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی۔

جب بابر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو چب چند سلامی کے لئے اس کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنی جائیداد کی توثیق کرالی۔ اس کے بعد اس نے عافیت مسلمان ہونے میں ہی سمجھی۔ اس نے اپنا نام شاداب خان رکھ لیا۔ جب ہمایوں ہندوستان کا بادشاہ بنا تو شاداب خان ان کے ساتھ قدم قدم پر رہا اور مشکل سے مشکل مہمات میں بھی انہوں نے ہمایوں کا ساتھ دیا۔

چب راجے ایک زمانے میں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ کھاری، کریالی اور نوشہرہ کے قریب قریب آباد تھے۔ جب سکھ بر سراقتدار آئے تو انہوں نے گجرات کے گکھڑوں پر فتح پانے کے بعد چبوں پر حملہ کر دیا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد ایک سردار

گوجر سنگھ کے لڑکے صاحب سنگھ نے مان سنگھ شکر چاکیہ کے ساتھ مل کر منگلا پر حملہ کیا لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ جب سکھوں سے راجوں کی ان بن ہو گئی تو راجہ عمر خان نے سکھوں سے صلح کر لی۔ یہ صلح عارضی ثابت ہوئی۔ چب راجوں کی مشکوک سرگرمیوں کے بعد سکھوں نے وہ مراعات پھر واپس لے لیں جو صلح کے عوض انہیں لوٹائی گئی تھیں۔ البتہ سکھوں نے امیر خان کو ۴ ہزار روپیہ اور اس کے بھتیجے شیر جنگ خان کو تین ہزار پنشن دی۔ کھاری کریالی کی جاگیر کھڑک سنگھ کے پاس تھی۔ اس نے امیر خان کے چھوٹے بھائی فضل داد خان کو اپنے ہاں تین روپیہ دہاڑی پر ملازم رکھ لیا اور دس سال بعد دس سواروں کے عوض اسے ایک ہزار پچھتر روپے کا عطیہ دیا۔ جب کشمیر اور جموں مہاراجہ گلاب سنگھ کے حصہ میں آئے تو عطیہ کو جاگیر میں شامل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ فضل داد خان کے وارثوں کو مزید عطیئے اور جاگیریں عطا ہوئیں۔

چبوں کا ایک ممتاز سردار راجہ سلطان خان تھا۔ اس نے جنگ آزادی میں انگریزوں کی وفاداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی جس کے عوض انہیں انعامات اور جاگیریں ملیں۔ چبوں میں سے ہندو خاندان کی اولاد نے بھی انگریز سے عہدے مناصب اور جاگیرداریاں وصول کیں۔ مردان علی خان نے جنگ آزادی میں انگریزوں کو تین ہزار سوار دیئے تھے۔ اس کے علاوہ ابن سینا اور افغان جنگ میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ مردان علی خان کو خان بہادر کے علاوہ کھاریاں تحصیل کی بڑی جاگیر اور ذیلداری دی۔ انہیں چناب کالونی میں نو مربعے زمین بھی ملی۔ مردان علی خان کی وسیع جائیداد اس کے چھ بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ تاہم انہوں نے انگریز کی فوجی خدمات بجالا کر بہت کچھ پایا۔ ان کا تیسرا بیٹا سلطان عالم خان کسی زمانے میں وزیری کالج لاہور کا ہاؤس سرجن تھا۔

انگریز موزخوں کا بیان ہے کہ مسلمان چبوں کے برعکس ہندو چب انگریز کے لئے بہت زیادہ پریشانی کا باعث تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں وہ ڈاکہ اور راہزنی کے لئے بدنام تھے۔ وہ جموں کے قریب پہاڑیوں پر رہتے تھے اور جب موقع ملتا، پہاڑیوں سے نیچے اتر کر مار دھاڑ کرتے، وہ انگریزوں کی بستیوں میں بھی لوٹ مار مچاتے۔ آخر کار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انہیں ایسا سبق سکھایا کہ وہ مدتوں تک لوٹ مار کی سرگرمیوں سے غائب ہو گئے۔

چب راجپوتوں کی ایک اور شاخ کا مورث اعلیٰ راجہ سلطان خان تھا۔ اس نے ڈوگروں کی ایک فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حوالے کی اور اسے اکسایا کہ کشمیر پر قبضہ کرے۔ لیکن جب دھیان سنگھ اور گلاب سنگھ نے دیکھا کہ سلطان خان بے حد اثر ورسوخ کا مالک ہوتا جا رہا ہے تو انھوں نے اسے جموں بلایا اور وہاں نماز کی حالت میں اسے اپنے نوکروں سے قتل کرا دیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو یہ اطلاع ملی تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے سلطان خان کے بیٹے فیض طالب کو لاکھوں کی جاگیر اور سرداری بخش دی۔ راجہ رنجیت کے بعد راجہ گلاب نے انھیں سکھوں سے ملنے والی لاکھوں کی مراعات کم کر دی۔ ۱۸۱۷ء میں سر ہنری لارنس نے سکھوں سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ جو پہاڑی سردار انگریز راج کے تحت رہنا چاہیں، ان کو ۳۲,۸۰۰ روپے کی دائمی پنشن دی جائے گی۔ اس کے علاوہ سوجان پور (پٹھان کوٹ) اور دریائے بیاس اور چکی کے درمیان کا علاقہ انگریز کے حوالے کر دیا جائے۔ راجہ فیض طالب انگریزوں کا انتہائی وفادار ساتھی تھا۔ جس کو ہنری لارنس "ببھبروالا" کہتے تھے اور وہ دس ہزار پنشن کے حق دار بھی ہوئے۔ ان کے پوتے راجہ علی بہادر خان نے خاندانی روایات پر چلتے ہوئے انگریزوں سے عہد پیمان باندھا یہ صوبائی درباری اور راولپنڈی میں ایکسٹرا اکمشنر کے عہدے پر تعینات تھے۔ ان کے بیٹے راجہ محمد اکبر خان نائب تحصیل دار تھے۔ راجہ اکبر کے پاپا غلام قادر خان ایک دلیر سپاہی تھے۔ ۱۸۴۹ء میں سکھوں کے خلاف جب انگریزوں نے ملتان پر چڑھائی کی تو وہ انگریزوں کے وفادار ساتھی کی طرح ساتھ ساتھ تھے۔ انھیں انھی خدمات کے صلہ میں ۶۰۰ روپے سالانہ پنشن ملتی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد اس خاندان کے سرکردہ افراد ضلع جہلم میں صوبائی اور قومی سیاست میں نمایاں ہوتے رہے ہیں۔ ان کی سیاسی وفاداریاں قیام پاکستان کے بعد ہر حکمران جماعت سے وابستہ رہی ہیں۔

راجہ غلام صفدر گکھڑ آف راولپنڈی

سلطان مقرب خان

- شاداں خان
  - کمال خان — 1898ء میں فوت ہوئے
    - محمد یوسف خان
      - عبدالحمید
    - غلام سرور خان
      - کرم اللہ خان
      - عبداللہ خان
        - ثریا اختر
    - اللہ داد خان
  - نور علی خان
  - راجہ حیات اللہ خان — 1865ء میں فوت ہوئے
    - خان بہادر راجہ کرم داد خان — 1933ء میں فوت ہوئے
      - راجہ محمد اکبر خان — 1901ء میں پیدا ہوئے
        - مسعود اکبر خان
        - محمود اختر — 1928ء میں پیدا ہوئے
        - نعیمہ اختر
      - کرم علی خان
      - رسالدار سلطان علی خان — 1924ء میں فوت ہوئے
        - غلام صادق — 1900ء میں پیدا ہوئے
        - راجہ غلام صفدر
          - سلطان جان — 1924ء میں پیدا ہوئے
          - سلطان اصغر — 1932ء میں پیدا ہوئے
- منصور علی خان
  - چار بیٹے
- بہادر علی خان
  - ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی
- سعد اللہ خان
  - ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی

راجہ غلام صفدر گکھڑ آف راولپنڈی

تاریخ پاک وہند میں جس قبیلے کا سب سے زیادہ ذکر آتا ہے. وہ گکھڑ قبیلہ ہے جو کئی سو سالوں تک ملک کے مختلف حصوں میں لڑتے، جھگڑتے اور مرتے رہے۔ میدانی اور پہاڑی علاقوں میں بھی ان کا سکہ چلتا تھا۔ ان کی جنگجوانہ طبیعت انہیں سکون سے نہ رہنے دیتی۔ جہلم، راولپنڈی اور میانوالی کے علاقوں میں جتنی بے چینی اور بدامنی انہوں نے پھیلائی، کسی اور نے نہیں پھیلائی۔ یہ اعوانوں، گکھڑوں، جنجوعوں اور کھوکھروں سے لڑتے جھگڑتے رہے۔ کبھی ان کی جیت ہوتی، کبھی ہار اس طرح انہوں نے راولپنڈی کے بہت بڑے علاقے پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا جس کی وجہ سے قبیلے کا باہمی اتحاد و اتفاق تھا۔ جنگجوانہ طبیعت کے ہاتھوں یہ آپس میں لڑتے مرتے رہے لیکن یہ اپنے مشترکہ دشمن کے مقابلے میں کندھے سے کندھا ملا کر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے نظر آتے تھے۔

گکھڑوں کی اپنی تاریخ کے مطابق وہ ایرانی نسل ہیں۔ وہ سلطان کیدو کی اولاد میں سے ہیں۔ جس نے تبت فتح کیا تھا۔ ان کی سات پشتیں تبت پر حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ جب سلطان کاب گدی نشین ہوا تو انہوں نے اپنی تعلق داری میں اضافہ کرتے ہوئے کشمیر کے علاقے کو بھی ہتھیا لیا۔ جہاں اس قبیلے کی تیرہ پشتیں حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ کشمیریوں نے ان کے مظالم سے تنگ آکر بغاوت کر دی اور رستم نامی بادشاہ کو قتل کر دیا تو اس کا بیٹا بھاگ کر کابل میں سلطان ناصرالدین سبکتگین کے پاس چلا گیا۔ یہ تو تھا گکھڑوں کا موقف. البتہ کہا جاتا ہے۔ کہ گکھڑوں نے کشمیر کو کبھی بھی فتح نہیں کیا۔ وہ ۳۰۰ء میں خراسان سے آکر پنجاب میں آباد ہوئے تھے۔ انکے ایک سردار نے راجہ رسالو کی بیٹی سے شادی کر لی۔ بعض مورخ اس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ جنجوعوں کی طرح

گکھڑ بھی پنجاب کے قدیم باشندوں میں سے ہیں۔ ان کے بغیر پنجاب کی سیاسی اور عسکری تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق گکھڑ ساتویں صدی سے پنجاب میں قیام پذیر ہیں۔ انہوں نے افغانوں سے معاہدہ کر کے لاہور کے راجہ کا مقابلہ کیا۔ گکھڑوں کی اپنی تاریخ کے مطابق سبکتگین نے کابل خان کو ملازم رکھ لیا۔ اس کے دوسرے بیٹے کا نام شاہ تھا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ پنجاب میں آئے اور یہاں آکر اس نے اپنے نام پر ایک قبیلہ کی داغ بیل ڈالی۔ رفتہ رفتہ اس نے جہلم اور سندھ کے وسطی علاقہ بھی فتح کر لئے جسے پوٹھوہار کا نام دیا۔ یہاں گکھڑوں نے اپنا کلچر متعارف کرایا۔ اس علاقے کی روایات اور رسم و رواج دوسرے علاقوں سے مختلف ہیں۔

گکھڑ شاہ کے بھتیجے راجر خان نے ڈنگلی نام کا ایک گاؤں آباد کیا۔ کہتے ہیں وہاں ڈان نامی ایک جن رہتا تھا۔ جو ارد گرد کے علاقے کے لئے وبال جان بنا ہوا تھا۔ راجر خان نے اسے ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس غرض کے لئے اس نے ایک پیر کی خدمات مستعار لیں۔ پیر نے جن کو غار کے منہ کو اچھی طرح بند کر کے آگ لگا دی لیکن جن ایک سوراخ سے نکل کر غائب ہو گیا۔ اس جن کے نام پر یہ گاؤں ڈان گلی آباد ہے۔

راجر خان کے بعد صفر خان، بعد ازاں تنگ خان اس قبیلے کا سردار بنا۔ اس نے خدائی خان سے مل کر سلطان محمود غزنوی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جس نے اپنے جرنیل قطب الدین ایبک کو گکھڑ ، کی رکوبی کے لئے بھیجا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب گکھڑوں نے اس علاقے میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور کسی کی جان و مال اس قبیلے کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ اس دور میں تنگ خاں اس قبیلے کا سردار تھا۔ ان کی موت کے بعد لوہار خان گکھڑوں کا سردار بنا۔ ان کے زمانے میں ناصرالدین محمود نے پوٹھوہار پر حملہ کیا اور کئی ہزار گکھڑوں کو غلام بنا کر ساتھ لے گیا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ۱۲۴۱ء میں مغلوں کی مدد کی تھی۔ لوہار خان کے بھتیجے نے روہتاس میں اپنا ایک علیحدہ قلعہ تعمیر کیا۔ اس خاندان کے افراد اب بھی ڈومیلی میں آباد ہیں۔

جب تیمور نے حملہ کیا تو گکھڑوں کا سردار گل محمد تھا۔ اس کی اولاد جسرت خان نے کشمیر پر حملہ کیا اور علی شاہ کو پکڑ کر قید کر لیا۔ اس کے بعد اس نے جالندھر پر قبضہ کیا اور دہلی کی طرف پیش قدمی کی۔ ابھی وہ لدھیانہ پہنچا ہی تھا کہ انہیں شاہی فوجوں کی مزاحمت کا سامنا

کرنا پڑا۔ وہ راولپنڈی چلا آیا۔ یہاں سے اس نے یکے بعد دیگرے لاہور اور جموں پر حملے کیے۔ اس نے جموں کے راجہ رائے بھیم کو شکست دے کر مار ڈالا۔ جب بابر نے حملہ کیا تو گھکھڑوں کا سردار ہتی مان تھا۔ مشکل سے گھکھڑوں کے گڑھ پہاڑ والا پر قبضہ کر لیا گیا لیکن ایک راستہ سے بابر کی فوجیں داخل ہوئیں تو دوسرے سے ہتی مان بھاگ نکلا، تاہم اس کے بھائی سارنگ خان نے بابر کی اطاعت قبول کر لی۔ تزک بابری میں بھی گھکھڑوں کا ذکر آتا ہے۔ اس نے جنجوعوں پر چڑھائی کر کے ان کا بے دریغ خون بہایا تھا جس کے نتیجہ میں پوٹھوہار کا علاقہ بدستور ان کے پاس رہنے دیا گیا۔

۱۵۴۱ء میں شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالنے کے بعد روہتاس کا مشہور قلعہ بنایا جہاں اس نے جرنل خواص خان کو پہرہ پر بٹھا دیا تاکہ ہمایوں دوبارہ نہ آ سکے لیکن گھکھڑوں کے سردار سارنگ خان کو بابر کا احسان ابھی تک یاد تھا وہ روہتاس پر حملے کر کے شیر شاہ سوری کی فوجوں کو گاہے بگاہے ہراساں کرتا رہتا تھا۔ شیر شاہ کے بعد اس کے بیٹے سلیم شاہ نے گھکھڑوں کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ سارنگ خان نے مجبور ہو کر پناہ مانگی لیکن سلیم شاہ نے اس کے بیٹے کو زنجیروں سے جکڑ کر قید خانے بھجوا دیا۔ ۱۵۵۰ء میں ہمایوں کے بھائی کامران نے گھکھڑوں کے پاس آ کر پناہ لی۔ پہلی مرتبہ تو گھکھڑوں نے اس کی آؤ بھگت کی لیکن دوسری مرتبہ جب وہ سلیم شاہ کے سلوک سے نالاں ہو کر پھر آیا تو سارنگ کے بھائی آدم خان نے قبیلہ کی روایت کے خلاف اسے پکڑ کر ہمایوں کے حوالے کر دیا۔ ہمایوں نے اس کی آنکھیں نکال دیں اور اس کے بعد خود ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ جب وہ فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہو رہا تھا تو اس کے ساتھ گھکھڑوں کا سردار بھی تھا۔ اسے غداری کا صلہ مل گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کے زمانہ تک چناب سے سندھ کے وسیع علاقے تک گھکھڑ قابض ہو چکے تھے۔ ان کی طاقت سکھ سرداروں نے آ کر توڑی۔ ان کا ایک ایک علاقہ چھین لیا گیا اور ان کے افراد کو در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ ایک گھکھڑ راجہ حیات اللہ خان کو جب کیپٹن ایبٹ نے سکھوں کی قید سے آزاد کرایا تو وہ ان کا وفادار بن گیا۔ مغل شہنشاہ کے زمانے میں جب گھکھڑوں کی سرزمین میدان جنگ بن گئی تو ان قبائلی لڑائیوں کے خاتمے کے لئے مغل بادشاہ نے یہ زمین متحارب خاندانوں میں تقسیم کر کے لڑائیوں کو ختم

کر دیا تھا۔ جلال خان کو اس بندر بانٹ میں ۴۵۴ گاؤں ملے اور مبارک خان جو کہ کمال خان پھیر والا کا بیٹا تھا اسے ۳۳۳ گاؤں ملے۔ اور اکبر آباد کے علاقے میں ۲۴۲ گاؤں ملے۔ اس طرح یہ خاندان طاقت کے بل بوتے پر حکمرانوں کو بلیک میل کرتا رہا اور اپنی سیاسی اور معاشی قوت میں اضافہ کرتا رہا۔ مبارک خان کی موت کے بعد اس کا بیٹا اس کا صحیح جانشین ثابت نہ ہو سکا بلکہ وہ بہت جلد فوت ہو گیا۔ شادمان خان قبیلے کا سربراہ بنا تو انہوں نے کوہاٹ، بنوں اور یوسف زئی کے علاقے میں مغلوں کے دشمنوں کو عبرتناک سزائیں دیں۔ ان کی موت کے بعد ان کا پوتا اللہ داد خان قبیلے کا سربراہ بنا لیکن وہ اتنی اہلیت کا مالک نہ تھا البتہ اس کی بیوی انتہائی ہوشیار تھی اور وہ اپنے خاوند کا سارا انتظام چلاتی تھی۔ یہ خاندان آپس میں لڑتا جھگڑتا رہا۔ جب ان کے جھگڑے بہت زیادہ بڑھ گئے تو سردار گجر سنگھ نے ان کی تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا اور ان کے پاس صرف پھیر والا کا گاؤں رہنے دیا۔ سعد اللہ خان اور نادر اللہ خاں کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ خاندانی جاگیر شادمان خان اور منصور خان کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ ۱۸۱۸ء میں سردار انند سنگھ نے ایک بار پھر ان کی تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا اور یہ انتہائی غربت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ سکھوں کے دور تک اس خاندان کی کوئی تاریخ ریکارڈ پر موجود نہیں۔ راجہ حیات اللہ خان کے ساتھ ہی اسی خاندان کو ایک بار پھر ابھرنے کا موقع ملا۔ اس نے سکھوں کے ہاتھوں بڑی اذیت اٹھائی اور بارہ سال تک قید کی کوٹھری میں پڑا رہا۔ ۱۸۴۷ء میں جب کیپٹن ایبٹ نے سکھوں کے خلاف ایکشن لیا تو انہیں رہائی نصیب ہوئی۔ اس احسان کے صلہ میں اس نے سکھوں کے خلاف انتقامی جذبہ سے سرشار ہو کر بھرپور کارروائیاں کیں اور اس نے ہزارہ اور ملتان کی مہمات میں باغیوں کی سرکوبی کے لئے ظلم کی انتہا کر دی۔ اور خاص طور پر ۱۸۵۷ء میں جب مری پر سکھوں نے حملہ کیا اور بغاوت کر کے اس علاقے کے امن کو تباہ کر دیا تو راجہ حیات اللہ نے بغاوت کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان خدمات کے صلہ میں سکھوں نے جو جائیداد ان سے چھینی تھی، بحال کر دی گئی بلکہ بارہ سو روپیہ سالانہ گرانٹ بھی دی گئی۔ ۱۸۶۴ء میں جب وائسرائے کا دربار سجایا گیا تو انہیں گھکھڑ خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے پروٹوکول دیا گیا۔ ۱۸۶۵ء میں وہ فوت ہو گئے۔

باپ کی موت کے بعد راجہ کرم داد خاندان کے سربراہ بنے اور باپ کے نقش قدم

پر چلتے ہوئے انہوں نے انگریزوں سے وفاداری کی۔ یہ گھکھڑ خاندان کی چیف برانچ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس خاندان کا دعویٰ ہے کہ اس علاقے میں صرف یہی "راجہ" گھکھڑ ہیں۔ راجہ کرم داد کی عمر اس وقت صرف آٹھ سال تھی جب اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں وہ فوج میں جمعدار کی حیثیت سے بھرتی ہوئے اور جلد ہی صوبیدار بن گئے۔ ۱۸۸۱ء میں اس نے فوج سے استعفیٰ دے دیا اور وہ پھر والد کے قلعہ میں رہائش پذیر تھا جہاں اسکے خاندان کی پرانی نشانیاں موجود تھیں۔ وہ راولپنڈی کے دورے صوبائی درباری تھے اور انہیں کہوٹہ تحصیل میں سول جج کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ یہ سب رجسٹرار بھی تھے انہیں ۸۰۰ روپے سالانہ گرانٹ ملتی تھی اور انہیں بہت بڑی زمین جہلم کیمبل میں دی گئی۔ ان کا بیٹا سلطان علی بھی فوج میں تھا۔ اس خاندان کو تحصیل کہوٹہ میں ۳۴ دیہات کی تعلق داری بھی حاصل تھی جس کے عوض یہ ۱۵۰۰ روپے سالانہ حکومت کو جمع کراتے تھے۔ بعدازاں یہ تمام سہولتیں جو ان کے خاندان کو انگریزوں نے دے رکھی تھیں، کرم داد کو مل گئیں۔ راجہ کرم داد اس خاندان کے انتہائی ذہین شخص تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے بیٹے راجہ حسن اختر نے جو ایک بیوروکریٹ تھے، خاندان کا نام نمایاں کیا۔ یہ خاندان سیاست میں ابھرنے کی کوشش کرتا رہا ہے لیکن قومی اور صوبائی سطح پر اس خاندان کو کوئی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

راولپنڈی کے الیپال

فتح جنگ کا جنوبی حصہ الیپال کے قبضہ میں ہے۔ اس خاندان کا تعلق راجپوتوں سے ہے۔ یہ بھی چودھویں صدی میں دوسرے راجپوتوں کے ساتھ آ کر اس علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ یہ مستقل رہائش کی غرض سے گھومتے رہے۔ بالآخر خوشاب اور فتح جنگ کے علاقے میں آ کر آباد ہو گئے۔ 1901 ء کے ریکارڈ کے مطابق الیپال قبیلے کا تعلق منج راجپوتوں سے بھی ملتا ہے۔ یہ بہادر، قانون شکن، جرائم کی طرف راغب تھے البتہ ان کی بہت بڑی تعداد کھیتی باڑی بھی کرتی تھی اور یہ زراعت کے ماہر بھی تصور کیے جاتے ہیں۔

الیپال خاندان چکری کے چوہدری ہیں اور اس خاندان کو چوہدری شیر خان سے عروج حاصل ہوا۔ انہوں نے انگریزوں سے انتہائی وفاداری کا مظاہرہ کیا اور دولت سے مالا مال ہو گئے۔

1849 ء میں انہوں نے سکھوں کے خلاف انگریزوں سے مکمل تعاون کیا۔ اور سکھوں کے خلاف نکلسن کے ساتھ ساتھ رہے۔ شیر خان چوہدری جب سندھ دوآب ساگر کی مہم سے واپس لوٹے تو ان کے حوالے انگریزوں نے کئی اہم ذمہ داریاں سونپی اور خاص طور پر راولپنڈی کے علاقے میں گکھڑوں نے انگریزوں کا جینا اجیرن کر دیا تھا۔ انگریزوں کے دوسرے وفادار جاگیردار، ان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے گھبراتے تھے جب شیر محمد چوہدری کے ذمہ نادر خاں گکھڑ کی بغاوت کو کچلنے کی ذمہ داری سونپی تو انہوں نے کوئی پروا کئے اور بہانہ لگائے بغیر اس ذمہ داری کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس مہم میں کامیابی حاصل کی۔ انہیں اس مہم کے صلہ میں 250 ء روپے سالانہ ملنے لگے اور انہیں لگان معاف کر دیا گیا جس کی قیمت اس وقت 492 ء روپے تھی۔ 1857 ء میں ایک بار پھر چوہدری شیر خان نے وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے وقتاً

فوقتاً ایسی اطلاعات انگریزوں کو فراہم کرتے رہے جو باغیوں کو کچلنے میں اہم کردار ادا کرتیں اور انہوں نے حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے ایک دستہ بھی ترتیب دیا تھا جس نے مری کے علاقے میں بغاوت کو کچل دیا اور انہوں نے جلد ہی اس علاقے میں امن قائم کر دیا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو ملنے والی رقم 429 ء سے بڑھا کر 750 ء کر دی اور 500 ء روپے کی جائیداد الاٹ کر دی انہوں نے 500 ء روپے کی خلعت بھی وصول کی۔ جب انگریزوں نے ملک پر اسلحہ پر مکمل پابندی عائد کر رکھی تھی تو چوہدری شیر علی خان کو اس شرط سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے 15 ء بندوقیں اور 15 ء ڈھالیں رکھنے کی اجازت خصوصی طور پر دے رکھی تھی۔ چوہدری شیر خان 1875 ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے احمد خان کو باپ کی جاگیر کا وارث قرار دیا گیا۔ وہ ایک خاموش طبع اور باکردار انسان تھے۔ ان کی ذاتی صفات کی وجہ سے علاقے کے لوگ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

انہیں دربار میں خصوصی نشست الاٹ کی گئی اور ذیلدار بنا دیا گیا۔ ان کی موت 1914 ء میں ہوئی۔ ان کے دو ہونہار بیٹے سلطان خان اور حیات خان نے باپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ دونوں نے صوبے دار کی نوکری سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ جنگ عظیم میں چوہدری سلطان خان نے انگریزوں کا بڑا ساتھ دیا اور انہیں بھرتی کے لئے اپنے علاقے سے آدمی مہیا کئے۔ چوہدری حیات خان نے خرابی صحت کی بنا پر فوج کی نوکری چھوڑ دی۔ ابھی جنگ جاری تھی۔ کہ چوہدری حیات نے جنگ میں جھونکنے کے لئے چھ سو سپاہی مہیا کئے۔

جنگ میں چوہدری حیات نے جس جوش و جذبے سے تعاون کیا تھا، انہیں اس کے عوض کئی تعریفی سندیں دی گئیں۔ انہوں نے 1918 ء میں فوج میں دوبارہ ملازمت اختیار کر لی اور وہ ترقی پاتے پاتے صوبے دار میجر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ شاہی خاندان کے ڈیوک نے جب انڈیا کا دورہ کیا تو یہ ان پانچ خوش نصیب افسروں میں شامل تھے جنہیں ڈیوک کے اعزاز میں دی جانے والی چائے پارٹی میں شمولیت کا اعزاز حاصل تھا۔ 1922 ء میں پرنس آف ویلز نے جب انڈیا کا دورہ کیا ان کا تعارف پرنس آف ویلز سے خصوصی طور پر کرایا گیا یہ کسی ہندوستانی کے لئے اعزاز سے کم نہ تھا۔ اس سے ہم اس خاندان کی انگریزوں سے وفاداری کا بآسانی تعین کر سکتے ہیں۔ انہیں اس موقع پر کئی میڈل دیئے گئے اور خاص طور پر وزیرستان فورس میڈل قابل ذکر ہے۔ 1929 ء میں انہیں آنریری مجسٹریٹ بنا

دیا گیا چوہدری سلطان خان سر شاہ نواز کے پروردہ تھے۔ چوہدری سلطان کے بڑے بیٹے چوہدری فتح خان نے فوج میں جمعدار کے عہدے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ 1933 ء میں انہیں انڈین ملٹری اکیڈمی میں کمیشن ملا۔ انگریزوں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں سات مربعے زمین الاٹ کی۔ چوہدری سلطان کے چھوٹے بیٹے تاج محمد نے بھی فوج سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی انگریزوں نے نوازنے کا سلسلہ جاری رکھا اور خاص طور پر غلام محمد نے مقامی انتظامیہ کا ساتھ دیا تھا اور اسی صلہ میں انہیں پانچ مربعے زمین الاٹ ہوئی۔ صوبے دار اورنگ زیب خان نے بھی انگریزوں سے وفاداری کا سلسلہ جاری رکھا۔

قیام پاکستان کے بعد اس خاندان نے سیاسی حوالے سے ابھرنے کی کوشش کی۔ بریگیڈیر چوہدری فتح خان نے مسلم لیگ کی سیاست میں حصہ لیا۔ ایوب خان نے جب کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تو یہ بھی اس میں شامل ہو گئے اور 1965 ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ بریگیڈیر فتح خان کے بعد ان کا ہونہار بیٹا چوہدری نثار علی 1977 ء میں سیاسی حوالے سے نمایاں ہوا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا جب تختہ الٹا گیا تو چوہدری نثار علی، ضیاء الحق کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے اور مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہو گئے۔ ان کا شمار نواز شریف کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے اور انہیں نواز شریف کے پانچ پیاروں میں سے ایک پیارے کی حیثیت حاصل ہے۔ 1985 ء کے غیر جماعتی انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جب مسلم لیگ میں میاں نواز شریف اور محمد خان جونیجو کے دوران مسلم لیگ کی قیادت کے مسئلہ پر شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ تو ان کا جھکاؤ میاں نواز شریف کی طرف تھا۔ پرانے مسلم لیگیوں اور نوجوان مسلم لیگیوں کو میاں نواز شریف کا ہم نوا بنانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ 1988 ء میں قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے کرنل حبیب کو شکست دی تھی جن کا شمار پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ 1990 ء کے انتخابات میں نثار علی خان قومی اور صوبائی اسمبلی کی دونوں نشستوں سے کامیاب ہو گئے۔ میاں نواز شریف کے وزیر اعظم بن جانے کے باعث کہا جا رہا تھا کہ اب چوہدری نثار علی ہی پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ اخبارات نے تو ان کے وزیر اعلیٰ کی خبر چھاپنے کی تیاریاں بھی کر لی تھیں۔ آخری لمحے پر

میاں نواز شریف نے غلام حیدر وائیں کو وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا اور چوہدری نثار علی کو وفاقی وزیر بنا دیا۔ ان کے ایک بھائی فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ چوہدری نثار علی میاں نواز شریف کی کابینہ میں صرف ایک وزیر ہیں لیکن انہیں وزیر اعظم کے خصوصی معاون کی حیثیت حاصل ہے ان کے اسلامی جمہوری اتحاد کی دیگر جماعتوں سے قریبی رابطے ہیں میاں نواز شریف اور ایم کیو ایم میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو ختم کرنے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا اور خاص طور پر مسلم لیگ اور اے این پی میں ابھرنے والے اختلافات کو ختم کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا پیر پگاڑا نے مئی 1992 ء میں جب عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا تو اس موقع پر مسلم لیگ پگاڑا گروپ کے قائدین نے قائد اعظم کی شان میں گستاخی کرنے والوں پر سخت الفاظ میں تنقید کی ساتھ ہی انہوں نے ایسے وزراء کی مذمت کی جو اے این پی کے قائدین سے معافی مانگنے گئے انہوں نے ان وزراء کو "معافی گروپ" کا نام دیا ان کا اشارہ چوہدری نثار علی کی طرف بھی تھا جنہیں نواز شریف کی حکومت میں خصوصی مقام حاصل ہے

اٹک کے گوندل

یہ کوئی زیادہ دور کی بات نہیں، تقریباً چار صدی پہلے کا ذکر ہے کہ مغل شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں کٹھڑ قبیلہ کے ایک فرد محمد صادق دہلی سے چھچھ آئے اور اٹک سے چھ میل دور انہوں نے فتو چک کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے پشاور کی شاہراہ پر گوندل اور کئی دوسرے شہر آباد کئے۔ ہمایوں نے انہیں جاگیر انعام میں دی۔ چاچھیوں میں محمد صادق بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور انہیں اسی قابلیت کی بنا پر قاضی بنا دیا گیا اور وہ اس عہدے پر برس ہا برس کام کرتے رہے۔ اس کے بعد گوندل خاندان گمنامی میں چلا گیا۔ ان کی تیسری نسل اپنے خاندان کی ماضی جیسی شان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ محمد حسین اور محمد جعفر خان نے اپنے خاندان کو ایک بار پھر سہارا دیا۔

سکھوں نے جب 1848ء میں اٹک پر قبضہ کیا تو اس خاندان کو بہت نقصان پہنچا اور ان کی جاگیروں کے تمام کاغذات ضائع کر دیئے۔ سکھوں سے خوفزدہ ہو کر اس خاندان کے سرکردہ افراد دریائے سندھ اور خٹک کے قرب و جوار میں روپوش ہو گئے۔

سکھوں نے غلام محمد کے گھر کو آگ لگا دی اور سامان لوٹ لیا البتہ سردار امیر سنگھ سندھن والیہ نے انہیں واپس بلا لیا اور دوبارہ آباد کیا اور ان کا خسارہ پورا کر دیا۔ راجہ رنجیت سنگھ کے اس خاندان سے اچھے تعلقات وابستہ ہو گئے اور انہوں نے اس خاندان کو یوسف زئی اور خٹک قبیلے سے دوستی قائم کرنے کے لئے وکیل مقرر کر دیا 1824ء تک یہ ذمہ داریاں یہ خاندان ادا کرتا رہا لیکن سکھوں کے دل سے اس خاندان کے خلاف کدورت ختم نہ ہوئی۔ انہوں نے غلام محمد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کی موت کے بعد ان کا بڑا بیٹا قاضی فضل احمد باپ کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ اپنے حسن سلوک سے پٹھانوں میں

بہت جلد شہرت اختیار کر گیا۔ یہ وہ دور تھا کہ انگریز اپنے قدم جما رہے تھے اور انہیں سب سے زیادہ مزاحمت پٹھانوں سے ہو سکتی تھی۔ انہوں نے قاضی فضل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا کیونکہ قاضی فضل احمد کے خاندان نے سکھوں سے بڑے چرکے کھائے اور انہوں نے انگریزوں سے وفاداری کا وعدہ کر لیا اور ہر موقع پر ان کا تعاون انگریزوں کے ساتھ ہوتا۔ 1848ء میں جب انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری بار جنگ شروع ہوئی تو گوندلوں نے نکلسن کے ساتھ مل کر بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس جنگ کے بعد انگریزوں نے ان پر انعامات کی بارش کر دی۔ انہیں گوندل اور جھٹیل گاؤں سے 600روپے اور 220روپے الگ خدمات کا معاوضہ ملتا تھا۔ انہیں 300روپے کی جاگیر بھی انعام میں دی گئی۔ سکھوں کے دور میں گوندل خاندان کو جتنی مشکلات کا سامنا تھا، انگریزوں کا دور ان کے لئے کسی مہربانی سے کم نہ تھا۔

1857ء کی جنگ میں حریت پسندوں کو کچلنے میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ انہیں اٹک کا قلعہ بھی مہیا کیا اور حریت پسندوں کو جس بے دردی سے قتل کیا گیا، ان کے خون سے تاج محل تعمیر کرنے والوں میں یہ خاندان بھی شامل تھا۔ جب آزادی کی تحریک چلی گئی تو انہیں 200روپے کی خلعت اور لمبی چوڑی جاگیریں دی گئیں۔ قاضی فضل احمد 1878ء میں فوت ہوئے تو ان کا بیٹا قاضی فتح خان باپ کا جانشین مقرر ہوا۔ انہوں نے اپنے باپ کی صوبائی اور درباری کی نشست بھی حاصل کر لی تھی اور انہیں پشاور ضلع میں جاگیر بھی انعام میں دی گئی۔ قاضی فتح خان 1912ء میں فوت ہوئے تو قاضی علی قادر ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ اس طرح قیام پاکستان تک یہ خاندان جاگیروں، معافیوں، خلعتوں اور عہدوں سے سرفراز ہوتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد گوندل مقامی سیاست میں نمایاں ہونے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اٹک کے جودھرے

اٹک کے جودھرے راجپوتوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اس علاقہ میں گھیبوں کے پڑوسی ہی نہیں رہے بلکہ انہوں نے آپس میں رشتہ داریاں بھی کی تھیں۔ دریائے سندھ کے کنارے یہ قبیلہ بارہ میل کے علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ قبیلہ جموں کشمیر میں قیام پذیر تھا اور وہاں سے نقل مکانی کر کے پنڈی گھیب کے علاقے میں رہائش پذیر ہوگیا۔ اس خاندان کو پہلی بار علیہ خان کی قیادت میں نمایاں ہونے کا موقع ملا۔ ٹالا، سوہان، سل اور تلہ گنگ کے علاقہ پر اس خاندان کا تسلط قائم ہوگیا۔ اور علیہ خان کی زندگی میں یہ علاقہ ان کے زیر نگر رہا۔ ان کی موت کے بعد ان کا بیٹا امانت خان جانشین مقرر ہوا۔ اس نے بھی اپنے باپ کا صحیح جانشین ثبوت دیتے ہوئے حکمرانی کی 1813ء میں اس علاقہ پر سکھوں نے قبضہ کر لیا اور امانت خان کا بیٹا نواب خان کوہاٹ فرار ہوگیا۔ البتہ ان کا بھائی غلام محمد سکھوں کا تابعدار بن گیا اور انہوں نے انہیں مراعات دیں۔ وہ 1827ء میں اٹک کے قریب ہونے والی لڑائی میں اتار سنگھ کی قیادت میں لڑتا رہا۔ اس لڑائی میں سکھوں نے مسلمانوں کا ناحق خون بہایا تھا اور سید احمد شہیدؒ کے مجاہدوں کو چن چن کر قتل کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد غلام محمد خان اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان کے بعد اللہ یار خان باپ کا جانشین منتخب ہوا۔ سکھوں نے اسے مالا مال کر دیا۔ انہوں نے 1848-49ء میں انگریزوں کا سکھوں کے خلاف بھرپور ساتھ دیا۔ ان کے پانچ گھوڑ سوار نکلسن، ٹیلر، اور ایڈورڈز کے درمیان رابطہ کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اس کے عوض انگریزوں نے انہیں مالی فائدے دیئے۔ ان کی موت کے وقت ان کے دونوں بیٹے کم سن تھے۔ اللہ یار کا بڑا بیٹا جوان ہوا تو وہ بھی انگریزوں کا پکا دوست بن گیا اور خاص طور پر 1857ء کی جنگ

آزادی میں علیہ خان نے حریت پسندوں کو کچلنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی انہیں 400روپے کی خلعت دی گئی۔ جس طرح اس دور میں سردار فتح خان آف کوٹ اور محمد خان آف کھٹھ کا اپنے علاقے پر اثر ورسوخ تھا، اسی طرح علیہ خان بھی اپنے علاقے کا بااثر زمیندار تھا۔ ان کی یہ حیثیت انگریزوں کو علاقے پر امن وامان برقرار رکھنے کے لئے بڑی مدد گار ثابت ہو سکتی تھی۔ انہیں بھی پنجاب کے بڑے بڑے جاگیرداروں کی طرح اسلحہ ایکٹ سے مستثنیٰ قرار دے رکھا تھا۔ ان کا شمار پنجاب کے بہت بڑے جاگیردار اور زمیندار میں ہوتا تھا۔ ان کی شادی سردار فتح آف کوٹ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس طرح گھیبے اور جودھرے رشتہ داری کی بندھن میں بندھ جانے کے بعد سیاسی حوالے سے مضبوط ہوگئے۔ 1896ء میں علیہ خان کی موت ہوئی۔ اس سے قبل انگریزوں نے اس خاندان پر انعامات کی اتنی بارش کی کہ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ قسمت کی دیوی نے ابھی تک صرف انہیں کے گھر کا راستہ دیکھا ہے۔ ان کا بڑا بیٹا غلام محمد خان باپ کی جاگیر کا وارث بنا۔ انہیں ذیلداری اور صوبائی درباری کی نشست بھی مل گئی اور انہیں بھی اسلحہ ایکٹ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ وہ 1912ء میں آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اور 1913ء تک اسی عہدے پر برقرار رہے۔ انہیں 1913ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور پانچ سال بعد انہیں نواب کا خطاب دیا گیا۔ جنگ عظیم میں انہوں نے انگریزوں سے وفاداری اور تعاون میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تو انہیں اس کے صلہ میں منٹگمری میں دس مربعے زمین دی گئی۔ خان بہادر نواب ملک غلام محمد خان کے بیٹے ملک اللہ یار خان کو آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ اللہ یار خان کے چھوٹے بھائی نواب ملک جنگ بہادر خان کو 250روپے کی جاگیر دی گئی۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی محمد زمرد خان کے تین بیٹے تھے۔ ملک محمد سرفراز خان ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، دوسرا ملک محمد امانت خان وہ ایگریکلچر یونیورسٹی میں پروفیسر رہے ہیں۔ اور ملک محمد اکبر خان فوج میں رہے ہیں۔ انہیں 1917ء میں خان صاحب کیپٹن محمد اکبر خان کے چار بیٹے تھے۔ 1857ء جنگ عظیم اور تحریک عدم تعاون میں اس خاندان کا رویہ انگریزوں کی طرف نمایاں رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ خاندان سیاسیات پاکستان میں دولت اور جاگیر کے بل بوتے پر نمایاں ہوتا رہا ہے۔ اور ضلع کی سیاست میں نمایاں کردار ادا کرتا رہا ہے۔

اٹک کے گھیبے

اٹک کے جاگیرداروں میں سیاست کے حوالے سے گھیبے بھی نمایاں رہے ہیں اس خاندان کی تاریخ برسوں پرانی ہے ان کا ذکر ٹوانوں اور سیالوں کے ساتھ آتا ہے اس قبیلے کے زیادہ تر افراد دریائے سندھ اور وادی سون سیکسر کے درمیان آباد ہیں یہ قبیلہ جنگجو تھا انہوں نے علاقے کے اعوانوں، گھکھڑوں اور جودھروں سے قبائلی لڑائیاں لڑیں، علاقے پر اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لئے انہوں نے احمد شاہ ابدالی کی ایک نہ چلنے دی البتہ یہ سکھوں کی مزاحمت کو برقرار نہ رکھ سکے اور ان کا سردار رائے جلال خان ان کا باجگزار بن گیا اس فرمانبرداری کے صلہ میں راجہ رنجیت سنگھ نے ان کو نہ صرف معافی دے دی بلکہ انہوں نے انہیں جاگیر بھی عنایت کر دی ۱۸۰۶ء میں راجہ رنجیت سنگھ نے جب سردار فتح سنگھ کو راولپنڈی کا گورنر بنا کر بھیجا تو رائے محمد خان کو کوٹ اور کھنڈا کے علاقے میں اپنا تسلط قائم رکھنے کی اجازت دے دی اور اس نے محمد خان کو ۵۰۰ مالیت کا گاؤں انعام میں دے دیا علاوہ ازیں انہیں ۱۰۷۵ روپے سالانہ گرانٹ بھی ملتی تھی سکھوں نے ان پر انعامات کی بارش جاری رکھی گھیبوں کے جانی دشمن پنڈ گھیب کے ملک بھی جب سکھوں کے وفادار بن گئے تو ملکوں کا تعاون گھیبوں کے لئے خطرے کی گھنٹی بنا گیا۔ دونوں میں اس حد تک دشمنی بڑھ گئی کہ گھیبے اور ملک ایک دوسرے کا خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ایک سال کے دوران دونوں قبیلے اس حد تک لڑائیوں میں الجھے رہے کہ انہوں نے سردار فتح سنگھ کلیان والہ کو کسی قسم کا لگان بھی ادا نہ کیا۔ ان کی اس غفلت پر دہلی دربار سے انہیں خصوصی ہدایت بھی جاری ہوئی تھی پنجاب چیف کے مطابق ۱۸۳۰ میں رائے محمد نے سید احمد شہیدؒ کے خلاف سکھوں کی بھرپور مدد کی۔ سید احمد شہیدؒ مسلمانوں کے بہت بڑے

روحانی رہنما تھے۔ انہوں نے اپنے لاکھوں ماننے والوں کے دلوں میں تصوف اور حق کی شمع روشن کی تھی۔ انہوں نے سکھوں کو مجبور کیا کہ وہ پشاور کے علاقے سے نکل جائیں اور بالاکوٹ کو انہوں نے اپنا دار الحکومت بنا رکھا تھا۔ سکھوں نے سید احمد شہیدؒ کی روحانی قوت کو توڑنے کے لئے حملہ کر دیا۔ اس آپریشن میں پرنس شیر سنگھ اور جنرل ونچورا خود شامل تھے۔ رائے محمد خان سید احمد شہیدؒ کے خلاف سکھوں کی فوج میں شامل تھے۔ اس خدمت میں انہیں ایک گاؤں انعام میں دیا گیا جس کی مالیت دو سو روپیہ تھی۔ جودھ سنگھ، دھنا سنگھ ملوائی، اتار سنگھ کیلیانوالہ اور پرنس نونہال سنگھ نے گھیبوں کے تعاون سے اٹک کے علاقے میں حکمرانی کی۔ جب سکھوں کا ستارۂ اقتدار غروب ہونے لگا اور لاہور گورنمنٹ کا ایک ایک علاقے سے تسلط ختم ہوتا گیا تو گھیبوں نے بھی اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیں۔ 1848ء میں وہ نکلسن اور ایبٹ کے ساتھ ساتھ رہے۔ انہوں نے سکھوں کے خلاف فیصلہ کن لڑائی میں پیادہ سپاہی اور نقل و حرکت کے لئے گھوڑے دیئے۔

1857ء کی تحریک آزادی میں اگر اپنے حریت پسندوں سے غداری نہ کرتے تو جنوب مشرقی ایشیاء پر مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔ فتح خان نے حریت پسندوں کی تحریک کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا جس کے صلہ میں انہیں سالانہ چھ سو روپے پنشن اور ایک ہزار کی خلعت ملی تھی۔ ان کی تمام جاگیریں واگزار کر دیں۔ 1860ء میں فتح خان کو جاگیردار مجسٹریٹ کا عہدہ نکال کر تعینات کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں دیوانی اور فوجداری اختیارات بھی دیئے گئے۔ اس کے علاوہ انہیں 1866ء میں کالا چٹا پہاڑوں میں تین ہزار ایکڑ چراگاہ کے طور پر دیئے گئے۔ 1888ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ خان بہادر فتح خان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ حکومت نے ان کے بھتیجے غلام محمد خان کو ان کی جائیداد کا وارث تسلیم کر لیا۔ غلام محمد خان کے والد احمد خان 1843ء میں مارے گئے تھے۔ گھیبے خاندان کے وارث کو 5,220 کی جاگیر ملی۔ 1411 روپے کی لائف جاگیر اور 3800 روپے کی وراثتی جائیداد ملی۔ جب تک انگریز بر سر اقتدار رہے، ان سے گھیبوں کا تعاون کسی نہ کسی صورت موجود رہا۔ سردار فتح خان 16 دیہاتوں کے مالک تھے۔ وہ راولپنڈی کے بہت بڑے جاگیرداروں میں شامل ہوتے تھے۔ انہیں حکومت نے اسلحہ ایکٹ سے مستثنیٰ قرار دے رکھا تھا۔ ذاتی حوالے سے یہ ایک باکردار آدمی تھے۔ انہوں نے

اپنے اثر و رسوخ کا ووٹ ہمیشہ حکومت کی طرف داری میں ہی استعمال کیا۔ خان بہادر فتح علی خان کی وفات 1894ء میں ہوئی تو غلام محمد خان ان کے صحیح جانشین ثابت ہوئے لیکن فتح خان کی موت کے 9 سال بعد وہ وفات پا گئے۔ اس کا بیٹا محمد نواز خان باپ کا صحیح صحیح جانشین بنا۔ باپ کی موت کے وقت سردار شاہنواز خان کی عمر بہت کم تھی اور ان کی جاگیر کوٹ آف وارڈ میں چلی گئی۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم ایچی سن کالج اور دیگر اعلیٰ اداروں سے حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان مسلم لیگ میں شامل ہو گیا تو سردار محمد نواز خان کو نواب ممدوٹ کی وزارت میں نائب وزیر دفاع مقرر کیا گیا۔ سردار محمد نواز خان گھیبہ قبیلہ کے ایک مشہور سردار رائے جلال کے بھائی رائے سرفراز کی اولاد میں سے تھے انہوں نے ملٹری اکیڈمی سے تعلیم حاصل کی اور زمینداروں کے حلقے کی طرف سے مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔ سردار نواز جاگیردار ہی نہیں بلکہ وہ بہت بڑے جاگیردار تھے۔ 1933ء میں انہیں آنریری میجر کا عہدہ ملا۔ وہ پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی رہے اپنے سیاسی عقائد کے اعتبار سے وہ پکے یونینسٹ سمجھے جاتے رہے۔ بعد ازاں وہ مسلم لیگ میں آ گئے۔ انہوں نے اسمبلی کی بحثوں میں بہت کم حصہ لیا اور ان کی حیثیت محض ناظر کی رہی۔ کردار کے حوالے سے وہ ایک مضبوط آدمی تھے۔ انہوں نے پیر آف گولڑہ کی نماز جنازہ پڑھائی تھی کیونکہ پیر صاحب نے اعلان کر رکھا تھا کہ میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے زندگی میں کبھی زنا نہ کیا ہو۔ انہوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ ان کی نواب آف کالاباغ سے قریبی رشتہ داری بھی تھی۔ کیونکہ یہ ملک امیر محمد خان کے فرسٹ کزن تھے ان کے نواسے ملک عطا محمد ایم پی اے ہیں۔ انہیں گھوڑ سواری کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ قیام پاکستان کے بعد گھیبہ خاندان کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔

اٹک کے کھٹڑ

اٹک کے علاقہ میں جو بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار آباد ہیں، ان میں کھٹڑ قبیلے کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ اٹک اور فتح جنگ کی تحصیلوں میں کالا چٹا پہاڑ کے ساتھ ساتھ یہ قبیلہ اپنا اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ عبداللہ خان تھے۔ اہل قبیلہ کا دعویٰ ہے کہ وہ خراسان سے آئے ہیں اور ان کا شجرہ نسب قطب الدین ایبک سے جاملتا ہے۔ ان کا مقبرہ انار کلی بازار کے پہلو میں واقع ہے جو گھوڑے سے گر کر وفات پاگئے تھے۔ وہ شہاب الدین غوری کے وائسرائے تھے اس کے بعد خاندان غلاماں کے بانی بن کر اسلامی ہند پر حکمران ہوئے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو چوہانوں نے ان کی امداد کی۔ اس قبیلہ کی ایک شاخ کا سردار کھٹڑ خان تھا۔ وہ محمد غوری کے پاس ملازم ہوگیا۔ جب محمد غوری نے پنجاب پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو کھٹڑ خان بیوپاری کے لباس میں یہاں آیا اور اچانک نیلاب کے قلعہ کو فتح کرنے میں کامیاب رہا۔ نیلاب اس زمانے میں دریائے سندھ پر اٹک کے نیچے ایک بارونق شہر تھا۔ اس واقعہ کے بعد کھٹڑ خان کے تمام ساتھیوں نے اپنے قبیلے کا نام کھٹڑ رکھ لیا۔ وہ اٹک کے گورنر جنگ خان کے ماتحت تھا۔ کھٹڑ کے چھ بیٹے تھے جو تین پشتوں تک راولپنڈی سے دریائے سندھ تک تمام اراضی پر قابض رہے۔ گکھڑوں اور اعوانوں کی طرح انہوں نے بھی سکھوں کا مقابلہ کیا۔ انگریزوں کے زمانہ میں ان کی زمینداری پختہ ہوگئی۔

ان کے سیاسی عروج کا دور کرم خان حیات سے شروع ہوتا ہے۔ کرم حیات خان ایک بہادر سپاہی تھے انہوں نے نکلسن کی ملازمت کے دوران انگریزوں کے لئے پیادہ اور گھوڑ سوار سپاہی بھرتی کئے۔ سکھوں کو انگریزوں سے شدید نفرت تھی۔ کریم حیات خان کو

انگریزی فوج میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ سکھوں نے پنجاب میں اودھم مچائے رکھا۔ جنگجو سکھوں نے اتار سنگھ کی قیادت میں اناری والہ کے مقام پر ان کے گھر پر حملہ کر کے ان کا گھر جلا دیا، کرم حیات خان اپنے ہی بھائی فتح خان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد ان کا بیٹا محمد حیات خان قبیلے کا سردار بنا انہوں نے بھی انگریز فوج سے وفاداری قائم رکھی۔ اور انگریزوں کو بھرتی کے لئے سپاہی بھی دیئے اور ان کی اس وقت تک مدد کی جب تک سکھوں کی طرف سے برپا کی گئی شورش کو مکمل طور پر کچل نہیں دیا گیا۔ 1857ء میں نکلسن پشاور کا ڈپٹی کمشنر تھا اور فسادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیونکہ حریت پسندوں نے برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک انگریزوں کو ناک چنے چبا رکھے تھے۔

انگریزوں نے حیات خان کو حکم دیا کہ وہ آفریدیوں کو ملازمتیں دے کر ان کا ایک دستہ تیار کرے۔ محمد حیات خان کو جب لوگوں کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھنے کے لئے دستہ کی کمان دی گئی تو محمد حیات خان اس جنرل کے ساتھ ساتھ رہے انہوں نے حریت پسندوں کو خوفناک سزائیں دیں۔ انہوں نے جب دہلی کی طرف مارچ کیا تو وہ ہر چیز کو فتح کرتے چلے گئے، شہر کے محاصرے کے دوران حیات خان شدید زخمی ہو گئے، یہاں تک کہ ان کی زندگی کی امید بہت کم رہ گئی تھی۔ جب آپ ٹھیک ہو گئے تو پھر اپنی خدمات انگریز سرکار کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک انگریزوں کی وفاداری کو نبھایا۔

ان خدمات کے صلہ میں انہیں 250 روپے سالانہ پنشن اور انگریز سرکار کی طرف سے جو مراعات ان کے والد کرم حیات خان کو ملتی تھیں، وہ بھی ان کو ملنے لگیں۔ ان کو ملنے والی پنشن میں بھی اضافہ کر کے تین سو ساٹھ روپے سالانہ کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں انہیں خلعت بھی دی گئی۔ دہلی کو فتح کرنے کے بعد محمد حیات خان واپس پشاور آئے تو انہیں تھانے دار بنا دیا گیا، تھوڑے ہی عرصہ بعد انہیں ٹرانسفر کر کے جہلم بھیج دیا گیا جہاں انہیں تلہ گنگ کا تحصیل دار بنا دیا گیا۔ مئی 1861ء میں انہیں ترقی دے کر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا اور انہیں شاہ پور میں تعینات کر دیا گیا۔ بعد ازاں وہ بنوں ٹرانسفر ہو گئے جہاں محمد خیل کے وزیری قبیلہ نے بغاوت کر دی تھی۔ ان کی خدمات بنوں ضلعی انتظامیہ کے حوالے کی گئی تو انہوں نے بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے اس قبیلے کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا، ان کی گراں قدر خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

1872ء میں انہیں اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ بعد ازاں انہیں۔ “Companion of the order of the star of India” کے اعزاز سے نوازا گیا۔ انہیں پولیٹیکل آفیسر بنا کر کرم فیلڈ فورس کے ساتھ تعینات کر دیا گیا۔ جہاں وہ 79-1878ء تک تعینات رہے اور اسی عہدے میں ان کی خدمات کابل فیلڈ فورس سے منسلک کر دی گئیں جہاں وہ 1879ء سے 1880ء تک تعینات رہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے انہیں ڈویژنل جج بنا دیا گیا۔ 1899ء میں انہیں نواب کے خطاب سے نوازا گیا۔ 1901ء میں ان کی موت کے بعد محمد اسلم حیات خان قبیلے کے سردار بنے تو انہوں نے اپنی خدمات پنجاب سول سروس میں سرانجام دیں اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

سردار محمد اسلم حیات خان 1924ء کو فوت ہوئے تو ان کے بیٹے کیپٹن مسعود حیات خان قبیلے کے سربراہ مقرر ہوئے، انہوں نے 1918ء میں فوج میں ملازمت اختیار کی۔ یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ انہوں نے خیبر ایجنسی میں 1902ء تک خدمات سرانجام دیں۔ اس کے ایک سال بعد 1921ء تک عراق میں عسکری ڈیوٹی کے سلسلہ میں تعینات رہے، بعد ازاں وہ شمال سرحدی صوبہ میں 25-1923ء تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اور کچھ عرصہ بعد وہ پٹیالہ ریاست کے چوتھائی حصہ کے ماسٹر جنرل آف پٹیالہ بنا دیئے گئے۔ 24-1921ء کے دوران انہوں نے جو قابل قدر خدمات سرانجام دیں، اس کے صلہ میں انہیں انڈین سروس میڈل دیا گیا۔

خان بہادر نواب سر لیاقت حیات خان کے۔ بی۔ ای نواب محمد حیات خان کے تیسرے بیٹے تھے۔ انہوں نے 1909ء میں پنجاب پولیس میں بحیثیت ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ملازمت اختیار کی اور ان کو ترقی دے کر ان کی ملازمت انڈین پولیس کو منتقل کر دی گئیں۔ ان کے ذمہ اس بات کا کھوج لگانا تھا کہ 1857ء کی جنگ آزادی کن لوگوں کی سازش تھی اور اس کا لیڈر کون تھا؟ جس کے صلہ میں انہیں کنگ پولیس میڈل دیا گیا۔ 1922ء میں جب پرنس آف ویلز نے ہندوستان کا دورہ کرنا تھا، اس موقع پر ان کے اعزاز میں لاہور میں ایک بہت بڑا میلہ لگایا گیا جس کے تمام انتظامات کا سہرا ان کے سر تھا۔ ان خدمات کے صلہ میں انہیں خان بہادر اور او۔ بی۔ ای کے خطابات سے نوازا گیا اور انہیں بہت بڑا علاقہ بطور انعام دیا گیا۔ 1923ء میں انکی خدمات ریاست پٹیالہ دربار کے حوالے کر دی گئیں۔

جہاں انہوں نے پانچ سال تک ریاست پٹیالہ کے وفادار کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ 1930ء میں ریاست پٹیالہ کے مہاراجہ نے ان کی وفاداریوں کی قدر کرتے ہوئے انہیں اپنا وزیر اعظم بنالیا۔ ان کی خدمات کے صلہ میں ریاست کے وراثتی القابات اعتماد الدولہ "وقار الملک" سے نوازا گیا۔ انہوں نے راونڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر پٹیالہ سٹیٹ کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے پارلیمنٹ جائنٹ سلیکشن کمیٹی میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کی۔ 1933ء میں انہیں "Knighthood" شہنشاہ کے انتہائی وفادار کا خطاب دیا گیا۔ 1939ء میں انہیں K-B-E کا خطاب بھی دیا گیا۔

سردار شوکت حیات کے والد آنریبل میجر سردار سرسکندر حیات خان (K-B-E (D-O-L) (K-B) (نواب محمد حیات خان کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ 1892ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ اور یونیورسٹی کالج آف لندن سے تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے 2/67 پنجابی بٹالین میں بحیثیت بھرتی آفسر کے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ انہوں نے تیسری افغان جنگ میں کمپنی کی کمانڈ کی۔ یہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے برٹش فوج کی قیادت کی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز حیات خاندان پر کس قدر اعتماد کرتا تھا۔ قیادت کی اس ذمہ داری میں انہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغان قبائل کو شکست دی۔ ان کی خدمات کے صلہ میں انہیں سپیشل سند، خلعت اور خدمات کا بیج عنائت کیا گیا۔ ان کی فوجی خدمات کے صلہ میں انہیں (K-B-E (ایم۔ بی۔ ای (ملٹری) کا اعزاز بھی دیا گیا۔ سردار سکندر حیات پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے لینڈ لارڈ نشست پر بلا مقابلہ منتخب ہو گئے تھے۔

1918ء سے 1930ء تک درجہ اول کے اختیارات کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ کی خدمات سرانجام دیں۔ آنریبل سرسکندر حیات عوامی خدمات کا ایک نمایاں ریکارڈ رکھتے تھے۔ وہ حسن ابدال سمال ٹاؤن کمیٹی کے غیر سرکاری صدر بھی چنے گئے۔ پرنس آف ویلز کے دورہ کے موقع پر میلہ آفیسر کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1926ء میں انہیں پولیس انکوائری کمیٹی کا غیر سرکاری رکن نامزد کیا گیا۔ بعد ازاں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل اور پرونشل ریفارمز کمیٹی کے چیئرمین چنے گئے۔ 1927ء میں انہیں پنجاب گورنمنٹ کا ریونیو ممبر مقرر کیا گیا۔ وہ 1932ء میں چار ماہ تک گورنر پنجاب کے عہدے

پر قائم مقام گورنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور 1934ء میں تقریباً چار ماہ تک دوبارہ نگران گورنر کی ذمہ داری سے عہدہ بر آہ ہوتے رہے۔ 1935ء میں جب ریونیو ممبر سے ریٹائر ہوئے تو وہ ڈپٹی گورنر آف ریزرو بینک آف انڈیا مقرر ہوئے اور ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ بر آہ ہو کر 1936ء کو پنجاب لوٹے، جہاں سرفضل حسین نے پنجاب کے زمینداروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے یونی نسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ 1937ء کے انتخاب میں یہ پارٹی پنجاب میں واضح اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی۔ سرسکندر حیات کو 1935ء کے قانون کے تحت وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ اس طرح سردار سکندر حیات یکم اپریل 1937ء کو پنجاب کے پہلے خود مختار وزیر اعظم چنے گئے۔ انہیں نواب بہادر کا خطاب 1928ء کو دیا گیا۔ اور 1933ء میں انہیں "Knight Comander of the British Empire" کا خطاب دیا گیا۔

برکت حیات خان نواب محمد حیات خان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ وہ ڈسٹرکٹ کونسلر اور بلدیہ حسن ابدال کے صدر رہے۔ خان سعد اللہ خان سردار گلاب خان کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے اور 1922ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے ممتاز علی خان ڈسٹرکٹ بورڈ اٹک کے وائس چیئرمین رہے۔ انہیں 1935ء میں سلور جوبلی میڈل دیا گیا اور سند عطا کی، اس طرح اس خاندان کے دیگر افراد بھی سیاست میں نمایاں رہے۔

- نواب مظفر خان سی. آئی. ای سردار گلاب خان کے ہونہار بیٹے تھے۔ یہ 1879ء میں پیدا ہوتے۔ وہ 1912ء میں منصف کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں انہیں اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا اور پنجاب گورنمنٹ میں میر منشی کی خدمات بھی سرانجام دیتے رہے۔ 1919ء میں انڈیا افغان امن کانفرنس میں شرکت کے لئے برٹش مندوب کی حیثیت سے رکن نامزد ہوئے۔ اور انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور اس کے ایک سال بعد انہیں "برٹش مشن ٹو کابل" کا ممبر نامزد کیا گیا۔ 1923ء میں ان کی کابل سے واپسی ہوئی تو ان کی ذہانت اور وفاداری کو دیکھتے ہوئے ان کی خدمات برٹش انڈیا کے سیاسی شعبے کے حوالے کر دی گئیں۔ بعد ازاں انہیں وہاں سے شمال سرحدی صوبہ میں اسسٹنٹ کمشنر

تعینات کیا گیا۔ انہیں 1922ء میں نواب بہادر کا خطاب دیا گیا۔ سردار شوکت حیات سر سکندر حیات کے ہونہار بیٹے ہیں۔ سردار شوکت حیات کے خاندان نے ایک صدی تک انگریز بہادر کی خدمت کی ہے۔ اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سیاست وراثت میں پائی، ان کی ساری زندگی معرکوں اور ہنگاموں میں گزری ہے برطانیہ کی فوج میں کپتان تھے تو لیبیا میں فسطائی طاقتوں سے نبرد آزما رہے۔ جب اتفاقات زمانہ سے سیاست کے میدان میں کودے تو یونینسٹ وزیر اعلیٰ ملک خضر حیات ٹوانہ اور برٹش گورنر گلینسی سے دو دو ہاتھ کئے۔ اس زمانے میں سردار شوکت حیات خان مسلم عوام کی آنکھوں کا تارا تھے اور اطراف و اکناف ملک میں شوکت اسلام زندہ باد سے ان کا سواگت ہوتا تھا۔ اس زمانے میں قائد اعظم" ان کی سیاسی یک رخی سے بہت متاثر تھے۔ سردار شوکت حیات اپنی یادوں میں بیان کرتے ہیں۔ "میں قائد اعظم" سے ملاقات کے لئے گیا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو اس کے بعد بھی وہ بدستور اخبار پڑھتے رہے، اس طرح پچیس منٹ گزر گئے، اور قائد اعظم" نے میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بیس منٹ کے بعد قائد اعظم" میز پر اخبار رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے

"آپ مجھ سے ٹکٹ لینے آئے ہیں؟ ٹکٹ میں نہیں دیتا۔ آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔ آپ واپس پنجاب جایئے۔ وہیں سے آپ کو ٹکٹ مل سکتا ہے۔" اس پر سردار شوکت حیات نے قائد اعظم" کو جواب دیا "مجھے معلوم ہے ٹکٹ مجھے پنجاب ہی سے ملے گی اور میں ٹکٹ حاصل کر بھی لوں گا لیکن میں ایک سپاہی کی حیثیت سے آپ کو دیکھنے آیا ہوں تاکہ جو شخص مستقبل میں میرا جرنیل بننے والا ہے، اس کا اندازہ لگا سکوں۔" یہ اچانک جواب سن کر قائد اعظم ششدر رہ گئے۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر قائد اعظم" نے فرمایا دیکھو۔ "تم کیا دیکھنا چاہتے ہو اس پر سردار شوکت حیات نے جواب دیا۔" جناب میں ایک فوجی آدمی ہوں کہ اگر جنرل حکم دے تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں۔ اسی غرض سے ملاقات کے لئے میں حاضر ہوا تھا تاکہ وہ پروگرام معلوم کر سکوں جس پر آگے چل کر مجھے کام کرنا ہے۔

سردار شوکت حیات کی شخصیت کے بارے میں شورش کشمیری لکھتے ہیں:

"سکندر حیات بدلتے ہوئے ہندوستان میں انگریزوں کی گرتی ہوئی دیواروں کو

سہارا دینے والے ایک ہی تھے۔ انگریزوں کو بھی ان کا بہت خیال تھا۔ ادھر شوکت گرفتار ہوئے، ادھر سلسلہ جنبانی شروع ہو گیا۔ چنانچہ ایک اطالوی جرنیل کے معاوضہ میں کیپٹن شوکت حیات کو رہا کر دیا گیا اور پنجاب میں واپس بھیج دیا گیا۔ جنگ میں قاعدہ ہے کہ رہا شدہ قیدی محاذ پر دوبارہ نہیں جاتے۔ جائیں تو زندہ پکڑے جانے پر انہیں گولی سے اڑا دیا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں ان سے قیدی کا سلوک نہیں کیا جاتا وہ ایک دفعہ قیدی رہ چکے ہوتے ہیں اور دوبارہ شریک جنگ نہ ہونے کی شرط پر ہی انہیں رہا کیا جاتا ہے۔"

سردار شوکت حیات کو باپ کے نام پر آگے لایا گیا۔ فوج سے چھٹی کرائی گئی۔ پہلے وزیر بنایا گیا پھر ووزر لیکن شوکت حیات نے وفاداری بشرط استواری کی بعض حدیں توڑ دیں۔ جب نوابوں کی خاندانی آویزش اصول کا مسئلہ بن گئی تو شوکت حیات اس قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ انگریز نے آنکھیں پھیر لیں، الزام یہ تھا کہ شوکت حیات نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے بعض معاملات میں دیانت کو مجروح کیا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ شوکت نے گلینسی کے اشارہ ابرو پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ شوکت کا وزارت سے عزل ایک ایسا واقعہ تھا جس سے مسلم لیگ کا زور بندھا اور وہ نواب جو مسلمان عوام سے دامن کشاں رہتے تھے، ایک بار پھر میدان میں آن ڈٹے گویا شوکت کو ان سب کے گناہوں کی گٹھڑی لے کر صلیب پر لٹکایا گیا۔ شوکت حیات کا عزل اور شملہ کانفرنس کا انجام یہ دو واقعات تھے جس سے ملک کے طول و عرض میں مسلم لیگ کے لئے انتخاب کا راستہ ہموار ہوا۔ لیکن شوکت اس شہرت کو سنبھال نہ سکے۔ یہ نہیں کہ اس کی زندگی میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی بہ نسبت کوئی جھول تھا، واقعہ صرف اتنا تھا کہ جن لوگوں نے اسے قربانی کا بکرا بنایا تھا، وہ خود ہی ان کی مقبولیت سے خار کھانے لگے تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ سردار شوکت کو پس پشت ڈالنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے بلکہ ایسی ایسی چالیں چلیں کہ جذباتی سردار شوکت خود اپنے دوستوں میں ایک کٹا ہوا پتنگ بن کر رہ گیا۔

جن دنوں وہ شوکت اسلام تھے، اس کا طنطنہ گفتار کافی پر شکوہ تھا۔ وہ مقرر تو تب بھی نہ تھے اور نہ آئندہ اس کے امکانات تھے، لیکن جب ہجوم کے نعرہ ہائے ارادت گونجتے اور اس کے طرہ دستار کی آڑ انہیں شوکت اسلام کی آوازوں کے ساتھ چرخ ہفتمیں کی خبر لانے لگتیں تو وہ جھوم اٹھتے۔

اور جب پاکستان بنا تو شوکت وزیر بھی تھے اور مشیر بھی۔ وہ اقتدار کے نشہ میں اپنے دوستوں کے سوا سب کچھ بھول چکے تھے۔ ان کی زبان پر بعض ناگوار بول بھی تھے۔ وہ ایوان اسمبلی میں اپنے نکتہ چینیوں کو وہی جواب دیتے جو آج اس کی نکتہ چینی کے جواب میں خان لیاقت علی خان نے دیا ہے۔ ان کو یقین نہ تھا کہ عروس وزارت دغا بھی دے سکتی ہے۔ وہ اس کی ہم آغوش کے سرور میں کھو گیا۔ ممتاز دولتانہ کی چکنی چپڑی باتیں اس کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔ وہ مستقبل کے وزیر اعظم کے تختے کی امید میں مستعفی ہوئے جب انہوں نے ممتاز دولتانہ کی سیاسی کروٹ سے محسوس کیا کہ سیاست بری چیز ہے تو انہوں نے نیشنل بنک میں کئی ہزار روپے ماہوار پر ملازمانہ گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ وہ مجبور تھے اور حالات کی عام رفتار سے ان کا جی کھٹا ہو چکا تھا۔ شوکت اپنے ماحول سے مختلف نوجوان تھا۔ وہ نہ تو اپنے باپ کی طرح زمانہ شناس تھے اور نہ اپنے ہم سفر سیاستدانوں کی طرح تیور شناس۔ "

پاکستان بننے کے بعد سردار شوکت حیات نواب ممدوٹ کی کابینہ میں وزیر مال چنے گئے اور اسی حیثیت میں انہوں نے کئی معرکے مارے اور بالآخر میاں ممتاز دولتانہ کی معیت میں وزارت سے مستعفی ہو کر باہر آ گئے۔ اور آہستہ آہستہ مسلم لیگ سے دور ہوتے گئے۔ مسلم لیگ سے علیحدگی کے بارے میں ان کے ارشادات تھے کہ مسلم لیگ بری تھی، اب اس کی وہ شکل برقرار نہیں رہی بلکہ اس کی موجودہ تبدیل ہیئت ایسی ہے کہ اس کو معرض وجود میں لانے والے بھی ایک بار تو اسے نہ پہچان سکیں گے۔

مسلم لیگ میں انفرادی کشمکش تو پہلے بھی تھی لیکن قائد اعظم" کی تناور شخصیت کے سائے میں تمام چھوٹے چھوٹے پودے ایک ہی جگہ پھل پھول رہے تھے۔ قائد اعظم" کی وفات کے بعد مسلم لیگ میں جو اختلافات اندر ہی اندر جڑیں پکڑ رہے تھے. وہ اب کھل کر سامنے آ گئے اور برسوں کی سیاسی رقابتیں اور مخالفتیں ایک ایک کر کے رنگ لانے لگیں۔ لیاقت علی خان مرحوم اب وہ پہلے سے "لیاقت" نہیں رہے تھے بلکہ مسٹر لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان بن چکے تھے۔ سردار شوکت حیات پارٹی میں اپنے خیالات کا اظہار اسی طرح کرتے تھے جس طرح سے وہ پہلے کیا کرتے تھے لیکن اب ان کی تلخ نوائی انہیں ناگوار

گزرتی تھی۔

جب میاں افتخار الدین اور سردار شوکت حیات نے سیفٹی ایکٹ کے خلاف مسلم لیگ پر تنقید کی تو انہیں مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ میاں افتخار الدین نے آزاد پاکستان پارٹی کی بنیاد رکھی تو سردار شوکت حیات ہی اس کے پروڈیوسر تھے اور سردار شوکت حیات نے غریبوں اور کسانوں کی باتیں شروع کر دیں۔

کیونکہ اس پارٹی کا منشور بائیں بازو کے نظریات پر مشتمل تھا۔ میاں افتخار الدین امیر کبیر ساہو کار اور لاہور کے بڑے جاگیرداروں میں شامل ہوتے تھے۔ ان کی زندگی اور پارلیمانی جدوجہد میں غریبوں اور کسانوں کے استحصال کے خلاف احتجاج کی جھلک نظر آتی تھی اور انکی صاف گوئی کے دشمن بھی قائل تھے۔ سردار شوکت حیات تو بیچارے میاں افتخار الدین صاحب کے تابع مہمل تھے۔ سر سکندر حیات کے خاندان سے ایسے غازیوں کا پیدا ہونا جو عوام کی باتیں کریں، اس صدی کا ایک معجزہ تھا۔ سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن آزاد پاکستان پارٹی اقتدار کا زینہ نہیں بن سکتی تھی۔ اکتوبر 1953ء میں سردار شوکت حیات آزاد پارٹی سے یکایک مستعفی ہو کر سیاسی حلقوں میں بحث کا موضوع بن گئے۔ سردار صاحب نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز 1941ء میں پنجاب کی یونینسٹ کینٹ کے ایک ممبر کی حیثیت سے کیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد ملک خضر حیات سے اختلافات ہو گئے اور سر برینڈ گلینسی گورنر پنجاب نے انہیں وزارت سے ڈسمس کر دیا۔ اس کے بعد آپ مسلم لیگ کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ اور حصول آزادی کی جدوجہد میں سرگرم رہے۔ حزب مخالف کی بینچوں سے آئین ساز اسمبلی میں بعض بڑے بڑے بتوں پر حملے کئے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمٰی جب غلام محمد کی دھکا شاہی کی نظر ہوئی تو محمد علی بوگرا نے خواجہ ناظم الدین کی جگہ لے لی۔ انہوں نے آتے ہی سردار شوکت حیات کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی اور سردار صاحب بلا تامل شیشے میں اتر بھی گئے اور اس طرح وزیر اعظم محمد علی بوگرا کے مشیر اور دوست کی حیثیت میں سامنے آئے۔ آئین ساز اسمبلی کے ٹوٹنے کے بعد جب نئی آئین ساز اسمبلی کی تشکیل ہوئی تو اسی محمد علی بوگرا نے سردار صاحب کو اسمبلی کا الیکشن لڑنے کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔ 1954ء میں مولوی تمیز الدین کے مقدمہ میں جسٹس منیر کے فیصلے کے خلاف بطور احتجاج اسمبلی سے الگ ہوئے۔ 1964ء تک محلاتی سازشوں کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے

سیاست سے الگ ہو رہے ہیں۔ ممتاز دولتانہ جب ایبڈو کے تحت سیاست سے کنارہ کش ہو گئے اور سردار شوکت حیات نے میدان خالی دیکھا تو ایک بار پھر سیاست کے منظر پر نمودار ہوئے۔ 1965ء کے صدارتی انتخاب میں آپ نے مادر ملت فاطمہ جناح کے ہاتھ مضبوط کئے اور بہت کم عرصے میں محترمہ فاطمہ جناح کے قابل اعتماد اور وفادار ساتھیوں میں شمار ہونے لگے۔ جنوری 1965ء میں مادر ملت ناکام ہو گئیں تو آپ برابر بحالی جمہوریت کی تحریک میں شامل رہے۔ 1966ء میں معاہدہ تاشقند کے خلاف لاہور میں مظاہرہ کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ مادر ملت کا ساتھ دینے کے جرم میں انہیں بہت ستایا گیا تھا۔ ان کی فیکٹریاں اور زمینیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ جب سردار شوکت حیات نے گورنر گلینسی کے ساتھ اصولی اختلاف کیا تو ان کی ہزاروں ایکڑ اراضی اس وقت بھی ضبط کر لی گئی تھی۔ گورنر امیر محمد کے زمانے میں ان کے لڑکے کو شاہی قلعہ میں رکھا گیا۔ اسے اتنی تکلیفیں پہنچائی گئیں کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔

میاں ممتاز دولتانہ ہر بڑے کام کا آغاز بڑی سادگی سے کرتے ہیں۔ 1966ء میں وہ ایبڈو کی قید سے آزاد ہوئے تو انہوں نے شوکت سردار حیات کو ہی استعمال کیا کہ وہ ان کی قیادت میں کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ محترم فاطمہ جناح کو خط لکھا کہ وہ کونسل مسلم لیگ کا دو آنے کا ممبر بننا چاہتے ہیں اور انہیں کسی عہدے کی خواہش نہ تھی۔ شوکت حیات سے ان کا معاہدہ بھی ہوا تھا کہ وہ صرف اور صرف شوکت حیات کی قیادت کو اجاگر کرنے کے لئے کام کریں گے۔ مگر اندر ہی اندر شطرنج کے شہسوار بازی کھیلتے رہے اور دولتانہ کونسل مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔ دولتانہ صاحب نے اپنے طرز عمل سے مسلسل یہ ثابت کیا کہ سیاسی زندگی میں معاہدوں اور الفاظ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات خان کونسل مسلم لیگ کے کرتا دھرتا تھے۔ جب ایوب خان کی حکومت کا دھڑن تختہ ہوا تو کنونشن مسلم لیگ کے جاگیر دار کونسل مسلم لیگ میں جوق در جوق داخل ہونے لگے کنونشن لیگ کے دور اقتدار میں کونسل مسلم لیگ کو بلاشبہ دوسرے جمہوریت پسندوں کی نسبت زیادہ محرومیوں اور سختیوں کا شکار ہونا پڑا لیکن جونہی کنونشن لیگ اپنی شامت اعمال کی پاداش میں ملک و قوم کو نازک صورت حال سے دوچار کر کے محروم اقتدار ہوئی تو کچھ عرصہ بعد تمام مسلم لیگیوں کو ایک کرنے اور سب کو متحد ہو جا[illegible]

ہونے لگیں۔ یہ تبدیلی بلکہ کایا پلٹ اتنی یک لخت اور شدید تھی کہ جن مخلص کونسل لیگی کارکنوں نے کنونشن لیگیوں کے ہاتھوں سختیاں اور حق تلفیاں برداشت کی تھیں، وہ پیشہ ور سیاسی مسافروں سے میل ملاپ کو

؎ آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

کے جواز کے باوجود پذیرائی بخشنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ ان کے عام تامل اور ذہنی کرب کے باعث سرکردہ کنونشن لیگیوں کے مشرف بہ کونسل مسلم لیگ ہونے کے باوجود یہ سلسلہ عام نہ ہو سکا۔ اس دوران وہ ایئر مارشل نور خان کو بھی کونسل مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ابھارتے رہے۔

یحییٰ خان نے 1970ء میں عام انتخابات کا اعلان کیا تو کونسل مسلم لیگ اور جماعت اسلامی دو قوتیں ایسی تھیں جو مغربی پاکستان میں بھٹو کی سحر انگیزی کو توڑ سکتی تھیں لیکن الیکشن سے ایک آدھ ماہ قبل میاں ممتاز دولتانہ نے بظاہر اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر کونسل مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ صدارت کے لئے جو نام لیا جا رہا تھا، وہ سردار شوکت حیات ہی کا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ صدارت کا تاج خود میاں ممتاز دولتانہ ان کے سر پر رکھیں لیکن ان کی مراد بر نہ آئی اور میاں ممتاز دولتانہ صدارت کی کرسی پر پھر جلوہ افروز ہو گئے۔ 1970ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان میں کونسل مسلم لیگ دوسری بڑی جماعت بن کر ابھری تھی۔

ممتاز دولتانہ نے سیاست میں خاموشی اختیار کر لی اور انگلینڈ میں سفیر بن کر ریٹائر زندگی گزارنے لگے۔ کونسل مسلم لیگ کے ارکان اسمبلی جس میں اکثریت جاگیردار سیاست دانوں کی تھی، سرکاری پالیسیوں کی حمایت کرتے رہے۔ بعد ازاں وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔

15/نومبر 1976ء کا دن کیمبل پور کی سیاست میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس روز ممتاز مسلم لیگی رہنما سردار شوکت حیات نے چیئرمین پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو کی موجودگی میں پیپلز پارٹی اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا۔ سردار صاحب کی پیپلز پارٹی میں شمولیت کوئی دھماکہ خیز خبر نہ تھی کیونکہ سردار صاحب نے اسمبلی میں اپوزیشن نشستوں پر بیٹھ کر بھی سرکاری پالیسیوں کی حمایت کی تھی۔ مقامی سیاسی حلقوں کا خیال تھا سردار صاحب

نے پیپلز پارٹی کے چیئرمین سے اپنی پرانی خدمات کے صلہ میں آئندہ الیکشن میں پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لے ایک سیاسی چال چلی ہے۔ یہ خبر بھی ان دنوں گردش کر رہی تھی کہ سردار شوکت حیات جیسے کہنہ مشق زیرک سیاستدان نے کھٹر برادری پر اپنی سرداری قائم رکھتے ہوئے قدیم جاگیردارانہ سیاسی قدروں کو زندہ رکھنے اور اپنے بعد اپنے سر سکندر حیات کو سیاسی حلقوں میں متعارف کرانے کے لئے یہ تمام سیاسی سوانگ رچایا تھا۔ سردار صاحب کے پیپلز پارٹی میں شمولیت سے پہلے ان کے پرانے حریف ملک اسلم آف شمس آباد، سابق وزیر اعلیٰ نواب صادق قریشی کی کیمبل پور آمد پر اپنی خدمات پیپلز پارٹی کو وقف کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جبکہ پیر صفی الدین آف مکھڈ، خانزادہ تاج افضل خان آف حضرو۔ سیٹھ داؤد اور کئی دوسرے سیاسی پردھان پیپلز پارٹی کی صفوں میں پہلے ہی داخل ہو چکے تھے اور سردار صاحب کی شمولیت اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی جو جاگیردارانہ سیاست کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ حزب اختلاف کے بینچوں پر بڑی مشکل سے ٹھہرتے ہیں۔

جاگرداروں، وڈیروں اور زمینداروں نے 1970ء کے انتخاب میں پیپلز پارٹی کو انتہائی کمزور قرار دیا تھا۔ اور 1970ء کے نتائج نے بھی جاگیرداروں کے اس دعوے کو اس ضلع کی انتخابی سیاست کی روشنی میں سچ ثابت کر دیا تھا۔ اس ضلع کے جاگیردار 1977ء کے انتخاب میں سیاسی مفادات کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے لئے سیاسی وفاداریاں تبدیل کر کے پیپلز پارٹی کے امیدوار بن گئے تھے۔ اور اس ضلع میں "پیپلز پارٹی غریبوں کی جماعت ہے" کا دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ شوکت حیات کی شمولیت سے اس ضلع سے کونسل مسلم لیگ کا وجود ختم ہو گیا کیونکہ ان کے ساتھی تقریباً تمام کھٹڑ قبیلہ اور ان کے سیاسی رفقاء مسلم لیگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ 1977ء میں اس ضلع سے پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی تمام نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ جب قومی اتحاد نے انتخابی نتائج کو تسلیم نہ کرتے ہوئے دھاندلی کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں سیاسی مظاہروں اور جلسے جلسوں کا سلسلہ چل نکلا اور ملک کے سیاسی حالات پیپلز پارٹی کے ہاتھ سے نکلتے دکھائی دیئے تو سردار شوکت حیات نے ذوالفقار علی بھٹو پر شدید تنقید کی اور الزام لگایا کہ وہ اسلامی قوانین کے نفاذ میں مخلص نہیں اور ساتھ ہی سردار شوکت حیات نے اسلام آباد میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ اس طرح ذوالفقار علی بھٹو کو کہنا پڑا کہ

سردار شوکت حیات پیپلز پارٹی میں نووارد ہیں۔ انھیں اجلاس بلانے کا کوئی حق نہیں۔ ملک میں جب مارشل لاء نافذ ہوا تو سردار شوکت حیات سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو گئے۔ سردار شوکت حیات اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان سیاسی اختلافات ماضی میں بھی رہے ہیں۔ جب بھٹو کابینہ میں وزارت وسفارت ان کے حصہ میں نہ آئی تو انہوں نے جدہ کی اسلامی سیکرٹریٹ کی سربراہی پر قناعت کرنا چاہی۔ اس عہدے اور منصب کے لئے انہوں نے خوشی خوشی آئینی سمجھتے پر دستخط کر دیئے۔ اور اس کی حمایت میں تابڑ توڑ کئی عدد بیانات داغے۔ جب ان کو اس عہدے پر مستقل نہ کیا گیا اور ٹکو عبدالرحمان کو ان کی جگہ جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا تو انہوں نے بستر ابدلا اور آئینی سمجھوتے سے منحرف ہو گئے۔ وہ بھاگے بھاگے طور خم پہنچے۔ خان عبدالغفار خان کو ہار پہنائے۔ دھوم دھام سے ان کا جلوس پشاور کی جانب روانہ ہوا تو ان کے پہلو میں بیٹھے بیٹھے مسکراتے تھے۔ جب پشاور میں جلسہ ہوا اور اس میں قائد اعظمؒ اور ان کی مسلم لیگ پر تنقید ہوئی تو یہ خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے رہے۔ بعدازاں وہ متحدہ جمہوری محاذ میں شامل رہے۔ محاذ آرائی کے لئے مورچہ سازی کا فن انہوں نے میاں ممتاز دولتانہ سے سیکھا تھا جو سیاسیات پاکستان کی بساط سیاست پر شطرنج کے زبردست شاطر تھے۔

سردار شوکت حیات عمر کے اس حصے تھے کہ سیاسی محاذ آرائی کے لئے ان کی عمران کا ساتھ نہ دیتی تھی کیونکہ سیاست پہلے محلوں میں ہوتی تھیں، اب یہ بازاروں میں آگئی تھی۔ انہوں نے غنیمت اسی میں جانی اور دھوم دھام سے وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔

ضیاالحق کے مارشل لاء میں جب گورنر سوار خان کو کابینہ بنانے کے مرحلے سے گزرنا پڑا تو اٹک کے سیاستدانوں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ یہ ضلع قیام پاکستان بلکہ انگریزی دور سے ہی تین چار گھرانوں کے تسلط میں رہا ہے اور سیاسی خانوادے کسی نہ کسی صورت میں حکومتوں میں شریک رہے ہیں۔ ان سیاسی خانوادوں کا سیاسی سفر تقریباً اسی طرح ہوا کہ پہلے یونینسٹ، مسلم لیگ، ری پبلی کن، کونشن مسلم لیگ، پیپلز پارٹی، مجلس شوریٰ، محمد خان جونیجو کی مسلم لیگ، پھر پیپلز پارٹی کی بہاریں دیکھیں۔ یہ

سیاسی خانوادے ہمیشہ جمہوریت کا دم بھرتے ہیں۔ ضیاء الحق نے مارشل لاء کے بعد جب وفاقی کابینہ کا اعلان کیا تو اس میں مسلم لیگ کی شمولیت پر ملک قاسم کے ساتھ سردار شوکت حیات بھی مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ ملک قاسم اور سردار شوکت حیات کا تعلق دو حریف سیاسی گھرانوں ملکان شمس آباد، "سرداران واہ" سے ہے۔ ان خاندانوں کے درج ذیل افراد قیادت کے حوالے سے نمایاں رہے ہیں۔ سر محمد امین مرحوم شمس آباد، سر سکندر حیات (واہ) ملک محمد اکرم خان (شمس آباد) سر ممتاز علی خان (واہ) ملک محمد اسلم خان (شمس آباد) سردار شوکت حیات خان (واہ) سیاسی معرکے کرتے رہے ہیں اور وہ ضلع کے سیاسی تاریخ میں ایک دوسرے کے کٹر سیاسی مخالفین کی حیثیت سے مشہور رہے ہیں۔ کنونشن مسلم لیگ میں ملک محمد قاسم جنرل سیکرٹری تھے اور قومی اسمبلی میں پارلیمانی سیکرٹری رہے۔ اپنے مخالف دھڑے کی حمایت کی وجہ سے بھی سردار شوکت حیات محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ 1970ء میں سردار شوکت حیات کے مقابلے میں ملک محمد اسلم آف شمس آباد کو بہت کم ووٹ ملے تھے۔ سردار شوکت حیات کے قدر دانوں میں ولی خان بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلی حزب اختلاف کے قائد سردار شوکت حیات ہی تھے۔ کنونشن مسلم لیگ اور کونسل مسلم لیگ کو جب متحدہ مسلم لیگ میں مدغم کر دیا گیا تو سردار شوکت حیات کونسل مسلم لیگ کی صدارت سے رضاکارانہ طور پر مستعفی ہو گئے۔ وہ خان غفار خان کا استقبال کرنے جلال آباد تک چلے گئے۔ ملک قاسم نے بحیثیت جنرل سیکرٹری متحدہ مسلم لیگ اس کے ان رویے پر انہیں اظہار وجوہ کا نوٹس بھی دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کی مجلس عاملہ نے معاہدہ شملہ کی حمایت کی تو سردار صاحب نے بھی نیپ کی تقلید میں معاہدہ شملہ کے حق میں قرار داد منظور کروالی۔ ان ہی دنوں انہیں اپنی جماعت میں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا پھر بھی سردار صاحب نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی میں مفاہمت کے لئے اپنے آپ کو "اٹک" کے سیاسی پل کی حیثیت سے متعارف کرواتے رہے۔ آئینی سمجھوتے اور آئین پر حزب اختلاف کے ارکان کے دستخط ثبت کروانے میں بھی سردار صاحب سرگرم رہے۔ انہی دنوں انہیں مسلم لیگ سے پانچ سال کے لئے نکال دیا گیا۔ مسلم لیگ کے سابق صدر قائد اعظم" کے دست راست کے دعوے دار مسلم لیگ کے عام ممبر بھی نہ رہے۔ پھر بھی کچھ عرصہ تک اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلواتے رہے اور

سردار شوکت حیات اپوزیشن کے بینچوں پر بیٹھتے رہے۔ سردار شوکت حیات نے مسلم لیگ سے اپنے اخراج کے بارے میں کہا تھا کہ یہ سب کیا دھرا ملک قاسم کا ہے۔ وہ مجھے سیاست سے باہر نکال کر اپنے خاندان کی ان سیاسی شکستوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں جو انہیں ہمارے خاندان نے انتخابات میں دی تھیں۔ جب سردار شوکت حیات نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی تو سیاسی حلقوں کی طرف سے قیاس کیا جا رہا تھا کہ ایوب خان کے گیارہ سالہ دور اقتدار میں ایوب خان کی دلیرانہ مخالفت کرنے والا بھٹو کے ابتدائی چند سالوں میں بھٹو کو للکارنے والے شوکت حیات بھٹو کے خلاف تحریک میں نمایاں کردار ادا کرنے والے ملک قاسم کے خلاف وہی چالیں چلیں گے جو ملک قاسم نے سردار شوکت حیات کو سیاست سے ناک آوٹ کرنے کے لئے چلی تھیں۔ انہیں اپنے منصوبوں پر عمل کرنے کا موقعہ نہ مل سکا اور ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا اور سیاست کو ضیاء الحق نے شجر ممنوعہ قرار دے دیا اور ایک عرصہ تک سردار شوکت حیات اپنے علاقے میں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ پیپلز پارٹی میں شمولیت کے باعث وہ پیپلز پارٹی کی پالیسیوں کی حمایت کرتے ہوئے 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی سردار شوکت حیات کے کسی اور سیاسی خانوادے نے اس میں حصہ لیا۔ 1988ء کے انتخابات سے پہلے ہی سردار شوکت حیات سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے صاحب زادے سکندر حیات خان جو ایوب دور میں طالب علم رہنما کی حیثیت سے ابھرے تھے اور جن پر شاہی قلعے میں بے پناہ تشدد کیا گیا تھا، نے عملی سیاست میں سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف کے مشیر کی حیثیت سے حصہ لیا۔ میاں نواز شریف کی حکومت کو شدید بحرانوں کا سامنا تھا۔ سکندر حیات نے محسوس کیا کہ اب پیپلز پارٹی اپنے سیاسی حریفوں کو بہانے جائے گی تو انہوں نے نواز شریف کی کشتی سے کنارہ کش ہو کر محترمہ بے نظیر بھٹو کی سیاسی بیعت کر لی۔ اٹک سے صوبائی اسمبلی کے رکن چنے گئے۔ ان کے مقابلہ میں اسلامی جمہوری اتحاد کے ملک عطا محمد خان اور آزاد امیدوار سردار سرفراز خان ناکام ہو گئے تھے۔ سردار سرفراز خان رشتہ کے اعتبار سے سابق صوبائی وزیر ملک اللہ یار آف کھنڈہ کے کزن ہیں جو 1985ء میں اس علاقہ سے قومی اسمبلی کے رکن چنے گئے تھے۔

نومبر 1991ء کے آخری ہفتے میں شوکت حیات کی بیٹی وینا حیات کے ساتھ ایسا

شرمناک واقعہ رونما ہوا کہ اس نے ہر دل رکھنے والے پاکستانی کو رولا دیا۔ سردار شوکت حیات نے الزام لگایا کہ سندھ کے حکمران اپنے سیاسی مخالفین کو تشدد کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ ان کی بیٹی کے ساتھ کی گئی زیادتی بھی اسی تشدد آمیز سیاست کا حصہ ہے۔ یہ کوئی معمولی ڈکیتی نہیں تھی، ان کی بیٹی کو بے نظیر کی دوستی کی سزا دی گئی ہے۔ حکومت سندھ نے اس کیس کی ایف آئی آر بھی نہ کاٹی۔ بقول حیات فیملی کے ترجمان کہ ان کا مقدمہ فوج کی مداخلت پر درج ہوا تحریک پاکستان کا نڈر سپاہی سفید بالوں کے ساتھ بے بسی کے آنسو رویا۔ اس صورت حال سے اہل لاہور اور قوم کے نبض شناس سیاسی رہنماؤں کا تڑپ جانا لازمی امر تھا اس واقعہ پر ملک بھر کے عوامی حلقوں، مذہبی پیشواؤں اور سیاستدانوں نے شدید رد عمل کا اظہار کیا۔ ملک کے بزرگ سیاستدان کی بیٹی کے اپنے وطن میں بے آبرو ہونے کے واقعہ پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے تصور پاکستان کے خالق علامہ اقبال ؒ کے نامور فرزند سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق جج ڈاکٹر جاوید اقبال نے جن تاثرات کو نمایاں کیا، وہ ہر درد مند پاکستانی کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے سینے سے جذبات کا یہ اظہار ٹوٹ کر نکلا تھا کہ جہاں کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں وہ کیسی اسلامی ریاست ہے؟ وطن حاصل کرنے والوں کے بچوں کے ساتھ اس قسم کا ننگ انسانیت سلوک ہونا تھا تو پھر ملک کو معرض وجود میں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ جب حکومت نے اس افسوسناک واقعہ کا نوٹس لیتے ہوئے کمیشن بٹھانے کا اعلان کیا تو سردار شوکت حیات کی طرف سے صدر غلام اسحاق خان کی ذات کو سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے داماد وزیر اعلیٰ سندھ کے مشیر برائے امور داخلہ عرفان اللہ مروت کو اس شرمناک واقعہ کا ملزم ٹھہرایا جانے لگا۔ دوسری طرف کھٹڑ قبیلے نے اپنی روایات کے مطابق جرگہ طلب کیا جس نے فرحانہ حیات سے زیادتی کے مرتکب افراد کو سزائے موت سنا دی اور طے پایا کہ قبیلے کے غیور نوجوان ملزموں کو تلاش کر کے ختم کر دیں گے۔ فرحانہ حیات کا معاملہ کمیشن کے سپرد کر دیا گیا۔ شوکت حیات اور ان کی بیٹی فرحانہ نے اس کا بائیکاٹ کئے رکھا۔ ان کا اصرار تھا کہ ایف آئی آر میں جن افراد کو نامزد کیا گیا ہے، ان کے خلاف قانون کے مطابق کاروائی کی جائے۔ اس کیس میں ایک بات نمایاں نظر آتی ہے کہ جب انصاف کے تقاضوں کی تسکین کے قانونی ذرائع غیر مؤثر اور راستے مسدود ہو جاتے ہیں تو انتقام کی آگ بجھانے کے غیر قانونی طریقے اور

سہارے تلاش کرنے کا رجحان بڑھنے لگا اور دم توڑتی قبائلی روایات کا احیاء ہونے لگتا ہے۔

اٹک کے خان اور مکھڈ پیر

اٹک کے بڑے بڑے زمینداروں میں مکھڈ خاندان نمایاں ہے۔ مکھڈ خاندان کے مورث اعلیٰ غازی خان تھے۔ اس خاندان کو احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں بہت عروج حاصل ہوا تھا۔ عباس خان نے شادی خان کے خاندان کا خاتمہ کر کے خان آف مکھڈ کا لقب حاصل کر لیا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد غلام مصطفےٰ خان نے ان کے ورثا کو ختم کر کے قبیلہ کی قیادت خود سنبھال لی تھی۔ درانی بادشاہ کے زمانہ میں یہ قبیلہ خراج کے طور پر 80 روپے درانی سلاطین دہلی کو پیش کرتا تھا۔ علاوہ ازیں 80 سوار بادشاہ کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار رکھتے تھے۔ سکھوں کے دور میں یہ خراج نقدی کی صورت میں ادا کیا جانے لگا جس کا 1/8 حصہ مکھڈ چیف کو الاؤنس کی صورت میں ملتا تھا۔ اس حصہ میں محصول چونگی، دریائے سندھ کی ریت سے نکالے جانے والے سونے کی آمدنی اور مکھڈ کے گھاٹ کی وصولی سب شامل تھے۔ جب پنجاب کا الحاق عمل میں آیا تو چونگی معاف کر دی گئی اور مکھڈ کے خانوں کو مال گزاری کا 1/8 حصہ ملنے لگا۔

1848-49ء میں مصطفےٰ خان کی وفاداریاں انگریزوں کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوئیں۔ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں سکھوں اور افغان لیڈروں کی سرکوبی کے لئے استعمال کیں۔ اس دوران وہ نہ صرف مکھڈ اور شکر دار کی مہموں میں شامل رہے بلکہ انہوں نے قلعہ جالی پر چڑھائی کر دی جہاں سکھ باغیوں نے پناہ لے رکھی تھی اور یہاں بغاوت کے منصوبے تیار کئے جاتے تھے۔ وہ 1861ء تک زندہ رہے۔ ان کی موت سے کچھ عرصہ پہلے تک ان کا بیٹا غلام محمد خان بھی باپ کے ساتھ مہموں میں شامل رہا اور اس نے خاندان کے معاملات کو بھی سنبھالا دیئے رکھا۔ وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے

انگریزوں کا وفادار رہا۔ انہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے گھوڑ سواروں اور پیدل نوجوانوں کی فورس ضلع انتظامیہ کے حوالے کر رکھی تھی۔ یہ راولپنڈی کے تین بڑے جاگیر داروں میں شامل تھے جنہیں حکومت نے اسلحہ ایکٹ کی شق سے مستثنیٰ قرار دے رکھا تھا۔ کھٹڑ چونکہ سندھ کے ایک ایسے مقام پر واقع ہے جو انگریز کے زمانہ میں فوجی لحاظ سے اہم تھا اس لئے کھٹڑ کے خانوں کی امداد بہت قیمتی خیال کی جاتی تھی۔ غلام محمد کی موت 1887ء میں واقع ہوئی۔ ان کے چار بیٹے فقیر محمد، دوست محمد، سلطان محمد خان اور پیر محمد خان تھے۔ غلام محمد خان نے اپنی زندگی میں ہی فقیر محمد خان کو جاگیر کا وارث بنا دیا تھا اور باقی بیٹوں کو گزارا الاؤنس دیا گیا۔ فقیر خان کا اپنے باپ اور سوتیلے بھائی سلطان محمد خان سے اکثر جھگڑا رہتا تھا اور یہ جھگڑا بھائیوں میں سالہا سال چلتا رہا۔ 1850ء تک انہیں زمینوں سے حاصل ہونے والے لگان کا 1/4 حصہ ملتا تھا جس کی مالیت 672 روپے سالانہ تھی جو کہ نظر ثانی کے بعد بڑھا دی گئی۔ اب ان کی سالانہ آمدنی 1570 ہونے لگی۔ خان آف کھٹڑ شکر دارا کے علاقے کے بھی بہت بڑے جاگیر دار تھے۔ فقیر محمد 1890ء میں فوت ہوئے۔ ان کی موت کے بعد کھٹڑ قبیلے کا رئیس شیر محمد خان نامزد ہوا۔ اس وقت شیر محمد کی عمر بہت کم تھی۔ شیر محمد خان کھٹڑ کے قبائل میں کبھی بھی شہرت حاصل نہ کر سکا اور اپنے علاقے کا بے اثر رئیس بن کر رہ گیا۔ ان کے چچا دوست محمد خان جن کے شیر محمد سے اچھے تعلقات نہ تھے. قبیلے میں ان کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ وہ کھٹڑ کے ذیلدار بھی تھے 1921ء میں ان کی موت کے بعد اس کے بیٹے غلام سرور خان ذیلدار بنا دیا گیا۔ انہوں نے ذیلدار کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا نہ کیں تو شیر احمد خان کو ان کی جگہ ذیلدار بنا دیا گیا۔ شیر احمد خان نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی۔ 1935ء میں انہیں آنریری مجسٹریٹ کے اختیارات بھی مل گئے۔

قیام پاکستان کے بعد خان آف کھٹڑ سیاسی حوالے سے نمایاں نہیں رہے۔ سردار سیف اللہ خان اور سردار امیر قمرالزمان خاں بھی سیاست میں ابھرنے کی کوشش کرتے رہے۔ سیاسی دھڑے بندیوں میں اس خاندان کو ہمیشہ نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ ایوب خان کی زرعی اصلاحات میں سردار سیف اللہ خان، سردار امیر قمرالزمان خان اور خان

آف کھٹڑ شیر احمد خان کی 7759 ایکڑ زمین اصلاحات کی زد میں آ گئی جس کے باعث سیاسی حوالے سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔

کھٹڑ کا پیر خاندان بھی سیاست میں نمایاں رہا ہے۔ تحریک پاکستان میں محی الدین لال بادشاہ کی ہمدردیاں دولتانہ گروپ سے رہی ہیں۔ محی الدین لال بادشاہ ذاتی صفات کے حوالے سے ایک باکردار انسان تھے البتہ ان کا خاندان تبدیل ہوتی حکومتوں کے ساتھ وفاداریاں تبدیل کرتا رہا ہے۔ وہ 1951ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہیں پہلی اور دوسری دستوریہ میں بھی مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل ہوئی۔ پیر محی الدین لال بادشاہ دربار غوثیہ کے سجادہ نشین تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے پنجاب اور سرحد میں قبائلی علاقے میں ان کے بے شمار مرید تھے۔ ان کی موت کے بعد ان کا ہونہار بیٹا پیر صفی الدین باپ کا جانشین نامزد ہوا۔ انہوں نے بھی سیاسی وابستگی دولتانہ گروپ سے رکھی۔ جب میاں ممتاز دولتانہ کو ایبڈو کے تحت سیاست سے ریٹائر کر دیا گیا تو انہوں نے کونشن مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1965ء میں وہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ صدارتی انتخابات میں پیر صفی الدین نے محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا تھا، پیر صاحب نے نواب کالاباغ سے ایسی ٹکر لی کہ نواب آف کالاباغ انتظامیہ کے سارے صدارتی انتخابات تو جیت گئے لیکن اس جنگ نے پیر صفی الدین کو قومی سطح کا لیڈر بنا دیا جس نے نواب امیر محمد کے ظلم کے سامنے گردن نہ جھکائی۔ پیر صاحب نے اس وقت کونشن مسلم لیگ میں حقیقی معنوں میں شمولیت اختیار کی جب نواب آف کالاباغ کونشن مسلم لیگ سے الگ ہو گئے۔ انہوں نے صدارتی انتخابات میں صدر ایوب کے خلاف محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ نہیں دیا تھا بلکہ نواب آف کالاباغ کی دشمنی میں ایوب خان کی مخالفت کی تھی۔ نواب آف کالاباغ پیر صاحب کے والد کے سیاسی حریف تھے اور اس طرح وہ کالاباغ کی مخالفت اپنے والد کی طرف سے اپنے اوپر لازم سمجھتے تھے۔ کالاباغ کی مخالفت جہاد سے کم نہ تھی۔

پیر صاحب نے کونشن مسلم لیگ کا اس وقت ساتھ دیا جب بڑے بڑے کاسہ لیس ایوب خان کو چھوڑ رہے تھے۔ ایوب خان جب اقتدار سے الگ ہوئے تو پیر صاحب کونسل مسلم لیگ میں واپس آتے ہوئے شرماتے تھے میاں ممتاز دولتانہ انہیں واپس کونسل مسلم لیگ

میں لے آئے۔ 1970 ء میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ کچھ عرصہ اپوزیشن کے بینچوں پر بیٹھے۔ بعدازاں وہ پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ 1977 ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کی ملکان ٹمن کے ساتھ برسوں پرانی مخالفت ہے۔ 1985 ء میں کھٹڑ خاندان نے حیات ٹمن خاندان سے صلح کر لی۔ سیاست میں ان کا خاندان سردار شوکت حیات کا سیاسی حواری رہا ہے۔ پیر صفی الدین کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ 1970 ء میں معرض وجود میں آنے والی اسمبلی کے اجلاسوں میں مقررہ وقت سے پہلے باقاعدگی سے حاضر ہوا کرتے ہیں پیر صفی الدین کی موت کے بعد سیاست میں اس خاندان کا کردار وقتی طور پر ختم ہو گیا ہے

کی سرکوبی کے لئے شمس آباد کو اپنا کیمپ بنایا تو یہاں کے ملک اندرون خانہ سکھوں سے ملے ہوئے تھے۔ دیوان مکھن چند نے کابل فوجوں کو شکست دی۔ اس لڑائی کے دوران یہ علاقہ تباہی و بربادی کا منظر پیش کرتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خصوصی ہدایت پر اس علاقے کی تعمیر نو کی گئی۔ 1844 ء تک ملک خاندان کے زیادہ تر معاملات غلام احمد کے ہاتھ میں ہی رہے۔

فیروز خان نے قبیلی معاملات غلام احمد کو اس لئے دیئے تھے کہ ان اس کی تمام تر توجہ مذہبی تعلیم اور خاص طور پر قرآن حکیم کی تعلیم پر مرکوز ہو گئی تھی۔ 1848-49 ء میں اس خاندان کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف ہو گیا۔ نکلسن کی قیادت میں انہوں نے رام نگر مرگلہ اور پنڈ داون خان میں سکھوں کے خلاف لڑائیاں لڑیں۔ نکلسن ان کی بہادری کے معترف تھے اور وہ انہیں دہلی لے جانے کے متمنی تھے۔ لیکن 1857 ء کی جنگ آزادی میں اعوانوں کی ضلع اٹک میں بہت ضرورت تھی اور انہوں نے بہت جلد حریت پسندوں کی تحریک آزادی کو کچل کر رکھ دیا۔ سکھوں سے انہیں 1705 روپے پینشن ملتی تھی۔ انگریزوں نے اس میں اضافہ کر کے 2205 روپے کر دیا۔ 1857 ء میں فیروز الدین نے بہادری اور وفاداری میں پکے دوستوں کا ثبوت دیا اور ان کی لحہ بہ لحہ مدد کی۔ گھوڑوں اور پیادہ فوجوں نے انگریزوں کی قوت میں زبردست اضافہ کر دیا تھا۔ انہی سرو سزی کی بنا پر انہیں 1857 ء میں تحصیل دار بنا دیا گیا۔ انہوں نے 500 روپے کی خلعت بھی وصول کی۔ تحصیل دار کے عہدے پر وہ 1863 ء تک کام کرتے رہے اور انہیں چار سو روپے کی خصوصی گرانٹ بھی دی۔ فیروز الدین 1867 ء میں فوت ہو گئے۔

فیروز الدین کی موت کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا روشن الدین قبیلے کا سربراہ بنا۔ انہیں 2200 کی مستقل جاگیر کا وارث قرار دیا گیا جو شمس آباد میں تھی۔ انہوں نے 1873 ء میں حسن ابدال میں منعقد ہونے والے دربار میں خلعت حاصل کی۔ انہوں نے ضلعی انتظامیہ کا ہر برے وقت میں ساتھ دیا۔ 1893 ء میں روشن الدین کی موت کے بعد ملک محمد امین نے اعوانوں کے خاندانی معاملات کی سربراہی کی ایچی سن کالج سے فارغ التحصیل تھے اور انہیں راولپنڈی ضلع کی طرف سے دوران تعلیم وظیفہ ملتا تھا۔ ملک محمد امین صوبائی درباری اور ذیلدار تھے اور ان کے ایک بھائی ملک کے دستے میں رسالدار تھے۔ ملک محمد امین

کے چچا غلام قادر بھی انگریزوں کے ساتھیوں میں شامل تھے۔ وہ 1913ء سے 1926ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ 1915ء میں انہیں آنریری مجسٹریٹ اور سب جج بنا دیا گیا۔ انہوں نے 1920ء اور 1931ء میں تحریک ریشمی رومال کو دبانے میں پورا پورا ساتھ دیا۔

وہ گورنمنٹ کی مختلف کمیٹیوں اور مسلم آرگنائزیشنوں کے ممبر رہے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں تلوار انعام میں دی گئی۔ جنگ عظیم میں انہوں نے سپاہیوں کی بھرتی کے لئے بڑی محنت سے کام کیا۔ انہیں ریکروٹنگ بیج اور O-B-E کا خطاب اور دس مربعے زمین منٹگمری کالونی میں دی گئی۔ خاں بہادر محمد امین خان نے ریاست بہاولپور میں بھی اہم ذمہ داریاں سرانجام دی تھیں جس کے نتیجہ میں ان کے بھائی محمد احسان خان کو سو مربعے اراضی دی گئی۔ وہ فوج میں رسالدار تھے۔ بعد ازاں انہوں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہیں خلقت بھی دی گئی۔ ملک محمد امین کے چھوٹے بھائی عبدالحق اور شیر محمد جو دونوں گریجویٹ تھے، پنجاب میں سرکاری ملازم تھے۔ ملک شیر محمد ممدوٹ کی ریاست کے انچارج بھی تھے۔ 1919ء تک وہ ممدوٹ ریاست کا انتظام چلاتے رہے۔ ملک شیر محمد نے ریاست کا انتظام جس طرح چلایا انہیں تعریفی اسناد اور تلوار انعام میں دی گئی۔ ملک عبدالحق کو 1921ء میں خان صاحب کا خطاب دیا گیا۔ ملک امین کا بڑا بیٹا محمد اکرم بار ایٹ لا تھا اور وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر تھے۔ خان بہادر ملک امین خان کے دو چچا ملک غلام جیلانی اور قادر خان شاندار سروس کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ غلام قادر کو سولہ مربعے اٹک اور ۵ مربعے اٹک جہلم میں دیئے گئے۔ دونوں کی خدمات سیاسی ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ملک امین کے صاحب زادے ملک محمد اکرم خاندانی روایات نبھاتے ہوئے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1951ء میں وہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ جب ری پبلکن پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو ان کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔

1965ء میں ملک اکرم کے بیٹے ملک محمد اسلم نے سیاست میں قدم رکھا اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ کنونشن مسلم لیگ کی باگ ڈور ملک اسلم کے ہاتھ میں تھی جس کی وجہ ملک قاسم تھے جو ان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ انہوں نے ملک اسلم کے سیاسی مخالفین خاص طور پر سردار شوکت حیات کو ابھرنے کا موقع نہ دیا۔ ملک اسلم اعوان ضلع اٹک کنونشن

مسلم لیگ کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ضلع کی ایڈمنسٹریشن میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ 1970ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب نہ ہو سکے اور انہوں نے صادق حسین قریشی کا دامن پکڑ کر پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور 1977ء میں پیپلز پارٹی نے انہیں ایم پی اے کا ٹکٹ دیا اور یہ کامیاب بھی ہو گئے۔ 1977ء کے مارشل کے بعد انہوں نے سیاسی ہمدردیاں ضیاالحق سے منسلک کر لیں اور مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہوئے۔ 1985ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اپنے سیاسی حریف خانزادہ تاج محمد خان کو شکست دے کر ماضی کی شکستوں کا بدلہ چکا دیا۔ 1985ء میں محمد خان جونیجو وزیر اعظم بنے تو ملک محمد اسلم مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1987ء کے بلدیاتی انتخابات میں اپنے سیاسی حریف سرفراز خان کھنڈہ سے مل کر ملک محمد آصف کھنڈہ کو چیرمین منتخب کرایا۔ 1988ء میں جب ضیاالحق فضائی حادثے میں جاںبحق ہو گئے تو وہ دوبارہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پرانے سیاسی حریف خانزادہ تاج محمد خان اور شیخ آفتاب احمد کو شکست دی۔ 1990ء کے انتخابات میں وہ شکست کھا گئے اور 1991ء کے بلدیاتی انتخاب میں بھی ملک محمد اسلم کے گروپ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دو سو سال سے ملک اسلم کا خاندان ضلعی سیاست میں حصہ لے رہا ہے۔ ملک اسلم کے والد ملک محمد اکرم سردار شوکت حیات سے مقابلہ کرتے رہے ہیں اور سردار شوکت حیات کے والد جناب سر سکندر حیات خان مرحوم ملک اسلم کے دادا مرحوم سے انتخابی معرکہ آرائی کرتے رہے ہیں۔

ملک قاسم بھی شمس آباد اعوانوں کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ 1962ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور دفاع کے پارلیمانی سیکرٹری بنائے گئے۔ انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف صدارتی انتخاب میں ایوب خان کا ساتھ دیا اور ان کے حق میں زور دار انتخابی دورے کئے۔ 1965ء میں وہ دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن چنے گئے اور وفاقی پارلیمانی سیکرٹری بنائے گئے۔ انہوں نے اٹک میں اپنے سیاسی مخالفوں پر الزاموں کے پہاڑ توڑے اور "شمس آباد" فیملی کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

محمد اسلم جلوانہ جب کنونشن مسلم لیگ سے مستعفی ہوئے تو ملک قاسم کو کنونشن مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ انہوں نے ایوب خان کے مستعفی ہو جانے کے بعد بھی کنونشن

مسلم لیگ کو قائم رکھا۔ 1970 ء کے انتخابات میں وہ بہاولنگر سے شکست کھا گئے تھے۔ وہ 1970 ء سے 77 ء تک پیپلز پارٹی سے خائف رہے۔ انہوں نے اس دوران پیپلز پارٹی اور ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مختلف تحریکوں، احتجاجی جلسے اور جلوسوں کی قیادت کی۔ ملک قاسم کی کوششوں سے کونسل مسلم لیگ اور کنونشن مسلم لیگ ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گئی۔ یہی وہ جرم تھا جس کی پاداش میں ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں سات سال تک ستائے رکھا یہاں تک کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی گئی۔ 1977 ء میں انہوں نے لاہور اور بہاولنگر سے قومی اسمبلی کی دونشستوں سے شکست کھائی۔ مسلم لیگ کی مارشل لا حکومت میں شمولیت کے مسئلہ پر پگاڑا سے ان کی ان بن ہو گئی۔ انہوں نے پرانے مسلم لیگی رہنماؤں محمد حسین چٹھہ اور خواجہ خیرالدین سے مل کر مسلم لیگ کا الگ دھڑا قائم کر لیا۔ خواجہ خیر الدین اور محمد حسین چٹھہ سے بھی قیادت کے مسئلہ پر ان سے شدید اختلافات ہو گئے۔ جب ایم آر ڈی کی بنیاد پڑی تو اپنا الگ گروپ تشکیل دے کر اس سے منسلک ہو گئے اور وہ مسلم لیگی قائدین اور مارشل لاء کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ جس پیپلز پارٹی سے ملک قاسم کو بہت خوف تھا۔ بھٹو کی موت کے بعد وہ ذہنی طور پر اس سے ہم آہنگ ہو گئے۔ 1988 ء میں پیپلز پارٹی نے ان کے مقابلے میں امیدوار کھڑا نہ کیا لیکن اس کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے۔ بعد ازاں بے نظیر کے خصوصی مشیروں میں شامل ہو رہے۔ 1990 ء میں بھی انھیں بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

کالاباغ کے نواب

کالاباغ کئی نسلوں سے اعوان ملکوں کے قبضہ میں رہا ہے۔ یہاں کے پہاڑوں سے نمک نکلتا ہے، لوہا بھی دریافت ہو چکا ہے کالاباغ کے قریب ہی دریائے سندھ بہتا ہے جس میں دونوں طرف کشتی رانی کی جا سکتی ہے۔ اس سہولت کے باعث حملہ آور اس راستہ سے دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔

اعوان ملک سولھویں صدی میں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ ان کا پہلا پڑاؤ ڈانت کوہ پر تھا جو کالاباغ سے اوپر کی جانب ایک قدرتی قلعہ ہے۔ جب کبھی حملے کا خطرہ ہوتا، لوگ اسی میں آ کر پناہ لیتے تھے۔ پہلے اعوان آباد کار کا نام شیخ عدو تھا، بعدازاں ان کے پوتے بند علی نے نمک کی کانوں پر قبضہ جما لیا اور پورے علاقے کے سردار بن گئے، وہ ملاح بھی تھے۔ اس لئے کشتیوں کے ذریعے جو لوگ دریائے سندھ عبور کرنا چاہتے، ان سے کرایہ کے علاوہ نمک کا محصول بھی لیتے تھے۔ کالاباغ کے شمال میں بھنگی خیل خٹک آباد تھے انہوں نے ان سے خراج لینا شروع کر دیا۔ اگرچہ وہ زمانہ بدامنی اور پریشانی کا تھا اور آئے دن حملے ہوتے رہتے تھے، لیکن اعوان ملکوں نے پوری جرات کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور آخر کار قرب و جوار کی تمام اراضی پر قابض ہو گئے۔ 1822 ء میں جب سکھوں نے اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ملک علی یار خان کو یہاں کی جاگیریں عنایت کیں کیونکہ انہوں نے سکھوں کی مخالفت نہیں کی تھی ملک علی یار خان مالیہ کے علاوہ مہاراجہ کو دو گھوڑے، گیارہ اونٹ، پانچ کتے، "تمان" اور محصول نمک کا دو تہائی اور مسان زمینوں کے مالیہ کا 2/5 دیا کرتا تھا، سکھوں کے عہد میں ہی اعوان ملک یہاں کے بہت بڑے جاگیردار بن گئے تھے۔

جب انگریز آئے تو علی یار خان نے ان کی بھی مخالفت نہ کی۔ انگریز کے ریکارڈ کے مطابق انہوں نے انگریزوں کی مدد کی اور ایڈورڈ کو بنوں اور ولیپ گڑھ کی مہمات میں سکھوں کے مقابلہ میں سامان رسد اور گھڑ سواروں کی کمی نہ آنے دی۔ گھڑ سواروں کا سردار خود اس کا بیٹا مظفر خان تھا جو ملک فتح خان ٹوانہ کے دوش بدوش لڑتا رہا۔ فتح خان ٹوانہ ان مہمات میں سکھوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے جبکہ مظفر خان کو گجرات کے قریب ہتھیار ڈالنے پڑے اور اسے قیدی بنا لیا گیا۔

1857 ء کی جنگ آزادی میں اعوان ملکوں کا کردار وہی تھا جو بعض دوسرے بڑے زمینداروں نے ادا کیا تھا۔ مظفر خان اور اسکے بیٹے نے ایک دستہ جو سینکڑوں جانثاروں پر مشتمل تھا، ایڈورڈ کی کمان میں دے دیا جس نے انہیں پشاور کے ایک دروازے پر متعین کر دیا۔ اس کے صلہ میں مظفر خان کو خان بہادر کے لقب سے نوازا گیا۔ 1863 ء میں اپنے باپ کی موت کے بعد مظفر خان کالاباغ کے رئیس بن گئے۔ اس دوران نواب مظفر خان نے رفاہی معاملات اور امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنانے میں ہر طرح سے مدد کی۔ انہوں نے جنگ افغانستان میں انگریز کی بڑھ چڑھ کر مدد کی اس کے بعد نہ صرف انہیں کالاباغ کی کانوں کے ٹھیکے ملے بلکہ عیسیٰ خیل اور میانوالی کی جاگیریں بھی ان کے حصہ میں آئیں۔ 1907 ء میں انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔

نواب بہادر مظفر خان نے افغان جنگ میں ٹرانسپورٹیشن کے لئے گھوڑے اور اونٹ بھی دیئے۔

مظفر خان کے والد ملک یار محمد خان پشاور میں (Dafadar) دفعدار تھے۔ انگریز سرکار کی نظر میں ان کی بہت قدر تھی اور انگریز ان پر اندھا اعتماد کرتے تھے میانوالی دربار میں بھی انہیں خاص مقام حاصل تھا ان کا انتقال 1908 ء میں ہوا۔ ان کے بعد ملک عطا محمد رئیس کالاباغ منتخب ہوئے ملکوں میں یہ رواج نسل در نسل چلتا رہا کہ بڑا بیٹا باپ کا جانشین بنتا اور باقی بیٹوں کو صرف گزارا الاونس ہی ملتا ہے۔ یہ روایات انگریزوں نے اپنے ساتھیوں کی شان و شوکت قائم رکھنے کے لئے بنائی تھیں ملک عطا محمد نے جنگ عظیم میں ایک لاکھ ایڈوانس، 75 ہزار جہازوں کی مرمت کے لئے، 35 ہزار گھوڑوں کی رجمنٹ کے لئے اور 7 ہزار جنگ کے متاثرین کی بحالی کے لئے جمع کرائے تھے اس کے علاوہ لڑنے کے لئے

ہزاروں سپاہیوں کا تحفہ بھی انہیں پیش کیا۔ حکومت کی طرف سے ان کی خدمات کو سراہنے کے لئے دہلی میں ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا گیا جس میں انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا اس کے علاوہ انہیں سرٹیفکیٹ اور بہت سے میڈل عطا کئے گئے اور نوابوں کے اعلیٰ درجے میں شامل کر لئے گئے۔ انہیں یہ اعزاز 1916 ء میں عنایت کیا گیا۔ نواب ملک عطا محمد کی وفات 1924 ء میں ہوئی۔ رئیس کالاباغ ملک امیر محمد بنائے گئے جو ابھی کمسن تھے۔ ان کی تمام جائیداد 1932 ء تک کے لئے کورٹ آف وارڈ کی نگرانی میں چلی گئی۔ 1935 ء میں نواب ملک امیر محمد خان کو سلور میڈل دیا گیا۔ ملک امیر محمد رجاز کے صاحب زادے تھے جو خان بہادر مظفر خان کے بھائی تھے ملک امیر محمد کو نواب کا لقب ورثہ میں ملا۔ وہ زمینداروں کے بہت بڑے حامی تھے ان کا سیاست میں داخلہ نواب افتخار حسین ممدوٹ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب کی تغافل کشیوں کا مرہون منت تھا۔ اگرچہ نواب آف کالاباغ پاکستانی اور مسلم لیگی تھے لیکن انہیں اسمبلیوں کی سیاست سے دلچسپی نہ تھی۔ 1946 ء کے تاریخی انتخابات میں انہوں نے یونینسٹ امیدوار کے مقابلہ میں مسلم لیگی امیدوار مولانا عبدالستار خان نیازی کی حمایت کی تھی لیکن وہ اسمبلیوں سے دور رہ کر اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ جب قیام پاکستان کا مرحلہ مکمل ہو گیا تو نواب افتخار حسین ممدوٹ کو ایم ایل اے صاحبان کے سوا کسی بیرونی آدمی سے ملنے کی فرصت ہی نہ ہوتی تھی۔ نواب آف کالاباغ کو کئی مرتبہ اس کا خود بھی تلخ تجربہ ہوا۔ انہوں نے محض ملاقات کی تقریب پیدا کرنے کے لئے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا لیکن رکن منتخب ہو جانے کے بعد انہوں نے دھڑے بندیوں اور جوڑ توڑ کی کشاکش میں کوئی حصہ نہ لیا ان کا رویہ ہمیشہ پروقار رہا ہے اس بنا پر ایوب خان کے مارشل لاء سے پہلے انہیں کئی مرتبہ گورنری کی پیش کش کی گئی۔ ممتاز صحافی م ش نے ملک امیر محمد آف کالاباغ کے گورنر نامزد ہو جانے پر ان کی شخصیت کے نمایاں خدوخال کا اظہار کچھ یوں کیا تھا "مغربی پاکستان کے سب سے بڑے زمیندار رتبہ کے لحاظ اور روپے کے لحاظ سے لاکھ پتی نہیں بلکہ کروڑ پتی ہیں۔ زیرک، ذہین خوبصورت نواب صاحب کالاباغ کا مغربی پاکستان میں بطور گورنر تقرر نئی خبر نہیں بلکہ دو تین سال پرانی بات ہے جب ملک میں ری پبلکن کا راج تھا تو نواب آف کالاباغ کو پہلے مرکز میں وزارت اور بعد میں صوبے کی گورنری پیش کی گئی جسے انہوں نے قبول کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اگر

انہوں نے صوبے کا گورنر بننا قبول کیا ہے کہ عہدہ برائے عہدہ نہیں بلکہ فرائض کی ادائیگی کے پیش نظر نواب صاحب کالاباغ پنجاب کے عام زمینداروں کی ڈگر سے ہٹ کر ایک منظم قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں پنجاب کے زمینداروں کی روایتی دلچسپیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ نہ تو شکار کے لئے کتے پالتے ہیں اور نہ ہی انہیں پتنگ اڑانے کا شوق ہے۔ حتیٰ کہ وہ سگریٹ تک نہیں پیتے۔ ان کی اپنی نجی زندگی کھری اور صاف ہے۔ وہ گھوڑے پالتے ہیں۔ بھیڑوں کے گلے رکھتے ہیں۔ ڈیری فارم کے لئے مویشی رکھتے ہیں اور میانوالی کی سنگلاخ زرعی زمین سے محض محنت سے سونا کماتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کو نہایت اعلیٰ تعلیم سے مزین کیا ہے۔ خود شلوار، اچکن اور پگڑی استعمال کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی فیشن سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ وہ سالہا سال سے سیاسیات میں عملی دلچسپی لیتے رہے ہیں، انہوں نے 1946 ء کے معرکتہ آلارا انتخاب میں ایک یونینسٹ امیدوار کے مقابلہ میں ایک مسلم لیگی امیدوار کی حمایت کی۔ بعد میں بھی وہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ جب چوہدری محمد علی صاحب نے مسلم لیگ کو چھوڑا تو نواب آف کالاباغ نے بھی مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد ان کی ری پبلکن پارٹی سے دلچسپی ان کے احباب اور نیاز مندوں کے لئے حیرانی کا باعث بنی رہی نواب آف کالاباغ درحقیقت ایک جنٹلمین ہیں"

نواب آف کالاباغ نے ایوبی دور میں جس انداز سے گورنری چلائی اور محترمہ فاطمہ جناح کو جس طرح شکست دی، اس سے کالاباغ کی شخصیت متنازعہ بن کر ابھری تھی ان کے دور میں ایوب خان کے سیاسی حریف سیاست سے ہی کنارہ کشی پر مجبور ہو گئے۔

نواب آف کالاباغ جب بقید حیات تھے تو کالاباغ نمونہ تھا نوابی ٹھاٹھ بھاٹھ کا۔ وہ ایک قبیلہ کے سردار کی طرح تھے اور مختلف خانوادوں کے سربراہ ان کے ساتھ تھے نواب مرحوم کا ہر لفظ قانون تھا۔ نواب آف کالاباغ جب گورنر بن گئے تو ریاست کا سارا کاروبار ان کے بیٹوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ گورنر بننے کے سبب کالاباغ ریاست کے انتظام کا دائرہ بے حد وسیع ہوا۔ اس طرح میانوالی ضلع میں جب تک مرحوم نواب آف کالاباغ گورنر رہے، قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ سیاسی مخالفین کو دبایا گیا جو دبائے نہ جا سکے انہیں مراعات دے کر ہم نوا بنا لیا گیا۔

زرعی اصلاحات کے بارے میں حکومتیں بلند بانگ دعوے کرتی رہی ہیں۔ نواب

آف کالاباغ اور ان کے بیٹوں کے نام کر دیا ملک امیر محمد آف کالاباغ اور ان کے چار بیٹوں کو اٹھارہ ہزار چار سو انیس ایکڑ اور ملک محمد خان آف کالاباغ نے ایک سو بیس ایکڑ اراضی حاصل کی۔ سابق وزیر زراعت خدا بخش بچہ سے اسمبلی فلور پر رکن اسمبلی ایم حمزہ نے سوال کیا کہ آیا ان لوگوں سے پٹہ کی رقم وصول کی جائے گی تو وزیر موصوف نے نفی میں جواب دیا۔

کالاباغ میں ایک علاقہ ایسا بھی تھا جہاں بیسویں صدی میں بھی الف لیلوی روایات پر بڑی آب و تاب سے عمل کیا جاتا رہا۔ نوابزدگان کے نظام کو ریاست کے اندر ریاست کا نام دیا جا سکتا تھا۔ اس کے باہر جمہوری اور آئینی قوانین چلتے تھے لیکن اسی ریاست کے اندر صرف اور صرف ریاستی قوانین کی عملداری تھی۔

نوابین کالاباغ کی بیگمات کی سواریاں جب بازار سے گزرتی تھیں تو الف الیلیٰ کی داستانوں کے منظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتے تھے ان کی بیگمات کو جب کسی تقریب میں جانا ہوتا تو سب سے پہلے یہ حکم جاری کیا جاتا کہ بازار کی تمام بتیاں اور روشنیاں گل کر دی جائیں جب بتیاں بجھوانے والا گروپ بازار سے گزر جاتا تو دوسرا مسلح گروپ بازار میں پہنچ جاتا۔ اس گروپ کا کام یہ ہوتا کہ اگر بیگمات کی گزرگاہ کے درمیان اگر کوئی مرد مل جائے تو اس کی ہنٹروں سے پٹائی کی جائے۔ اس ظالمانہ روایت کی وجہ سے لوگوں کا بڑا نقصان ہوتا تھا۔ انہیں کئی کئی گھنٹے روشنیاں گل کر کے بیٹھنا پڑتا۔ اس سارے نظام کی بنیاد ملک امیر محمد آف کالاباغ نے رکھی تھی۔ جب تک وہ زندہ رہے، یہ شہر ایک ریاست تھی۔ اسی ریاست میں نواب امیر محمد کا نظم و نسق برطانوی آقاؤں کے لئے قابل رشک تھا۔ ملک امیر محمد کے حسن انتظام سے متاثر ہو کر برطانیہ کی ملکہ الزبتھ نے کہا تھا کہ "امیر محمد ایسے منتظم ہیں جن کی ایڈمنسٹریشن جنگلی شیر بھی مانتا ہے" لیکن آج شہر کے باسی اس ایڈمنسٹریشن کے باغی ہیں۔ نواب امیر محمد کی ایڈمنسٹریشن کا یہ عالم تھا کہ ان کے جیتے جی کسی نے ان کے گھر سے جنازہ اٹھتے نہیں دیکھا تھا نواب نے یہ تاثر دے رکھا تھا کہ موت بھی آتے آتے ان کے گھر کی راہ بھول جاتی ہے۔ جس روز نواب امیر محمد کی والدہ کا انتقال ہوا، کالاباغ کے ہزاروں شہری سوگوار چہرے لئے نواب سے اظہار تعزیت کرنے گئے لیکن ان میں سے کسی کو بھی حرف

تعزیت زبان پر لانے کی جرات نہ ہوئی۔ مبادا نواب برا نہ مان جائیں۔ اس موقع پر جو کوئی نواب کی ماں کی مرگ کی خبر دوسرے کو سناتا تو وہ اطمینان کر لیتا کہ کوئی سن تو نہیں رہا اور پھر کہتا "اوے جھکے دی ماوی مر گئی ایں!" جیسے یہ کوئی انہونی ہو گئی ہے۔

نواب آف کالاباغ ایک منظم قسم کے حکمران تھے وہ بدانتظامی کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے دوران گورنری کراچی سے لاہور پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ایک اعلیٰ افسر نے انہیں بتایا کہ طلبہ کی ایک ٹولی راستے میں گڑبڑ کرنے والی ہے آپ اگر راستہ بدل لیں تو بہتر ہو گا نواب آف کالاباغ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو نواب آف کالاباغ کو دیکھ کر افسر کانپنے لگا اور اس کے چہرے سے پسینے چھوٹ پڑے نواب آف کالاباغ نے دبدبے سے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں اگر طلبہ کی ٹولی ہنگامہ کرنے والی ہے تو آپ کا یہاں کیا کام۔ اگر ڈیوٹی پر متعین پولیس افسر اس گڑبڑ کو نہ روک سکے تو تمام پولیس افسر خود کو نوکری سے فارغ سمجھیں جب نواب آف کالاباغ اسی راستے سے گئے تو کسی ہنگامے کا نام و نشان نہ تھا انہوں نے اسی افسر کو وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ اگر پولیس خود کو عوام کا خادم سمجھے تو حالات بگڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

کمشنر قلات کے گھر چوری ہوئی تو یہ خبر سن کر نواب آف کالاباغ غصے سے لال پیلے ہو گئے انہوں نے متعلقہ کمشنر کو معطل کر دیا ان کے نزدیک ڈویژن کا جو حاکم اپنے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ عام لوگوں کی حفاظت کیسے کر سکتا ہے چوروں کے نزدیک ایسے حاکم کی کوئی حیثیت نہیں انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ حاکم چوکس رہیں نواب آف کالا باغ جہاں انتظامی معاملات میں سخت گیر تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ سیاستدانوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا کرتے تھے ان کے دور میں شیخ مسعود صادق وزیر رہے ہیں جب وہ راولپنڈی کے دورے پر گئے تو کنونشن مسلم لیگ کے کارکنوں نے مقامی انتظامیہ کے رویے کی شکایات ان سے کیں جن کا شیخ مسعود صادق نے نوٹس لیتے ہوئے متعلقہ افسروں کو ریسٹ ہاؤس طلب کیا اور ان سے کارکنوں کے ساتھ زیادتی کے بارے میں باز پرس کی اور انہیں کارکنوں کے کام کرنے کی تنبیہ کے علاوہ انہیں ڈانٹ بھی پلائی اس واقعہ کی اطلاع جب نواب آف کالاباغ تک پہنچی تو انہوں نے شیخ مسعود صادق کو طلب کیا اور اس واقعہ کا نوٹس لیا نواب آف کالاباغ نے متعلقہ افسروں کو بھی گورنر ہاؤس طلب کیا اور ثابت ہو گیا کہ سیاسی کارکنوں کا رویہ غیر

مناسب تھا انھوں نے شیخ مسعود صادق کو ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا کہ آپ سرکاری پارٹی کے ممبر ہیں آپ پارٹی سے زیادہ خدا کے سامنے جواب دہ ہیں انھوں نے افسروں سے کہا کہ آپ کسی کارکن کا ناجائز کام نہ کریں اور نہ انھیں اپنے دفتروں میں گھسنے دیں ان کے دور میں کسی اعلیٰ شخصیت کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ سرکاری رہائش گاہ پر شراب، رقص و سرور کی محفل سجائیں انھوں نے ایک مرکزی وزیر کا سرکاری رہائش گاہوں پر داخلہ بھی بند کر رکھا تھا جب ایوب خان نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ کیا تو وہ غیر ملکی دورے پر جانے سے پہلے سکندر مرزا کو آگاہ کر گئے کہ وہ نواب آف کالاباغ کو کابینہ میں شامل کر لیں اس سلسلہ میں سکندر مرزا نے نواب آف کالاباغ کو وزارت کی دعوت دی جو کہ انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول نہ کی اس سلسلہ میں سکندر مرزا نے کئی بار نواب آف کالاباغ سے رابطہ قائم کیا کیونکہ انھیں خدشہ تھا کہ ایوب خان غیر ملکی دورے سے واپس آ کر یہ سوال ضرور کریں گے ایوب خان نے دورے سے واپس آ کر سکندر مرزا سے پوچھا کہ نواب آف کالاباغ کو ابھی تک وزارت میں شامل کیوں نہیں کیا انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اس سلسلہ میں کئی بار رابطہ قائم کیا لیکن انھوں نے وزیر بننے سے انکار کر دیا جب ایوب خان نے نواب آف کالاباغ سے انکار کی وجہ پوچھی تو نواب آف کالاباغ نے ایوب خان کو جواب دیا کہ میں دو، دو ٹکے کے ارکان اسمبلی کا ایوان میں کھڑے ہو کر جواب دوں گا کہ جناب سپیکر صاحب اس سوال کا یہ جواب ہے اور فلاں سوال کا یہ جواب ہے۔

جب ملک امیر محمد خان گورنری سے الگ ہوئے تو بھی یہاں کا نظام اسی طرح قائم تھا۔ بعدازاں نواب امیر محمد کو پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا اور اس قتل کا الزام ان کے بیٹے ملک اسد پر لگایا گیا جو بعدازاں اس الزام سے بری ہو گئے۔ نواب کی میت کو جس کسمپرسی سے ٹھکانے لگایا گیا، وہ عبرت کا نشان تھا۔ قتل کے بعد درجنوں آدمیوں نے بیٹوں کی اجازت سے لاش تھانے اور ہسپتال پہنچائی۔ گنتی کے آدمیوں نے جنازہ پڑھا جن میں امیر عبداللہ خان روکڑی اور حمید اللہ خان روکڑی بھی شامل تھے۔

ملک عطا محمد کے بعد جب نواب امیر محمد رئیس کالاباغ نامزد ہوئے تھے تو چوری، ڈاکہ، قتل، زنا اور دیگر جرائم کے فیصلے بوہڑ والے بنگلے میں ہونے لگے تھے۔ قصبہ میں سینکڑوں مکان بیک قلم جنبش ملک امیر محمد کی ذاتی جائیداد قرار دے دیئے گئے۔ تمام دکاندار،

نواب کے کرایہ دار بنا دیئے گئے۔ شہر اور بازار میں کوئی شخص ذاتی مکان تعمیر نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی جائیداد کی خرید و فروخت کا مجاز تھا۔ لوگ لاکھوں روپیہ رکھنے کے باوجود کالاباغ میں سرمایہ کاری کرنے سے محروم تھے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں خاندانوں اور جانبین کی مرضی کی بجائے ملک امیر محمد کی مرضی چلتی تھی۔ ان کی مرضی و اطلاع کے بغیر کوئی رشتہ مناکحت انجام نہیں پا سکتا تھا۔

کالاباغ سے باہر کے لوگ آ کر عارضی یا مستقل طور پر مقیم نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے لئے نواب سے اجازت ضروری تھی اور شہر کا کوئی باسی اپنے کسی رشتہ دار کو نواب کی اجازت کے بغیر مستقل رہائش پذیر نہیں کر سکتا تھا۔ کالاباغ کے شہری زرعی اجناس پیدا کرتے تھے لیکن وہ اسے شہر یا شہر سے باہر آزادانہ طور پر فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لئے اصول یہ تھا کہ پہلے نواب کی ملکیت زرعی اجناس فروخت ہوتی تھیں۔ اس کے بعد عام آدمیوں کی پیداوار غلہ منڈی اور سبزی منڈیوں کی راہ لیتی تھی۔ کالاباغ کے شہری کسی بھی حالت میں نواب کی ملکیت ٹرانسپورٹ کے علاوہ کوئی دوسری ٹرانسپورٹ استعمال کرنے کے مجاز نہ تھے۔ کالاباغ کا کوئی شہری ذاتی ٹرک یا بس نہیں خرید سکتا تھا

یہاں باقاعدہ انٹیلی جنس فورس بھی کام کرتی تھی۔ نواب آف کالاباغ کی زندگی تک ملک کا کوئی سیاستدان اس شہر میں قدم نہ جما سکا۔ مقامی طور پر سیاسی گفتگو، سیاسی اجتماع، سیاسی جماعت سازی یا کسی سیاسی جماعت کی حمایت سنگین جرم تھا۔

جن سرپھروں نے کبھی کوئی سیاسی یا احتجاجی آواز بلند کرنے کی کوشش کی، انھوں نے اس کی بھاری قیمت ادا کی۔ ان سرپھروں میں قاضی امیر عبداللہ ایڈووکیٹ تھے جن کے جرم سیاست میں دو بھائی قتل ہو گئے۔ قاضی صاحب کو کالاباغ سے نکال دیا گیا اور اس کے باقی اہل خانہ پر پابندیاں عائد کر دی گئیں

اس کے باوجود نواب امیر محمد بعض خوبیاں بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے جیتے جی بھی شراب کو نہ چھوا نہ زنا کے قریب پھٹکے۔ قومی لباس کی روایت کو انھوں نے سات سمندر پار بھی نبھایا جب وہ طالب علم تھے۔ عورت کے بارے میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ ایوب کے دور میں ایک ضیافت میں نواب کو ملکہ الزبتھ سے ایوب خان نے متعارف کروانا تھا۔ نواب نے انکار کرتے ہوئے کہا "مرد کبھی عورت سے ہاتھ نہیں ملاتا

جب بھٹو نے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا تو ان کا بہت سا علاقہ زرعی اصلاحات کی زد میں آ گیا۔ انہوں کے ہاریوں نے استدعا کی کہ وہ زمین نہیں مانگتے مگر زمین کی پیداوار میں جائز حق مانگتے ہیں۔ اس گستاخی پر 120 خاندانوں کو اینوں سے نکال دیا گیا ان کے گھروں اور مکانات کو ایک ہی رات میں بلڈوز کر دیا گیا۔ یہ بے سہارا خاندان بچوں بوڑھوں اور خواتین خانہ کے ہمراہ داؤد خیل کے ریلوے سٹیشن پر رہائش پذیر ہو گئے۔ کئی ہفتے ان کی شنوائی نہ ہوئی تو ایک دن ریلوے لائن پر لیٹ گئے۔ گھنٹوں ریل گاڑی کو روکے رکھا۔ خدا خدا کر کے تحصیل بھکر میں صاحب زادی محمودہ بیگم کی مداخلت سے جگہ مل سکی۔ ریاستی قانون کے تحت یہاں تعلیم ممنوع تھی۔ جب بھی ان کے علاقے میں سکول منظور ہوتا، یہ فوراً منسوخ کروا دیتے۔ لوگ چوری چھپے اپنے بچوں کو تعلیم دیتے۔ اگر کوئی پکڑا جاتا تو اسے سزا ملتی تھی۔

کالاباغ کے خلاف عوامی لہر کا آغاز 1976 ء میں ہوا تھا۔ ان میں ایسے افراد بھی شامل تھے جنھوں نے یہاں پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی تو انہیں نوابزدگان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی نوابزدگان تھے جنھوں نے 1970 ء میں اعلان کیا تھا کہ جس نے پیپلز پارٹی کا پرچم لہرایا، اس کو سبق سکھایا جائے گا بعد ازاں وہ پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ اس موقع پر پیپلز پارٹی میانوالی کے جیالوں نے اعلان کیا کہ وہ کالاباغ کے نوابوں اور جاگیرداروں کے خلاف بھرپور جدوجہد جاری رکھیں گے

قاضی عبداللہ ابھی میٹرک میں تھے کہ انہیں کالاباغ سے نکال دیا گیا۔ اس کے تمام اہل خانہ پر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ اس سے مل نہیں سکتے۔ قاضی عبداللہ کالاباغ سے کراچی پہنچے اور وہاں تعلیم مکمل کی اور میانوالی میں وکالت شروع کر دی۔ اس دوران انہوں نے کالاباغ کے لوگوں کو نوابزدگان کے خلاف جمع کرنا شروع کر دیا۔ جو لوگ کھاتے پیتے تھے ان کو ترغیب دی کہ کالاباغ چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں آباد ہو جائیں اور نوابوں کے خلاف خود کو منظم کریں ان کی مخالف سرگرمیوں میں اس وقت شدت آئی جب ان کے 20 سالہ بھائی کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس نوجوان کے قتل کی پولیس میں رپورٹ تک درج نہ ہو سکی 1977 ء میں عیدالفطر سے ایک دن قبل قاضی نے نوابزدگان کے خلاف پمفلٹ شائع کیا اور اسے قبرستان میں قبروں کے سرہانے رکھ آیا اگلے دن جب لوگ اپنے

عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ کے لئے گئے تو وہ نوابزدگان کے خلاف پمفلٹ دیکھ کر حیران رہ گئے

کالاباغ کے شہریوں نے بلوچی محاذ کے نام سے 29 اپریل 1979 ء کو ایک تنظیم بنائی۔ اس تنظیم کے بعد نوابوں کا ان کے مخالفین سے آمنا سامنا ہوتا رہا۔

نواب آف کالاباغ جاگیرداری کے حامی تھے۔ 1965 ء میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں 5 سالہ منصوبے کا خاکہ پیش کیا گیا اس کے ساتھ ایک نوٹس یا اس کی ترمیم شدہ صورت کی طباعت اور اشاعت کی نوبت ابھی تک نہیں آئی کہ یہ مسودہ واپس لے لیا گیا۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے نفاذ کے دو سال بعد ارکان قومی اسمبلی میں جو اصل مسودہ تقسیم کیا گیا تھا اس کے صفحہ 120 پر زراعتی اداروں کا نظام کے تحت یہ عبارت درج تھی اراضی کے مالکانہ حقوق کی منتقلی کے باوجود غیر مالک مزارعین کی اکثریت اس کی فیض یابی سے بدستور محروم ہے۔ آئندہ زراعتی ترقی پر غور کرتے وقت یہ پہلو خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ جو مالکان اراضی قدیم سے چلے آ رہے ہیں، ان کے حقوق ملکیت کی حدود قائم کی جائیں گی یعنی وہ نہری رقبے کی 250 ایکڑ اور بارانی رقبے کے 500 ایکڑ سے زائد نہیں رکھ سکیں گے

یہ وہ جملہ تھا جس نے سابق گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد آف کالاباغ کو مخالف کر دیا تھا۔ اور منصوبہ بندی کمیشن کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اس جملے کو اپنے مسودے سے حذف کر دے اور منصوبے کی جو کاپیاں ارکان اسمبلی میں تقسیم ہو چکی تھیں اس سے زائد کی تقسیم کو روک دیا گیا زرعی اصلاحات کے کل حاصل کردہ رقبے اور اس رقبے کی تقسیم کے متعلق جو اعداد و شمار حکومت کی طرف سے پیش کئے تھے۔ وہ درج ذیل تھے:۔

کل رقبہ جو زمینداروں سے لیا گیا 122,09,464 ایکڑ اس رقبے کی تقسیم اس طرح ہوئی نیلام کیا گیا 1,84,324 ایکڑ فروخت کیا گیا 5,35,606 ایکڑ جو بہتر بنانے کے لئے رکھا گیا 2,35,214 ایکڑ رقبہ جو حکومت کے محکمے کو دیا گیا 3,35,758 ایکڑ رقبہ جو مزارعین کو دیا گیا 37,234 اس طرح جن لوگوں کے لئے یہ رقبہ حاصل کیا گیا تھا یعنی مزارعین کو 22 لاکھ ایکڑ میں سے صرف 37 ہزار ایکڑ دیا نواب کالاباغ کے صاحب زادگان نے 18,619 ایکڑ رقبہ حاصل کیا۔ نواب آف کالاباغ بڑی زمینداریاں ختم

کرنے کے سخت مخالف تھے

وہ میاں ممتاز دولتانہ سے بڑے خائف تھے انہوں نے اپنے دور اقتدار میں میاں ممتاز دولتانہ کو ابھرانے کا موقعہ نہ دیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر انہوں نے ممتاز دولتانہ کو صدر ایوب کے قریب جانے دیا تو ان کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ نواب آف کالا باغ نے سردار شوکت حیات، مولانا محمد اکبر خان، زیڈ ایچ لاری، ملک سرفراز آف خوشاب، چوہدری محمد احسن علیگ، سید شاہنواز کرمانی، چوہدری لال دین، میاں عبدالباری اور چوہدری محمد حسین چٹھہ اور مولانا عبدالستار خان نیازی کو ایوب خان کا سیاسی مخالف قرار دیا اور ان کے خلاف کاروائیاں جاری رکھیں۔ نواب آف کالا باغ نے ایبڈو کے تحت 30 دسمبر 1966 ء تک سیاست سے کنارہ کش ہونے والوں کی سیاسی حمایت بھی اندرون خانہ حاصل کر لی تھی علاوہ ازیں ڈیرہ غازی خان کے لغاریوں اور مزاریوں کے درمیان شدید سیاسی محاذ آرائی رہی ہے یہ نواب آف کالا باغ کی سیاسی بصیرت تھی کہ دونوں دھڑے حکومتی پلڑے میں تھے۔ اسی طرح ملتان کے قریشی اور گیلانی بھی نواب آف کالا باغ کی وجہ سے ایوب خان کے ہاتھ مضبوط کرتے رہے۔ ساہیوال سے راجپوتوں اور ارائیوں کو مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم مہیا کیا۔ سرگودھا کے ٹوانوں اور قریشیوں میں مفاہمت کا جذبہ پیدا کیا گیا بعد ازاں دونوں گروپ حکومت میں شامل رہنے کے باوجود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف رہے نواب آف کالا باغ نے ضلع رحیم یار خان سے میانوالی قریشیاں گروپ کے قائد مخدوم حمید الدین کو صوبائی وزیر بنا لیا جس نشست سے موصوف 1962 ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے ان پر ان کے مخالف قومی اسمبلی کے رکن جمال دین والی گروپ کے قائد مخدوم غلام میراں شاہ کو کھڑا کر دیا اور انہوں نے انہیں بلا مقابلہ بھی منتخب کروا لیا۔ اسی طرح ملتان کے قریشی گروپ کے قائد مخدوم سجاد حسین قریشی کے پیر ظہور حسین قریشی نے 1964 ء کے صدارتی انتخاب میں مادر ملت کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی یہ ادا نواب آف کالا باغ کو پسند نہ آئی اس پاداش میں انہیں بہت ستایا گیا۔

سرگودھا کے نواب زادہ ذاکر حسین قریشی ایوبی حکومت میں اس لئے شامل ہوئے تھے کہ نواب آف کالا باغ نے ان کی زمینیں ضبط کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ذاکر حسین قریشی

ممتاز دولتانہ کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے بعد ازاں ان کی آپس میں رشتہ داری بھی ہو گئی۔ ذاکر قریشی کی ممتاز دولتانہ سے رفاقت نواب امیر محمد آف کالا باغ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ 1965 ء میں نواب آف کالا باغ نے ایوب خان کو مشورہ دیا تھا کہ ذاکر قریشی کنونشن مسلم لیگ میں ہونے کے باوجود اس سے مخلص نہیں۔ اس لئے اس کے مخالف دھڑے ٹوانوں کو آگے لایا جائے۔ انہوں نے ملک محمد انور ٹوانہ کا نام ٹکٹ کے لئے پیش کیا۔ نواب آف کالا باغ کی یہ خوبی تھی کہ زرعی اصلاحات کے ذریعے جن جاگیردار گھرانوں پر زد پڑی تھی، انہیں وہ سیاسی اعتبار سے بہت آگے لانا چاہتے تھے اور وہ گورنر کے ساتھ ساتھ جاگیرداروں کے مفادات کے نمائندہ بھی تصور کئے جاتے تھے نواب آف کالا باغ کی چوہدری ظہور الٰہی سے بڑی گہری دوستی تھی نواب آف کالا باغ چوہدری ظہور الٰہی کو گورنر ہاؤس میں بلا کر اکثر مشورے کرتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایوب خان چوہدری ظہور الٰہی کو بہت اہمیت دیتے تھے اور انہیں دو مرتبہ وزارت کی پیش کش بھی کی جسے چوہدری ظہور الٰہی نے شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ نواب آف کالا باغ کو ایوب خان کے قریب کسی سیاسی قائد کا جانا پسند نہ تھا اور وہ خود بھی اپنی ذات میں انجمن رہنا چاہتے تھے۔ بیورو کریسی نے سازش کے ذریعے نواب آف کالا باغ کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ چوہدری ظہور الٰہی آپ کی جگہ گورنر بننا چاہتے ہیں حالانکہ چوہدری ظہور الٰہی کو گورنری میں خود دلچسپی نہ تھی اس سلسلے میں نواب آف کالا باغ نے چوہدری ظہور الٰہی سے ایسی خواہش کے بارے میں سوالات بھی کئے جب انہوں نے نواب آف کالا باغ کے دل اچھی طرح صاف کر دیا تو تب جا کر نواب آف کالا باغ کو تسلی ہوئی۔ چوہدری ظہور الٰہی پاکستان ٹائمز، مشرق اور امروز اخبارات کے مالک بھی تھے۔ راولپنڈی پاکستان ٹائمز نے یہ خبر شائع کر دی کہ نواب امیر محمد آف کالا باغ علاج کے لئے ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ اس خبر سے یہ تاثر لیا جا رہا تھا کہ ایوب خان اب ان کی جگہ کوئی اور گورنر لا رہے ہیں۔ بیورو کریسی اور سیاسی حلقوں میں چوہدری ظہور الٰہی کا نام موضوع بحث بن گیا۔ نواب آف کالا باغ نے نہ صرف اپنے تندرست ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا بلکہ اس دن کے بعد نواب امیر محمد آف کالا باغ چوہدری ظہور الٰہی کے مخالف ہو گئے۔ نواب آف کالا باغ نے 1965 ء میں چوہدری ظہور الٰہی کے حلقے میں ایسی انتخابی حد بندیاں کروائیں جو ان کے لئے نقصان دہ تھیں۔ گجرات تحصیل کو جو ہمیشہ

ایک حلقہ چلا آ رہا تھا، توڑ کر اس کے ساتھ دوسری تحصیلوں کے علاقے بھی شامل کر دیئے تاکہ چوہدری ظہور الٰہی کو اپنے ہی دوستوں چوہدری سی محمد اور جان خان بسال کا مقابلہ کرنا پڑے اور ان کے خلاف چوہدری فضل الٰہی اور چوہدری غلام رسول تارڑ کو کھڑا کیا گیا جو چوہدری ظہور الٰہی کے ضلعی سیاست میں قریبی ساتھی تھے۔ انتخاب سے تین روز قبل نواب آف کالاباغ نے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے چوہدری ظہور الٰہی کے بھائی منظور الٰہی سے رابطہ کیا اور ان کے ذریعے چوہدری ظہور الٰہی کو پیغام بھجوایا کہ اگر قومی اسمبلی سے دستبردار ہو جائیں تو انہیں دو صوبائی اسمبلی کی نشستیں دی جا سکتی ہیں۔ نواب آف کالاباغ نے چوہدری ظہور الٰہی کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی بھی کر لی تھی بعد ازاں اس انکشاف کو چوہدری ظہور الٰہی نے اپنے ایک خصوصی انٹرویو میں افشاں کیا اس طرح ساہیوال میں میاں ممتاز ماہیکا اور میاں یاسین وٹو گروپوں میں شدید سیاسی محاذ آرائی تھی اور ان دونوں کو مادر ملت کی خلاف لا کھڑا کیا گیا اور دونوں گروپوں کی صلح کروا دی۔ مولانا عبدالستار خان نیازی کو محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کے جرم میں سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا گیا نواب صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ملک مظفر نواب سربراہ بنے۔ انہوں نے سیاسی زندگی کا آغاز 1962 ء کے قومی اسمبلی کے انتخاب سے کیا باپ کے قتل کے بعد ملک مظفر علی خان ایک آدھ سال خاموش رہے۔ 1970 ء میں ان کا مقابلہ میانوالی حلقہ نمبر ایک سے جمعیت علماء پاکستان کے مولانا عبدالستار خان نیازی سے ہوا۔ نواب آف کالاباغ نے 49584 ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی ان کے مقابلہ میں مولانا عبدالستار خان نیازی نے 47987 ووٹ حاصل کئے امیر عبداللہ خان روکڑی کنونشن مسلم لیگ کے امیدوار تھے انہوں نے 39786 ووٹ حاصل کئے جبکہ پیپلز پارٹی کے امیدوار عبدالکریم نے 5200 ووٹ حاصل کئے۔ بعد ازاں نواب مظفر خان نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور اپنے سیاسی مخالفوں کرنل محمد اسلم نیازی اور سابق ایم پی اے مسٹر امان اللہ شاہانی کے ساتھ مل کر اپنا گروپ تشکیل دیا 1977 ء کے انتخابات میں ضلع میاں والی کی قومی اور صوبائی نشستوں میں اضافہ کیا 1970 ء کے انتخابات میں یہاں دو نشستیں تھیں 1977 ء میں تین ہو گئیں امیر عبداللہ خان نواب آف کالاباغ کے نائب اور سیاسی دست راست رہے ہیں ملک مظفر علی خان نے اس بار پھر مولانا عبدالستار خان نیازی کو شکست دی دھاندلیوں کے الزامات کے بعد پیدا

ہونے والی صورت حال کے پیش نظر نہ صرف ان اسمبلیوں کو رخصت ہونا پڑا بلکہ ملک میں مارشل لاء لگ گیا مارشل لاء لگ جانے سے سیاسی بیداری کی جس تحریک نے سر اٹھایا تھا اس نے سیاسی سرگرمیاں معطل ہونے کے ساتھ ہی دم توڑ دیا 1985 ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ملک مظفر علی خان کے مقابلے میں مقبول خان نیازی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے تھے نواب مظفر آف کالا باغ کی یہ پہلی شکست تھی اس سے قبل وہ 1977,1970,1965,1962 ء میں چار مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے ان کے بھائی اللہ یار ضیاالحق کی شوریٰ کے رکن بھی رہے ہیں اس فتح نے بلوچی محاذ کے حوصلے بلند کر دیئے ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں دوسری بار تحریک پاکستان کے عظیم مجاہد مولانا عبدالستار خان نیازی نے انہیں شکست دی جو دو مرتبہ 1970 ء اور 77 ء میں ان سے شکست کھا گئے تھے 1988 ء میں بھی ملک مظفر علی خان کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی موت کے بعد ان کا بیٹا ملک وحید بلدیاتی سطح سے ابھرنے کی کوششوں میں مصروف ہے لیکن ابھی تک قومی اور صوبائی سیاست سے اس خاندان کا مکمل خاتمہ ہو گیا ہے۔

عیسیٰ خیل کے نیازی

میانوالی کے جاگیرداروں میں عیسیٰ خیل کے نیازی انگریز دور میں نمایاں ہوئے اور ان سے حاصل کردہ مراعات کے بل بوتے پر سیاسیات پاکستان میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ احمد شاہ درانی کے عہد میں عیسیٰ خیل کا چیف دلیل خان تھا۔ احمد شاہ نے انہیں اس حلقہ میں اپنے خصوصی نمائندہ کی سند عطا کر رکھی تھی۔ وہ انہیں مروت اور بنوں کے علاقہ سے ٹیکس وصول کرنے کے صلہ میں چھ ہزار سالانہ ادا کرتا تھا۔ بعد ازاں یہ خاندان سکھوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان کا زبردست خیر خواہ بن گیا۔ شاہ نواز نیازی سکھوں کے بہت قریبی ساتھی تھے اور یہ سکھوں کی مہمات میں ساتھ ساتھ رہے اور جب انگریزوں نے برصغیر میں قدم جمانے کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تو عیسیٰ خیل کا یہ خاندان ان کے ہاتھ مضبوط کرتا رہا۔ جب جنرل وین گورنر بن کر آیا تو ان کے ساتھ محمد خان نے جو تعاون کیا تھا، اس سے خوش ہو کر انہیں مراعات عنایت کیں اور انہیں جاگیروں کا مالک بنا دیا۔ جب دوسری سکھ جنگ کا آغاز ہوا تو ایڈورڈ محمد خان کے ساتھ مہمات میں شامل تھا اور محمد خان نے جو کارنامے سرانجام دیئے تھے، اس پر ایڈورڈ ان کا بہت شکر گزار تھا کیونکہ انہوں نے سکھوں کو جو عبرتناک سزا دی تھی اس سے انگریزوں کے دل میں اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ ان کا بیٹا عالم خان بھی ایک بہادر خان تھا۔ وہ دلیپ گڑھ کی مہم میں ملک فتح محمد ٹوانہ کے ساتھ ساتھ تھا ملک فتح خان ٹوانہ نے سکھوں پر بہت مظالم ڈھائے تھے، جب خود ان کے قابو آئے تو سکھوں نے اسے قتل کر دیا اور محمد عالم کو قیدی بنا کر لے گئے اور انہیں گجرات کی جنگ سے پہلے رہا نہ کیا۔ ان کے بھائی ایاز خان نے سکھوں کو دھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی سرفراز خان کے ساتھ مل کر رینل ٹیلر کی قیادت میں زبردست معرکہ آرائیاں کیں اور قلعہ لاکھی پر حملہ کر دیا۔ ان کا ایک بھائی شاہ نواز انہی معرکہ آرائیوں میں

ملا گیا۔ شاہ نواز کی موت کے بعد ان کے بیٹے عبدالرحیم خان کو 500 سالانہ پنشن اور اتنی ہی مالیت کی جاگیر ان کے باپ کی انگریز سے وفاداری کے صلہ میں ملی اور انہیں خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا۔ محمد خان 1885ء میں فوت ہوئے۔ انہوں نے اپنی تمام جاگیر چھ بیٹوں اور ایک پوتے کے درمیان مساوی تقسیم کر دی۔ 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو عیسیٰ خیل کا یہ خاندان حریت پسندوں کے خلاف سرگرم تھا اور آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لئے انگریزوں سے ہر طرح کا تعاون کرتا رہا۔ محمد ایاز خان کے پاس حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے ایک گھوڑ سوار دستہ تھا جو بنوں کے ڈپٹی کمشنر کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرتا رہا اور انہیں اس کے صلہ میں 250 روپے پنشن کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ سرفراز خان اور عبداللہ خان نے جنرل وین کی قیادت میں ایک سو گھوڑ سواروں کے ساتھ دہلی کی طرف مارچ کیا۔ اس دستے نے ضلع ہوشیار، پٹیلی، منگولی اور جمال پور میں حریت پسند کو عبرتناک سزائیں دیں۔ عبداللہ خان نے پوری مہم میں جس بہادری کا مظاہرہ کیا، حکومت نے خصوصی طور پر اس کا شکریہ ادا کیا اور ان کے خاندان کے تعاون کو انگریز دوستی کی سدا قائم رہنے والی علامت قرار دیا۔ ان کی خدمات کی ضرورت انگریزوں کو اودھ میں بھی محسوس ہوئی جو آزادی پسندوں کا بہت بڑا مرکز تھا تو انہیں وہاں بھیج دیا گیا۔ محمد عبداللہ خان نے 1860ء میں کمیشن سے استعفیٰ دے دیا اور انہیں اس موقعہ پر انگریزوں کی طرف سے خدمات کے اعترافات کے طور پر 360 روپے کی پنشن سالانہ دی گئی اور 600 مالیت کی جاگیر دی گئی۔ 1868ء میں انہیں تحصیلدار بنا دیا اور صرف چھ سال کے عرصہ میں انہیں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا۔ 1887ء میں 1520 روپے سالانہ پنشن پر ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں انہیں آنریری سول جج اور مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ دوسری افغان جنگ میں انہوں نے نقل و حمل کے سلسلہ میں انگریزوں کو ایک بڑا دستہ دیا۔ اس کے بعد انہیں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ وہ اپنے ضلع کے سب سے نمایاں درباری تھے۔ ان کی موت 1903ء میں ہوئی اور ان کے پس ماندگان میں تین بیٹے تھے۔ فیض اللہ ان میں سب سے بڑے تھے۔ وہ اپنے باپ کی جاگیر (جس کی مالیت 872 روپے تھی) کے مالک بن گئے اور اسے کلار کی زمین جس کی مالیت 800 روپے تھی، وہ بھی ملی۔ وہ ڈویژنل درباری بھی تھے۔ بعد ازاں انہیں صوبائی درباری کی لسٹ میں شامل کر لیا گیا۔ وہ 22 سال تک

آنریری مجسٹریٹ اور لمبے عرصے تک میونسپل کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ رہے۔ ان کی موت کے بعد ان کا اکلوتا بیٹا سیف اللہ خان والد کی جاگیر کا وارث بنا تو انہیں صوبائی درباری کی لسٹ میں بھی شامل کر لیا گیا۔ انہوں نے جنگ عظیم میں فوج میں لوگوں کو بھرتی کی ترغیب دی۔ ڈسٹرکٹ ریکروٹنگ آفیسر کی حیثیت سے انہوں نے میانوالی سے لوگوں کو جس طرح بھرتی کرایا تھا، اس کے عوض انہیں خصوصی بیج دیا گیا۔ 1921ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے اپنی یہ پوزیشن بعد میں آنے والے دونوں انتخابات میں بھی برقرار رکھی۔ 1926ء میں انہیں خان صاحب اور اس کے چار سال بعد خان بہادر کا خطاب دیا گیا اور بعد میں انہیں شاہی کمیشن دے کر راولپنڈی ڈویژن میں آنریری اسسٹنٹ ریکروٹنگ آفیسر کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ وہ 1918ء تک عیسیٰ خیل میونسپلٹی میں وائس پریذیڈنٹ، بعد ازاں ڈسٹرکٹ بورڈ کے نائب صدر نامزد ہوئے۔ انگریز سرکار نے انہیں کئی اور رابطہ عوام کے منصوبے سونپے ہوئے تھے۔ محمد عبداللہ خان کے دوسرے بیٹے عطاءاللہ خان نے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں خان صاحب کا خطاب دیا گیا۔ ان کے بیٹے عبیداللہ خان نے پولیس کی ملازمت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کے چھوٹے بیٹے حمیداللہ خان کے پاس بنوں، میانوالی، لائل پور، ہوشیار پور، شاہ پور اور لاہور میں بہت بڑی جاگیریں تھیں اور اس وقت یہ 1500 سالانہ لینڈ ریونیو ادا کرتے تھے۔ انہوں نے جنگ عظیم میں انگریزوں کی حمایت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی جس کے عوض انہیں کئی تعریفی سرٹیفکیٹ اور سندیں عنایت کی گئیں۔ محمد سرفراز خان جو کہ خان بہادر محمد عبداللہ خان کے بھائی تھے، انہوں نے بھی اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح انگریز سرکار کی خدمت کی جس کے عوض انہیں ایک ہزار مالیت کی جاگیر اور خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ ان کے دو بیٹے عبدالرحمان خان اور محمد نواز خان بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے وفادار رہے۔ محمد نواز خان ڈویژنل درباری بھی تھے۔ انہیں بھی بہت بڑی جاگیر عطیہ میں ملی اور وہ کئی سال تک آنریری مجسٹریٹ رہے عبدالرحمان کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا باپ کی جاگیر کا وارث قرار دیا گیا۔ محمد نواز خان کے پوتے محمد اسلم خان نے وائسرائے

کیشن سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ خان بہادر محمد عبداللہ خان کے ایک اور بھائی محمد ایاز خان بھی انگریزوں کے وفادار تھے۔ انھیں بھی انگریزوں نے خدمات کے صلہ میں خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ ان کے دو بیٹے عبدالکریم خان اور حق داد خان بھی خاندان کی نمائندگی کرتے ہوئے سیاست میں سرگرم رہے۔ یہ بھی انگریزوں کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔

خان بہادر عبداللہ خان C.I.E کی موت کے بعد ان کا بھتیجا خان بہادر عبدالرحیم خان عیسیٰ خیل خاندان کا سربراہ بن گیا اور اس کے پاس یہ عہدہ 1908ء تک برقرار رہا۔ بعدازاں قبیلے کی سرداری ان کے کزن عبدالکریم کے پاس چلی گئی۔ انھیں 1910ء میں خان بہادر بنا دیا گیا اور انھیں خدمات کے عوض 1924ء میں نواب کا خطاب بھی دیا گیا اور انھیں ہشتم کا جاگیردار قرار دے دیا گیا۔ یہ علاقے کے جرگہ کے ممبر، جیل کے نان آفیشل وزیٹر، ڈائریکٹر کواپریٹو سوسائٹی اور زرعی بنک کے نائب صدر تھے۔ خان بہادر عبدالرحیم خان کے بیٹے محمد کرم داد خان عیسیٰ خیل خاندان کے سربراہ بنے تو انھیں صوبائی درباری اور ہشتم کی جاگیریں ورثہ میں ملیں۔ علاوہ ازیں ان کے خاندان کے دیگر افراد عبدالستار خان، عبدالصمد خان اور عبدالرحمان بھی درباریوں کی فہرست میں شامل تھے۔ اس طرح نیازی خاندان کے افراد سیاست میں ابھرتے رہے یوں انگریز سرکار کا دور نیازی خاندان کے لئے ترقی کا زینہ بنتا رہا۔ اس خاندان کے ایک اہم رکن غلام رسول خان فوج میں رسالدار کے عہدے پر متمکن رہے۔ انھوں نے جنگ عظیم تحریک ریشمی رومال میں انگریزوں کی طرف داری میں اہم کردار ادا کیا۔ میانوالی کی سیاست میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔ اس خاندان کے ایک اور اہم فرد غلام قادر خان کی بھی انگریزوں کے وفادار رہے ہیں وہ ڈویژنل درباری، خان صاحب اور بعدازاں خان بہادر بنا دیئے گئے۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ انھوں نے اپنے علاقے میں بدامنی کی تحریکوں اور جرائم کے خاتمہ کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ انھیں ان خدمات کے صلہ اور دوستی کی علامت کے طور پر سونے کی گھڑی اور تلوار کا تحفہ دیا گیا۔ وہ اپنے علاقہ کے جرگہ کے ممبر اور کئی اہم سرکاری ذمہ داریوں پر فائز رہے۔ حکومت نے انھیں کئی تعریفی اسناد دیں۔ عیسیٰ خیل

جب گروہ بندیوں کی سیاست کا آغاز ہوا تو یہ خاندان بھی اپنی وفاداریاں تبدیل کرتا رہا ہے۔ نواب آف کالاباغ نے اپنے علاقے میں سیاسی طور پر کسی کو ابھرنے کا موقعہ نہ دیا تو یہ خاندان پس منظر میں چلا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو جب برسراقتدار آئے تو محمد اسلم خان نیازی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا۔ 1977ء میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس خاندان کی وفاداریاں ضیاء الحق سے وابستہ ہو گئیں۔ 1988ء اور 1990ء کے انتخاب میں عیسیٰ خیل کا نیازی خاندان پس منظر میں چلا گیا۔ مقبول احمد خان نیازی 1985ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انھوں نے نواب آف کالاباغ کی سیاست پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کے بعد نوابزادگان میں کوئی بھی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہا نواب آف کالاباغ اور ان کے صاحبزادگان خود کو ناقابل شکست سمجھتے تھے 1988ء کے انتخاب میں مقبول احمد نیازی ناکام ہو گئے تھے نیازی خاندان نے نواب آف کالاباغ سے برسوں پرانی دشمنی ختم کر کے ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا اعلان کیا تو عیسیٰ خیل کا نیازی خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

رسالدار مردان علی خان آف میانوالی

میانوالی کے میاں

میاں علی جس نے گکھڑوں کے زمانے میں میاں والی دریافت کیا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک انتہائی خدا ترس بزرگ تھے اور انھوں نے بغداد سے نقل مکانی کر کے اس علاقے میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا اور لوگ ان کی آواز پر جان تک قربان کر دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گکھڑوں کو اس علاقے میں اسی بزرگ کی بدولت یہ علاقہ خالی کرنا پڑا تھا۔ ان کا بیٹا سلطان ذکریا کئی سالوں تک روحانیت کے حوالے سے اپنے باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔ ان کا بیٹا علی محمد بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ 1847ء میں چراغ علی، مراد علی اور غوث علی اپنے خاندان کی روحانی طاقت کی بدولت طاقت میں آگئے تھے کیونکہ اس خاندان کے ہزاروں جانثار اس علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور یہ انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہوگئے اور ان کے اشارے پر لوگوں کا خون بہاتے رہے۔ قیادت کے مسئلہ پر یہ خاندان باہمی انتشار کا شکار بھی رہا ہے۔ انگریزوں نے عملی تعاون کے صلہ میں انھیں مالا مال کر دیا۔

چراغ علی کے صاحب زادے میاں حسین علی نے ایڈورڈ کی بہت مدد کی۔ جب بھی وہ مشکل میں ہوتے، میاں حسین علی کا عملی تعاون انھیں مشکل سے نجات دلا دیتا۔ ان کا اکلوتا بیٹا بھی انگریزوں کا وفادار رہا۔ سلطان علی کو انگریز سرکار نے درباری کی نشست الاٹ کر دی تھی اور انھیں باپ کی موت کے وقت وہ تمام سہولتیں بھی مل گئیں جو خاندانی سربراہ ہونے کے ناطے انھیں انگریزوں سے حاصل تھیں۔ وہ میاں والی اور اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے سات دیہاتوں کے مجسٹریٹ بھی تھے۔ انگریز مسٹر تھربن نے انھیں بے پناہ خوبیوں کا مالک قرار دیا تھا۔ انھوں نے اسے بے خوف و خطر، نیزہ باز، بہادر، مشکلات کا مقابلہ کرنے

والا اور سپورٹس کا دلدادہ قرار دے رکھا تھا۔ میاں سلطان علی کا ایک بیٹا میاں محمد حیات ڈسٹرکٹ درباری اور ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے جنگ عظیم میں 240 افراد بھرتی کرائے تھے۔ وہ اپنے باپ کی طرح شکاری اور نشانہ باز تھے۔ جنگ کے بعد انھیں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریکروٹنگ تعینات کر دیا گیا۔ سلطان علی کے پوتے میاں فتح شیر بھی انگریزوں کے وفادار تھے۔ وہ نمبردار تھے۔ انھیں انگریزوں سے تعاون کے صلہ میں پانچ گاؤں نیلی بار اور پانچ مربعے زمین الاٹ ہوئی تھی۔ ضلعی انتظامیہ کے لئے جب بھی لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہوا تو میاں فتح شیر کا تعاون ان کے ساتھ ہوتا۔ اسی طرح مراد علی کے پوتے عباس علی جو کہ اس خاندان کی سیکنڈ برانچ سے تعلق رکھتے تھے، انگریزوں کے وفادار دوست ثابت ہوئے۔ انھیں ڈویژنل درباری اور لمبردار کی حیثیت سے جاگیریں الاٹ ہوئی تھیں اور وہ جرگہ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ان کے بیٹے ملک شیر نے بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں سے تعاون کیا۔ مراد علی کے خاندان کے ایک اور وارث ملک علی نے جنگ عظیم میں شاندار خدمات سرانجام دی تھیں۔ ان کا بیٹا محمد اکبر بھی باپ کی طرح انگریزوں کا جانثار تھا۔ رولٹ ایکٹ اور تحریک خلافت کی تحریک نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ ملک علی اور اس کے بیٹے نے اس تحریک میں مسلمانوں اور ہندوستان کے بسنے والے بے گناہوں کے خون میں درندگی سے ہاتھ رنگے۔ خاص طور پر رولٹ ایکٹ کے ضمن میں ہونے والے جلیانوالہ حادثے نے انگریزوں کو ظلم اور بربریت کا نشان بنا دیا تھا باپ اور بیٹا اس ظلم میں انگریزوں کے وفادار دوست تھے اور انھیں ایسی معلومات فراہم کرتے رہے جس کا صرف اور صرف رولٹ ایکٹ اور تحریک خلافت چلانے والوں کو نقصان اور انگریزوں کو فائدہ ہو سکتا تھا۔ بعدازاں محمد اکبر کو میونسپل کمیٹی میانوالی کا نائب صدر نامزد کر دیا گیا کیونکہ صدر کا عہدہ انگریزوں کے پاس ہی ہوتا تھا۔ انھیں اپنے ضلع میں اہم شخصیت کا پروٹوکول بھی حاصل تھا۔ انھیں 1935ء میں تاج برطانیہ کے لئے دی گئی خدمات کے صلہ میں سلور جوبلی میڈل دیا گیا۔ میاں حیات علی ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر، ذیلدار اور کئی حکومتی ذمہ داریوں پر فائز رہے اور مقامی انتظامیہ کو کامیابی سے چلانے میں ان کے تعاون کا بڑا عمل دخل تھا۔ ان کے بڑے بیٹے میاں شیر محمد تحصیل دار تھے۔ انھیں بھی [illegible] سلور جوبلی میڈل دیا گیا۔ میاں فضل

علی کے صاحب زادے میاں سرفراز 1909ء میں خاندان کے سربراہ چنے گئے۔ وہ اور ان کے بھائی عباس علی ڈویژنل درباری تھے۔ انھوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ اور جرگہ میں جو خدمات سرانجام دی تھیں، حکومت پنجاب نے انھیں ان خدمات کے اعتراف کے طور پر کئی سندیں انعام میں دیں۔ جنگ عظیم میں میاں سرفراز نے پروپیگنڈا کے ذریعے فضا کو انگریزوں کے حق میں بدل دیا تھا۔ وہ 1934ء میں وفات پا گئے تو ان کی موت کے بعد ان کا بیٹا رسالدار مردان علی خاندان کے معاملات کا نگران چنا گیا۔ وہ آنریری مجسٹریٹ، میونسپل کمشنر ممبر جرگہ اور لمبردار کے عہدوں پر کام کرتے رہے ہیں۔ جنگ عظیم میں انھوں نے جو خدمات سرانجام دی تھیں، انگریز ان کی بدولت اس خاندان سے بہت خوش تھا اور خاص طور پر ملٹری نے ان کی خدمات کو بہت سراہا۔ 1935ء میں انھیں سلور جوبلی میڈل دیا گیا۔ میاں خاندان کی روحانی طاقت نے انھیں بہت بااثر بنا دیا تھا اور انھوں نے اپنے اس اثر و رسوخ کی پوری پوری قیمت وصول کی۔ اس خاندان کی ملک فتح خان ٹوانہ سے رشتہ داری ہوئی تو اس خاندان کی سیاسی قوت میں اور اضافہ ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ان خاندان نے ابھرنے کی کوششیں کیں لیکن وہ صوبائی سطح پر سیاسی حوالے سے کوئی اہم کردار ادا نہ کر سکے۔ صرف میاں والی میں ان کا آج بھی اثر و رسوخ ہے۔ میاں ریاض سیاست میں ابھرانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کے والد میاں فیروز علی بھی شہر کی ایک اہم شخصیت شمار ہوتے ہیں۔ میاں غلام حیدر بھی بلدیاتی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس خاندان کے میاں محمد اکبر برس ہا برس سے قومی اور صوبائی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن کامیابی ان سے ابھی تک کوسوں دور ہے۔ وہ میونسپل کمیٹی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ اس خاندان کے نوجوان میاں منیر احمد جو 1991ء میں ڈسٹرکٹ کونسل کے رکن منتخب ہوئے، ان سے توقعات کی جا سکتی ہیں کہ وہ سیاست میں کوئی کارنامہ سرانجام دے سکیں گے۔

خان صاحب ملک امیر خان آف واں بھچراں

ملک سرخرو — ملک چراغ — ملک اکبر

خان بیگ — احمد یار

فتح خان — ملک احمد یار — جہان خان

خدا یار خان — احمد یار خان — برخوردار خان — سردار خان

خان صاحب ملک امیر خان — خدا یار دو بیٹے — جہان خان

خان بہادر کیپٹن ملک مظفر خان — ملک حاکم خان

عمر حیات — خضر حیات

ملک غلام عباس

میانوالی کے بھچر

ملک صاحب ملک امیر خان بھچراں قبیلے کا نمایاں ترین فرد تھے۔ اس خاندان کی میاں والی آمد کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ ملک بندا گجرات کے علاقے سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے ملک بندا کے طفیل ہی اس خاندان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اس علاقے میں سعادت وال گاؤں کی بنیاد بھی رکھی جو اب شادیا گاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ ملک سعادت جو کہ ایک مضبوط کردار کے مالک تھے، ان کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر اس خاندان کو میاں والی میں اہم حیثیت حاصل ہو گئی۔ انہوں نے بندھیال کے علاقے کو دشمنوں کی بربادی سے بچانے کے لئے ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا جو ان کی عسکری قوت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جس کے آثار اب بھی ٹوبہ جٹ والا میں موجود ہیں۔ ملک سعادت پکی کے چیف کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو ان کی موت کے بعد ان کا بیٹا ملک سرخرو قبیلے کا سربراہ بنا۔ انہوں نے سترھویں صدی میں واں بھچراں کا گاؤں آباد کیا۔ انہوں نے دشمنوں سے حملے سے بچاؤ کے لئے ایک مضبوط دیوار بھی تعمیر کی تھی جس کے بارے میں ایک قیاس یہ ہے کہ اس دیوار کی تعمیر شیر شاہ سوری نے کرائی تھی۔

ملک سرخرو نے یہ دیوار کلیار جاٹوں سے مل کر تعمیر کی تھی۔ ملک سرخرو بھی سازشوں کا شکار ہو گیا اور اپنے ہی دوستوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ملک چراغ اپنے بھائی کے قتل کے بعد قبیلے کا سربراہ بنا تو انہیں بھی قتل کر دیا گیا۔ اس وقت ملک چراغ کے تین بیٹے ملک احمد یار (جو اندھے تھے)، ملک فتح خان اور ملک جہاں داد تھے۔ ملک فتح خان اور ملک جہاں داد چھوٹے تھے وہ اپنی ماں کے پاس وٹ خیل چلے گئے۔ بڑے ہو کر ملک فتح خان خاندان کے زیادہ تر معاملات سنبھالتے رہے۔ ان کی دو بیویوں سے چار بیٹے تھے۔

ملک فتح نے راجہ رنجیت سنگھ کے دور میں سکھوں کی حکومت کے استحکام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ سکھوں نے انہیں واں بھچراں کے علاقے کی تعلق داری بھی دے رکھی تھی اور ان کے پاس اس علاقے کی وراثتی قیادت بھی تھی جس کا 1/5 حصہ ریونیو انہیں ملتا تھا۔ ان کا یہ حصہ 1849ء میں الحاق پنجاب کے وقت بند ہو گیا تھا لیکن یہ 1852ء میں پھر بحال ہو گیا۔ اس طرح یہ خاندان سکھوں کی طرف سے ملنے والی امداد سے خوشحال ہوتا گیا۔

ملک فتح خان کا بیٹا احمد یار اور سردار خان سکھوں کے بہت قریب تھے۔ احمد یار کی موت کے بعد ان کا بیٹا ملک امیر خان اپنے باپ کو ملنے والے سرکاری وظائف کا حق دار ٹھہرا۔

ملک خدا یار اور ملک برخوردار خان نے ملتان کے فسادات میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا حالانکہ اس خاندان کو مالی اعتبار سے سکھوں نے ہی ابھارا تھا۔ ملک فتح خان کے پوتے خان صاحب ملک امیر انگریزوں کے لئے بڑا کار آمد ثابت ہوئے۔ وہ 1863ء میں پیدا ہوئے۔ جنگ عظیم میں ان کی خدمات کا الفاظ میں تذکرہ مشکل ہے۔ مقامی انتظامیہ ان کے اس تعاون کی اپنے اقتدار کے خاتمہ تک مشکور رہی۔ ملک امیر خان اور ان کے بیٹے ملک مظفر علی نے جنگ عظیم میں ضلع سے سینکڑوں لوگوں کو بھرتی کرایا۔ انہوں نے ایک ہزار خطیر رقم بھی جنگی قرضہ میں جمع کرائی تھی۔ انہیں 1917ء میں خان بہادر صاحب کا خطاب دیا گیا۔ 1919ء کے فسادات اور ہنگاموں میں بھی ان کی خدمات انگریزوں کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ انگریز نے 1919ء میں جب آزادی کی تحریک کروٹ لے رہی تھی اور تحریک خلافت زوروں پر تھی، ان کی دی ہوئی معلومات انگریزوں کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ انہیں اس کے فوراً بعد ڈویژنل درباری کی لسٹ میں شامل کر لیا گیا۔ ان کے بیٹے خان بہادر کیپٹن ملک مظفر خان نے اپنے باپ کی موت کے بعد بھچراں قبیلے کی باگ دوڑ سنبھالی۔ انہوں نے 1908ء میں دفعدار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور 1920ء میں وہ رسالدار کے عہدے پر جا پہنچے۔ 1930ء میں انہیں کیپٹن کے عہدے پر متمکن کیا گیا۔ انہوں نے 527 افراد کو جنگ عظیم میں بھرتی کرایا تھا۔ 1919ء میں امن قائم کرنے والی کمیٹی میں ان کا نام شامل تھا انہیں پیر محل کالونی میں اے کلاس جاگیر

الاٹ کی گئی اور خان صاحب کا خطاب دیا گیا۔ وہ پنجاب لیجسلیٹو کے نمایاں رکن رہے ہیں۔ وہ اپنے علاقے میں ذیلدار اور آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ وہ میانوالی ڈسٹرکٹ بورڈ کے نائب صدر بھی رہے۔ انہوں نے تین سال تک میانوالی میونسپلٹی کے صدر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ وہ سب رجسٹرار میانوالی کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے ہیں۔ انگریزوں سے وفاداری کی طویل رفاقت کی بنا پر انہیں 1932ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ 1935ء میں انہیں سلور جوبلی میڈل دیا گیا۔ ان کے بیٹے ملک غلام عباس نے علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کے خاندان نے انگریزوں کے لئے جو طویل خدمات سرانجام دی تھیں، اس کے عوض انہیں 35463 ایکڑ اراضی الاٹ کی گئی جس کے عوض وہ صرف 14000 سالانہ مالیہ ادا کرتے تھے۔ ملک غلام عباس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کے ایک بھائی ملک ممتاز کسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے سرگرداں ہیں۔ انہوں نے پنجاب کی سطح پر ایک انجمن بھی قائم کر رکھی ہے۔ اس خاندان کا ایک سپوت ملک منیر انتخابی معرکوں میں حصہ لیتا رہا ہے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ملک منیر، ایف کے بندھیال کے پھوپھی زاد ہیں۔ ملک منیر سپورٹس مین ہیں اور انہیں گھوڑ سواری کا بہت شوق ہے۔ اس خاندان نے بدلتی حکومتوں کے ساتھ ساتھ اپنے رویئے تبدیل کیے ہیں۔

کتابیات

1. **The Chronology of Modern India**
   by James Burgess, C,I,E – L,L,D F,RS,E, F,R,G,S M,R,A,S
   Edinburgh John Grant 31 George IV Bridge, 1913
2. **This War**
   Why Should The Punjab Take A Hand In It?
   Printed by the Civil and Military Gazette Ltd.
3. **Titles and Honorary Distinction in India**
   Printed by Home Secretariat, 1860
4. **War Services of the Shahpur District**
   Printed at the Civil and Military Gazette Press
5. **War Speeches**
   Sir Michael O'Dwyer
   Printed by the Superintendent, Government Printing, Punjab, 1919.

۶۔ مارشلاء سے مارشل لاء تک
سید نور
۷۔ شہاب نامہ

قدرت اللہ شہاب
۸۔ الیکشن 85 طارق اسماعیل
۹۔ الیکشن 88 طارق اسماعیل
۱۰۔ ایوان صدر میں سولہ سال م ب خالد
۱۱۔ "جرنیل سیاست میں محمد اصغر خان"
۱۲۔ (روزنامہ پاکستان کی خصوصی اشاعت) یہ جاگیریں کس بات کا صلہ ہیں
سلیم چوہدری

13- The Lawrences of the Punjab by Frederick P Gibbon

14- The indian Mutiny of 1857 Golonel G.B Malle: son C.S.I Author of "the Decisive Battles of india

15- A History of the indian Mutiny by G.W Forrest C-I-E, EX. Director of records Govt. of india

5 اکتوبر 1945ء انقلاب "کیا یونینسٹ مسلمانوں کا پاکستان اور بے غیر مسلموں کی تازہ خود فریبی"

۱۷۔ 13 اکتوبر 45 انقلاب "وزارت اور حق خود اختیاری" سر فیروز خان نون کا تازہ بیان

۱۸۔ "پاکستان کے دیہہ خدا"
شبلی بی کام

19- Pakistan under the Military: Eleven years of Zia-ul-Haq Shahid Javed Burki ECraig with Contributionsly Robert Laporte, Jr,E Kamal Azfar

21- Not the whole Truth East Pakistan Crisis (March December) Role of the foreign Press by Sarfaraz Hussain Mirza

22- Provincial Politics and the Pakistan Movement by (IAN) Talbot (LAN)

۲۳۔ 22 اپریل 72 "مشرق پاکستان میں جمہوری نظام کی بحالی کے محرکات کا جائزہ"

24- A History of nidian Mutiny G.W Forsest. C-I-E EX Director of records Government of india

۲۵۔ صوبوں میں خلفشار "مارشلا سے مارشلا تک"

۲۶۔ 17 اگست 79 بادبان "کالا باغ میں نوابزادوں سے لیکر روکڑی اور نیازی تک کون کیا کرتا رہا"

۲۷۔ بادبان 79 "سیاسی اور صحافتی داستانیں"
ضیاالسلام انصاری سلسلہ وار

۲۸۔ 15 جنوری 72 مشرق "فوجی حکمران کروڑوں روپے کی اراضی کے مالک"
ریاض بٹالوی

۲۹۔ 30 جنوری 77 نوائے وقت "امریکی سیاست کی سنگدلی"

۳۰۔ 10 فروری 77 نوائے وقت "انتخابی رشتہ داریاں"

۳۱۔ 8 مئی 50 چٹان "ممدوٹ اور دولتانہ میں مصالحت کی کوششیں"

۳۱۔ اداریہ

۳۱۔ 15 اکتوبر 1945ء انقلاب "ملک خضر حیات اور سر فیروز خان نون کی بحث" تصفیہ کی گنجائش اب بھی ہے

۳۲۔ یکم نومبر 1945ء انقلاب "پاکستان اور یونیسٹ مسلمان"
ملک خضر حیات کا بیان

۳۳۔ 2 نومبر 45 انقلاب "یونیسٹ مسلمان اور پاکستان"
میاں ممتاز دولتانہ کے ارشادات

۳۴ 5 نومبر 45 انقلاب "آج حکومت صرف مسلم لیگ ہی سے ٹکر لے رہی ہے"
میاں افتخار کی عبرت آموز تقریر

۳۵۔ 8 نومبر 45 انقلاب "یونیسٹ مسلمان اور پنجاب لیگ باہم اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ آرٹیکل

۳۶۔ 9 نومبر 45 انقلاب "سرخپوش کیوں کانگریس کے ساتھ ہیں"
خان عبدالغفار خان کا دلچسپ بیان

۳۷۔ 11 نومبر 45 انقلاب "پنجاب اسمبلی کے قابل فخر کارنامے"

۳۸۔ 8 دسمبر 1945ء "پنجاب لیگ بورڈ کی نامزدگیاں مختلف حلقوں کے ووٹروں کی شکایات"

۳۹۔ 30 دسمبر 1945ء انقلاب "مسلم لیگ کا جہاد ہندو کے خلاف نہیں انگریز کے خلاف ہے"

۴۰۔ "میرا سیاسی سفر یادداشتیں"
مخدوم زادہ سید حسن محمود

۴۱۔ "پاکستان جمہوریت کا زوال جمہوریت کے خلاف سازشوں کی عہد بہ عہد تاریخ"
محمد فاروق قریشی

۴۲۔ "رنجیت سنگھ کا دربار"
ڈبلیو جی آسبرن ترجمہ نواب ذوالفقار علی خان

۴۳۔ "پاکستان جرنیل اور سیاست"
"افواج پاکستان کے چیدہ جرنیلوں سے مکالمہ"
علی حسن

۴۴۔ "الیکشن 90" طارق اسماعیل ساگر

۴۵۔ " پاکستان تاریخ و سیاست "
ڈاکٹر صفدر محمود

۴۶۔ " انگریزوں کو لڑکیاں پیش کرنے والوں کو جاگیریں اور ریاستیں ملیں "
سینٹ میں بحث 10 مارچ 1992ء

47- Partition and Aftermath Kewal Singh

۴۸۔ 13 مارچ 1992 جنگ " متحدہ ہندوستان کے راجوں اور نوابوں کے بارے میں انکشافات "

۴۹۔ 31 جنوری 1992ء جنگ " سی آئی اے کے عالمی معرکوں اور سازشوں کی کہانی "

۵۰۔ 28 فروری 1991ء پاکستان " سیاسی قتل " (امان افضل)

۵۱۔ 24 اگست 1990ء امروز " 43 برس میں گیارہ وزیر اعظم آئے اور بحران چلتا رہا۔ " مولانا اشفاق

۵۲۔ 19 اکتوبر 1990ء امروز " ملک کی چھ قومی اسمبلیاں ٹوٹ چکی ہیں "
وحید عثمانی

۵۳۔ 27 اگست 1991ء جنگ " سیاسی شطرنج اور 40 گھرانے " سہیل وڑائچ

۵۴۔ 25 جون تا 78 الفتح " راتوں رات ایک خاندان جاگیردار سے صنعت کار بن گیا "

۵۵۔ 23 جنوری 1960ء " میاں مشتاق گورمانی ایبڈو کیس سماعت "

۵۶۔ 12 جنوری 1970ء " مسلم لیگ میں ہیرا پھیری کرنا بہترین بزنس تھا " (قلندر کے قلم سے)

۵۷۔ 2 نومبر 1970ء نوائے وقت " سیاسی جماعتوں کے انتخابی معاہدے ٹوٹ گئے "
عبدالقادر حسن

۵۸۔ " جب سیاست دو نسلی دھڑوں کی اجارہ داری میں چلی جائے؟ "
احسان بی اے

۵۹۔ 13 دسمبر 1970ء امروز " عوام نے نئی قیادت پر اعتماد کیا ہے "
فخر ہمایوں

۶۰ 1 تا 8 اپریل 1977ء الفتح " ملتان کی سیاست گیلانیوں اور قریشیوں کے ہاتھ میں "

۶۱ زندگی " بے نظیر حکومت۔ بے نظیر کارنامے "
تنویر قیصر شاہد

۶۲۔ 21 جنوری 77 الفتح " برستے کوڑے گونجتی فریادیں " (کالا باغ میں جاگیرداروں کے خلاف گواہی دینے والوں کو شہر بدر کر دیا جاتا ہے)

۶۳۔ 17 دسمبر 76 الفتح " کالاباغ کی کالی راتیں، ظلم کا بھیانک سایہ "

۶۴۔ 19 نومبر 1976ء الفتح " کالاباغ میں ابھی تک نجی جیلیں قائم ہیں "

۶۵۔ 27 جون 1972ء الفتح " کالاباغ میں سیاہ رات کب ختم ہو گی "

۶۶۔ 18 مارچ 77 الفتح " قریشوں کے خلاف گیلانیوں کا مورچہ "
ناصر زیدی

۶۷۔ 14 دسمبر 53 چٹان " یہ ہیں ہمارے نمائندے " (اداریہ)

۶۸۔ 23 اپریل 76 الفتح " طوطا چشم سیاستدان 4 کروڑ روپے ہضم کر گئے " " 1970ء کے انتخاب کی اندرونی کہانی "

۶۹۔ ایوبی دور میں ملک کے ذرائع آمدنی کی بندر بانٹ
خیف خصوصی رپورٹ

۷۰۔ 19 جون 1976ء معیار " پنجاب کے دارالحکومت میں رہائشی قطعات کی بندر بانٹ "

۷۱۔ 24 دسمبر 1976ء الفتح " لاہور کی پوش کالونیوں کے پلاٹ کس کو ملے "

۷۲۔ ستمبر تا دسمبر 1988ء نوائے وقت، امروز، مشرق، الیکشن رپورٹ جنگ

۷۳۔ ستمبر تا دسمبر 1990 نوائے وقت، امروز، مشرق، جنگ، الیکشن رپورٹ

۷۴۔ 29 مئی 1988ء صدر ضیاء الحق تقریر

۷۵۔ 6 اگست 1990ء صدر غلام اسحاق خان تقریر

۷۶۔ 31 مارچ 57 لیل و نہار "ایک اور وزارت ٹوٹ گئی"

۷۷۔ 6 اپریل 70 زندگی "نوکر شاہی جس نے پورے ملک کو نوکر بنالیا ہے"

۷۸۔ 24 جنوری 71 نصرت "عوام پر افسر شاہی کے مظالم"

۷۹۔ 3 ستمبر 1953ء اقدام "بڑے جاگیرداروں کی جنگ اقتدار کا ڈنکا بج گیا"

۸۰۔ 18 اپریل 54 اقدام "پنجاب مسلم لیگ کے 33 بڑے"

۸۱۔ "میں نے یحییٰ کی دعوت کیسے قبول کی جنرل شیر علی انٹرویو"

۸۲۔ 5 فروری 50 اقدام "ممدوٹ دولتانہ ملاقات" اداریہ

۸۳۔ 11 فروری 77 الفتح "انتخاب میں بائیس خاندانوں کے امیدوار"

۸۴۔ 20 نومبر 1950ء چٹان "تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے"
دولتانہ کے ارشادات

۸۵۔ جنوری تا مئی 1951ء امروز الیکشن رپورٹ 1951ء

۸۶۔ جنوری تا مئی 1951ء نوائے وقت الیکشن 1951ء

۸۷۔ فروری تا مئی 1962ء امروز الیکشن رپورٹ

۸۸۔ فروری تا مئی 1962ء نوائے وقت الیکشن رپورٹ

۸۹۔ دسمبر 1964ء تا مارچ 1965ء امروز صدارتی انتخابات

۹۰۔ دسمبر 1964ء تا مارچ 1965ء مشرق صدارتی انتخابات

۹۰۔ صدارتی انتخابات

۹۱۔ مارچ تا جون 1965ء مشرق، امروز، نوائے وقت قومی انتخابات رپورٹ

۹۲۔ ستمبر تا دسمبر 1970ء امروز، مشرق، نوائے وقت، قومی انتخابات رپورٹ

۹۳۔ جنوری تا مئی 1977ء امروز، نوائے وقت، جنگ کراچی، مشرق، وفاق الیکشن رپورٹ

۹۴۔ ستمبر تا دسمبر 1979ء امروز، مشرق، نوائے وقت، بلدیاتی انتخابات

۹۵۔ جنوری تا مئی 1985ء امروز، جنگ، نوائے وقت، مشرق، (غیر جماعتی انتخاب

رپورٹ)

۹۴۔ 23 دسمبر 77 معیار "جنگ آزادی کے غدار انگریزوں کے وفادار پاکستان کے حکمران" (رسال حسین)

۹۵۔ 21 مئی 76 الفتح "ایوب کے بیٹے اپنے نام ریلوے کا کارخانہ قائم کرنا چاہتے تھے" (مشتاق احمد وجدل)

۹۶۔ 20 فروری 76 الفتح "یو ٹو کی پروازوں کا خفیہ معاہدہ"
شوکت صدیقی

۹۷۔ 23 مئی 75 الفتح "ایوبی دور کی ان کہی کہانی"

۹۸۔ اپریل 76 الفتح "جرنیلوں کی رات" (ایک عینی شاہد کے انکشاف)

۹۹۔ 23 جولائی 1976ء الفتح "5 سال میں کروڑ پتیوں میں دوگنا اضافہ"
میر عالم فاروقی

۱۰۰۔ وزیر اعظم کی سفارش پر قومی اسمبلی کے 75 ارکان کو کیسے پلاٹ الاٹ ہوئے
شاہین بھٹی

۱۰۱۔ 2 مارچ 1972ء الفتح "یحییٰ کے دربار میں نوکر شاہی کا اعتراف گناہ"
شوکت صدیقی

۱۰۲۔ یکم اگست 1975ء الفتح "جب سرداروں نے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کی بگھی کھینچی"

۱۰۳۔ "کالا باغ میں صدیوں سے مسلط ظلم کی کالی رات دم توڑ رہی ہے"

۱۰۴۔ 9 جولائی 1976ء الفتح "کالا باغ میں آج بھی نواب کا سکہ چلتا ہے"
جعفر خان

۱۰۵۔ 20 دسمبر 70 امروز "کیا پیپلز پارٹی مخالف بنچوں پر بیٹھے گی"
فخر ہمایوں

۱۰۶۔ 20 دسمبر 70 زندگی "سفلی جمہوریت سے ملوکی جمہوریت تک"
عبدالکریم عابد

۱۰۷- 15 نومبر 70 امروز "تمام سیاسی جماعتیں بڑی زمینداریاں ختم کرنا چاہتی ہیں"
فخرماہیں
۱۰۸- 30 اکتوبر 60 لیل و نہار "اندھیرے سے اجالے تک جاگیرداریاں"
۱۰۹- 21 دسمبر 70 جنگ کراچی "ون یونٹ کی تاریخ"
۱۱۰- 24 ستمبر 77 معیار "گجرات کی سیاسی ڈائری"
۱۱۱- 14 دسمبر 65 نوائے وقت "پاکستان اور امریکہ"
۱۱۲- 17 جنوری 64 نوائے وقت "ضرورت ہے اپوزیشن کی"
زیڈ اے سلہری
۱۱۳- 24 مارچ 58 چٹان "قزلباش وزارتی سہیلیاں اور سیاسی پہیلیاں"
۱۱۴ یکم ستمبر 65 نوائے وقت "امریکی دباؤ کا نیا محاذ"
۱۱۵- 19 ستمبر 57 امروز "ری پبلکن اور مسلم لیگی ارکان کو وفادار بنانے کی مہم"
اداریہ
۱۱۶- 14 اگست 1960ء امروز "پاکستان کا حال اور مستقبل"
ایوب خان سابق صدر
۱۱۷- 18 دسمبر 75 امروز "مسلم لیگ کا ماضی، حال، اور مستقبل"
۱۱۸- 29 نومبر 1991ء نوائے وقت "اپوزیشن حکومت کا کچھ نہیں بگاڑ سکی"
میاں م ش کی یادیں
۱۱۹- 20 تا 27 جنوری 1972ء الفتح "پاکستان کے خلاف فوجی جرنیلوں کی سازشیں"
۱۲۰- 10 اگست 89 تکبیر "سرکاری ملازمت دینے کے تمام اختیارات وزیر اعظم کی ذات میں مرتکز ہو گئے"
(ناصر محمود)
۱۲۱- 16 اگست 1990ء تکبیر "بے نظیر اقتدار کے پتے بکھر گئے"
122-Playing with Desting by M-H Askari Herald

Election (90) Spacial issue.
123- The hot Seats Herald election (90) Spacial issue.
124- Who,s who Political families of Punjab (Herald election 90) Rajas, Sheiks and Chaudheys (election 90) Herald.
۱۲۵- 3 مارچ 69 چٹان صدر ایوب کی رسوائی کا ذمہ دار الطاف گوہر
۱۲۶- 12 نومبر 50 امروز مسلم لیگی لیڈروں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ملک کی ترقی میں رخنے ڈالنے شروع کر دیئے"
منشور آزاد پاکستان پارٹی
۱۲۷- 8 دسمبر 69 مشرق "بدعنوانی کے الزام میں معطل ہونے والے"
۱۲۸- 9 تا 25 فروری 80 الفتح" 61 سے 71 کے واقعات میں سیاستدانوں کا ہاتھ نہیں تھا"
۱۲۹- 23 مئی 1959ء امروز "حق نواز ٹوانہ قاسم بجلی سمگلنگ کیس میں"
۱۳۰- 31 اگست 72 پاک جمہوریہ "قائداعظم سے قائد عوام تک"
۱۳۱- 20 جنوری 70 زندگی "معلبدوں اور خوابوں کا بادشاہ دولتانہ" مجیب الرحمان شامی
۱۳۲- 25 جنوری 59 اقدام "سرکاری زمینوں کی تقسیم" (رپورٹ)
۱۳۳- 3 نومبر 53 لیل و نہار "نئی وزارت پرانی سیاست"
۱۳۴- 31 اگست 58 اقدام "جاگیردار سیاست کا کردار قزلباش"
۱۳۵- 30 مارچ 64 چٹان "مسلم لیگ کھوٹے سکے"
"نواب زادہ نصراللہ خان کے تجربات، مشاہدات، تاثرات، آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد کی داستان"
۱۳۶- 2 مارچ 70 زندگی "نواب زادہ نصراللہ خان کی کہانی"
مجیب الرحمان شامی

۱۳۷-30 اکتوبر 57 لیل و نہار "دس سال میں 5 سوار
مرکزی وزارتیں کب اور کیوں ٹوٹیں

۱۳۸-3 نومبر 70 امروز "جمہوری مجلس عمل کی کارروائیوں کے محرکات"

۱۳۹- یکم ستمبر 57 اقدام "مغربی پاکستان کے پنجابی وزراء جواب دیں"
اداریہ

۱۴۰- 21 نومبر 53 چٹان "پیروں کی گدیاں سیاست میں"

۱۴۱- 7 اگست 50 چٹان "دولتانہ اور ممدوٹ سے درخواست"
اداریہ

۱۴۲- 17 دسمبر 69 اخبار جہاں "عبدالغفور خان ایوب کے عروج و زوال کی کہانی سناتے ہیں"

۱۴۳-16 اگست 72 اخبار جہاں "پاکستان والو عزت حاصل کرو" (اداریہ)

۱۴۴-22 مئی 1950 چٹان "اٹھارہ سو ستاون میں وفاداری بشرط استواری کے صلے"

۱۴۵-25 دسمبر 50 چٹان "لیاقت علی خان کی خدمت میں"

۱۴۶- ___ چٹان 1950 "اقتدار کی خاطر ہر چیز جائز ہے"

۱۴۷-10 دسمبر 1951 چٹان "پنجاب مسلم لیگ کیا کر رہی ہے"

۱۴۸- زندگی 1971 "اپوزیشن کی کہانی نوابزادہ نصراللہ کی زبانی"

۱۴۹- 9 مئی 1976 "نوائے وقت سیاسی دھڑے بندیاں پنجاب کے قومی و صوبائی اراکین کی قلابازیاں۔" طارق اسماعیل

۱۵۰- جنوری، فروری، مارچ انقلاب "الیکشن 1946"

۱۵۱- 9 مارچ 1970 چٹان "دولت بٹ کے رہے گی۔" شورش کشمیری

۱۵۲- 25 فروری تا 4 مارچ 1977 الفتح "انتخابی گٹھ جوڑ"

۱۵۳-22 جنوری چٹان "مرکز اور پنجاب"

154- What Accountalilty.(The news.)

۱۵۵- زندگی 1970 "سیاسی گھرانے ادھر بھی تھے ادھر بھی تھے" طارق اسماعیل

۱۵۶- 2 فروری 59 چٹان "زرعی اصلاحات"

۱۶۰- 15 اگست 58 چٹان "انگریزوں کے برخوردار۔ شورش کشمیری"

۱۶۱- 6 نومبر 77 اخبار جہاں "جنرل رانی کے انکشافات"

۱۶۲- 29 جنوری 77 معیار "نو جماعتی اتحاد کیسے بنا"

۱۶۳- 6 نومبر 55 اقدام "سیاسی دھڑے بندیوں کی ذمہ داری کس کی ہے"

۱۶۴- 4 جنوری 55 امروز "ریاست بہاولپور اور اس کے حکمران"

۱۶۵- 19 جنوری 70 مشرق "سکندر مرزا سے چیف کمشنر تک سب حکام سمگلروں کے بادشاہ سے کمیشن وصول کرتے تھے"

۱۶۶- "پاکستان میں وزارت عظمیٰ کی کرسی آنے اور جانے والوں کی کہانی" (طارق اسماعیل) جمعہ میگزین روزنامہ پاکستان

۱۶۵- 28 اکتوبر 1991 نوائے وقت "پنجاب اسمبلی میں معرکے" (میاں محمد شفیع، م ش)

۱۶۶- 11 اکتوبر 1991 نوائے وقت "سانپ اور سیڑھی کا کھیل کب تک" (سید انور قدوائی)

۱۶۷- 23 دسمبر 1991 جنگ "ضلع ڈیرہ غازی خان کی بلدیاتی ڈائری فاروق لغاری اور ذوالفقار کھوسہ میں انتخابی کشمکش" (افتخار غوری)

۱۶۸- 23 دسمبر 1991 جنگ "آہیر اور ٹوانہ گروپوں کے درمیان کانٹے دار مقابلہ" (ایم حسین حیدری)

۱۶۹۔ 12 مارچ 57 کو خان ممدوٹ نے ان لوگوں کے ناموں کا انکشاف کیا جن کو زمین الاٹ کی گئیں۔ (اسمبلی سوال)

۱۷۰۔ 26 مارچ 77 معیار نون برادران 70 میں مخالف 77 میں ایک ساتھ۔ سرگودھا کی سیاسی ڈائری

۱۷۱۔ 26 مارچ 77 معیار چھوٹے ملکوں میں سی آئی اے کیسے مداخلت کرتی ہے

۱۷۲۔ 11 فروری 77 معیار وہی چہرے وہی حکمت عملی (نواب بمقابلہ مولوی) میانوالی کی انتخابی ڈائری

۱۷۳۔ 4 مارچ 77 الفتح مقابلہ ہل اور تلوار کا نہیں جاگیرداروں اور برادریوں کا ہے (پنجاب کی انتخابی سرگرمیوں کا خصوصی جائزہ)

۱۷۴۔ 4 مارچ 77 الفتح نوکر شاہی اور عوام کا مقابلہ 77 کا الیکشن کون لڑ رہا ہے

۱۷۵۔ 20 جنوری 78 الفتح حقیقی سیاسی قوت پانچ سو جاگیرداروں، افسروں اور وکیلوں کے پاس رہی ہے۔ (مبشر حسن)

۱۷۶۔ 31 جنوری 1992 جنگ سروے بلدیاتی گروہ بندیاں

۱۷۷۔ 21 تا 28 جنوری 1977 الفتح مقابلہ ٹوانوں اور قریشیوں میں ہوگا

۱۷۸۔ 26 نومبر 1970 امروز جہلم کی سیاسی ڈائری

۱۷۹۔ 21 تا 28 جنوری 1977 الفتح کیمبل پور کی سیاسی ڈائری

۱۸۰۔ 6 تا 12 مارچ 1977 زندگی پنجاب کے دریاؤں کا رخ کس طرف ہے۔ رپورٹ ممتاز اقبال ملک

۱۸۱۔ 16 جنوری 1960 سردار محمد خان لغاری کے خلاف ایبڈو کی سماعت

۱۸۲۔ 21 تا 28 جنوری 1977 الفتح جاگیرداروں کے گڑھ میں عوامی جدوجہد

۱۸۳۔ پاکستان کا ہر وزیر اعظم کسی نہ کسی سازش کا شکار ہوا۔ عبدالمجید خان

۱۸۴۔ 3 نومبر 58 چٹان میجر جنرل سکندر مرزا کی سبکدوشی (اداریہ)

۱۸۵۔ غلام محمد کی حکومت ایوب خان کی مرہون منت تھی

۱۸۶۔ 26 نومبر تا 30 دسمبر 76 الفتح شوکت حیات کی سیاسی گدی پر سکندر حیات

۱۸۷۔ 20 تا 27 جنوری 1972 الفتح پاکستان کے فوجی جرنیلوں کی سازشیں۔ ارشاد راؤ

۱۸۸۔ 2 ستمبر 1957 چٹان گورمانی کا استعفیٰ۔ اداریہ

۱۸۹۔ 8 فروری 1951 چٹان پنجاب کی انتخابی سیاست کا جائزہ

۱۹۰۔ 26 ستمبر 1956 اقدام میاں مشتاق گورمانی انٹرویو عبداللہ بٹ

۱۹۱۔ 16 ستمبر 56 اقدام سید عابد حسین انٹرویو عبداللہ بٹ

۱۹۲۔ 28 دسمبر 72 سے 4 جنوری 73 تک الفتح پنجاب نواب آف کالاباغ سے مصطفیٰ کھر تک

۱۹۳۔ 2 اپریل 1951 چٹان میاں ممتاز دولتانہ کے افکار

۱۹۴۔ 18 اکتوبر 1956 اقدام میاں ممتاز دولتانہ انٹرویو عبداللہ بٹ

۱۹۵۔ 30 ستمبر 57 چٹان ایک ملک دو حکومتیں کئی نظریئے (اداریہ)

۱۹۶۔ یکم تا 7 اکتوبر 73 زندگی م ش کی یادیں

۱۹۷۔ دولتانہ وزارت کے چند پہلو 4 اکتوبر 70 قندیل

۱۹۸۔ میں نے ایوب خان کو خوشامدانہ خط لکھا

م ش کی یادیں 17 تا 23 دسمبر 73 زندگی

۱۹۹۔ ری پبلکن پارٹی اقتدار کی خاطر ہر چیز جائز ہے

24 نومبر 1956 اقدام

۲۰۰۔ دولتانہ کی تقریر کے خلاف زمینداروں نے محاذ بنالیا
م ش کی یادیں 26 تا 30 ستمبر 73 زندگی

۲۰۱۔ جاگیرداروں کی جیت 28 مارچ 58 امروز

۲۰۲۔ بے اصولی کی انتہا (اداریہ) 20 مارچ 58 امروز

۲۰۳۔ 21 اگست 49 آفاق ہمارے لیڈروں کی ناانصافیاں اور اس کا علاج

۲۰۴۔ 11 ستمبر 49 آفاق مسلم لیگ زرعی اصلاحات کمیٹی کی رپورٹ

۲۰۵۔ 19 اکتوبر 49 آفاق دھڑے بندی کے نتائج

۲۰۶۔ 23 جولائی 1950 آفاق ممدوٹ گروپ اور دولتانہ گروپ کشاکش یہ جھگڑا کیا ہے اور کیوں ہے

۲۰۷۔ 15 اپریل 1973 امروز آئین ساز کے چھبیس سال

۲۰۸۔ 19 تا 26 فروری 1977 معیار کیمبل پور کی ڈائری

۲۰۹۔ 12 نومبر 1970 مشرق لائل پور برادریوں کی جنگ

۲۱۰۔ 2 ستمبر 73 لیل و نہار پیر کمعڈ وزارت کے انتظار میں

۲۱۱۔ 17 دسمبر 1991 جنگ پنجاب کی بارہ سالہ بلدیاتی سیاست کا پوسٹ مارٹم وکیل انجم

۲۱۲۔ 28 جولائی تا 3 اگست 1978 زندگی چڑھتے سورج کے پجاری صوبائی وزارتوں کے امیدواروں کی سرگرمیاں

۲۱۳۔ کیا ہوتا رہا اور کیا ہو رہا ہے۔ نصراللہ خان کا تحریری بیان

۲۱۴۔ 18 اکتوبر 1953 اقدام شوکت حیات کا استعفیٰ

۲۱۵۔ پنجاب کی سیاست کے رازہائے سربستہ کی کہانی سردار شوکت حیات کی زبانی

۲۱۶۔ 12 مئی 1948 امروز خاندان ممدوٹ

۲۱۷۔ 14 اگست 1948 امروز

۲۱۸۔ 29 جنوری 1982 جنگ پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت برادریوں اور خاندانوں کے گرد گھومتی ہے

۲۱۹۔ 31 اکتوبر 1949 امروز اٹک کے نواب مظفر علی خان (تعارف)

۲۲۰۔ 27 ستمبر 49 امروز سردار محمد نواز گھیب (تعارف)

۲۲۱۔ 19 مارچ 49 امروز میاں ممتاز دولتانہ (تعارف)

۲۲۲۔ 23 مارچ 49 امروز پنجاب اور سرحد کے جاگیردار پنجاب میں دولتانہ حکومت 716 دنوں پر محیط

۲۲۳۔ 26 مارچ 53 امروز وزارت اور کابینہ کا پس منظر

۲۲۴۔ 22 فروری 51 امروز نواب مشتاق گورمانی پس منظر

۲۲۵۔ 23 فروری 1953 امروز سرگودھا کے ٹوانے

۲۲۶۔ 5 دسمبر 1952 امروز نصراللہ خان نے مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔ میں نے قائداعظم کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مشتاق گورمانی انٹرویو زندگی

۲۲۷۔ مغربی پاکستان کی بساط سیاست اداریہ اقدام 20 مئی 1956

۲۲۸۔ 25 نومبر 1970 اخبار جہاں میاں ممتاز دولتانہ انٹرویو

۲۲۹۔ 19 تا 26 اپریل 1973 الفتح سی آئی اے کے سربراہ سے ایوب کا قریبی رابطہ۔ جمناداس اختر

۲۳۰۔ 24 تا 31 مئی 73 الفتح یحییٰ خان کی رنگین راتوں کا پراسرار کردار فیقی

۲۳۱۔ 30 مئی 1950 چٹان شوکت حیات لیگ تعارف

۲۳۲۔ زندگی رپورٹ چوہدری محمد حسین چٹھہ اصول پسندی سے برادری ازم تک

۲۳۳۔ 20 جنوری 1958 چٹان رشید وزارت کے خلاف سازش (اداریہ)

۲۳۴۔ 16 نومبر تا 3 دسمبر 76 الفتح پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر جاگیرداروں کے مظالم حزاری نے پارٹی کارکنوں کے گھروں کو آگ لگادی

۲۳۵۔ 7 جنوری 1951 آفاق مسلم لیگ کے کارکن اور پنجاب کے بڑے

۲۳۶۔ 20 نومبر 50 چٹان ممتاز دولتانہ کے ارشادات

۲۳۷۔ 15 جنوری 51 چٹان پنجاب کی انتخابی جنگ

۲۳۸۔ 6 مئی 1962 نوائے وقت سردار شوکت حیات کی برطرفی

۲۳۹۔ 13 مئی 1962 نوائے وقت مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں قوت آزمائی

۲۴۰۔ 3 مئی 1962 نوائے وقت یونینسٹ اور مسلم لیگ

۲۴۱۔ 4 مارچ 1951 آفاق ضلع گجرات کی سیاسی سرگرمیاں

۲۴۲۔ 18 جنوری 49 چٹان حصول اقتدار کا دلچسپ تماشا

۲۴۳۔ 7 فروری 49 چٹان وزارتی ڈرامے صرف آخر

۲۴۴۔ 12 نومبر 1951 چٹان ملک قادر بخش رپورٹ

۲۴۵۔ 10 نومبر 48 امروز وزارت کا جھمیلا۔ بدعہدی کی داستان

۲۴۶۔ 15 فروری 1951 امروز برادریوں اور گروہ بندیوں پر ٹکٹ دیئے گئے

۲۴۷۔ سکھ آمریت سے ایوبی آمریت تک (مختار حسن)

۲۴۸۔ بڑی بڑی زمینداریوں کی سرزمین جھنگ (احسان بی اے)

۲۴۹۔ تاریخ کی شہادت

سپریم کورٹ میں اے کے بروہی کے دستاویزی ثبوت

۲۵۰۔ سیاست دان اور اعلیٰ افسر، انہیں زمینیں کیوں ملیں اور کیسے ملیں۔ حسین منصور (صحافت)

۲۵۱۔ 19 تا 26 اپریل 73 الفتح مسلم لیگ نے قوم کو آئین سے محروم رکھنے کی سازش کی تھی۔ (قومی اسمبلی میں میاں افتخار الدین کی تقریر)

۲۵۲۔ 8 نومبر 1953 اقدام پنجاب کے جاگیردار (مخدوم) منظور انور قریشی

۲۵۳۔ 19 جنوری 1970 زندگی سرکاری افسر کارخانوں کے مالک بن گئے

۲۵۴۔ 8 ستمبر 57 اقدام کشمکش اقتدار (اداریہ)

۲۵۵۔ 19 فروری 1975 اخبار جہاں ملک خضر حیات ٹوانہ۔ ایک شخصیت۔ ایک تاثر۔ ایک ملاقات فرید احمد

۲۵۶۔ 18 مارچ 57 چٹان وہ خدایا یہ زمین تیری نہیں میری نہیں (اداریہ)

۲۵۷۔ 16 مارچ 1972 الفتح نوشتہ دیوار پڑھ کر اپنی یادیں تازہ کیوں نہیں کرتے۔ علی جمال

۲۵۸۔ 18 اکتوبر 1953 پنجاب کے جاگیردار ٹوانے۔ منظور انور قریشی

۲۵۹۔ سیاسی وفاداریاں کیا رخ اختیار کریں گی؟ الطاف حسن قریشی

۲۶۰۔ نواب آف کالاباغ میرا دوست میرا دشمن۔ یادوں سے چوہدری ظہور الٰہی پردہ اٹھاتے ہیں۔ (مختار حسن انٹرویو) زندگی

۴۶۱۔ 17 دسمبر تا 24 دسمبر 1977 معیار ون یونٹ کا خاتمہ ہربرٹ فیلڈ کی کتاب سے تلخیص

۴۶۲۔ 23 اگست 1970 قندیل ایوبی دور کے پیشہ ور بیان باز

۴۶۳۔ 21 اکتوبر 1970 اخبار جہاں جو سازشیں لیاقت علی کے قتل سے شروع ہوئیں ان کی منزل کہاں ہے

۴۶۴۔ 12 نومبر 1977 معیار سونا اگلنے والی زمین افسروں کو اونے پونے دے دی گئی

۴۶۵۔ 18 فروری 1977 معیار ملتان کی سیاست پر سیاسی خاندانوں کا قبضہ

۴۶۶۔ 7 دسمبر 1970 نوائے وقت لغاریوں کی سیاست

SECRET.

/CB

COMMISSIONER
SARGODHA DIVISION

Ph.4400/4300

Dated Sargodha the 2nd June,1980.

SUBJECT:- VISIT OF DR.ABDUL RAUF,DIRECTOR PUBLIC INSTRUCTIONS PUNJAB TO RABWAH ON 24-5-1980.

H.R.PASHA

Dear Mr.

It has been reported that Dr.Abdul Rauf Director Public Instructions Punjab, visited Rabwah on 24th May,1980 to preside over a function of Talimul Islam College,Rabwah. After the function he called on Ameer Jamayat-e-Ahmadia and invited him to embrace Islam. This gesture was resented at the time it was made and it has generated further resentment in the Qadiani community.

2. I do not understand the motives which prompted Dr.Abdul Rauf to take such a step. As a Government servant his acts are likely to create misunderstanding among people of Rabwah which as you are aware, is quite a sensitive place. His motives might have been extremely noble but his act could lead to extremely serious consequences. There is a lot of resentment among the Ahmadi community in Rabwah. The local administration is of the view that a poster appearing in Rabwah threatening to take all the girl students of Jamia Nusrat for Women, as hostages was put up as a measure of retaliation to what Dr.Abdul Rauf, had done.

3. I am bringing this fact to your notice so that you could caution Dr.Abdul Rauf about his public conduct.

With regards,

Yours sincerely,

(H.R.PASHA)

Mr.Safdar Hussain Kazmi,
Secretary to Government of the Punjab,Education Department,
LAHORE.

دعانامہ بطور ایڈریس

بحضور جناب نواب ... آنریبل سر مائیکل فرانسس او ڈوائر جی سی آئی ای کے سی ایس آئی لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب

OFFICIAL USE ONLY.

SELECTED PAPERS

RELATIVE TO THE

GRANT OF TITLES AND HONORARY DISTINCTIONS

IN INDIA.

CALCUTTA:

Printed by F. F. Wyman, Home Secretariat.

1860.

Tahsil Pindigheb—contd.

MAKHAD.						
Mawiz Khan, Pathán, of Nardra.	......	65	...	...	Has no great claims; was Mukhtár to Khan of Makhad, but they have since quarrelled.	
Fatteh Khan, Pathán, of Nardra.	......	60*	...	...	A useful man.	
Malik Hayát, Awan, of Maian.	......	50	...	...	Good man. Increased from Rs. 25 to Rs. 30.	
Nádir Shah, Pathán, of Nardra.	......	60*	...	...	Nádir Shah helps all who go to Nardra, whether officials or not, and is worthy of commendation.	
Mir Afzal, Pathán, of Nardra.	......	60*	...	...	Serves Pasio, at Lakarwár.	
Pir Ghulám Jáfar Shah, of Makhad.	......	50	...	...	The Settlement Officer recommended an inám for this man; but the Financial Commissioner disallowed it, as he doubted its necessity and the proposal did not seem to him to find its proper place in a list of lambardári ináms. This case, perhaps, does not come exactly within the terms of the Government order, but the Pir is, I believe, a leading man among agriculturists, and I think it would be very useful to have a hold on some one else in Makhad besides the family of the late Ghulám Muhammad Khan. As a matter of policy the inám would, in my opinion, be well bestowed, and the Pir would then be better able to take up the position of a leading member of the agricultural community, which would be an advantage.	I shall be glad if Government can accept this recommendation; but Ghulám Jáfar is not a lambardár, and to put his grant on the same basis as the grants to lambardárs would not, I think, be wise. If given, it should be granted to him personally, to be held during the pleasure of Government, and at his death it should be considered, as there is no certainty that his son will succeed to his influence. (Sd.) E. G. W.
Total		325	157	250	This is a frontier tract, requiring a considerable number of ináms. Raising Malik Hayat to Rs. 30, this gives a total of Rs. 275. The tract is a poor one and the jáma low. I think the amount should be maintained.	*I have raised three of the ináms from Rs. 50 to Rs. 60. The tract is on the banks of the Indus, far removed from control, and at the same time the people are well behaved. The money is very well deserved. (Sd.) E. G. W.

No. 2, dated 3rd January 1889.

7. Basant Singh of Philloke ... 1 rectangle.
8. Hiru of Chak No 36, tahsil Khangah Dogran .. 1 do.
9. K. B. Ch. Karam Ilahi, M.B.E., Ahmad nagar ... 6 rectangles.
10. Sardar Sundar Singh, M.B.E. 2 do.
11. Nihal Singh, son of Subel Singh, Waraich of Rarhiala, Waraich .. 1 rectangle.
12. Ram Singh, son of Zaildar Sant Singh of Kila Rai Singh ... 1 do.
13. Karam Dad, of Matto, Bhanoke ... 2 rectangles.
14. Pensioned Havildar Sundar Singh, son of Kharak Singh, Virk of Bahk Lakhin ... 1 rectangle.

(III).

LIST OF PERSONS TO WHOM JAGIRS WERE GRANTED.

		Rs.
1. Rai Sahib Teja Singh of Sangla	...	500
2. Ch. Ghulam Qadir of Kot Bhaga	...	250
3. Ch. Sant Singh, Sufedposh, Majju Chak	...	250

(IV).

LIST OF PERSONS WHO WERE GRANTED SEATS IN DIVISIONAL DURBARS.

1. Sardar Sundar Singh, Pleader, M.B.E.
2. Ch. Fazal Ilahi, Zaildar, of Vanike.

(V).

LIST OF PERSONS TO WHOM REWARDS WERE DISTRIBUTED AT THE COMMISSIONER'S DURBAR, HELD AT GUJRANWALA, ON 5TH MARCH, 1918.

1. R. S. Teja Singh ... Gun.
2. B. Sundar Singh, Pleader ... Do.
3. Ch. Ghulam Qadir, Zaildar, of Kot Bhaga Do.
4. S. B. S. Kirpal Singh, of Mananwala .. Silver Watch.
5. Ch. Fazal Ilahi Zaildar, of Vanike ... Do.
6. Ch. Ata Ullah, Zaildar, of Kaulo Tarar .. Do.
7. Ch. Muhabbat Khan, Zaildar, of Karkan... Do.
8. Ch. Sultan Ahmad, Zaildar, of Wazirabad... Do.
9. Ch. Muhammad Khan, Zaildar, of Kalaske Do.
10. Ch. Sant Singh Sufedposh, Majju Chak ... Do.
11. Qazi Mazhar Husain, retired Tahsildar of Sodhra ... Stick.
12. S. Afzal Ali of Mahbubpura ... Do.
13. S. Rajwant Singh, Zaildar of Rariala ... Lungi, 1st Class.
14. Ch. Husain Khan, Tarar of Kaulo Tarar Do.
15. Ch. Bahawal Sher of Khanga Dogran ... Do.
16. S Sardul Singh of Wazirabad ... Lungi, 2nd Class.
17. Ch. Sardar Khan of Kaulo Tarar ... Do.
18. Ch. Bhagwan Singh, Zaildar of Kuthiala Do.
19. Ch. Surat Singh, Zaildar of Ghazi Kaka Do.

A statement showing the names of persons who invested Rs. 1,000 and above in the 1st War Loan is attached herewith.

A list of those gentlemen who subscribed big amounts and helped in securing subscribers, and in recognition of their services were granted Sanads by the Local Government or the Secretary, Provincial War Loan Committee, is also attached.

2nd War Loan.—Total Rs. 48,01,750. An announcement in connection with the 2nd War Loan was made by Government in April 1918. As at the time of 1st War Loan a similar Local Committee was formed to collect subscriptions for the II War Loan, the members of the Committee tried their utmost to collect money. In order that fullest publicity be given to the Loan a large number of leaflets and posters both in English and Vernacular and Gurmukhi suitable to various classes of people were distributed and posted in the Bazars. They were also distributed to District Inspector of Schools, Head Masters of Secondary Schools and Principals of Colleges. It was largely through the personal influence of the President and members of the District Committee that a total sum of Rs. 48,01,750 was collected in this district. A statement showing the names of investors of Rs. 1,000 and over is attached herewith.

Recruiting.—The Lahore District did not do much in the way of Recruiting. According to a village-to-village census made by the Patwaris and Kanungos the number of men in the Army on 31st March 1919 was as follows:—

Name of Tahsil. Total male population. No. in Army on 31-4-19. Per cent of Col. 3 on Col. 2.

Name of Tahsil	Total male population	No. in Army on 31-4-19	Per cent of Col. 3 on Col. 2
Lahore City			
Lahore Tehsil ..	138,793	3.404	2·4
Kasur ..	161,789	5,404	3·3
Chunian ..	122,641	1648	1·3
Total ..	423,223	10,456	2·4

As compared with other districts the recruiting activities of Lahore district were not as good as could be desired. The district in pre-war time was not a favourite recruiting ground. The number of Lahore men in the Army before the War was about 2,000. The villagers in the neighbourhood of Lahore City did not readily enlist in the Combatant ranks, they made too good a living as daily labourer in and about the city to think of entering the service. At the same time the pressure of population was so light that there was no pecuniary incentive to a military life. It cannot be said that any great military ardour was aroused during the War but the number serving rose to about 10,800 of whom about 9,160 were combatants, 1,640 non combatants. These figures do not include the very large number of labourers skilled and otherwise who joined up through the Railway Recruiting Office. These cannot have numbered less than 2,000 of whom the Hon'ble R. B. Ram Saran Dass, C.I.E., enlisted some 700. These men principally came up from the villages close round Lahore city from which a large number of the ordinary Railway operatives also come.

Turning to the tribes and castes the only tribe that did really well were the Labanas who enlisted 450 men or 1 in 5 of the male population. For the recruiting activities among the Labanas Sardar Sahib Gopal Singh is mainly responsible. Christians also did well having supplied 750 or 1 in 12 of the total male population. The Christian figures are good as they stand, but in reality they are even better than this as a large number of Christians enlisted in Mazhbi-Regiments, so that the actual number of the Mazhbis that are shewn as being enlisted for the Lahore District exceeds the total male population as shewn in the last Census.

Many small villages in this District supplied more than their quota and the Patti School sent 60 boys to the Army.

Account of persons who have won the Indian Order of Merit (I. O. M.) and shewn gallantry in the War

The only distinction I have been able to trace is the I. O. M. (II Class) won by Havildar Kishan Singh of the Guides of Chak No. 45, Tahsil Chunian. This distinction was won in 1915 for gallantry on the North-West Frontier. It has also been ascertained that several other men of the 20th Punjabis showed gallantry in the action at Sannaiyat near Nut and among them Hakim Singh, son of Hardit Singh, Jat Pattidar of Chima, Tehsil Kasur, carried ammunition through a barrage (barsat) of bullets three times but was killed by a bomb.

List of persons who have contributed Rs. 500 or over to all funds in the Lahore District upto 31st December 1918.

	Name	Rs.	a.	p.
1.	His Honour the Lieutenant Governor, Punjab	1,500	0	0
2.	Raja Fateh Singh of Sheikhupura	22,100	0	0
3.	Hon'ble R. B. Ram Saran Dass, C. I. E. ..	25,000	0	0
4.	Nawab Fateh Ali Khan, C. I. E.	22,000	0	0
5.	Chaudhari Ghulam Rasul	7,000	0	0
6.	R. B. Lala Mohan Lal	8,600	0	0
7.	Messrs. Spedding & Co.	9,398	0	0
8.	Rani Sahiba Rani Chhaunian	5,000	0	0
9.	Hon'ble Nawab Zulfiqar Ali Khan, C.I.E. ..	1,500	0	0
10.	Chaudhari Fazal Ilahi	1,500	0	0
11.	Hon'ble K. B. Mian Muhammad Shafi, C.I.E.	1,000	0	0
12.	Mata Musli Committee, Katlui	1,000	0	0

to perpetuate to some degree the memory of former rulers; and were it not for the really contemptible private character of most Indian Chiefs and Princes, I should feel much inclined to suggest that purely English distinctions should be bestowed. I can imagine that the Minister of Nepaul received with greater delight the decoration of the Grand Cross of the Bath than he would have done any oriental Title, and I think that distinction would be highly valued by any Indian ruler, the Nizam for instance; but I submit that it is too pure an honor to be sullied by being shared in by such characters as Asiatics usually bear. The same may be said of the lower classes of the Order of the Bath.

6. All such distinctions are of a personal nature; but hereditary Titles are generally considered as honors to a family. For instance, I would not hesitate to propose a Baronetcy for the Nabob of Jourah, but I should be sorry to see him gazetted as K.C.B. or even *Knight Bachelor*; the grants should, in my opinion, be all from Her Majesty.

2nd.—TO NATIVES GENERALLY.

7. *The Order of Merit.*—I would beg to propose that, as in the Order of the Bath, there be both a Military and Civil class, and I know no other improvement that could be made, but it should be very sparingly bestowed to both Civil and Military.

8. I have for many years felt convinced that the time had arrived for our Government to try to introduce some distinction for those who can show *hereditary* service before the Hon'ble Company's rule in India ceased. I have often said that I should be proud to wear a Copper Order, bearing merely the words "*Tisree pooskt Sircar Company ka Noukar.*"

9. The natives cling to family services: the worst of their rulers, in the greatest of his extremity, has frequently found his old hereditary servants cling to his ruined fortunes. So valuable and so amiable a characteristic ought not, I submit, to be neglected by so great a Government as ours. But our whole system is to treat the Natives as if they were machines. At Lord Elphinstone's table in December 1856, I mentioned this, and remarked that

ANNEXURE D.

REWARDS FOR WAR SERVICES.

(I).

LIST OF PERSONS UPON WHOM TITLES WERE CONFERRED

	Name.	Title.	Date of announcement.
1.	L. Sant Ram ...	Rai Sahib ...	8th August, 1917.
2.	L. Udai Bhan, Civil Surgeon ...	Do. ...	Do.
3.	Lala Amar Nath, M.A., LL.B., Extra Assistant Commissioner	M. B. E. ...	3rd June, 1918.
4.	Khan Bahadur Chaudhri Karam Ilahi, Ahmadnagar ...	Do. ...	Do.
5.	Lala Maya Das, Civil Surgeon...	Rai Sahib ...	Do.
6.	Lieut. Colonel A.J. O'Brien, C.I.E., Deputy Commissioner	C. B. E. ...	1st January, 1919.
7.	Malik Sahib Khan Nun, Revenue Assistant ...	M. B. E. ...	Do.
8.	M. Sundar Singh, Pleader, Gujranwala ...	Do. ...	Do.
9.	S. Amar Singh, Extra Assistant Commissioner ...	Sardar Sahib ..	Do.
10.	L. Khushi Ram, M.A., Head master ...	Rai Sahib ...	Do.
11.	Rai Bahadur Barkat Ram ...	M. B. E. ...	June, 1919.

(II).

LIST OF PERSONS TO WHOM GRANTS OF GOVERNMENT WASTE LAND WERE MADE.

1. K. B. Mirza Sultan Ahmad, E.A.C. ... 5 squares.
2. Ch. Ali Muhammad of Laungowal ... 2 "
3. Ch. Zafar Yasin, grandson of Nizam Din, Zaildar of Shahkot ... 2 "
4. Ch. Hayat Muhammad of Gakhar ... 2 "
5. Ch. Wahid Ali, Zaildar, Murikke ... 2 "
6. Ch. Ali Ahmad, Wazirabad ... 2 "

Tahsil.	Ilaqa.	Name of Inamkhor, caste and village.	Jagir, mafi or pension enjoyed already with remarks by Settlement Officer.	Amount of Inam.	Retainable amount of Inam.	Limit assigned.	Remarks by Settlement Officer.	Remarks by Financial Commissioner.	No. and date of letter conveying Government sanction.	Remarks.
1	2	3	4	5	6	7	8	9	10	11
	DEWAL—concld.		Tahsil Murree—concld.	Rs.	Rs.	Rs.				
		Hassan Ali Khan, Dhund, of Ausia.	......	25	...	...	On account of the Ausia, commonly called the Dewal Dâk Bungalow and Parão.	I concur in these proposals. (Sd.) R. W.		
			Total	300	281	400	I think Rs. 300 is a sufficient sum for this Dhund Ilâqa.			
	KOTLI.	Sura Khan, Satti, of Chhajâna.	......	60	...	...	The head of the Satti clan; an old man, supposed to have done good service; influential.	I concur with these proposals. (Sd.) R. W.		
		Haidar Khan, Lambardâr, Satti, of Kotli.	......	30	...	...	A new Inâm for Haidar Khan, who serves Kotli Parão, is required.			
		Haidar Khan, son of Jâffar Khan, Satti, of Kotli.	......	25	...	...	Strongly recommended by Tahsildâr. Kotli is rather a heavy parão.			
		Muhammad Zamân, Satti, of Malot Sattian.	......	15	...	...	An Inâm is required in this tract, and I think this man should have it.			
		Bakhsh Khan, Kethwâl, of DhirkotKethwâlân.	......	20	...	...	A deserving man in his way.			
			Total	190	84l	190				

INAMS

IN THE

RAWALPINDI DISTRICT

SANCTIONED

UP TO THE

17th OF JANUARY 1889.

Published by Authority.

Lahore:
THE "CIVIL AND MILITARY GAZETTE" PRESS,
Contractors to the Punjab Government.

1890.

HISTORY

OF THE

WAR SERVICES

OF THE

GUJRANWALA DISTRICT

BY

AMAR NATH, M.A., LL.B., M.B.E.,
Extra Assistant Commissioner, Punjab.

1920.

Published under the Authority of the Punjab Government

Lahore:
PRINTED AT THE "CIVIL AND MILITARY GAZETTE" PRESS.

their own homes. The defence of the frontier is no doubt important, but your Pathan neighbours in the North-West Frontier Province are performing the same duty and also giving one *jawan* in every nine to the greater task of defending the Empire. I expect the Tumandars to make the Mukaddams and all their tribesmen understand that it is their duty to provide men for the army which, whether it is fighting in Egypt or Palestine or Mesopotamia, is in reality defending the frontiers of India. Let me quote the words addressed by His Excellency the Viceroy to the Baluchistan Chiefs at his visit to Quetta in October 1917—" When I was told that the martial races of Biluchistan still remain but scantily represented in the army my surprise was almost as great as my regret. I recognise and gladly acknowledge the manly part your Frontier Province plays in standing guard like a faithful sentinel at one of the gates of India. I recognise the sparseness of your population and the other difficulties peculiar to Baluchistan. But I trust that you will now set yourselves in earnest to devise means to secure a more adequate representation of Baluchistan in His Majesty's Forces." Those words apply with equal force to you. In answer to His Excellency's appeal no less than 500 recruits were produced by Baluchistan in the second fortnight of January. Are you contented to stand aside when your neighbours in Baluchistan, the North-West Frontier Province and the Punjab, are coming forward in thousands to fight for a cause which is as much yours as theirs. To this day your bards sing the deeds of the great Baloch warriors of the past. Their song hereafter will be hushed in very shame if you do not now show yourselves worthy of your fathers. But the call to arms is not for the Balochis only. The Jats and Pathans of this district are equally subjects of the *Sarkar* and equally bound by their duty to obey the call of duty and to follow the example of their brethren in other districts and to prove that the Jat and the Pathan are still men."

So far I have appealed to you in the name of your duty to the *Sarkar* and of the call of honour, claims which a loyal and manly people are quick to admit. But the material advantages which a military career now offers are substantial. They may not be so well known in this district as in the rest of the Punjab, and I will repeat what I have said elsewhere. A bonus of Rs. 50 is given to each combatant recruit, Rs. 10 on enrolment and the remaining Rs. 40 as

soon as he is passed fit by the Medical Officer of his regiment. The soldier receives his clothing and food free at the hand of the *Sarkar*. He can save practically all his pay, and it is said that in Rawalpindi and Jhelum as much as 20 lakhs a year are sent home by soldiers of those districts. You can imagine what a difference such a yearly income would make in a poor district. The soldier is carefully guarded against disease; if disabled by wounds or illness he receives a substantial pension, and if he loses his life on service—and more lives were lost in this district in the recent malaria epidemic than in the 3 years' campaign in Mesopotamia—his family is not forgotten. The man who does his duty well and has ability, can rise to the commissioned ranks and establish his own *izzat* and that of his family for good. Those who may not wish to serve on in the army can take their discharge six months after the end of the war and return to their homes if they have been on service, with a medal on their breasts to show that they have done their duty as brave men. And finally Government has set apart 178,000 acres in the Lower Bari Doab Colony as rewards to those whom the Military authorities select as having rendered specially distinguished service. The honour, *khillats* and *sanads* which I have distributed to-day prove that Government is not slow to recognise those who have served it in times of need, and I trust that your response to my appeal to-day will justify even more ample recognition before the year is over. We are now, there is reason to believe, in the last year of the war, and if you are to play a part in it worthy of your forefathers, worthy of your name, you must come forward without delay, so as to share in the final struggle and in the credit of the final victory.

19 - Speech delivered by His Honour the Lieutenant-Governor at a Darbar held at Dera Ghazi Khan on the 18th February 1918.

* * * * * * * * * *

At the Darbar held here in 1916 I pointed out that the army offered an honourable career to all and particularly to those who found it difficult to earn a livelihood in their homes, and I said that I should be glad to see the district taking its share in meeting the demand for recruits. It is true that you have not in the past been accustomed to serve in the Indian Army and at the outbreak of war there were less than a score of men from Dera Ghazi Khan in its ranks. You slept away 1915 and 1916, and the year 1917 opened with only 40 men from this district in the army. A special appeal for recruits was made in 1917, and by the end of the year the number had risen to 418, of whom practically all were combatants, and the latest figures gave a total of 640. The improvement though slow is steady, and perhaps justifies me in sharing your confidence that in time the Baloches, Jats and Pathans of this district will come forward in some proportion to their numbers and martial traditions. But you will realise how inadequate the present numbers are from the following figures :—

			Number of males.	Number enlisted.
Baloches	..	..	115,000	450
Jats	..	..	77,000	140
Pathans	..	..	7,000	51

In the Rawalpindi Division, which adjoins you, one man in every seven of fighting age is now serving in the Indian Army. In the adjoining North-West Frontier Province one man in nine of the Pathan population is with the colours. Here in Dera Ghazi Khan you have given so far only one man out of 150.

I realise the difficulties of recruiting among a simple and home-loving people who though brave and loyal have hitherto had no military connections or traditions. I admit

the good work you are performing by protecting 250 miles of your own border. But with all this I am not satisfied, that you have fully discharged your duty in this great crisis and now that a beginning had been made, I am sure you will not rest content till the results are more worthy of a race which rightly prides itself on its courage and its loyalty.

To the small results hitherto achieved the Sori Lunds, the Mazaris, Legharis, Drishaks and Nutkanis have mainly contributed, while the Bozdars, Kasranis, Gurchanis and Khosas have so far been the most backward.

Most of the recruits have gone to form a Double Company in the 3-124th Balochis at Karachi, and the fact that the regiment is commanded by Colonel Holbrook, who served so long in this district and whom we are all glad to see here to-day, is a guarantee that your *jawans* will meet with kind and considerate treatment. One encouraging feature is that members of the Chiefs' families are beginning to come forward. Sardar Hamidullah Khan, nephew of Nawab Sir Bahram Khan, who originally enlisted in the Punjabi Brigade Signal Section, is now a Jemadar in the 3-124th Balochis, and will, I am confident, uphold the name and traditions of his family. A cousin of the Leghari Chief is also a Jemadar, and offers of service have been received from the eldest sons of the Bozdar and Kasrani Chiefs. I hear that some 30 men of the Baloch Levy following the excellent example of their Subedar-Major Nur Muhammad Khan have volunteered for the army, and I congratulate them on their patriotic decision. All honour to those who led the way. Among these the first was Khan Muhammad Khan, Khosa Leghari, Zaildar of Mamuri, who sent his son and eight of his neighbours to the 10th Lancers, where they have turned out so well that I hear the Commanding Officer would like to have a troop of them Examples like these should inspire all classes, Tumandars and tribesmen, Jats and Pathans, with a similar spirit of patriotism. The Tumandars have recently received liberal grants of land from the *Sarkar* in the Lower Bari Doab Colony in recognition of their position and past services. Those grants are conditional on active loyalty, and I am confident that they will give proof of this by redoubling their efforts to raise recruits from among their tribes. The Deputy Commissioner tells me that the assistance given by the Mukaddams is less than it should be, and that some of them imagine they have discharged their duty when they have offered service in

19 - Speech delivered by His Honour the Lieutenant-Governor at a Darbar held at Dera Ghazi Khan on the 18th February 1918.

* * * * * * * * * *

At the Darbar held here in 1916 I pointed out that the army offered an honourable career to all and particularly to those who found it difficult to earn a livelihood in their homes, and I said that I should be glad to see the district taking its share in meeting the demand for recruits. It is true that you have not in the past been accustomed to serve in the Indian Army and at the outbreak of war there were less than a score of men from Dera Ghazi Khan in its ranks. You slept away 1915 and 1916, and the year 1917 opened with only 40 men from this district in the army. A special appeal for recruits was made in 1917, and by the end of the year the number had risen to 418, of whom practically all were combatants, and the latest figures gave a total of 640. The improvement though slow is steady, and perhaps justifies me in sharing your confidence that in time the Baloches, Jats and Pathans of this district will come forward in some proportion to their numbers and martial traditions. But you will realise how inadequate the present numbers are from the following figures :—

			Number of males.	Number enlisted.
Baloches	..	..	115,000	450
Jats	..	..	77,000	140
Pathans	..	..	7,000	51

In the Rawalpindi Division, which adjoins you, one man in every seven of fighting age is now serving in the Indian Army. In the adjoining North-West Frontier Province one man in nine of the Pathan population is with the colours. Here in Dera Ghazi Khan you have given so far only one man out of 150.

I realise the difficulties of recruiting among a simple and home-loving people who though brave and loyal have hitherto had no military connections or traditions. I admit

NEW SERIES No. 18.

SELECTIONS FROM THE RECORDS

OF THE OFFICE OF THE

FINANCIAL COMMISSIONER, PUNJAB.

Published by Authority.

No. 44.

CONTENTS.

Lahore:
THE "CIVIL AND MILITARY GAZETTE" PRESS,
Contractors to the Punjab Government.
1896.

NEW SERIES No. 18.

SELECTIONS FROM THE RECORDS

OF THE OFFICE OF THE

FINANCIAL COMMISSIONER, PUNJAB.

Published by Authority.

No. 44.

CONTENTS.

Lahore:
THE "CIVIL AND MILITARY GAZETTE" PRESS.
Contractors to the Punjab Government.

1896.

وکیل انجم ایک نوجوان اخبار نویس ہیں ان کے سینے میں ایک مضطرب دل ہے اور دل میں سب کچھ کرگزرنے کا جذبہ وہ گھسے پٹے راستوں پر چلنے والے نہیں بلکہ اپنا راستہ آپ بنانے والوں میں سے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ سیاست کے فرعون پڑھ کر جعلی خداؤں کے خلاف جدوجہد کا جذبہ پیدا ہوگا۔ کیونکہ یہاں بندگی سے تو بھلا نہیں ہوگا اِن خداؤں کے لیے تو محمود غزنوی کی ضرورت ہے۔

مجیب الرحمٰن شامی

- سیاست کے فرعون کہانی ہے اُن جاگیرداروں کی جنہوں نے
- ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں کے خون سے ہاتھ رنگے۔
- قومی تحریکوں میں ملت اسلامیہ سے غداری کی۔
- انہیں جاگیریں، خطابات اور انعامات کیسے ملے۔
- بدلتی حکومتوں میں کیسے قلابازیاں لگاتے رہے۔
- پلاٹ اور قرضے کیسے حاصل کیے۔